ماہنامہ
کرن
ستمبر 2012
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
کرن کتابچہ
فیشن کل اور آج

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

ستمبر 2012

جلد 35 شمارہ 6

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

ستمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
پاکستان کی تاریخ میں ماہ ستمبر ایک اَن مٹ موڑ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جب دشمن نے رات کی تاریکی میں وطن عزیز پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ پاکستانی فوج کے جیالے سپاہیوں نے اس حملے کا مقابلہ ایک نئے ولولے اور جوش سے کیا تھا۔ اور وطن عزیز پر حملہ کرنے والوں کو دندان شکن جواب دیا۔ پاکستان کی مسلح افواج کے لاتعداد سپاہیوں نے اپنی جانوں کی قربانی دے کر وطن کو بچالیا۔
پاکستان ہماری شناخت ہے اور ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ جس کے لیے جان و مال ہر چیز کی قربانی دی جاسکتی ہے۔
آئیے اس دن کی یاد منائیں اور ان شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کریں جنہوں نے ہماری عزت و سلامتی کے لیے اپنی جانیں قربان کیں کہ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو کبھی نہیں بھولتیں۔

اس شمارے میں،

- اداکار "نور حسن" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "بینش چوہان" دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- ایف ایم 101 کے پریزنٹر "اکبر شہباز" کی باتیں،
- "مجھ سے ملیے" میں مصنفہ "بشریٰ احمد" اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں،
- "دردِ دل"، نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "دستِ کوزہ گر"، فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "نایاب ہیں ہم"، شفق افتخار کا مکمل ناول،
- مہوش افتخار اور صبا سحر کے مکمل ناول،
- "وہ اک پری ہے"، ریحانہ امجد بخاری کا دلچسپ ناولٹ،
- "نامحرم"، فاخرہ گل کا ناولٹ،
- اقصیٰ اسلام، رشک حبیبہ، شہزادی عباس، تنظیر فاطمہ اور مسرت ظہور کے افسانے
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "فیشن کل اور آج" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے پیش خدمت ہے۔ استفادہ کیجیے۔

شیاطینِ زمانہ سے تو اپنی ڈھال میں رکھے
تیرا احسان ہے مولا تو جیسے حال میں رکھے

نشانی ہر نفس، ہر رنگ سے تیری ہویدا ہے
عطا پھولوں کو خوشبو ہو یا پھل کو ڈال میں رکھے

کسے جیون کا لمحہ دے، کسی کی موت لکھ ڈالے
جسے چاہے اسیری اس کی مہ و سال میں رکھے

بنا تیری اجازت ہم سے کچھ بھی ہو نہیں سکتا
ستارے زیر کر دے، یا ہمیں پاتال میں رکھے

سوالی ہوں تیرے در کا کرم کی بھیک رکھ دے
گناہوں کو اگر مولا میرے اعمال میں رکھے

عطا کر دین و دُنیا میں ہمیں اسلاف کا رستہ
الٰہی جیسا ماضی تھا، اسی کو حال میں رکھے

سیّد فہیم الدین

ذکرِ خیر الانعام جاری ہے
تب ہی سارا نظام جاری ہے

رحمتِ مصطفےٰ ہے سایہ فگن
ساری دُنیا کا کام جاری ہے

سنتِ ربِ دو جہاں تازہ
لب پہ جب ان کا نام جاری ہے

ہوں معطّر تو نعت بنتی ہے
حرف جاری، کلام جاری ہے

ہاں یقیں ہے، کہ جی رہے ہیں ہم
ہاں درود و سلام جاری ہے

چار سو ان کے چاہنے والے
حوضِ کوثر ہے، جام جاری ہے

سیّد فہیم الدین

نور حسن سے ملاقات

شاہین رشید

اکثر اوقات مختصر کردار بھی لیڈنگ رول سے زیادہ پاور فل ثابت ہوتے ہیں اور جہاں لیڈنگ رول کا یا ڈرامے کا ذکر آتا ہے وہاں ایسے رول کا ذکر بھی ضرور آتا ہے جس کی وجہ سے کہانی میں رنگ آتا ہے یا انقلاب آتا ہے..... ڈرامہ سیریل "ہم سفر" کی بازگشت میں کمی نہیں آئی ہے اور نہ ہی لوگ اس کے کردار خضر کو بھول پائے ہیں۔ آج کل آپ اس کردار کے اصل نام نور حسن کو کافی ڈراموں میں لیڈنگ رول میں دیکھ رہے ہوں گے۔ لیکن ان کی پہچان اب بھی خضر ہی ہے اور لگتا ہے کہ کافی عرصہ رہے گی۔ اس بار ان سے گفتگو ہوئی جو نذر قارئین ہے۔

★ "کیسے ہیں نور حسن خضر کے کردار سے باہر آئے؟"

* "اللہ کا کرم ہے اور میں تو اس کردار سے کافی عرصے سے باہر آگیا ہوں۔ مگر لوگ باہر نہیں آتے ہیں مجھے دیکھتے ہی کہتے ہیں کہ وہ دیکھو "خضر" جا رہا ہے اور ساتھ ہی کچھ برا بھلا سننے کو ملتا ہے۔"

★ "سچی بات ہے کہ پورے سیریل میں آپ ہی چھائے رہے ہیں۔ حالانکہ آپ دو چار ہی اقساط میں آئے ہوں گے۔ اتنا مختصر رول کیوں کیا؟"

* "میں نے ایک دو ڈراموں میں ہی مختصر رول کیے ہیں ورنہ تو میرا لیڈنگ رول ہی ہوتا ہے اور یہ کردار تو ایسا تھا کہ لیڈنگ جیسا ہی تھا..... اس لیے آپ اسے مختصر رول نہیں کہہ سکتیں۔"

★ "آج کل ماشاء اللہ آپ کو کافی ڈراموں میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ بتائیں کہ مزید کیا مصروفیات ہیں؟"

* "آج کل مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔ گزشتہ چھ ماہ سے تو میں مسلسل کام کر رہا ہوں اور کئی ماہ کے لیے پہلے سے ہی بک ہوں۔ بہت اچھے لیڈنگ رول ہیں میرے اور سب سے بڑی بات یہ کہ جتنے بھی لیڈنگ پروڈکشن ہاؤسز ہیں ان سب کے ساتھ میں کام کر رہا ہوں۔ چھ ڈرامہ سیریلز آن ایر ہیں اور چھ مزید انڈر پروڈکشن ہیں اور مزید کے لیے بات چیت چل رہی ہے اور یہ سیریلز مختلف چینلز سے چلیں گے۔"

★ "ہم سفر کے کردار کی بات ایک مرتبہ پھر کروں گی کہ لوگوں نے برا بھلا تو کہا گالیاں بھی پڑیں۔ آپ کو اچھا لگا یا امیج خراب ہوا؟"

* "امیج خراب نہیں ہوا کہ سب کو پتا ہے کہ یہ ڈرامہ تھا۔ لیکن مجھے یہ حیرت ہے کہ ڈرامہ سمجھنے کے باوجود لوگ اس میں اتنے انوالو ہو گئے کہ لوگوں نے اس کو حقیقی کردار سمجھ لیا۔ لیکن مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ میں نے پہلا نگیٹو کردار کیا اور مجھے اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور میں نگیٹو رول اس

لیے بھی کرنا چاہ رہا تھا کہ ایک ایکٹر بننے کے لیے آپ کو مختلف موڈ شو کرنے پڑتے ہیں۔ صرف ہیرو کے ہی رول کر کے آپ اپنے آپ کو بحیثیت ایکٹر نہیں منوا سکتے۔ اور اگر لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں تو آپ نگیٹو رول میں یہ جان سکتے ہیں کہ آپ میں کام کی صلاحیت کتنی ہے اور لوگوں کو بھی اندازہ ہو کہ آپ دیگر رولز بھی کر سکتے ہیں۔"

★ "تو جب یہ چھوٹا مگر پاور فل رول ملا تو کیا اندازہ تھا، مقبول ہو گا یہ رول یا نہیں؟"

* "میں جیسا نظر آتا ہوں اور میں جس طریقے سے بولتا ہوں اور جیسی میری شخصیت ہے تو جب مجھے یہ کردار ملا اور میں نے لوگوں کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ تم یہ رول نہیں کر سکتے کیونکہ تمہاری شکل نگیٹو رول والی نہیں ہے۔ تمہاری شخصیت ویسی نہیں ہے تم دھیمے لہجے میں بات کرتے ہو تمہارے لیے یہ رول کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تب میں نے اپنے دوستوں اور دیگر لوگوں کو جن کو میں نے رول کے بارے میں بتایا تھا کہا کہ اب تو یہ رول میرے لیے چیلنج بن گیا ہے کہ جس طرح میں نظر آتا ہوں اسی کو سامنے رکھ کر میں یہ کردار کروں گا اور میں نے یہ کردار کیا۔ پوری دنیا میں میرا کردار دیکھا گیا۔ لوگوں نے بہت زیادہ نفرت بھی کی اور وہ لوگ جو کام کی تیکنک کو جانتے ہیں جو پروفیشنل لوگ ہیں اس فیلڈ کے انہوں نے میری اداکاری کو بہت زیادہ سراہا بھی کہ میں نے بہت اچھے طریقے سے اس کردار کو پرفارم کیا ہے مجھے خوشی ہے اس بات کی کہ میں نے یہ کردار کیا اور ایک اچھے پروجیکٹ کا حصہ بنا۔"

★ "اب جو سیریز آئیں گے ان میں آپ کے رول نگیٹو ہیں؟ یا پوزیٹو ہیں؟"

* "میں ایک سال میں صرف ایک پروجیکٹ ایسا کرنا چاہتا ہوں کہ جس کا کردار کسی دوسرے کردار سے مطابقت نہ رکھے۔ اس لیے اس سال یعنی 2012ء میں کوئی نگیٹو رول نہیں کروں گا۔ میں ہر سیریل میں بہت مختلف رول کر رہا ہوں تاکہ لوگ مجھے مختلف انداز میں دیکھ سکیں۔"

★ "آپ کی سوچ بہت اچھی ہے۔ کیونکہ ایک جیسے رول کرنے سے فنکار پر چھاپ لگ جاتی ہے کہ بس یہ تو اس کردار میں ہو گا؟"

* "جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں آنے والے سیریلز میں گاؤں کے لڑکے کا رول بھی کر رہا ہوں۔ ماڈرن رول بھی کر رہا ہوں۔ ہر کردار دوسرے سے مختلف ہے اور میرے لیے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ نگیٹو ہوں۔ آپ ہیرو ہوں یا کچھ بھی ہوں آپ کا کردار ایسا ہونا چاہیے جو کہانی کی ضرورت بن جائے جس کے بغیر کہانی آگے نہ بڑھ سکے اور میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے ایک بہت اچھی فلم کی آفر ہوئی تھی اور اس میں میرا کردار بھی اچھا تھا لیکن اس کو کرنے سے میں نے صرف اس لیے انکار کیا کہ اس میں میرا کردار اسٹوری کو move نہیں کر رہا تھا وہ فلم میرے کردار کے بغیر بھی بن سکتی۔ چل سکتی تھی۔ حالانکہ وہ بی بی سی اسپانسرڈ مووی تھی اور ایک بڑی فلم تھی۔"

★ ”آپ کو فلم کرنی چاہیے تھی۔ اس طرح فلم میکرز کو ایک نیا چہرہ مل جاتا؟“

✳ ”پہچان بے شک مل جاتی ہے لیکن اداکاری کی جو کوالٹیز ہوتی ہیں۔ جو معیار ہوتا ہے وہ آپ شو نہ کر سکتے۔ اداکاری تو یہ ہے کہ آپ اپنی فارمنس سے لوگوں کو متاثر کریں اور بتائیں کہ اسٹوری آپ کے بغیر نامکمل تھی۔“

★ ”کچھ اپنے بارے میں بتائیں کہ کب کہاں پیدا ہوئے؟“

✳ ”میں 16 مئی کو لیبیا کے شہر طرابلس میں پیدا ہوا اور میرا استارہ ٹورس ہے اور میرا ایک بڑا بھائی ہے جو کہ لندن میں رہتا ہے اور میری ایک چھوٹی بہن ہے جس کی ایک سال قبل شادی ہوئی ہے اور میں بیچ کا ہوں۔“

★ ”بیچ کے لوگوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دو کے درمیان پس جاتے ہیں‘ آپ کا تجربہ کیسا ہے؟“

✳ ”مجھے بھی بچپن میں یہی سننے کو ملتا تھا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا‘ بڑا میری بہت care کرتا تھا اور چھوٹی میری بہت عزت کرتی تھی اس لحاظ سے میں ہمیشہ بہت اہم رہا ہوں۔“

★ ”آپ لیبیا میں پیدا ہوئے۔ تو پھر پاکستان میں کیوں ہیں؟ لوگ تو باہر جانے کے لیے ترستے ہیں؟“

✳ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن چونکہ میرے والدین پاکستان آ گئے تھے جب میں 5 سال کا تھا تو تب سے اب تک ہم پاکستان میں ہی ہیں اور میں پاکستان میں رہ کر بہت خوش ہوں کیونکہ مجھے پاکستان سے بہت محبت ہے اور تعلیم بھی میری پاکستان میں ہی مکمل ہوئی۔ میں نے مارکیٹنگ میں ایم ایس سی کیا ہے انگلینڈ سے اور جب میں یو کے سے پڑھ کر آیا تھا تو مجھے جابز کی بہت آفرز آئی تھیں۔ لیکن چونکہ میں اداکاری کی طرف آنا چاہتا تھا اس لیے میں نے اپنے والدین کو کہہ دیا تھا کہ میری تعلیم مکمل ہو جائے تو میں وہ کرنا چاہوں گا جو میں اپنی زندگی میں کرنا چاہتا ہوں اور شکر ہے کہ میں وہ کر رہا ہوں جو میں کرنا چاہتا تھا۔“

★ ”کماؤ پوت ہیں شادی ہوئی؟“

✳ ”بالکل کماؤ پوت ہوں اور شادی ابھی نہیں ہوئی. اور نہ ہی کچھ سال شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ اس لیے کہ میں کچھ سال اپنے کام پہ فوکس رہنا چاہتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میں کچھ بن جاؤں تاکہ میرا پارٹنر مجھ پر فخر کرے۔“

★ ”شوبز میں کیسے آئے؟“

✳ ”جب ہم پاکستان آئے تو ابتدا میں ہم اسلام آباد میں تھے۔ جب میں اسکول میں تھا تو ریڈیو کے پروگراموں میں بحیثیت ینگ اسٹار کے حصہ لیا کرتا تھا اور تقریباً“ 3 سال پروگرام کیے۔ پھر جب اسکول سے فارغ ہوا تو پی ٹی وی کے ہی ایک ڈائریکٹر نے مجھ سے کہا کہ میں نے تمہیں پروگرام کرتے دیکھا ہے۔ تمہاری آواز بھی اچھی ہے اور تم دیکھنے میں بھی اچھے ہو تو تم ٹی وی پہ کیوں نہیں آ جاتے۔ اتنی اچھی آفر کو بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا چنانچہ میں نے پی ٹی وی کے لیے اور ”اے پلس“ یہ دو چینل جو اسلام آباد میں تھے ان کے لیے بحیثیت وی جے دو سال کام کیا اور لائیو ٹرانسمیشن بہت زیادہ کیں اور مجھے بہترین وی جے کا ایوارڈ بھی ملا اور پھر میرے کام میں گیپ آیا کیونکہ اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے لیے میں انگلینڈ چلا گیا تھا اور جب واپس آیا تو اتفاقاً“ ایک ڈرامے میں کام کرنے کا موقع ملا‘ لیکن اس وقت مجھے لگا کہ شاید اداکاری کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر جب دو تین پروجیکٹ کے بعد لوگوں نے مجھے بہت زیادہ پسند کرنا شروع کیا تو مجھے بھی بہت مزا آنا شروع ہو گیا اور مجھے لگا کہ یہی وہ سب کچھ ہے جو میں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے سکون مل گیا اور میں نے اس کام میں محنت شروع کر دی۔“

★ ”گھر والوں نے کہا نہیں کہ اتنا پڑھ لکھ کر یہی کچھ کرنا تھا کیا؟“

✳ ”میرے گھر والے بہت سپورٹ کرتے ہیں مجھے خاص طور پر میری امی اور میرا بڑا بھائی اور ان کا کہنا یہی تھا کہ تم زندگی میں جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرو کیونکہ یہ تمہارا حق ہے کہ اپنی زندگی اپنے انداز سے گزارو اور میں ماں باپ کو بھی یہی پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنی اولاد کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو پلیز ان کو وہ کرنے دیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔“

★ ”پہلا پروگرام کون سا کیا تھا۔ اور شہرت کس نے دی‘ یعنی پہچان کس نے دی۔“

✳ ”پہلا پروگرام میوزک کا تھا جو میں نے اے ٹی وی کے لیے کیا ______ اس میں لوگوں کی فرمائش پر گانے ہوتے تھے اور اس پروگرام نے مجھے شہرت بھی دی۔“

★ ”پہلی کمائی تو ریڈیو کی ہی ہو گی کیا تھی اور کیا کیا تھا ان پیسوں کا؟“

✳ ”جی ہاں..... پہلی کمائی ریڈیو کی ہی تھی اور ایک شو کے 325 روپے ملتے تھے اور ریڈیو کا جو پہلا چیک تھا وہ چھ ہزار روپے کا تھا اور چھ ہزار کا چیک دیکھ کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے خرچ کیسے کروں گا۔ خیر پھر میں اپنی فیملی کو ڈنر پر لے کر گیا اور یہ بات ہے 9‘10 سال پہلے کی اور آج سے نو دس سال پہلے بھی یہ رقم بہت بڑی تھی۔“

★ ”آپ نے کہا کہ ڈنر پر لے گیا تھا۔ تو آپ کھانے پینے کے شوقین ہیں؟“

✳ ”بالکل ہوں..... اور مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو کہتے ہیں کہ ہمیں کھانے کا زیادہ شوق نہیں ہے اور ہم غصے میں کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں۔ مجھے تو غصے میں زیادہ بھوک لگتی ہے اور میں تو کسی بھی سچویشن میں کوئی ایسا کام نہیں کرتا کہ جس سے مجھے کوئی نقصان ہوتا ہو۔“

★ ”گھر میں کھانا کھانا زیادہ پسند ہے یا باہر کا؟“

✳ ”گھر میں ہوتا ہوں تو ماں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتا ہوں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو میری ماں سے بہتر کوئی پکا ہی نہیں سکتا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں کھانے کا شوقین ہوں تو میں تقریباً“ ہر رات گھر سے باہر کہیں نہ کہیں کھانا کھاتا ہوں اور ___ ہر اچھا کھانا خواہ وہ کسی کے بھی ہاتھ کا ہو‘ شوق سے کھاتا ہوں۔“

★ ”کام کے سلسلے میں آپ کی فیوچر پلاننگ ہے یا جو کچھ ہو رہا ہے اسی کو فالو کر رہے ہیں؟“

✳ ”بالکل پلاننگ ہے اور اگر ہر کام پلاننگ کے مطابق ہوا تو انشاء اللہ چند سال کے بعد میں اس ملک کا مایہ ناز ڈائریکٹر ہوں گا اور جب میں لندن میں تھا تو میں نے ڈائریکشن کے کچھ کورسز کیے تھے۔ اداکاری کے لیے تو نہیں سوچا تھا‘ میری شکل اور قد و قامت دیکھ کر مجھے اداکاری کا مشورہ دیا گیا تھا۔ ورنہ میرے اندر کا جو ”نور حسن“ ہے وہ زیادہ ڈائریکٹر ہے اور کم ایکٹر ہے۔“

★ ”ہر فیلڈ میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں کس قسم کی باتیں یا رویے آپ کو تکلیف دیتے ہیں؟“

✳ ”بہت سی باتیں ہیں جو تکلیف دیتی ہیں خاص طور پر جب کوئی میرے اعتماد کو توڑتا ہے اور میری جائز بات کو سمجھتا نہیں ہے تو تکلیف ہوتی ہے اور اس وقت تو بہت ہی دکھ ہوتا ہے جب کوئی میرے سامنے کسی کی غیبت کرتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ یہ بندہ میرے سامنے دوسرے کی غیبت کر رہا ہے تو دوسروں کے سامنے میری بھی غیبت یقیناً“ کرتا ہو گا۔ بس اس قسم کی باتیں ہرٹ کرتی ہیں۔“

★ ”دوسروں کو کم تر سمجھنا بھی بہت تکلیف دہ رویہ ہوتا ہے؟“

✳ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ غریب لوگوں کو جب جھڑکتے ہیں اور برا سلوک کرتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ یہ لوگ ان لوگوں کے ساتھ برابری کا سلوک کیوں نہیں کرتے۔ آخر یہ بھی تو ہماری طرح انسان ہوتے ہیں۔“

★ ”انسان اپنی زندگی میں جو حاصل کرتا ہے وہ محنت سے کرتا ہے یا قسمت سے؟“

✳ ”قسمت سے حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ ہر انسان محنت کرتا ہے۔ ہر انسان جدوجہد کرتا ہے مگر اسے اتنا ہی ملتا ہے جتنا اس کے نصیب میں اس کی قسمت میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ 99 فیصد قسمت لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ سب کو محنت کا پھل نہیں ملتا قسمت کا لکھا ہوا ملتا ہے۔“ □

★ "سوشل ہیں یا گھر رہنا پسند کرتے ہیں؟"

⁕ "اگر ـــــــ تقریبات میں جانے کو سوشل کہتے ہیں تو میں بالکل بھی سوشل نہیں ہوں، مجھے بے معنی لوگوں کے درمیان وقت گزارنا پسند نہیں اور میں ان کے ساتھ وقت گزارنے سے بہتر اپنی ذات کے ساتھ وقت گزارنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

★ "شہرت پاکر کیسا محسوس کررہے ہیں؟"

⁕ "فی الحال تو بہت اچھی لگ رہی ہے۔ لیکن بعض دفعہ بہت خوف بھی آتا ہے کہ اگر یہ چلی گئی تو میں کیسا محسوس کروں گا لیکن شہرت کے ساتھ ساتھ میں اپنے آپ کو بہت ذمہ دار بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میری ذمہ داریوں میں بہت اضافہ ہوگیا ہے ایک فلم آئی تھی اسپائیڈر مین۔ جس میں ہیرو ایک جملہ بولتا ہے جو میری زندگی کا ایک معمول بن چکا ہے "زیادہ طاقت کے ساتھ زیادہ ذمہ داری بھی آتی ہے" اس لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ میں کوئی ایسا کام نہ کروں جو لوگوں پہ غلط تاثر چھوڑے۔"

★ "غصہ انسانی فطرت میں شامل ہے۔ کیوں اور کن باتوں پر آتا ہے اور رد عمل کیا ہوتا ہے؟"

⁕ "جی بالکل انسانی فطرت ہے اور مجھے غصہ آتا ہے جب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میرے اعتماد اور میری معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ کوئی مجھ سے جھوٹ بولتا ہے تو پھر پہلا رد عمل ـــــــ لاتعلقی ہوتا ہے۔"

★ "فضول خرچ ہیں؟"

⁕ "کہہ سکتی ہیں۔ کیونکہ میں الیکٹرونک کی چیزوں پر جیسے کمپیوٹر ہے۔ لیپ ٹاپ ہے موبائل ہے ان پر بہت خرچ کرتا ہوں اور اچھے کھانے پینے پر بھی کیونکہ مجھے کھانے پینے کا شوق ہے۔"

★ "کیا آپ اپنا احتساب کرتے ہیں؟"

⁕ "بالکل کرتا ہوں، مجھے اندازہ ہے کہ مجھ میں کیا اچھی عادت ہے اور کیا بری، مثلاً "مجھ میں انسانیت کا درد بہت زیادہ ہے۔ رحم دلی اور لوگوں کی عزت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور مجھے اندازہ ہے کہ میں اپنے غصے کا صحیح استعمال نہیں کرتا۔ جہاں مجھے غصہ دکھانا چاہیے وہاں دکھا نہیں پاتا اور جہاں نہیں دکھانا چاہیے وہاں دکھا دیتا ہوں۔"

★ "ٹپ ٹاپ سے رہنا پسند ہے یا رف ٹف؟"

⁕ "مجھے رف ٹف رہنا پسند ہے۔"

★ "ماڈلنگ کرنا کیسا لگا آپ کو؟ ماڈلنگ میں تو بہت پیسہ ہے؟"

⁕ "اچھا لگا اور اداکاری شروع کرنے سے پہلے میں نے ماڈلنگ ہی کی اور اب یہ کہنا غلط ہے کہ ماڈلنگ میں پیسہ زیادہ ہے بلکہ اب تو اداکاری میں پیسہ زیادہ ہے کمرشل ماڈلنگ میں بے شک پیسہ زیادہ ہے لیکن فیشن میگزین میں اتنا پیسہ نہیں ہے۔"

★ "اپنے ڈرامے خود دیکھتے ہیں؟"

⁕ "بالکل دیکھتا ہوں اور بہت تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور مجھے اپنے اکثر سین دیکھ کر افسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ میں نے اس سین کو زیادہ بہتر طریقے سے کیوں نہیں کیا۔"

★ "ہم سفر کا کوئی سین جس کو کرکے آپ کو بہت اچھا لگا ہو اور وہ ایک ہی ٹیک میں ہوگیا ہو؟"

⁕ "ایک سین جو مجھے اچھا لگا اور جو عتیقہ اوڈھو جیسی بڑی فنکارہ کے ساتھ میرا اکیلا سین تھا اور جس کو سب نے بہت سراہا وہ یہ تھا کہ جب میں امریکہ سے آتا ہوں اور عتیقہ اوڈھو کے گھر جاتا ہوں کہ وہ سارا کے یہاں میرا رشتہ لے کر جائیں۔ ایک ہی ٹیک میں اوکے ہوا۔ ایک بڑی فنکارہ کے ساتھ پہلا اکیلا سین تھا اور میں بہت گھبرا رہا تھا لیکن میں نے اعتماد سے کیا۔"

✡ ✡

دوکا پہاڑہ

بینش چوہان

شاہین رشید

1 "اگر آپ کو نام بدلنا پڑے تو کون سے دو نام پسند کریں گی؟"

☆ "نام بدلنا پڑے.... ارے نہیں کبھی نہیں بدلوں گی۔ میرا نام میرے لیے بہت لکی ثابت ہوا ہے۔ اس نام نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔"

2 "اگر لک پہ یقین ہے تو کون سے دو نمبر آپ کے لیے لکی ہیں؟"

☆ "لک پہ یقین ہے، لیکن لکی نمبر کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا، اب آپ نے کہا ہے تو سب کو آزما کر دیکھوں گی۔"

3 "دو تاریخی دور جس میں آپ جانا چاہتی ہیں؟"

☆ "ویسے تو میں اپنے حال پہ بھی بہت خوش ہوں لیکن پھر بھی مغلیہ دور مجھے بہت متاثر کرتا ہے شہزادیوں کی طرح رہنا چاہتی ہوں۔"

4 "کن دو افراد کے ایس ایم ایس کے جواب فوری دیتی ہیں؟"

☆ "جن کے ایس ایم ایس میں کوئی جواب طلب بات ہوتی ہے اور گھر والوں کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہوں۔"

5 "آپ کی کوئی دو بری عادتیں؟"

☆ "دوسروں کو جلدی معاف کردیتی ہوں۔ دوسروں کی نظر میں یہ اچھی عادت ہے مگر میری نظر میں بری۔ میرے جلد معاف کرنے کی وجہ سے ہی لوگ مجھے ہرٹ بھی کرتے ہیں بس ایک ہی بری عادت ہے۔"

6 "دو جھوٹ جو اکثر بولتی ہیں؟"

☆ "اگر دو جھوٹ بتا دیے تو پھر سب کو پتا چل جائے گا۔ اس لیے رہنے ہی دیں۔"

7 "دو باتیں جو آپ کو دوسروں میں ممتاز کرتی ہیں؟"

☆ "کہ میں بہت جلدی بے تکلف نہیں ہوتی یعنی زیادہ سوشل نہیں ہوں اور کم گو ہوں۔"

8 "حالات حاضرہ کے دو اینکر جو آپ کے خیال میں پرپچی سے آئے ہیں؟"

☆ "نہیں کوئی نہیں.... سب بہت اچھے ہیں اور سب نے بہت محنت کے بعد اپنا مقام بنایا ہے۔ ویسے مجھے سیاست سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔"

9 "مارننگ شو کے دو بہترین اینکر؟"

☆ "کیوں لڑائی ڈلوانا چاہتی ہیں۔ ہم سے تو سب ہی پیار کرتے ہیں۔"

10 "دو شخصیات جن پر آپ بھروسہ کرسکتی ہیں؟"

☆ "صرف اور صرف اپنی بہن پر۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ دنیا گھومنا

چاہتی ہیں؟"

☆ "دنیا اپنوں کے ساتھ ہی گھومنے کا مزا آتا ہے۔ اس لیے جب بھی دنیا گھومنے کا خیال آیا تو اپنوں کے ساتھ ہی گھوموں گی۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر رشک آتا ہے؟"

☆ "ضروری نہیں کہ ہم جن پر رشک کریں وہ پرفیکٹ زندگی گزار رہے ہوں۔ ہر شخص کی زندگی میں مسائل ہوتے ہیں۔ میں تو اپنے آپ پر رشک کرتی ہوں کہ خدا نے مجھے ہر نعمت سے نوازا ہے۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتی ہیں؟"

☆ "عید اور عید میلاد النبیؐ۔"

14 "دن کے چار پہر میں کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"

☆ "طلوع آفتاب کا وقت اور غروب آفتاب کا وقت، طلوع آفتاب کے وقت ایک نئے دن کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے اور شام اسی لیے اچھی لگتی ہے کہ کام کا اختتام ہو رہا ہے۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سی دو باتیں لازمی پوچھتی ہیں؟"

☆ "آپ کیسے / کیسی ہیں اور آپ کا اسٹار کیا ہے۔"

16 "کن دو کھانوں کو کھا کر کبھی بور نہیں ہوتیں؟"

☆ "حلیم اور چاٹ خواہ وہ فروٹ چاٹ ہو یا چنے چاٹ۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتیں؟"

☆ "کسی سے بھی معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتی۔ ابھی بتایا نا آپ کو کہ ہر ایک کو جلدی معاف کردیتی ہوں۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے کرکٹ دیکھتی ہیں؟"

☆ "پہلے کسی زمانے میں عمران خان اور اب اتنا شوق نہیں رہا۔"

19 "دو خواہشات جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں؟"

☆ "اللہ کا شکر ہے کہ سب خواہشیں پوری ہوئی ہیں ابھی تک تو، آگے کا کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

20 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتیں؟"

☆ "دو چیزیں.... ویسے تو موبائل سب سے پہلے رکھتی ہوں اور اسکرپٹ۔"

21 "دو جملے یا الفاظ جو زیادہ بولتی ہیں؟"

☆ "ارے.... ہائے۔"

22 "دو پسندیدہ صحافی؟"

☆ "آپ ہیں نا.... اور سمن۔"

23 "سات دنوں میں دو پسندیدہ دن؟"

☆ "پسندیدہ تو تب ہوں جب ہم نے اپنی مرضی سے گزارنے ہوں۔ ساتوں دن کام کرتے ہی گزر جاتے ہیں۔"

24 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"

☆ "کام کے لیے نکلتی ہوں تو اپنا کمرہ یاد آتا ہے، ملک سے باہر جاتی ہوں تو اپنا گھر بہت یاد آتا ہے.... تو جناب اپنا کمرہ اور اپنے گھر میں سب جگہیں میری پسندیدہ ہیں۔"

25 "گھر کے دو کام جن کو نہ کرنے پر گھر والوں سے ڈانٹ پڑتی ہے؟"

☆ "گھر کے کام نہ کرنے پر ڈانٹ پڑتی ہے۔ لیکن کیا کروں کہ میرے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ لیکن جب وقت ہوتا ہے تو ضرور کام کرتی ہوں۔"

26 "دو ایسے افراد جن پر آپ کسی قسم کا بھی شک نہیں کرسکتیں؟"

☆ "دو نہیں ہیں بلکہ اپنے سب گھر والوں پہ شک نہیں کرسکتی۔"

27 "دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟"

☆ "دو.... سب ہیں۔"

28 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"

☆ "جاپان اور ملائشیا۔"

29 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"

☆ "کالا اور آسمانی رنگ بے حد پسند ہیں۔"

30 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"

☆ "کراچی .... بہت پسند ہے اور نتھیا گلی۔ گرمیوں کے لیے بہترین ہے۔"

31 "اگر ساری دنیا سو جائے، سوائے آپ کے تو کون سی دو چیزیں لینا چاہیں گی؟"

☆ "اپنے ملک کے لیے امن و سکون۔"

32 "لڑکوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں۔"

☆ "نخرے نہ دکھایا کریں اور ڈیسنٹ رہا کریں۔"

33 "سال کے چار موسموں میں کون سے دو موسم پسند ہیں؟"

☆ "سردیاں بہت پسند ہیں اور پھر بہار.... پھولوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ ہر طرف پھول ہی پھول .... بہت اچھے لگتے ہیں۔"

34 "لڑکوں کی دو ناپسندیدہ باتیں؟"

☆ "دل بہت دکھاتے ہیں۔ فلرٹ کرتے ہیں۔ اس بات کا خیال رکھا کریں کہ سب لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔"

35 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام سب سے پہلے کرتی ہیں؟"

☆ "پہلے شیشے میں اپنی شکل دیکھتی ہوں کہ کیسی لگ رہی ہوں۔ پھر اپنے بال باندھتی ہوں۔"

36 "دو مرد جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟"

☆ "میرے میاں ایاز اور دوبارہ بھی انہیں کا نام لوں گی۔"

37 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟"

☆ "یہ ایک مشکل سوال ہے۔"

38 "دو چیزیں جن پر آپ بہت خرچ کرتی ہیں؟"

☆ "کپڑے اور جو پسند آئے خرید لیتی ہوں۔"

39 "اپنے دو ڈرامے جنہیں فراموش نہیں کرسکتیں؟"

☆ "دو نہیں کافی ڈرامے ہیں.... مجھے اپنے سب ڈرامے بہت پسند ہیں۔"

40 "کن دو باتوں سے پرہیز کرتی ہیں؟"

☆ "بلاوجہ کسی سے بحث نہیں کرتی اور کم بات کرتی ہوں۔"

41 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"

☆ "نہیں اللہ کا شکر ہے کہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جو غلط ثابت ہوا ہو۔"

42 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سے دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتی ہیں؟"

☆ "بھئی یہ تو اللہ اور میرا معاملہ ہے۔ اس سوال کو رہنے دیں۔"

43 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتیں؟"

☆ "جو تعریف کے قابل ہو اس کی تعریف ضرور کرتی ہوں۔"

44 "دو پسندیدہ مشروب۔"

☆ "پانی اور لال شربت۔"

45 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

☆ "سب ہی اچھے ہیں.... بس جس کا گانا دل کو بھا جائے یا کانوں کو بھا جائے۔"

46 "شادی کی دو رسمیں جو انجوائے کرتی ہیں؟"

☆ "مہندی اور مایوں کی۔"

47 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟"

☆ "نہیں موڈ تو خراب نہیں ہوتا۔ لیکن وہ لوگ جو اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں وہ اچھے نہیں لگتے اور جو بلاوجہ کی شیخیاں مارتے ہیں وہ لوگ اچھے نہیں لگتے۔"

48 "دو باتیں جو آپ کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہیں؟"

☆ "کہ شہرت نے میرا دماغ خراب نہیں کیا اور سب سے اچھے انداز میں ملتی ہوں۔"

49 "کن دو باتوں سے خوفزدہ رہتی ہیں؟"

☆ "کہ میری ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے اور کوئی مجھ سے ناراض نہ ہو۔"

50 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟"

☆ "لباس کے معاملے میں میں بہت حساس ہوں۔ اس بات کا ضروری خیال رکھتی ہوں کہ باریک نہ ہو اور جسم نمایاں نہ ہو اور جو ہماری اسلامی روایات کے مطابق ہو۔"

51 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "چھپکلی اور بلی اور آپ کو یہ سن کر یقیناً حیرت ہو گی کہ میں ان ڈراموں میں بھی کام نہیں کرتی جن میں چھپکلی اور بلی ہوتے ہیں۔"

52 "دو ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟"

☆ "اس معاملے میں چوزی نہیں ہوں۔ جہاں اچھا اور لذیذ کھانا ملے کھا لیتی ہوں، کوئی بتائے کہ فلاں جگہ کا کھانا بہت اچھا ہوتا ہے تو وہاں چلی جاتی ہوں۔"

53 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرتی ہیں؟"

☆ "کوئی خاص نہیں کہ اب پارک ٹاور یا فورم سے ہی شاپنگ کرنی ہے بازار جاتی ہوں اور جہاں سے اچھی چیز مل جائے خرید لیتی ہوں۔"

54 "کن دو باتوں کو اپنا کر انسان ترقی کر سکتا ہے؟"

☆ "کہ اپنے ماضی کو کبھی نہ بھولے چاہے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اور دوسری یہ کہ دوسروں سے ہمیشہ جھک کر اور انکساری کے ساتھ ملے۔"

55 "دو تبدیلیاں جو اپنے آپ میں لانا چاہتی ہیں؟"

☆ "کوئی ضرورت نہیں تبدیلی کی۔ میں جیسی ہوں ویسی ہی اچھی ہوں۔"

56 "آپ کے نزدیک دنیا کے دو خوب صورت مرد؟"

☆ "صرف اور صرف میرے میاں صاحب یعنی ایاز۔"

57 "دو چیزیں جو آپ کے بیگ میں لازمی ہوتی ہیں؟"

☆ "موبائل اور اے ٹی ایم کارڈ۔"

58 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا لطف نہیں آتا؟"

☆ "اگر کھانا گرم نہ ہو اور ٹیبل پہ پانی نہ ہو۔"

59 "غصے میں کون سے برے الفاظ منہ سے نکلتے ہیں؟"

☆ "گالیاں نکلتی ہیں۔"

60 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

☆ "بہت ہی مشکل کام ہے۔ میں ایک ہپی لائف گزار رہی ہوں۔ اس لیے ایسا کچھ نہیں کروں گی۔"

☆ ☆

اکبر شہباز

شاہین رشید

اکبر شہباز کا تعلق "آواز کی دنیا" سے اس وقت سے ہے جب ایف ایم کا آغاز ہوا تھا۔ اس لیے اکبر شہباز کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ایف ایم کو پروان چڑھایا.... خوب صورت آواز خوب صورت انداز.... ہر کوئی ان کو سننا اور ان سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہے۔

★ "کیسے ہیں اکبر شہباز صاحب؟"

* "جی الحمدللہ۔"

★ "آپ کا نام کس نے رکھا تھا اور نام کا اثر شخصیت پر ہوتا ہے؟"

* "اصل میں والد کا نام شہباز ہے اور انہوں نے میرا نام اکبر رکھا اور اس طرح دونوں ہی نام "اڑان" والے ہو گئے۔ نام بڑے ہیں اب روشن کا پتہ نہیں (قہقہہ) اور جہاں تک شخصیت پہ نام کا اثر کی بات ہے تو inspiration تو ہوتی ہے۔"

★ "آپ کے نام کا اثر آپ کی شخصیت پر کیسا پڑا؟"

* "ہم چھ بہن بھائی ہیں اور چار بھائیوں میں میں سب سے بڑا تھا تو سب کے ذہن میں یہ تھا کہ چونکہ یہ بڑا بھائی ہے تو اس کی عزت کرنی ہے تو چونکہ سارے ہی عزت کرتے تھے تو وقت سے پہلے ہی بڑے بن گئے۔ نام کا اثر تھا شاید کہ میرا لہجہ ہمیشہ نرم رہا اور مزاج بھی نرم رہا۔ تو شاید ہوتا ہے نام کا اثر۔"

★ "یہ بتائیں کہ آج کل مصروفیات کیا ہیں آپ کی؟"

* "آج کل مصروفیات کچھ یوں ہیں کہ ریڈیو اسٹار براڈ کاسٹنگ اسکول چلا رہا ہوں اور گزشتہ تین سال سے ہمارا یہ اسکول قائم ہے اور اس کے تحت ہم کافی نوجوانوں کو ٹریننگ دے چکے ہیں جو ریڈیو اور ٹی وی پہ

اپنی صلاحیتیں دکھا رہے ہیں۔"

★ "ٹریننگ اسکول بنانے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟"

* "میں ایف ایم 100 میں 9 سال آر جے رہا ہوں اور ساتھ ساتھ میں کنٹرولر آف پروگرام بھی تھا اور اس وقت بھی میں لوگوں کی گرومنگ کرتا تھا اور سکھاتا بھی تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اچھا لگتا تھا لوگوں کو سکھانا اور پھر میرے پاس براڈ کاسٹنگ کی ڈگری بھی تھی جو امریکہ میں تعلیم حاصل کرکے حاصل کی تو بس تین سال قبل خیال آیا کہ کیوں نہ ایک ٹریننگ سینٹر یا اسکول قائم کیا جائے جہاں 'نیوز' 'وائس اوور' 'آر جے' اور دیگر شعبوں میں لوگوں کو ٹریننگ دی جائے۔"

★ "کچھ نمایاں نام بتائیں جو آج کل کامیابی کے ساتھ پروگرام کر رہے ہیں؟"

* "بالکل جی..... ان میں ڈاکٹر یاسر 'شعیب احمد' مریم رضوی 'ایاز عمر' فہد پرویز' دانش انیس 'جو آج کل چینل میں ہوتے ہیں اور کئی نام ہیں جو کہ اس وقت ذہن میں نہیں ہیں۔"

★ "کب سے ایف ایم 100 میں اور ریڈیو جوائن کرنے کا خیال کیسے آیا؟"

* "میں ایف ایم 100 میں 1995ء سے ہوں..... اور ریڈیو جوائن کرنے کا خیال کیسے آیا تو میں جب اسکول میں تھا تو مجھے ________ ٹی وی پہ نیوز پڑھنے کا شوق تھا اور میں جب فارغ ہوتا تھا تو آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر نیوز پڑھنے کی پریکٹس کیا کرتا تھا اور یہ شوق میرے اندر ہی تھا اسے میں نے باہر نہیں نکالا اور دلچسپ بات یہ کہ نیوز پڑھنے کا شوق تھا مگر آج تک نیوز نہیں پڑھی..... اور جب میں امریکہ گیا اور میں نے "ماس کمیونیکیشن" میں داخلہ لیا اور میجر مضمون کی حیثیت سے میں نے جرنلزم لیا اور مائنر مضمون میں براڈ کاسٹنگ لیا..... لیکن جب براڈ کاسٹنگ کو پڑھا تو مجھے جرنلزم سے زیادہ مزا آیا چنانچہ میں نے شکاگو کے ایک براڈ کاسٹنگ اسکول سے ایک سال کا ڈپلومہ کیا اور یہی کورس اب میرے کام آرہا ہے اور میں یہاں پاکستان میں اپنے اسکول میں لوگوں کو سکھاتا ہوں.....

جب میں پاکستان آیا تو کچھ دن میں نے ریڈیو پاکستان سے انگریزی پروگرام کیے مگر کچھ عرصے کے بعد یہ پروگرام بند ہو گیا پھر جب 1995ء میں ایف ایم 100 کا آغاز ہوا تو پہلے دن سے میں نے اسے جوائن کیا اور مجھے ایف ایم 100 میں لانے کا سہرا آصف غزالی صاحب کو جاتا ہے..... اور شروع شروع میں چونکہ اس فیلڈ میں لوگ زیادہ نہیں تھے تو میں نے چار سال تک ایوننگ اور مارننگ شو کیے اور میری گرومنگ ایف ایم 100 میں ہی ہوئی اور چونکہ مجھے اللہ نے صلاحیت دی ہوئی تھی اس لیے آصف غزالی صاحب نے میرے نخرے بھی برداشت کیے۔"

★ "کس قسم کے نخرے آپ دکھاتے تھے؟..... کیا وقت پہ نہیں آتے تھے یا کچھ اور؟"

* "آصف غزالی کسی کا Attitude تو برداشت کرتے ہی نہیں تھے۔ لیکن وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ بندہ اپنے کام کے لیے سچا اور مخلص ہے اور ایک براڈ کاسٹر اپنی انجینئرنگ خود کرتا ہے۔ ایکوپمنٹ کو خود ہی چلا رہا ہوتا ہے یعنی آن کرتا ہے میوزک چلاتا ہے اشتہار چلاتا ہے سارے کام آر جے خود کرتا ہے۔ تو شروع شروع میں میں ان مشینوں سے اتنا ڈرتا تھا کہ میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں بول تو سکتا ہوں مگر ان شیشوں کو نہیں چلا سکتا..... تو وہ سمجھ گئے تھے کہ بندہ نخرے نہیں کر رہا واقعی ان ——— سے ڈرتا ہے۔ تو پھر غزالی صاحب نے مجھے کہا کہ آپ چھ مہینوں کے بعد مشینیں چلا لینا..... اور چھ مہینے تک ایک انجینئر میرے ساتھ کر دیا جو سارے کام کرتا تھا۔ اگر آج کے دور میں کوئی آر جے ایسے نخرے دکھائے تو اسے نوکری سے ہی فارغ کر دیا جاتا ہے.....

لیکن چونکہ میں ایک اچھا پریزنٹر تھا اور سر جھکا کر سارے کام کر دیا کرتا تھا تو اس کی وہ قدر کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ کہ جب انہوں نے ٹیلی فون کالز لینے کو کہا تو میں نے کہہ دیا کہ یہ کام تو مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں تو گھبرا رہا ہوں لاکھوں لوگ سن رہے ہوتے ہیں

اور کہیں میں کچھ غلط نہ بول دوں..... تو وہ ہنس پڑے کہ کیوں ڈرتے ہو۔ اور پھر جب ان کے کہنے پر میں نے لائیو کالز لینی شروع کیں تو آصف غزالی صاحب نے کہا کہ تم یونہی ڈرتے تھے دیکھو تم کتنی اچھی اچھی باتیں کرتے ہو۔ پھر انہوں نے مجھے "ٹاک شو" دے دیے اور میں نے تین سو سے زیادہ موضوعات پر ٹاک شو کیے اور بہت لوگوں نے میرے اس شو کی تعریف کی تھی۔"

★ "ڈرتے کیوں تھے..... تربیت میں کچھ کمی تھی یا گھر کا ماحول ایسا تھا کہ آپ ڈرتے تھے؟"

* "یہ سب قدرتی ہوتا ہے۔ جیسے لوگ اسٹیج پر آکر بات کرنے سے گھبراتے ہیں اس طرح میں بھی ڈرتا اور گھبراتا تھا۔ تو آج بھی جو طالب علم سیکھنے آتے ہیں وہ مائیک سے ڈرتے ہیں تو جب آپ مائیک سے ڈرتے ہیں تو پھر آپ سے کچھ بولا نہیں جاتا اور جب مشینوں سے اور مائیک سے ڈر ختم ہوتا ہے تو پھر آپ کھل کر بولتے ہیں اور پھر صحیح معنوں میں آپ آر جے بن جاتے ہیں۔"

★ "آپ امریکہ سے پڑھ کر آئے اور اپنے شوق کی خاطر آپ نے ایف ایم جوائن کیا تو جس زمانے میں آپ نے ریڈیو جوائن کیا اس وقت تو اچھی سیلری بھی نہیں ہوتی تھی۔ تو پھر کیوں آئے اس طرف؟"

* "میں ریڈیو پہ 80 کی دہائی سے ہوں اور ریڈیو پاکستان سے انگریزی میں پروگرام کیا کرتا تھا اور اس وقت مجھے ایک پروگرام کے 25 روپے ملا کرتے تھے۔ تو مجھے پیسے کا نہ مسئلہ تھا اور نہ ہی کوئی ایسی خاص دلچسپی تھی۔ چونکہ جرنلزم میں ایم اے کیا ہوا تھا اور براڈ کاسٹنگ میں ڈپلومہ کیا ہوا تھا تو اس لیے میں ریڈیو کی طرف آیا۔ اصل میں تو مجھے اخبار کی جاب کرنی چاہیے تھی اور میں اخبار میں گیا بھی مگر مجھے وہاں کچھ زیادہ مزا نہیں آیا اور مجھے یاد ہے کہ جب میں اخبار کے دفتر گیا تو مجھے کہا گیا کہ کل آپ کو آنا ہے اور کچھ انگریزی میگزین سے آپ کو آرٹیکل جمع کرنے ہیں جو کہ ہم چھاپیں گے۔ تو میں نے کہا کہ کیا آپ نے ان کے رائٹس لیے ہوئے ہیں۔ تو وہ میری شکل دیکھنے لگے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے..... میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ آرٹیکل چوری کر رہے ہیں اور انہیں برا بھی نہیں لگ رہا..... چنانچہ میں نے جاب کرنے سے انکار کر دیا..... اور پھر میں ایڈورٹائزنگ میں چلا گیا اور کافی عرصہ میں نے کام کیا میرا میجر کام ایڈورٹائزنگ کا تھا اور ایف ایم 100 پہ میں دو گھنٹے پروگرام کرتا تھا اور یہ

سلسلہ تقریباً" پندرہ سال رہا۔"

★ "اس فیلڈ میں لوگ ایک چینل سے دوسرے چینل پہ چلے جاتے ہیں۔ میری نظر میں یہ وفاداری تبدیل کرنا ہے۔ تو آپ کو کبھی وفاداری تبدیل کرنے کا خیال نہیں آیا؟"

✳ "میرے استاد آصف غزالی رہے ہیں۔ حالانکہ میں باہر سے پڑھ کر آیا تھا لیکن آصف غزالی صاحب نے مجھے بہت گروم کیا۔ وہ میری صلاحیتوں کو پہچان گئے تھے انہوں نے میرے اندر کے فنکار کو باہر نکالا۔ تو جو چیز میں نے سیکھی وہی چیزیں میں لوگوں کو سکھاتا ہوں..... تو جب آصف غزالی نے وہ جگہ چھوڑی تو میں نے بھی وہ جگہ چھوڑ دی۔ پھر مجھے چانس ملا ایف ایم 103 میں اور میں پہلا بندہ تھا جس نے ایف ایم 103 میں بحیثیت اسٹیشن منیجر کے کام کیا ایف ایم 103 کو بھی میں نے ہی سیٹ کیا ہے اور اس چینل پہ میں نے اٹھارہ انیس پریزنٹرز کو ہائر کیا اور زیادہ تر پریزنٹرز ایف ایم 100 کے تھے جو میری وجہ سے آئے تھے۔ کیونکہ وہ میری بہت عزت کرتے تھے اور میری اور میرے ساتھیوں کی کوشش سے ایف ایم 103 بہت مقبولیت حاصل کر رہا تھا اور ایک سال میں یہ چینل کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ تو میرے ساتھیوں نے کہا کہ جو کام آپ کو چار سال میں کرنا چاہیے تھا وہ آپ نے ایک سال میں کر دیا۔ دیکھیے گا کہ یہ آپ کو نکال دیں گے۔ میں نے کہا کہ ایسا کیسا ہو سکتا ہے۔ مگر ایسا ہی ہوا اور کہا گیا کہ بہت شکریہ آپ نے اس چینل کو بہت جلدی گروم کر دیا۔ اب ہمیں آپ کی ضرورت نہیں ہے۔"

★ "اوہو..... آپ تو بہت اپ سیٹ ہوئے ہوں گے یہی کام اگر ملک سے باہر کسی چینل کے لیے کرتے تو وہ آپ کی کتنی قدر کرتے۔"

✳ "بالکل..... لیکن مجھ میں اللہ نے یہ خوبی دی ہے کہ میں نیکی کرنا نہیں چھوڑتا اور بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ کہ اگر باہر ہوتا تو کتنی قدر ہوتی بلکہ جب وہ سال گرہ مناتے تب بھی مجھے یاد کرتے کہ اس آدمی نے ایک چینل کو ایک سال میں کتنا کھڑا کیا ہے۔ مگر میں آپ کو بتاؤں کہ ایف ایم 103 کے مالک کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ مالک تو ملک سے باہر رہتا ہے اور وہ جن کے حوالے کر کے گئے ہیں وہ ہمارے پاکستانی ساتھی ہیں۔ جنہوں نے میرے لیے بنائے گئے پرومو بھی ضائع کر دیے تاکہ اس بندے کی آواز بھی نہ رہے

۔ تو یہ ان کی تنگ نظری ہے خیر مالک ہیں جو اس چینل کے ان سے ابھی بھی میری بات چیت ہے اور اب وہ لاہور میں سیٹل ہو گئے ہیں۔ عمران باجوہ صاحب تو اچھے انسان ہیں مگر..... خیر۔"

★ "طویل عرصے سے ریڈیو سے وابستہ ہیں۔ ٹی وی اسکرین پہ آنے کا خیال نہیں آیا آپ کو؟"

✳ "میری ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں جاب تھی اور ریڈیو پر تھا تو ان دونوں جگہوں پہ اتنا زیادہ مصروف رہتا تھا کہ مجھے فرصت نہیں ملی کہ میں ٹی وی جاؤں اور کام کروں۔ لیکن اب میری خواہش ہے کہ میں ٹی وی پہ ٹاک شو کروں وہ جو میں ریڈیو پہ کرتا رہا ہوں "سوشل ایشو" پہ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک ٹی وی پہ سوشل ایشو پہ ٹی وی پروگرام نہیں ہوئے۔ اب پتہ نہیں میری شکل لوگوں کو پسند آئے نہ آئے۔ ویسے بحیثیت مہمان کے میں مختلف چینلز پہ آچکا ہوں۔"

★ "آواز کی دنیا کے لوگ ریڈیو کے علاوہ بھی مختلف شعبوں میں آواز کا جادو جگاتے رہتے ہیں۔ آپ نے بھی جگایا ہو گا؟"

✳ "جی ہاں ایسا ہے اور میں نے بھی بہت زیادہ وائس اوور کیا ہے۔ کمرشلز ہوں یا دستاویزی فلمیں ہو وغیرہ"

★ "اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں؟"

✳ "میری امی اردو اسپیکنگ تھیں اور میرے نانا انڈیا میں ایک فلم انڈسٹری میں پروڈیوسر تھے۔ جیسے پاکستان میں سید نور ہر کام کرتے ہیں..... اسی طرح میرے نانا انڈیا میں فلمیں بناتے تھے تو میرے نانا بمبئی اور شملہ میں رہے۔ انہوں نے ایک ہیروئن سے شادی بھی کی تھی اور اس طرح میری ایک سوتیلی نانی بھی ہیں۔ میرے والد کشمیری تھے اور شادی کے بعد والدین کراچی آگئے اور میں کراچی میں پیدا ہوا اور میری تعلیم و تربیت سب کراچی میں ہی ہوئی۔ میں 14 دسمبر کو پیدا ہوا اور پاکستان سے چھوٹا ہوں کافی

(قہقہہ) قائداعظم کے مزار کے سامنے ہمارا گھر تھا اور ہم نے قائداعظم کا مزار بنتے ہوئے بھی دیکھا اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ہم چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔"

★ "شادی......؟"

* "جی شادی ہوئی ہے میری۔ جب میں امریکہ سے آیا تو میں نے ایک سفرنامہ Foreigner in a Foreign Land کے عنوان سے لکھا جو ڈیلی نیوز میں چلتا رہا دو سال۔ واجد شمس الحسن اس وقت ڈیلی نیوز کے ایڈیٹر تھے اور یہ سفرنامہ بہت پسند کیا گیا اور اس کے بعد میں نے "پاکستان آکر مجھ پر کیا گزری" لکھا اور یہ بھی انگریزی کے ڈیلی نیوز کے لیے ہی لکھا اور اب آپ کے سوال شادی کے بارے میں بتاؤں تو میں نے اپنے آرٹیکل میں ایک لائن لکھی تھی کہ آئی میریڈ دی میچ میکر married the match maker (میں نے رشتہ کرانے والی سے شادی کرلی)

یہ لڑکی میری امی کی سہیلی کی بیٹی تھی اور میرے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی تھی اپنی سہیلیاں دکھا رہی تھی اور جب لڑکیاں دکھاتے دکھاتے اسے ایک سال ہو گیا تو میرا بھائی امریکہ سے آیا اور اسے پتا چلا تو اس نے کہا کہ لڑکی تو آپ کے سامنے ہے اور آپ لڑکیاں ڈھونڈ رہے ہیں۔ بات دل کو لگی اور میں نے اس لڑکی سے شادی کرلی اور ماشاء اللہ میری چار بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹی میں نے گود لی ہے اس کے والدین چونکہ نہیں تھے اس لیے میں نے اسے گود لے لیا اور حال ہی میں اس کی شادی بھی کردی ہے اور اب ایک بیٹی آٹھویں جماعت میں ہے باقی کی شادیاں ہو گئی ہیں اور میری تینوں بیٹیاں ملک سے باہر امریکہ، کینیڈا اور بحرین میں رہتی ہیں۔"

★ "بچپن سے لے کر اب تک مزاج میں کتنا اتار چڑھاؤ آیا؟"

* "شروع شروع میں خاصا خاموش مزاج تھا اور کچھ فلسفیانہ انداز تھا میرا ہارٹ ورکنگ بہت تھا۔ پڑھائی میں اتنا اچھا نہیں تھا لیکن پڑھتا بہت تھا میری یہ سوچ تھی کہ چاہے پاس ہوں یا فیل مگر میں کورس پورا پڑھوں گا تاکہ علم حاصل ہو۔"

★ "اس فیلڈ کے بارے میں یا اپنے بارے میں اس انٹرویو کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

* "اپنے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جو لوگ مجھے ریڈیو پہ سنتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ کون شخص ہے جو اپنے ملک پاکستان سے بہت محبت کرتا ہے جو اپنے دین سے بہت محبت کرتا ہے اور جو اپنی فیملی سے بڑی محبت کرتا ہے لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کی باتیں ہمیں بہت متاثر کرتی ہیں...... تو میں لوگوں سے یہ کہتا ہوں کہ جب میں پانچ سال ملک سے باہر رہا تو مجھے اپنے ملک کی بہت یاد آتی تھی تو تب سے اب تک مجھے بہت قدر ہے اپنے ملک کی۔ اپنے لوگوں کی اور اپنے مذہب کی۔ ہمارے قرآن میں بہت طاقت ہے اور ہماری آدھی طاقت تو ختم ہو گئی ہے قرآن نہ پڑھنے سے اسی لیے ہم لوگ ادھورے رہ گئے ہیں..... ہم نے تو وہ ملک دیکھے ہیں کہ جن کے لیے ہم سوچتے ہیں کہ ہم بھی فیوچر میں ویسے ہوں گے ہم فیوچر کا سوچتے ہیں اور وہ آج ایسے ہیں۔ انہوں نے اپنے ملکوں میں امن و امان رکھا ہوا ہے اور ہمارے ملک میں فساد برپا رہتا ہے۔"

★ "صحیح معنوں میں انسانیت کے خدمت وہی لوگ کر رہے ہیں اور ہمارے مذہب کو فالو بھی وہی لوگ کر رہے ہیں؟"

* "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وہ ایک سسٹم کے تحت کام کرتے ہیں اور وہ ٹیلنٹ کو استعمال کرتے ہیں ہمارے ملک میں بہت ٹیلنٹ ہے لیکن سسٹم نہیں ہے اس لیے ہر چیز ہر ٹیلنٹ ضائع ہو جاتا ہے۔ ہم باہر جا کر ان کے سسٹم کے تحت کام کرتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے اکبر شہباز صاحب سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

✡ ✡

بشریٰ احمد

(۱) "تاریخ پیدائش/اسٹار؟"
4اپریل 1980ء/حمل۔

(۲) "خدا سے تعلق؟"
"Undefined میں آج تک خود نہیں سمجھ سکی۔"

(۳) "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"
"ایک ورکنگ وویمن جو کہ دو بچوں کی ماں بھی ہو اس کے لیے یہ کافی مشکل سوال ہے پھر بھی اگر کبھی خوش قسمتی سے یہ چیز جسے فرصت کہتے ہیں میسر آجائے تو کوشش کرتی ہوں بچوں اور شوہر کے ساتھ انجوائے کروں۔"

(۴) "کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟"
"اچھا لہجہ' نرم تاثرات' خوشگوار مسکراہٹ۔"

(۵) "وہ چیز جو موڈ خراب کردے؟"
"جب چھٹی کے دن کوئی ضروری میٹنگ یا ورکشاپ ہو جائے' دل سے کوکنگ کروں اور کوئی تعریف نہ کرے۔ میاں وعدہ کریں اور ٹائم پر گھر نہ پہنچیں..... یہ فہرست کافی طویل ہو جائے گی۔"

(۶) "مشکل ترین لمحہ؟"
"مشکل ترین لمحات وہ تھے جب امی I.C.U میں تھیں اور ہم لمحہ بہ لمحہ موت کو امی کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔"

(۷) "بہترین تعریف جو وصول ہوئی؟"
"ہر وہ تعریف جو آپ کی غیر موجودگی میں کی جائے بہترین ہوتی ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ پروفیشنل لائف میں بھی اور ذاتی زندگی میں بھی ایسے بہت سے تعریفی کلمات ہوتے ہیں جو مجھ سے وابستہ افراد میرے لیے ادا کرتے ہیں۔ ایسا ہے کہ ہمارے sos ملتان کی چیرپرسن مسز مہناز فرید نے گزشتہ برس اینول میٹنگ میں میرے بارے میں میری غیر موجودگی میں کہا تھا کہ۔

"She is very dedicated and hard working."

ہمارے اکیڈیمک ہیڈ سر کامران یوسف اور ایڈمن ہیڈ مسز صفیہ مہر میری کارکردگی کو سراہتے ہیں تو وہ بھی میرے لیے بہترین تعریف ہوتی ہے۔ لیکن سب سے جامع تعریف جو میرے شوہر نے میری کی وہ یہ تھی کہ میں بہت خوب صورت' سلیقہ شعار' سمجھ دار اور باکردار بیوی ہوں۔"

(۸) "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"
"وقت ضائع کرنے کے بہت سے طریقے ہیں جن میں جدید ترین طریقے تو فیس بک استعمال کرنا اور موبائل پر messaging کرنا ہیں اور مزے کی بات یہ دونوں کام کرتے وقت اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کتنا ٹائم ضائع ہو رہا ہے۔"

(۹) "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"
"میری امی کی وفات۔"

(۱۰) "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"
"ہر وہ تحفہ جو محبت سے دیا جائے' بہترین ہوتا ہے۔ جیسا کہ صائمہ جمیل' سمیعہ خان' اسماء خورشید اور مہرین اکمل ہر سال مجھے دیتی ہیں میری برتھ ڈے پر۔"

(۱۱) "ایسی تاریخی شخصیت جس سے میں ملنا چاہوں گی؟"
"کوئی ایک نہیں' بہت سی ہیں۔"

(۱۲) "پسندیدہ ساتھی؟"
"میرے شوہر یعنی محمد معصوم خالق۔"

(۱۳) "پسندیدہ ہستی؟"
"میری ماں۔"

(۱۴) "پسندیدہ پروفیشن؟"
"ٹیچنگ۔ ہماری قوم کو آج کل جس چیز کی ضرورت سب سے زیادہ ہے وہ اچھے استاد ہیں۔"

(۱۵) "بہترین کاوش؟"
"ابھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی۔"

(۱۶) "پسندیدہ ملکیت؟"
"میرے شوہر اور بچے۔"

(۱۷) "زندگی کی خواہش؟"
"اپنے بچوں کو کامیاب انسان بنا دیکھنا۔"

(۱۸) "پریشان کن لمحہ؟"
"بعض دفعہ مستقبل کی سوچیں پریشان کرتی ہیں۔"

(۱۹) "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہوں؟"
"کبھی اظہار کر دیتی ہوں اور کبھی خاموش رہ کر وقت گزرنے کا انتظار کرتی ہوں۔"

(۲۰) "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
"اللہ کا شکر ہے ایسا کوئی فرد نہیں ہے۔"

(۲۱) "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
"جب بہت جلدی بدل جاتا ہے ویسے میں فیشن کے پیچھے اندھا دھند نہیں بھاگتی۔"

(۲۲) "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"
"جب توقعات پوری نہ ہوں۔"

(۲۳) "کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟"
"بقول تابندہ (میری چھوٹی بہن) آپ تو ملکہ جذبات ہیں لہٰذا جذباتی ہونے کے لیے کوئی ایشو ضروری نہیں۔"

(۲۴) "زندگی کا یادگار دن؟"
"جب نوائے وقت میں میرا پہلا آرٹیکل شائع ہوا اور کرن میں پہلا افسانہ۔"

(۲۵) "موسیقی میرے نزدیک؟"
"کچھ خاص نہیں۔"

(۲۶) "پسندیدہ گانا؟"
"غزل ہے 'اے جذبہ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے۔"

(۲۷) "پسندیدہ فقرہ؟"
"جب عبداللہ نے بولنا شروع کیا تو وہ کہتا تھا جانو ماما جی۔ آئی بیل یو (I love you) اس وقت مجھے اس کی زبان سے یہ فقرہ بہت مزے کا لگتا تھا۔"

(۲۸) "پسندیدہ کردار؟"
"مجھے اپنی کہانیوں کے Grand parents کے کردار بہت پسند ہیں۔ راشدہ کی سیکنڈ ہیرو ہیروئین مزے کے ہوتے ہیں۔ ویسے مجھے شفیق الرحمن کا روفی (شیطان) بہت زبردست لگتا ہے۔"

(۲۹) "سب سے عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"
"میری فیملی۔"

(۳۰) "اچھا اور خوب صورت موسم؟"
"موسم بہار' اس موسم میں میرا دل کچھ نہ کچھ نیا کرنے کے لیے بہت بے چین رہتا ہے۔"

(۳۱) "ناقابل فراموش واقعہ؟"
"میرے لیے اکثر واقعات ناقابل فراموش ہوتے ہیں یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ میں باتیں بھولتی نہیں ہوں۔"

(۳۲) "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
"خوشی اور فخر کے ملے جلے تاثرات تھے۔"

(۳۳) "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"
"وہ رات جس کی صبح عبداللہ کی آواز سے ہوئی یعنی جس صبح وہ دنیا میں آیا اور وہ دو راتیں جو امی نے I.C.U میں گزاریں۔"

(۳۴) "میرا خواب؟"
"اپنا اچھا سا گھر بنانا۔"
(۳۵) "پسندیدہ مزاح؟"
"شفیق الرحمن اور راشدہ رفعت کے قلم سے نکلا ہوا مزاح۔"
(۳۶) "حسد محسوس کرتی ہوں؟"
"اللہ کا شکر ہے 'نہیں۔"
(۳۷) "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"
"کیونکہ یہ خوشگوار تاثر چھوڑتی ہے۔"
(۳۸) "پسندیدہ خوشبو؟"
"Heavens-"
(۳۹) "آخری کتاب، جو میں نے پڑھی ہو؟"
"The Al-chemist کی Paulo coelho -"
(۴۰) "پسندیدہ جگہ؟"
"امی کا گھر۔"
(۴۱) "وہ جگہ، جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں؟"
"جب تک میری بڑی بہن جو کہ میری جیٹھانی بھی ہیں ملتان میں تھیں تو میں ان کے گھر جانا پسند کرتی تھی کہ وہاں میں اور میرے میاں دونوں بڑے Comfortable ہوتے ہیں اب جبکہ وہ رحیم یار خان ٹرانسفر ہو گئے ہیں تو چھٹی کا دن ہم گزارتے تو گھر پر ہی ہیں لیکن شام میں بچوں کو لے کر زمینوں تک چلے جاتے ہیں جو کہ نزدیک ہی ہیں۔ وہاں کی فضا میں سکون بہت ہوتا ہے۔ میرے شوہر روزانہ آفس سے آنے کے بعد وہاں جاتے ہیں کیونکہ سسر کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری ان ہی کے سر ہے۔ لہٰذا جس دن موڈ بنے اور فرصت ملے میں بھی ساتھ چلی جاتی ہوں۔"
(۴۲) "میری قوت ارادی؟"
"بہت کمزور۔"
(۴۳) "گھر کا پسندیدہ کمرہ؟"
"میرا بیڈ روم۔"
(۴۴) "کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟"
"ہر وہ لباس، جو میرے شوہر کو پسند ہو۔ مطلب یہ کہ میں ان کی مرضی کا پہنتی ہوں۔ کلرز بھی اور ڈیزائن بھی۔"
(۴۵) "پسندیدہ رنگ؟"
"ریڈ اینڈ وائٹ۔"
(۴۶) "پسندیدہ مصنف؟"
"اشفاق احمد 'شفیق الرحمن 'نسیم حجازی 'آسیہ رزاقی 'رفعت ناہید سجاد 'عالیہ بخاری اور راشدہ رفعت۔"
(۴۷) "پسندیدہ شاعر؟"
"فیض 'اعتبار ساجد اور ابن انشاء۔"
(۴۸) "ویران سنسان جزیرے پر پہلا کام کیا کروں گی؟"
"میں وہاں جاؤں گی ہی کیوں۔"
(۴۹) "خود اپنی بری عادت؟"
"بے صبری اور جلد بازی۔"
(۵۰) "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"
"مجھے گھومنا پسند ہے لیکن ہوٹلنگ نہیں پسند۔"
(۵۱) "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟"
"تو میرے دل میں یہ خلش نہ ہوتی کہ مجھے لکھنے کا ٹائم نہیں ملتا۔"
(۵۲) "ایک لفظ جو مجھے واضح کر دے؟"
"جذباتی۔"
(۵۳) "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"
"اگر مضبوط کردار کے حامل ہوں تو زبردست اور متاثر کن ورنہ کچھ نہیں۔"
(۵۴) "محبت کے بارے میں خیال؟"
"محبت کے بغیر زندگی بے معنی ہے لیکن "ویلنٹائن ڈے" والی محبت کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ محبت کو شتر بے مہار نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ آپ کو اپنے سے وابستہ جائز اور حقیقی رشتوں سے ہی محبت کرنی چاہیے۔"
(۵۵) "پسندیدہ رشتہ؟"
"ماں کا۔"
(۵۶) "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلے؟"
"کی سے کیا مطلب ہے۔ محبت کرتی ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ محبت کے جواب میں محبت ہی وصول کرتی ہوں۔"
(۵۷) "پسندیدہ لو اسٹوری؟"
"میری اور میرے شوہر کی۔" سچ کہہ رہی ہوں۔
(۵۸) "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟"
"میں فلمیں نہیں دیکھتی۔"
(۵۹) "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"
"بہت کچھ بتاتے ہیں۔ انسان کے چہرے سے ہی اس کے اندر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔"
(۶۰) "شاعری کے بارے میں خیال؟"
"شاعری سمجھ میں آتی ہے۔ اچھا شعر اپیل بھی کرتا ہے۔ لیکن یاد نہیں رہتا۔ اس کے برعکس میرے شوہر کی زبان سے برملا بر محل شعر بر آمد ہوتا ہے۔"
(۶۱) "میری جستجو میری کھوج؟"
"مشکل سوال ہے۔ جستجو تو بہتر سے بہترین کی ہونی چاہیے۔ سو میری بھی یہی جستجو ہے کہ اپنی زندگی کے ہر معاملے کو بہتر سے بہترین بناؤں۔"
(۶۲) "بہترین کامیابی؟"
"لوگ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی جاب اور اپنے گھر کو بہت اچھی طرح بیلنس کیا ہوا ہے۔ ویسے تو یہ بھی کامیابی ہے لیکن اصل کامیابی کا ابھی مجھے انتظار ہے۔"
(۶۳) "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہیں؟"
"میں بہت زیادہ وہمی ہوں۔ پہلے تو کسی بھی چیز کے متعلق سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہوں اور جب پریشان ہو ہو کر تھک جاؤں تو پھر سر جھٹکنے کی کوشش کرتی ہوں۔"
(۶۴) "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"موبائل فون اور کمپیوٹر ہی بہترین ایجادات ہیں۔"
(۶۵) "بد ترین ایجاد؟"
"یہی بد ترین ایجاد بھی ہیں۔"
(۶۶) "ایسی شخصیت، جو شدت سے یاد آتی ہے؟"
"میری پیاری امی۔"
(۶۷) "بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام؟"
"بچوں کو دودھ دینا۔ پانی کے جگ کو چیک کرنا۔"
(۶۸) "ایک بات، جو ہمیشہ یاد رہی؟"
"شادی کے شروع کے دنوں میں حمیرا باجی (بہن + جیٹھانی) نے نصیحت کی تھی کہ معصوم سے ہر طرح کی بات کر لینا لیکن اس کے ماں باپ کی برائی کبھی نہ کرنا۔ یہ بات میں نے ہمیشہ یاد رکھی ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ معصوم میری اس بات کو تسلیم بھی کرتے ہیں کہ میں نے گھریلو زندگی میں ان کو کبھی پریشان نہیں کیا۔
میرے ساس سسر (اللہ انہیں غریق رحمت کرے) تھے بھی بہت اچھے اور خیال رکھنے والے لیکن ان کی کسی چھوٹی موٹی بات کو بھی میں نے کبھی ایشو نہیں بنایا۔"
(۶۹) "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"
"میری شادی کا دن۔"
(۷۰) "قارئین کے لیے پیغام؟"
"Do respect and have respect-"
(۷۱) "کرن کے بارے میں رائے؟"
"کرن کے بارے میں کیا کہوں۔ اگر کرن نہ ہوتا تو آج میں "بشریٰ احمد" نہ ہوتی اور ان تمام محبتوں سے محروم ہوتی جو کرن کے توسط سے مجھے زندگی میں ملی ہیں۔ (ریحانہ اس فہرست میں تمہارا نام سب سے اوپر ہے۔)"

☼ ☼

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۴

چوبیسویں قسط

رات خاصی گہری اور تاریک ہو چکی تھی جب ان کی گاڑی دوبارہ لاہور کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔

زندہ دلان شہر جاگ رہا تھا اور زندہ دل شہر کے زندہ دل باسی جاگنے اور رتجگا دھوم دھام سے منانے میں مصروف تھے اور اس رتجگے کی رونقیں ریڈ لائٹ ایریا سے شرفا کی گلیوں تک اپنے عروج پہ تھیں اور سڑکوں پہ جابجا بکھرے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو نگارش ان مناظر کو یقیناً" دلچسپی سے دیکھتی اور انجوائے کرتی کیونکہ وہ پہلی بار پاکستان آئی تھی اور پہلی بار یہ سب دیکھ رہی تھی لیکن افسوس کہ اس وقت ان کے دل بے سکون اور دماغ منتشر سے تھے نگارش کے ساتھ ساتھ زری اور عبداللہ کا بھی یہی حال تھا' سوچیں گہری اور الجھی ہوئی تھیں اور انہی سوچوں کے دوران ساری رونقیں اور سارے مناظر پیچھے رہ گئے تھے اور ان کی گاڑی اپنے گھر کے سامنے آرکی تھی' عبداللہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

یہ گھر دل آور نے پسند کیا تھا' اسی نے خریدا تھا اور اسی نے اس گھر کی حسب ضرورت تھوڑی بہت سیٹنگ وغیرہ کروائی تھی اور ملازم بھی رکھے تھے' عبداللہ تو اس گھر کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اور پہلی نظر دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیشہ کی طرح دل آور کا یہ انتخاب بھی شاندار تھا' گھر کی خوبصورتی رات کے اندھیرے اور مصنوعی روشنیوں میں بھی اجاگر ہو رہی تھی۔

عبداللہ نے دل ہی دل میں سراہا تھا اور اتنے میں گلاب خان کے ایک ہی ہارن پہ گیٹ فوراً" کھل گیا تھا اور گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی اندر پورچ میں آرکی تھی جہاں دل آور شاہ کی سرف پہلے سے موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ان کا انتظار کر رہا تھا۔

"دل آور یہیں ہیں؟" عبداللہ کو حیرت ہوئی تھی۔ "جی۔! صاحب یہیں ہیں' وہ سامنے بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" گلاب خان نے لان کے بائیں طرف اشارہ کیا تھا جہاں ایک ٹیبل اور چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور انہی میں سے ایک کرسی پہ دل آور شاہ براجمان تھا۔ "اوہ۔! ہماری وجہ سے وہ بھی بے آرام ہو رہا ہے۔" عبداللہ شرمندگی اور افسوس سے کہتا گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا تھا اور اس کے پیچھے زری اور نگارش بھی اتر آئی تھیں۔

"مبارک ہو۔! بچ کے آگئے ہو۔" دل آور مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "تم نہ ہوتے تو نہیں آسکتا تھا' بڑے گھاگ شکاری تھے۔" عبداللہ نے اعتراف کیا تھا۔

"ہاہاہا.....! مجھے پہلے سے ہی پتا تھا کہ بڑے گھاگ شکاری ہیں' اسی لیے میں ہمیشہ ایسے گھاگ شکاریوں کو وہ شکار دیتا ہوں جن کو نگلنا بھی مشکل ہو جائے اور اگلنا بھی اور آج تم بھی ان کے لیے ایسا ہی شکار ثابت ہوئے ہو۔ بڑی تکلیف ہوئی ہو گی ان کو۔ دانت کچکچا کے رہ گئے ہوں گے؟" دل آور عبداللہ کے اعتراف پہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور زری کی جان لے گیا تھا وہ اس کے قہقہے پہ تھم سی گئی تھی اور نظریں نمانی پھر اس کے دیدار کے لیے اس کی ذات کی چوکھٹ پہ جا بیٹھی تھیں اور اپنا خالی اور حاجت مند دامن پھیلا دیا تھا۔

وہ سفید شلوار سوٹ میں ملبوس اونچے پورے قد سے کھڑا عبداللہ سے مخاطب زری کے دل کو اس کی دھڑکنوں سمیت سہما کے رکھ گیا تھا وہ دیکھتی رہ گئی تھی اس کے چہرے کی رنگت دمک رہی تھی وہ صاف ستھرا اور فریش نظر آرہا تھا اس کی صحت بھی پہلے سے کافی اچھی محسوس ہو رہی تھی' وہ شلوار سوٹ بہت کم پہنتا تھا مگر جب پہنتا تھا اسے بہت سوٹ کرتا تھا' اس کی پرسنالٹی گریس فل اور شاندار لگنے لگتی تھی ایسے میں اس کے مقابل ٹھہرنا اور اسے دیکھنا زری کے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا اس وقت بھی کچھ یہی حال تھا وہ بڑی مشکلوں سے دل کو لگام ڈالے دل کڑا کر کے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس صورت پہ تو وہ قربان تھی۔ وہ آخر کیوں نہ دیکھتی؟ وہ اس کے سامنے ہی کھڑا تھا؟ دیکھ دیکھ کر دل ہی نہیں بھرتا تھا تو وہ کیا کرتی؟ مجبور تھی اسے دیکھنے پہ اسے چاہنے پہ اور مجبور کرنے والا اس کا عشق تھا۔ منہ زور اور بے لگام جو دل آور شاہ کی سمت ہی سرپٹ بھاگے جا رہا تھا جسے یہ بھی پرواہ نہیں تھی کہ اگر راستے میں ٹھوکر کھا کے گرا تو چوٹ کتنی گہری آئے گی؟ سنبھل بھی پائے گا یا نہیں؟ اور زری بھی عشق کی رتھ پہ سوار تھی وہ جس طرف بھی لے جاتا اس نے تو جانا تھا۔ مجبور جو تھی لیکن اس وقت تو وہ کچھ زیادہ ہی مجبور تھی اتنی کہ عبداللہ سے بات کرتا دل آور بھی محسوس کر چکا تھا لیکن اس نے زری کی سمت دیکھ کر اسے نروس نہیں کیا تھا بس اپنے دھیان میں بات کرتا رہا اور وہ اپنے دھیان میں کھوئی رہی تھی۔ "زری!" نگارش بھی اس کی محویت بھانپ چکی تھی اسی لیے اسے ٹہوکا دیا تھا۔

"اف۔! مرجائے یہ زری۔ جب بھی کم بخت دل سیراب ہونے کی کوشش کرتا ہے زری کی یہ پکار ہمیشہ خلل ڈال دیتی ہے۔" وہ دل ہی دل میں جھنجلا کے رہ گئی تھی۔

"چلو۔! ہم اندر چلتے ہیں۔" نگارش نے اندر کی سمت اشارہ کیا تھا جس پہ عبداللہ اور دل آور بھی متوجہ ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے یار۔! آپ لوگ آرام کریں' میں بھی اب چلتا ہوں کافی ٹائم ہو رہا ہے۔" دل آور نے اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی سے ٹائم دیکھتے ہوئے اجازت چاہی تھی۔

"ارے۔! اتنی جلدی کیوں؟ کچھ دیر تو بیٹھو نا۔" عبداللہ کو اس کے اجازت طلب کرنے پر اچنبھا ہوا تھا۔

"نہیں یار۔! صبح کورٹ بھی جانا ہے اور ابھی ایک فائل پہ کام بھی کرنا ہے' اور ٹائم دیکھو رات کے بارہ بج رہے ہیں اس لیے اب چلنا چاہیے تم بھی تھک گئے ہو گے کھانا کھاؤ اور اب آرام کرو' باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔" اس نے عبداللہ سے الوداعی ہاتھ ملایا تھا اور اسے تسلی دی تھی۔

"او کے۔! جیسے تمہاری مرضی۔" عبداللہ نے سر ہلایا تھا اور دل آور خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گیا تھا لیکن زری اور نگارش کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے قدم ٹھٹکے تھے' زری کے ملبوس سے اٹھتی "نائٹ فرینڈ" کی خوشبو نے اسے اپنا آپ یاد دلایا تھا۔ مگر دل آور وہاں ٹھہرا نہیں تھا کیونکہ اس کے وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ اس لیے وہ بغیر رکے آگے بڑھ گیا تھا۔

"صاحب۔! میں بھی چلوں؟" چوکیدار کے پاس بیٹھا گلاب خان اسے دیکھ کر قریب آگیا تھا۔ "عبداللہ!" دل آور نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے رک کر آواز دی تھی۔

"حکم جناب۔" عبداللہ بھی جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔

"مجھے اپنے ڈرائیور کو ساتھ لے جانے کی اجازت ہے یا نہیں؟" کافی عاجزی سے پوچھا گیا تھا۔

"تو میرے پاس کون رہے گا۔" عبداللہ کو پریشانی ہوئی تھی۔

"آس پاس خواتین نہ ہوتیں تو میں تمہیں بتاتا کہ تمہارے پاس کون رہے گا۔" دل آور کا مسکراتا ہوا ذو معنی لہجہ عبداللہ کو اس کی بات کا مفہوم سمجھا گیا تھا جس پہ عبداللہ سٹپٹا گیا تھا۔

"دل آور۔! کبھی تو شرم کر لیا کرو۔" اس نے سرزنش کی تھی۔

"شرم ہی تو کی ہے۔" دل آور ہنسا تھا۔

"او کے او کے۔! جاؤ اب اور اپنے ڈرائیور کو بھی لے جاؤ' لیکن گاڑی چھوڑ جانا۔" عبداللہ نے جان چھڑائی تھی۔

"او کے جناب۔! اللہ حافظ۔" دل آور مسکراتے ہوئے کہہ کر گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا اور گلاب خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کی دو گاڑیاں تھیں سرف اور پراڈو۔ جن میں سے وہ اپنے استعمال میں

زیادہ تر سرف ہی رکھتا تھا اور پراڈو کبھی کبھار استعمال میں آتی تھی اس لیے اب جب عبداللہ آیا تھا تو اس کے پاس فی الحال کوئی گاڑی نہیں تھی اس لیے ول آور نے پراڈو اس کے لیے بھیج دی تھی کہ جب تک عبداللہ گاڑی نہ لے لیتا تب تک اسی کے استعمال میں رہتی جبکہ عبداللہ کا دل چاہ رہا تھا کہ گلاب خان بھی اسی کے پاس رہے جو کہ ناممکن سی بات تھی کیونکہ گلاب خان ول آور کا بہت خاص آدمی تھا اس لیے وہ زیادہ دیر اسے کہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا لہٰذا اپنے ساتھ لے کر ہی رخصت ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اوائل دسمبر کے دن تھے۔

موسم بھی لوگوں کے مزاج کی طرح دن بدن سرد ہوتا جا رہا تھا' راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہو چکے تھے۔ لیکن بڑی حویلی تو جیسے کسی جمود کا شکار تھی جہاں یوں محسوس ہوتا تھا کہ پندرہ نومبر کی صبح کا وقت ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا تھا جو نہ آگے بڑھ رہا تھا اور نہ پیچھے سرک رہا تھا بس اس جمود میں یہ فرق آیا تھا کہ وقار آفندی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آ گئے تھے اور اب آسیہ آفندی کی آزمائش کا وقت شروع ہو چکا تھا کیونکہ وقار آفندی اب اللہ کی ذات کے بعد صرف آسیہ آفندی کے رحم و کرم پہ ہی تھے اور وہی ان کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ فالج کے مریض کو سردی میں زیادہ تکلیف ہوتی تھی اس لیے ان کا زیادہ خیال رکھنا پڑ رہا تھا اور آسیہ آفندی تو چار دن میں ہی تھکنے لگی تھیں شاید اس لیے کہ ان کے سینے پہ بہت زیادہ غم کا بوجھ تھا۔ بیٹی کا غم اور شوہر کا غم۔ دونوں غم ہی انتہا کے تھے وہ اندر سے نڈھال ہو چکی تھیں۔ سہہ نہیں پا رہی تھیں اسی لیے بات بات پہ رو پڑتی تھیں۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا' وہ وقار آفندی کے لیے چکن سوپ بنا کر لائی تھیں لیکن وہ بیڈ پہ لیٹے تھے اور آسیہ آفندی سے ان کو اٹھانا اور تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر بٹھانا مشکل ہو گیا تھا انہوں نے لاکھ کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی اور اسی بے بسی پہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے' وہ رو پڑی تھیں۔

"ارے بیگم صاحبہ! کیا کر رہی ہیں آپ؟ لائیے میں کر دیتا ہوں۔" مبارک خان دروازے پہ دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا اور آسیہ آفندی کو نڈھال ہوتے دیکھ کر لپک کے قریب آیا تھا۔ آسیہ آفندی روتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی تھیں اور اچھے خاصے صحت مند مبارک خان نے فوراً ہی وقار آفندی کو سہارا دے کر تکیوں سے ٹیک لگا کے بٹھا دیا تھا۔

"پلیز بیگم صاحبہ! آپ روئیں مت صبر اور حوصلے سے کام لیں۔ آپ حوصلہ رکھیں گی تو صاحب جی بھی ٹھیک رہیں گے اس طرح رونے سے تو آپ خود بھی بیمار پڑ جائیں گی اور آپ کو پتہ ہے کہ صاحب جی کو آپ کی ضرورت ہے آپ بیمار پڑ گئیں تو ان کو کون سنبھالے گا؟" مبارک خان ایک تابعدار اور وفادار ملازم تھا اسے پتہ تھا کہ وقار آفندی پہ آج کل مشکل وقت تھا۔ اس لیے وہ ان کے اس مشکل اور کڑے وقت میں ان کا برابر کا شریک تھا ان کے ساتھ ایک ملازم کی طرح نہیں بلکہ ایک ساتھی کی طرح پیش آ رہا تھا اس وقت بھی اسے کوئی کام نہیں تھا وہ صرف ان کی خاطر وہاں آیا تھا' لیکن آسیہ آفندی کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا اسی لیے گھر کے ایک مخلص اور ہمدرد فیملی ممبر کی طرح انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی' لیکن اس سمجھانے میں بھی ایک عزت تھی' احترام تھا' عقیدت تھی' جس کی وجہ سے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں وہ سر جھکائے بات کر رہا تھا۔

"مبارک خان۔! ان سے کہو جلدی ٹھیک ہو جائیں مجھ سے ان کی یہ حالت برداشت نہیں ہو رہی' یہ۔۔۔ یہ ٹھیک نہ ہوئے تو مجھے کچھ ہو جائے گا۔" آسیہ آفندی بمشکل بول پائی تھیں ان کا حلق آنسوؤں کے بوجھ سے جیسے بند ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ دعا کریں بس۔" مبارک خان نے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھا سوپ والا باؤل اٹھایا اور ان کے بیڈ کے قریب کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور انہیں خود سوپ پلانے لگا تھا اور ساتھ ساتھ ٹشو سے ان کا منہ بھی صاف کرتا جا رہا تھا اور آسیہ آفندی اس کی اتنی اپنائیت پہ دیکھ کے رہ گئی تھیں۔ حالانکہ یہ کام اس کی ملازمت کا حصہ نہیں تھا مگر پھر بھی وہ یہ سب کر رہا تھا اسی لیے آسیہ آفندی کو اس کڑے وقت میں اگر کسی کی وضع داری اور خلوص پہ یقین آیا تھا تو وہ صرف مبارک خان تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آج بہت دنوں بعد جیزی سے ملنے کے لیے آئی تھی اور جیزی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

"واؤ میڈی؟" اس نے اپنے روم کا دروازہ کھولتے ہوئے اچانک خوشی کا اظہار کیا تھا۔ "کیسے ہو؟" مدحیہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں یقیناً" اس نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اپنے ٹھیک ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

"کیا ہو رہا تھا؟" مدحیہ پورے روم میں اک طائرانہ سی نظر دوڑاتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

"چیٹ ہو رہی تھی۔" جیزی نے لیپ ٹاپ کی سمت اشارہ کیا تھا جو صوفے کے سامنے ہی ٹیبل پہ رکھا تھا اور اس کی اسکرین روشن تھی۔

"کس سے چیٹ ہو رہی تھی؟"

مدحیہ نے لیپ ٹاپ کا رخ ذرا سا اپنی سمت موڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"دیکھ لو کس سے ہو رہی تھی۔" جیزی اورنج جوس کا ٹن اٹھا کر کھولتے ہوئے مدحیہ کے برابر ہی صوفے پہ آ بیٹھا تھا اور ایک ٹن مدحیہ کی سمت بڑھا دیا تھا۔۔۔ برائن' کرسٹینا اور مائیکل چاروں بیک وقت آن لائن تھے مدحیہ انہیں آن لائن دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور پھر بے ساختہ ہی اس کی انگلیاں کی پیڈ پہ حرکت کرنے لگی تھیں اور فوراً ہی اسے ان کے ہیلائی موصول ہونا شروع ہو گئے تھے۔

"کیسی ہو میڈی؟ پاکستان کیسا لگا؟" یہ سوال کرسٹینا کی طرف سے آیا تھا۔

"میں بھی اچھی ہوں اور پاکستان بھی اچھا ہے۔" مدحیہ نے میسج کے جواب میں ایک اسمائل کا آئی کون بھی پاس کیا تھا۔

"اچھا۔۔۔؟ سن کر حیرت ہوئی۔" فوراً ریپلائی آیا تھا جس کے اینڈ میں ایک حیرت زدہ سا آئی کون ایڈ تھا۔

"حیرت کس لیے ہوئی؟" مدحیہ نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔۔۔ "کہ پاکستان اچھا کب سے ہو گیا ہے؟" کرسٹینا نے پھر استہزائیہ سا کریکٹر سینڈ کیا تھا۔

"جب سے محبت ہو گئی ہے۔" مدحیہ یہ جملہ ٹائپ کرتے ہوئے ذرا سا جھجکی تھی' لیکن پھر سینڈ کر ہی دیا تھا۔

"محبت۔۔۔؟" کرسٹینا نے اس لفظ کو کافی لمبا کھینچ کے لکھا تھا۔

"ہاں۔۔۔ محبت۔۔۔" مدحیہ نے اقرار کیا تھا۔

"کس سے۔۔۔؟ جیزی سے؟" کرسٹینا کے اگلے سوال پہ مدحیہ ٹھہر گئی تھی۔ اس کی انگلیوں کی حرکت دھیمی پڑ گئی تھی۔ مدحیہ نے اک نظر اپنے قریب جیزی کو سراپا دیکھا' وہ اس وقت نائٹ ڈریس میں تھا' گھٹنوں تک شارٹ برمنڈ ٹراؤزر اور وائٹ سادہ سی کھلے گریبان کی ٹی شرٹ میں ملبوس ڈھیلے ڈھالے لاپروا انداز میں بیٹھا جوس سے شغل فرما رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کی اسکرین پہ عدیل عمر کی شبیہ لہرا گئی تھی' جو چند روز پہلے ورکشاپ کے گرد آلود اور کاٹھ کباڑ والے ماحول میں بھی اس کے مقابل کھسی پرانی کرسی پہ بیٹھا اس کے ساتھ

چائے پیتے ہوئے بھی کافی دیانت دار اور پرکشش لگ رہا تھا۔۔۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔۔۔ رہن سہن کا بھی اور اسٹیٹس کا بھی۔

اور مدحیہ نے ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا اور یہ فیصلہ، یہ انتخاب اس کے لیے مشکل نہیں تھا کیونکہ اس کا دل بہت پہلے ہی آنکھیں بند کر کے عدیل عمر کو انتخاب کر چکا تھا۔۔۔ بس مشکل یہ تھا اس انتخاب کا اظہار کرنا۔۔۔ لیکن کبھی نہ کبھی تو کرنا ہی تھا؟ تو پھر کرسٹینا کے سامنے ہی سہی۔

مدحیہ نے گہری سانس کھینچی اور سامنے اسکرین کی سمت دیکھا تھا۔

"بتاؤ نا۔۔۔ جیزی۔۔۔؟" کرسٹینا دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔" اس نے سینڈ کر ہی دیا تھا۔

"تو پھر کس سے؟"

"ایک پاکستانی سے۔۔۔!"

"پاکستانی سے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔! پاکستانی، محنت اور مزدوری کرنے والا پاکستانی، اپنا تن من مارنے والا پاکستانی، محبت اور عزت کرنے والا پاکستانی۔۔۔" مدحیہ نے فخر سے جواب لکھا تھا۔

"لیکن تم تو۔۔۔؟"

"میں غلط تھی۔" مدحیہ نے اعتراف کیا تھا۔

"تو پھر جیزی وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔۔۔ یہاں آنا اور یہاں رہنا اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے اسے کوئی امید نہیں دلائی تھی اور ویسے بھی وہ یہاں مہمان ہے۔ میں اسے زبردستی یہاں سے واپس تو نہیں بھیج سکتی نا؟"

"لیکن وہ تو صرف تمہارے لیے تمہاری محبت میں وہاں رہ رہا ہے؟" کرسٹینا کو حیرت ہو رہی تھی۔

"وہ میرے ملک میں رہے، میرے شہر میں رہے، لیکن میری محبت میں نہ رہے، کیونکہ میں خود کسی کی محبت میں رہ رہی ہوں۔" مدحیہ کا جواب دوٹوک تھا۔

"اف میڈی۔۔۔! تم نے مجھے چکرا کے رکھ دیا ہے، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں؟"

"اوکے۔۔۔! پھر بات ہوگی۔" مدحیہ نے بات سمیٹی تھی۔

"اوکے۔۔۔ بائے!"

کرسٹینا بھی آف لائن چلی گئی تھی اور مدحیہ نے بھی لیپ ٹاپ پیچھے سرکا دیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ اپنی جانب ذرا ترچھا کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس لیے جیزی نہیں دیکھ پایا تھا کہ ان کی آپس میں کیا بات ہوئی ہے۔

"کیا ہوا؟ پھر کرسٹی نے کچھ کہہ دیا؟" جیزی نے مدحیہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"نہیں۔۔۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اوکے۔۔۔ چھوڑو اس بات کو، یہ لو جوس پیو۔" اس نے مدحیہ کو دوبارہ جوس کی طرف متوجہ کیا تھا۔

"نو تھینکس۔۔۔ موڈ نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"کہیں باہر چلیں؟"

"نہیں، پھر کسی وقت چلیں گے، ابھی میں گھر جا رہی ہوں۔"

مدحیہ کہہ کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے موڈ کے پیش نظر جیزی چاہ کر بھی اسے روک نہیں سکا تھا۔ وہ تیز، تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی اور جیزی الجھا سا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مسلسل تین گھنٹے کی میٹنگ کے بعد نشست برخاست ہوئی تو رفتہ رفتہ سب ہی میٹنگ ہال سے باہر نکل گئے تھے۔

لیکن صرف آذر تھا جو وہیں کا وہیں بیٹھا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر کرسی کی بیک سے ٹکا دیا تھا۔ یوں جیسے تھک گیا تھا۔۔۔ اور اس کو وہیں بیٹھے دیکھ کر دانیال بھی وہاں سے نہیں جا سکا تھا۔

پورا میٹنگ ہال خالی ہو چکا تھا اور صرف وہ دونوں وہاں بیٹھے تھے اور ان کے درمیان مکمل خاموشی تھی۔ دانیال نے اک نظر آذر کو دیکھا تھا اور پھر لب بھینچ لیے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے بات کا اور الفاظ کا کوئی سرا ہی ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنے دنوں سے ان لوگوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک تناؤ سا، ایک گریز سا حائل تھا، لیکن یہ مسئلے کا حل تو نہیں تھا نا؟ آخر کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی بات تو کرنی ہی تھی یہی سوچ کر دانیال بھی وہیں ٹھہر گیا تھا۔ لیکن آذر اسے بیٹھے دیکھ کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آذر پلیز۔۔۔ رکو میری بات سنو۔" دانیال نے اسے روکا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ تمہارے پاس کوئی بات ہوتی تو میں ضرور سنتا دانیال صاحب۔۔۔ لیکن افسوس کہ تمہارے پاس کوئی بات نہیں ہے۔ صرف تسلیاں ہیں تسلیاں۔۔۔ جھوٹی اور خوش فہم تسلیاں۔۔۔ بے بنیاد تسلیاں۔۔۔ جن کو میں پہلے بھی سن چکا ہوں، لیکن اب مزید نہیں سننا چاہتا۔۔۔ اب جو کچھ جیسے چل رہا ہے اسے چلنے دو، کیونکہ اب کچھ کہنے سننے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔"

آذر کافی چبا کر بات کر رہا تھا، اس کا لہجہ کافی تلخ اور طنزیہ سا ہو رہا تھا۔

"آذر۔۔۔ ہمارے پاس کہنے سننے کے لیے بہت کچھ ہے، لیکن تم سمجھنے کی کوشش تو کرو۔۔۔ اس سارے قصے میں ایسا کچھ ضرور ہے، جو ہم سے پوشیدہ ہے۔ جو ہم سے چھپا ہوا ہے، جسے ہم نہیں جانتے، جسے علیزے جانتی ہے یا پھر ڈیڈ اور منصور حسین جانتے ہیں۔۔۔ تمہیں خود پتا ہونا چاہیے کہ علیزے ایسا نہیں کر سکتی تھی اور اگر اس نے ایسا کیا ہے تو ضرور کوئی وجہ ہوگی؟ کوئی بڑی وجہ۔۔۔ کوئی انتہا درجے کی وجہ؟" دانیال کے ذہن میں جو سوچیں کلبلا رہی تھیں، وہ ان سب کے سامنے لانا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی بھی سمجھنے اور غور کرنے پہ تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ کہا نا تمہارے پاس کوئی بات نہیں ہے، صرف تسلیاں ہیں، جھوٹی، خوش فہم اور بے بنیاد تسلیاں۔" آذر نے تمسخرانہ سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"آذر۔۔۔ تم تو علیزے کے بہت قریب تھے۔ بہت خیال رکھتے تھے اس کا، بہت چاہتے تھے اسے۔ ہم سب سے زیادہ انڈر اسٹینڈ کرتے تھے اس کو۔۔۔ اور تم ہی اس کو سمجھ نہیں پائے؟ تم ہی سب سے زیادہ بدظن ہوئے پھر رہے ہو اس سے؟ کیا تمہیں اس پہ ذرا بھی اعتماد نہیں تھا؟" دانیال کے لہجے میں تاسف تھا۔ دکھ تھا اور بے یقینی بھی۔

"مجھے اس پہ سب کچھ تھا۔ اعتماد تھا، بھروسہ تھا، اس سے محبت تھی، اس سے پیار تھا، کیا کچھ نہیں تھا اس سے۔۔۔ لیکن اس نے سب ختم کر دیا۔۔۔ خود۔۔۔ خود ختم کیا اس نے۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے، سب مٹا دیا اس نے۔۔۔ اس کے جو الفاظ میں نے سنے ہیں، وہ میں جانتا ہوں، تم سنتے تو اس وقت اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہ کہتے۔۔۔ جاؤ دیکھو۔۔۔ ڈیڈ کو دیکھو، جو کچھ میں نے سنا تھا وہ سب ڈیڈ نے بھی سنا تھا۔ میں سہہ گیا اور بچ گیا، وہ نہیں سہہ سکے، اس لیے بچ نہیں سکے۔ وہ ظاہر سے مفلوج ہوئے ہیں، میں باطن سے مفلوج ہوا ہوں، ان کا جسم پیرالائز ہوا ہے اور میرے دل و دماغ پیرالائز ہو گئے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہ بستر سے لگ گئے ہیں اور میں چل پھر رہا ہوں۔۔۔

وہ اپنے جسم سے کام نہیں لے سکتے اور میں اپنے دل و دماغ سے کام نہیں لے سکتا۔۔۔ ناکارہ ہو گئے ہیں ہم لوگ۔۔۔ ناکارہ۔۔۔ سمجھتے ہو نا اس کا مطلب؟" آذر نے تلخی سے کہتے ہوئے دانیال کو دیکھا تھا۔

"آذر۔۔۔ علیزے اب بھی واپس آجائے تو۔"

"بس دانیال بس۔۔۔ اب اور نہیں۔۔۔ عزت کوئی لباس نہیں ہے، جسے اتار کر دھو کر پونچھ کر دوبارہ پہنا جا سکتا ہے۔ عزت، عزت ہی ہوتی ہے، اتر گئی سو اتر گئی، دوبارہ بحال نہیں ہو سکتی، اگر ایسا کرنے کی کوشش بھی کرو گے تو بھی دل میں آئینے کی طرح بال رہ جائے گا اور جس چیز میں بال رہ جائے اسے جوڑنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔" آذر نے دانیال کی بات کاٹتے ہوئے خفگی اور تلخی سے کہا تھا۔ اب تو اس کا لہجہ ہمہ وقت ہی تلخ رہتا تھا۔

"لیکن آذر۔۔۔ علیزے کے ساتھ۔"

"پلیز دانیال۔۔۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔۔۔ میرے سامنے کسی کا نام مت لو۔" آذر نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا تھا۔

"کیوں نام نہ لوں؟ کیا اتنے ہی لاتعلق اور بے حس ہو گئے ہو تم؟"

"ہاں ہاں۔۔۔ ہو گیا ہوں بے حس اور کیا سننا چاہتے ہو تم۔ جو کچھ وہ کر کے گئی ہے کیا وہ بے حس ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ تم کہتے ہو اس کے ساتھ ضرور کچھ ہوا ہو گا۔ لیکن میں کہتا ہوں کیا ہوا ہو گا بھلا، کیا وہ منصور حسین اسے گن پوائنٹ پہ لے گیا ہے یا پھر وہ اسے بے ہوش کر کے کڈنیپ کر کے لے کر گیا ہے؟ وہ اپنے بیڈ روم میں تھی، ٹھیک ٹھاک حلیے میں تھی، وہ بھی اس کے ساتھ تھا، اس کے بیڈ روم میں تھا۔ وہ چاق و چوبند تھا تو وہ بھی اپنے ہوش و حواس میں تھی۔ اس کی کنپٹی پہ میں نے تو کوئی گن نہیں دیکھی تھی، جس کے دباؤ میں آکر وہ اس کے ساتھ جاتی۔۔۔ بلکہ وہ تو اعتراف کر رہی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے حویلی چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہے۔ اگر وہ کسی دباؤ میں ہوتی تو ہمیں کوئی اشارہ بھی دے سکتی تھی، رو سکتی تھی، چلا سکتی تھی، اس منصور حسین کی کبھی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے بیڈ روم میں گھس کر اسے سب کے سامنے زبردستی ۔۔۔ اپنے ساتھ لے جاتا اور اس کی مرضی کے بغیر یہ سب کر لیتا۔۔۔ اگر اس نے زبردستی ہی اسے لے کر جانا ہوتا تو بہت پہلے ہی اسے اپنے ساتھ لے جاتا، آخر وہ اس کے ساتھ آتی جاتی تھی۔ وہ اس کا ڈرائیور تھا، کرنا چاہتا تو بڑی آسانی سے اسے کڈنیپ کر سکتا تھا، لیکن نہیں۔۔۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔۔۔ کیونکہ یہ معاملہ زور زبردستی کا نہیں تھا، یہ جو کچھ بھی ہوا ہے دونوں کی باہمی رضا سے ہوا ہے۔ اس لیے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ علیزے آفندی پہ چودہ اور پندرہ نومبر کی درمیانی شب کوئی آفت آئی تھی جو اسے منصور حسین کے ساتھ اڑا کر لے گئی ہے۔" آذر نے سختی سے کہتے ہوئے غصے سے کرسی کو ٹھوکر ماری اور اپنا بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ اس کے اندر ابال اٹھ رہے تھے اور دماغ کی شریانیں پھٹنے کو تھیں۔ اس لیے وہ مزید آفس میں رکے بغیر وہاں سے نکل آیا تھا۔ وہ غصے میں تھا اور کافی رش ڈرائیو کرتا ہوا حویلی پہنچا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔!" سیڑھیاں اترتی کومل کے چہرے پہ رنگ آگئے تھے۔ لیکن آذر نے کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کافی عجیب اور غیر معمولی ہو رہے تھے جنہیں دیکھ کر وہ چونکی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" کومل اپنائیت کا پیکر بنی آگے بڑھی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ روکھے سے انداز میں کہہ کر سیڑھیاں طے کر گیا تھا۔ اس کا رخ علیزے کے بیڈ روم کی طرف تھا۔ کومل کو دیکھ کر جھٹکا لگا تھا۔

وہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ اک زوردار جھٹکے سے کھول کر اندر داخل ہوا تھا اور علیزے کا خوب صورت سجا سجایا لگژری بیڈ روم جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی، ویسا ہی جوں کا توں نظر آرہا تھا۔ یوں جیسے علیزے ابھی ابھی بیڈ روم

سے نکل کر باہر گئی ہو۔

آذر نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تھی اور پھر اسے دائیں سائیڈ کی دیوار سے لگے صوفے پہ اور صوفے کے سامنے والی ٹیبل پہ علیزے کی برتھ ڈے کے تمام گفٹس، ہنوز پیکنگ میں، بند پڑے نظر آئے تھے اور صوفے کے ساتھ والی چھوٹی کرسٹل ٹیبل پہ سب سے الگ تھلک آذر کا دیا ہوا گفٹ رکھا تھا اور باقی سب کی طرح وہ بھی، ہنوز پیکنگ میں ہی تھا۔ گویا علیزے نے آذر آفندی کے جذبات کھول کر بھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ بھی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ گولڈن ریپر ہٹا کر ہی دیکھ لے کہ وہ اس ریپر کی اوٹ میں کیا لپیٹ کر لایا ہے؟ محبت لایا تھا یا محبت کا اقرار لایا تھا۔

وہ اس نہج پہ سوچتی تو تب نا؟ اور آذر گولڈن ریپر میں لپٹے اپنے جذبات کی ناقدری پہ مٹھیاں بھینچتا ہوا سرخ چہرہ اور سرخ آنکھیں لیے اس گفٹ کی طرف بڑھا تھا۔

"آئی لو یو علیزے۔۔۔ آئی لو یو علیزے۔" سفید پتھر سے بنے تاج محل کے اندر سے میٹھی سی، سریلی سی آواز میں اظہار محبت کیا جا رہا تھا اور یہ اظہار آذر کو اور بھی کاٹ کے رکھ گیا تھا۔ وہ یہ گفٹ بڑے چاؤ سے بڑی مشکل سے انتخاب کر کے لایا تھا۔ محبت کی علامت اور محبت کا نشان سمجھ کے۔۔۔ ایک محبت کرنے والے کا محبت بھرا تحفہ سمجھ کے۔۔۔ لیکن یہاں محبت کو سمجھتا کون تھا بھلا؟ ہونہہ محبت۔۔۔ آذر تاسف سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور کھڑکی کے پٹ کھول کر ہاتھ میں پکڑے سفید سنگ مرمر سے بنے تاج محل کو اپنی پوری قوت سے کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ حویلی کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ تاج محل حویلی کے احاطے سے باہر جا کے گرتا۔

لیکن جہاں گرا تھا وہیں دانیال کی گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے اور وہ فوراً گاڑی سے اتر آیا تھا اس نے کشادہ اور طویل ڈرائیو وے کے بیچوں بیچ سفید سنگ مرمر کے ٹکڑے بکھرے ہوئے دیکھے تھے۔

"آئی لو یو علیزے۔۔۔ آئی لو یو علیزے۔" ایک چھوٹے سے پرزے میں ریکارڈ یہ جملہ ابھی تک اظہار سے باز نہیں آرہا تھا۔۔۔ جس سے لگ رہا تھا کہ ٹوٹنے کے بعد بھی محبت ختم نہیں ہوتی، چاہے دل ٹوٹ جائے، چاہے تاج محل۔۔۔

دانیال نے وہ گنگناتا ہوا پرزہ اٹھایا اور علیزے کے بیڈ روم کی کھڑکی کی سمت دیکھا تھا جہاں آذر نے کھڑکی کے پٹ بڑے زور سے بند کیے تھے اور دانیال تاسف سے دیکھتا نفی میں سر ہلاتا ہوا سفید سنگی ٹکڑوں کو بوٹوں تلے روندتا چپ چاپ انیکسی کی سمت بڑھ گیا تھا، بڑی حویلی کے حالات کشیدہ ہو چکے تھے۔ رشتوں میں اچھی خاصی بدمزگی اور بدظنی پیدا ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو میرے ہاتھوں میں
ایک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بنایا ہے؟
کس لیے بنایا ہے؟
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟
زندگی کے پرچے کے

سب سوال لازم ہیں
سب سوال مشکل ہیں۔۔۔

علیزے کے قدم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کانپ رہے تھے۔ اس لیے اس کے گرنے کے ڈر سے گل نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا جوان جہان لڑکی چند دن کی قید اور دو دن کے بخار سے خود چلنے پھرنے سے قاصر اور دوسروں کے سہاروں کی محتاج ہوگئی تھی۔ وہ ایک قدم سیڑھی پہ رکھتی تھی تو دوسرا قدم اٹھانے کے لیے اسے چند سیکنڈ اپنی ہمت مجتمع کرنی پڑتی تھی۔

اور یہ چند سیڑھیاں طے کرنے میں اسے یوں لگا جیسے گھنٹوں گزر گئے ہو' ایک ہاتھ سے وہ دیوار کا سہارا لے رہی تھی اور ایک ہاتھ گل نے تھاما ہوا تھا اور ان دو سہاروں کی مدد سے وہ اس ٹھنڈی قبر نما بیسمنٹ کی سیڑھیاں طے کرکے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی اور اس دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بھر آیا تھا۔

علیزے کو جب یہاں لایا گیا تھا تو وہ بے ہوش تھی' اس لیے بے ہوشی کی وجہ سے اسے نہیں پتا تھا کہ اسے کن راستوں سے لاکر کہاں پھینک دیا گیا تھا۔ اس کے لیے تمام راستے انجان اور ان دیکھے تھے۔

"بی بی جی۔۔۔ ادھر آجائیں' صاحب نے کہا تھا کہ آپ کو لان میں بٹھاؤں۔" گل اسے سیڑھیوں کے پیچھے سے نکال کے راہداری اور ڈرائنگ روم کے مرکزی حصے کی طرف لے آئی تھی۔

"لان میں؟" علیزے نے بے یقینی اور حسرت سے پوچھا تھا۔

"جی ہاں۔۔۔ لان میں صاحب نے خود کہا ہے۔" گل نے اسے یقین دلایا تھا اور علیزے کو یوں لگا جیسے گل نے اسے زندگی کی نوید سنائی ہو۔۔۔ اور پھر آہستہ قدموں سے چلتی وہ بمشکل گل کے سہارے راہداری عبور کرکے باہر لان تک آئی تھی۔

علیزے نے پہلی بے تاب اور پیاسی نظر آسمان کی طرف اٹھائی تھی' شفاف نیلا آسمان اور آسمان کے ماتھے پہ سجا سنہری سورج علیزے کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ وہ ہمیشہ سورج کی دھوپ سے ذرا بچ کے رہتی تھی۔ وقار آفندی ہمیشہ احتیاط کرتے تھے کہ کہیں علیزے کی رنگت دھوپ کی وجہ سے سنولا نہ جائے' کہیں خراب نہ ہوجائے' کوئی انفیکشن نہ ہو' اور آج وہی دھوپ علیزے کو اپنے جسم کے لیے ایک راحت محسوس ہورہی تھی اور وہ پلکیں موندتے ہوئے رو پڑی تھی' اس کے آنسو رخساروں پہ بہہ آئے تھے۔

"بی بی جی! تھک جائیں گی' وہاں کرسی پہ بیٹھ جائیں۔" گل نے لان میں بچھی کرسیوں کی سمت اشارہ کیا تھا' لیکن علیزے وہیں وہیں لان کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی تھی اور اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے بخار سے تپتے ہوئے جسم اور دل و دماغ کو دھوپ کی وجہ سے سکون ملنے لگا تھا۔ بیسمنٹ میں بہت زیادہ ٹھنڈک تھی اور علیزے اتنی سردی برداشت کرنے کی عادی نہیں تھی۔ اس لیے اسے ٹھنڈ کی وجہ سے بخار ہوگیا تھا۔ گل دو دن سے مسلسل اس کی دیکھ بھال کررہی تھی اور جب ولی آور کو پتا چلا کہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو وہ صبح آفس جانے سے پہلے خود اسے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑی تھی۔ اس لیے وہ جاتے جاتے گل سے کہہ گیا تھا کہ باہر دھوپ نکلے تو وہ اسے تھوڑی دیر کے لیے دھوپ میں لے جائے' تاکہ اس کے جسم کو سورج کی تھوڑی حرارت مل سکے' اس لیے ولی آور کے جانے کے تقریباً" دو تین گھنٹے کے بعد جب علیزے قدرے ہوش میں آئی تھی تو گل نے اسے بیسمنٹ سے باہر لانے میں جلدی کی تھی کہ کہیں صاحب کا یہ حکم پھر کسی غصے میں تبدیل نہ ہوجائے۔ اور علیزے باہر آکر یوں دیکھ رہی تھی جیسے مرنے کے بعد دوبارہ اسے زندگی عنایت کردی گئی ہو' جس کی ہر مرنے والے کی طرح اسے امید ہی نہیں تھی اور جب امید اور توقع سے بڑھ کے ملا تھا تو اس کی آنکھیں بار بار چھلک رہی تھیں' اس کا دل چاہ رہا تھا وہ یوں ہی عمر بھر اس آزاد اور

کھلی فضا میں انہی سیڑھیوں پہ بیٹھی رہے اور اس کی عمر تمام ہو جائے۔ اس وقت علیزے کے لیے اس کھلی فضا اور قدرتی ماحول سے بڑھ کے اور کوئی بھی شے قیمتی نہیں تھی۔ علیزے کو چند ہی دن میں ان سب چیزوں کی قدر و قیمت کا احساس ہو گیا تھا' جن کی اہمیت پہ اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس سورج سے زیادہ اسے ہیٹر کی گرمائش اہم محسوس ہوتی تھی۔

لیکن آج احساس ہوا تھا کہ سورج بھی انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے اور اس نے اس نعمت پہ کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا اور آج جب دھیان دیا تھا تو اس کے سوا کوئی اور چیز اہم نہیں لگ رہی تھی۔

گل نے بارہا اسے سیڑھیوں سے اٹھانے کی اور کرسی پہ بٹھانے کی کوشش کی تھی' لیکن وہ نہیں مانی تھی۔ لان کی سیڑھیوں کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ اس لیے مشرق کی طرف سے نکلنے والے سورج کی سنہری روپہلی دھوپ سیدھی علیزے پہ ہی پڑ رہی تھی۔ جس سے اس کے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو کافی تقویت مل رہی تھی۔ پہلے تو وہ کافی دیر لان کو دیکھتی رہی' پھر جب تھک گئی تو اپنا سر گھٹنوں پہ ٹکا دیا تھا اور پلکیں موند لی تھیں۔۔۔ اور یوں ہی گھٹنوں پہ سر رکھے اور پلکیں موندے ہوئے اسے نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی جب گیٹ پہ کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔

مگر بخار کی وجہ سے علیزے کا سر اور آنکھیں اتنی بھاری اور بوجھل ہو رہی تھیں کہ وہ ذرا کی ذرا سر اٹھا کر اتنا بھی نہ دیکھ سکی کہ آنے والا کون ہے۔

پہلے گیٹ کھلا تھا۔ پھر گاڑی اندر آئی تھی' پھر گاڑی روک کر کوئی گاڑی سے نیچے اترا تھا اور پھر رفتہ رفتہ بھاری قدموں کی چاپ اس کے قریب آتی چلی گئی تھی۔

"ہیلو۔۔۔ کیسی ہو؟" اس کی آواز علیزے کے بہت قریب سے ابھری تھی اور علیزے کا دل چاہا تھا وہ اپنی سماعتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لے' تاکہ وہ کبھی اس کی آواز نہ سن سکے۔

"میں تم سے مخاطب ہوں جان وقار۔۔۔ کیسی ہو؟ کچھ اچھا فیل ہوا یا نہیں؟" وہ اطمینان سے کہتا اپنی پینٹ ذرا سی گھٹنوں کے اوپر کھینچتا ہوا اس کے برابر ہی لان کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا تھا۔

اور اب کی بار نقاہت کے باوجود علیزے نے یک دم کرنٹ کھا کے دیکھا تھا' وہ اس کے ساتھ' اس کے بالکل برابر' اس کے بے حد قریب بیٹھا ہوا تھا اور علیزے کو یوں لگا جیسے اس کے پورے جسم پہ کسی نے تیل چھڑک کر اسے آگ لگا دی ہو' اس کا رواں رواں جل اٹھا تھا۔ وہ یک دم پیچھے ہٹی تھی' لیکن اس کا ہاتھ دل آور کے ہاتھ کے نیچے دبا رہ گیا تھا۔

"بیٹھی رہی ہو۔۔۔ برا ہو سکتا ہوں' لیکن بدنیت یا بدکردار نہیں ہو سکتا۔" دل آور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر اسے پیچھے ہٹنے سے روکا تھا اور علیزے نے اسے سرخ آنکھوں سے بڑے زخمی انداز سے دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے دل آور نے اس کی آنکھوں کی زخمی تحریر بڑے واضح حروف میں پڑھی تھی۔

"جس چیز کو تم میری بدنیتی سمجھ رہی ہو وہ بھی میری بدنیتی نہیں تھی' وہ سب بھی میں نے بڑی ایمان داری سے کہا تھا' اتنی ایمانداری سے کہ۔۔۔" اس نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی تھی اور علیزے کی روح تک تڑپ اٹھی تھی۔ وہ دل آور شاہ کی ادھوری بات کے آگے خاک ہو گئی تھی اور اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لینے کا سارا غرور مٹی میں مل گیا تھا۔

سیڑھیوں کے فرش پہ علیزے کا نازک سا ہاتھ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کے اوپر دل آور کے ہاتھ کا بوجھ تھا' لیکن علیزے نے اب ہاتھ کھینچنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔

"اوہ نو۔۔۔ تمہیں تو ابھی بھی بخار ہے۔" اس کو علیزے کے ہاتھ کی حدت ذرا دیر بعد محسوس ہوئی تھی۔ اس

نے علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اس کی کلائی چھو کر دیکھی تھی۔

"ٹیبلٹ لو گی؟" اس نے علیزے کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں۔۔۔" علیزے نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں۔

لیکن دل آور نے اس کے انکار پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور گل کو پکار لیا تھا۔

"جی صاحب۔۔۔ کہیے؟" گل دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی سامنے آئی تھی۔

"میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے دراز سے بخار کی ٹیبلٹ اور دو کپ چائے کے ساتھ ایک گلاس پانی لے کر آؤ۔۔۔ بس پانچ منٹ کے اندر اندر۔۔۔" اس نے حکم جاری کیا تھا اور گل ایک دم الرٹ ہو گئی تھی۔

"جی صاحب۔۔۔ ابھی لے کر آئی۔" وہ فوراً پلٹ گئی تھی۔ لیکن پلٹنے سے پہلے اس کی نظریں علیزے کے ہاتھ پہ ٹھٹکی تھیں جو اس وقت دل آور کے ہاتھ میں تھا اور یہ منظر گل کے لیے ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش منظر تھا۔ جس پہ وہ دل ہی دل میں حیران ہوتی اندر چلی گئی تھی۔

"آج میرے ایک اہم کیس کی ڈیٹ تھی اور مجھے اس میں کچھ پرابلمز نظر آ رہی تھیں۔ لیکن اللہ کی مدد سے اس کیس کا رزلٹ میرے حق میں ہی نکلا ہے۔ اس لیے کورٹ سے نکلتے ہوئے میں بہت خوش تھا اور میرا ارادہ اپنے دوستوں کی طرف جانے کا تھا' لیکن نہ جانے پھر کیوں تمہارا خیال آ گیا کہ تم بیمار ہو' اس لیے دوستوں سے ملنے کا ارادہ ترک کر کے گھر آ گیا ہوں۔۔۔ صرف تمہارے خیال سے تمہاری خاطر۔۔۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے یوں نرمی اور اپنائیت سے بتا رہا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان پیار و محبت کا بہت ہی گہرا رشتہ قائم ہو۔۔۔ یا پھر یوں جیسے وہ اس کی بیوی ہو یا محبوبہ۔

"ایک سوال پوچھوں تم سے؟ جواب دو گے؟" علیزے نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا' بھیگی آنکھیں سوالیہ ہو رہی تھیں۔

"اسی طرح تو جان بھی مانگو گی تو دے دوں گا۔ سوال کا جواب تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" دل آور نے نثار ہو جانے والے انداز میں کہا تھا۔

"کیا تم واقعی لوگوں کو انصاف دلاتے ہو؟" علیزے کے لہجے اور سوال میں بے یقینی تھی اور دل آور علیزے کے سوال پہ ٹھہر سا گیا تھا۔

"کوشش تو یہی کرتا ہوں۔۔۔ لیکن کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہوں' یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"تو پھر یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں تمہارا انصاف کیا کہتا ہے؟" علیزے بڑی بہادری کا مظاہرہ کرتی اس سے سوال و جواب کر رہی تھی۔

"تمہارے بارے میں میرا انصاف جو کہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا اور مجھے اللہ سے ڈر بھی لگتا ہے۔" دل آور نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے گہری سانس خارج کی تھی اور اس کے جواب پہ علیزے کی روح فنا ہو گئی تھی۔ اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا اور پورے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔

"صاحب۔۔۔ چائے۔" اتنے میں گل چھوٹی سی ٹرے لیے حاضر ہو گئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ لاؤ ادھر ہی رکھ دو۔" دل آور نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی صاحب۔" گل نے آگے بڑھ کے ٹرے سیڑھی پہ رکھ دی تھی۔

"اوکے۔۔۔ تم جاؤ اب۔" اس کے کہنے پہ گل اندر چلی گئی تھی اور دل آور نے ہاتھ بڑھا کے پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ اٹھا کے علیزے کی سمت بڑھا دی تھیں اور علیزے میں اتنی جرات نہیں تھی کہ ٹیبلٹ لینے سے

انکار کرتی۔ اس لیے چپ چاپ دل کڑا کر کے اس کے ہاتھ سے گلاس اور ٹیبلٹ لے لیے تھے۔ بڑی مشکل سے ٹیبلٹ نگلنے کے بعد اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"ڈونٹ وری... کچھ نہیں ہوتا' تم یہ چائے پیو۔" اس نے چائے کا کپ اٹھا کر علیزے کی سمت بڑھایا تھا۔

"میں... میں... چائے نہیں پیتی۔" اس نے بمشکل کہا تھا' کیونکہ اسے ٹیبلٹ کی وجہ سے ابکائی آرہی تھی۔

"تم تو کبھی فرش پہ بھی نہیں سوئی تھیں' لیکن پھر بھی سو رہی ہو۔" اس نے مثال دی تو۔ علیزے نے مجبوراً" اس کے ہاتھ سے کپ تھام لیا تھا۔

"ہوں گڈ... کافی سمجھ دار لڑکی ہو... بات کو کافی جلدی انڈر اسٹینڈ کر لیتی ہو۔" دل آور نے اسے سراہا تھا اور چائے کا کپ اٹھا کر خود بھی چائے کے سپ لینے لگا۔

علیزے کو اپنا آپ' اپنا دل مار کے وہ کام کرنا پڑ رہے تھے' جو اس نے پہلے کبھی نہیں کیے تھے۔ لیکن وقت تھا کہ اس سے سب کروا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے دل آور کے پہلو میں بٹھا کر چائے پلوا رہا تھا اور وہ پینے پہ مجبور تھی۔

"آذر آفندی کیسا لگتا ہے تمہیں؟" چائے پیتے ہوئے دل آور نے اک غیر متوقع سوال کیا تھا اور علیزے چونک گئی تھی۔

"آذر بھائی؟" علیزے نے حیرت اور نا سمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

"ہوں... تمہارا آذر بھائی... وہی... اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" علیزے کو اس کے عجیب سے سوال پہ الجھن ہوئی تھی۔

"جو پوچھا ہے اس کا جواب دو... سوال مت کرو۔" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بولا تھا۔

"کیا مطلب تھا تمہارا؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" علیزے ٹھٹک گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ کوئی اسپیشل فیلنگز اس کے حوالے سے۔" دل آور نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اپنی سمت دیکھتی علیزے کی آنکھوں میں دیکھا تھا جس کی گولڈن براؤن آنکھوں میں تحیر پھیل گیا تھا۔

"ڈ... ڈرائیور... یہ... یہ... تم کیا... کک... کہہ رہے ہو... تت... تم نے... یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ...؟" علیزے حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔

"ہونہہ' مجھے کیا ضرورت ہے ایسا فضول سوچنے کی۔ یہ سوچ تو تمہارے آذر بھائی کی ہے' جواب اپنی سوچ پہ پچھتا رہا ہے۔" دل آور نے لاپروائی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"آذر بھائی کی سوچ..." علیزے کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ اسے اپنی سماعتوں پہ اور دل آور کے کہے الفاظ پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن اسے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ اس کے قریب بیٹھا یہ آدمی مذاق نہیں کر سکتا۔

"ہوں... آذر بھائی کی سوچ۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"مم... مگر... یہ... یہ... کیسے ہو سکتا ہے بھلا وہ... وہ میرے بارے میں... ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں۔" علیزے کے دل و دماغ اس حقیقت کو قبول کرنے پہ تیار نہیں ہوئے تھے۔

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے کہ اس نے ایسا کیسے سوچ لیا اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔" وہ بھی لاپروائی سے کام لے رہا تھا۔

"تت... تم مجھے مینٹلی ڈسٹرب کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہو نا؟" اس نے دل آور کو مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں تمہیں دنیا کی تمام حقیقتوں سے روشناس کرانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں' میرے پاس رہو گی تو تمہیں

زندگی کی ہر اونچ نیچ کا پتا چل جائے گا۔ بڑی حویلی میں رہ کر دنیا کو پتا تھا کہ تم کیا ہو اور اب یہاں میرے گھر میں رہ کر تمہیں پتا چلے گا کہ دنیا کیا ہے۔ دنیا جنت بھی ہے اور دوزخ بھی... پہلے تم نے جنت کا رخ دیکھا ہے۔ اب دوزخ کا رخ دیکھو گی۔" کہتے کہتے دل آور کا لہجہ سخت ہو گیا تھا اور علیزے دل تھام کے رہ گئی تھی۔ وہ روح تک لرز گئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا اس کے سیل پہ بتول شاہ کی کال آگئی تھی اور وہ وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ لیکن علیزے کے پاس ہمیشہ کی طرح الجھنیں اور سوال چھوڑ گیا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ زندگی ریشم کی ڈوریوں کی طرح الجھ چکی تھی' کوئی سرا ہی ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب کسی نے ان کے گھر کا دروازہ انتہائی زور سے دھڑا دھڑ پیٹ ڈالا تھا۔

عدیل کے ساتھ ساتھ باقی گھر والے بھی گہری نیند سے جاگ گئے تھے۔ وہ اپنے اوپر سے گرم لحاف ہٹا کر بڑی تیزی سے اپنے بستر سے اٹھا تھا اور زیرو پاور بلب کی روشنی میں جوتے پہن کر کمرے کا سوئچ بورڈ ٹٹولا اور لائٹ جلا کر جلدی سے دروازہ کھول کے باہر نکل آیا تھا۔ اتنے میں مریم اور عابدہ خاتون بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل آئی تھیں۔

"عدیل... باہر کون ہے بیٹا؟" عابدہ خاتون پریشان ہو چکی تھیں۔

"پتا نہیں کون ہے' دیکھتا ہوں ابھی۔" عدیل کہہ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا تھا۔

"کون ہے؟" اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے احتیاطاً" پوچھا تھا۔

"استاد... میں ہوں شہریار... دروازہ کھولو۔" عدیل کو باہر سے چھوٹے کی آواز سنائی دی تھی اور دماغ میں کسی انہونی کا الارم بجا تھا۔

"شہریار..." اس نے فوراً" دروازہ کھول دیا تھا۔

"کیا بات ہے' خیریت تو ہے؟" عدیل پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

"خیریت نہیں ہے استاد... ورکشاپ میں آگ لگ گئی ہے' سب تباہ ہو گیا ہے۔ ہم... ہم سب برباد ہو گئے ہیں۔" شہریار نے اس کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا اور عدیل کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

"ورکشاپ میں آگ..." عدیل کو اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ رات کے تین بجے اچانک گہری نیند سے ہڑبڑا کے اٹھنا اور پھر ایسی خبر سننا دماغ کو ہولا کے رکھ گیا تھا۔

"استاد... تم یہاں سے چلے جاؤ' تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

شہریار نے اسے آنے والے وقت کی سنگینی سے بچاؤ کا راستہ بتایا تھا اور عدیل دم بخود رہ گیا تھا۔

"شہریار! یہ کیا کہہ رہے ہو تم' تمہارا مطلب ہے کہ میں گھر سے بھاگ جاؤں۔" عدیل کا لہجہ بے یقین سا تھا۔

"وقت کی نزاکت یہی کہہ رہی ہے استاد کہ آپ گھر سے چلے جاؤ... کچھ دن بعد میں آجانا۔" شہریار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"مگر کیوں شہریار' میں کیوں بھاگ جاؤں' میں نے کیا' کیا ہے بھلا۔" عدیل کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ شہریار کی بات سمجھنے اور ماننے پہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔

"بے شک آپ نے کچھ نہیں کیا استاد... لیکن ورکشاپ کی ذمہ داری تو آپ پہ ہی تھی نا' اب اگر ورکشاپ میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو ذمہ دار بھی تو آپ کو ہی ٹھہرایا جائے گا۔"

"ورکشاپ میں تین گاڑیاں جل گئی ہیں تو کیا ان کا نقصان باؤ امتیاز پورا کرے گا' ہونہہ! ہرگز نہیں۔۔۔ وہ یہ نقصان آپ کے کھاتے ہیں ڈال دے گا اور آپ یہ نقصان کیسے پورا کریں گے؟ اگر نقصان پورا نہ ہوا تو آپ کو جیل جانا پڑے گا اور اگر خدا ناخواستہ آپ جیل چلے گئے تو وہاں سے نکلو گے کیسے اور پیچھے گھر والوں کا کیا ہوگا؟ اس لیے بہتر ہے کہ آپ یہاں سے چلے جاؤ۔" شہریار عدیل کے ہر مسئلے پہ سوچ رہا تھا اور عدیل چکرا گیا تھا۔

"کیسے چلا جاؤں' کہاں چلا جاؤں' کیا کہیں جانا اتنا آسان ہے بھلا۔ میرے گھر میں ماں ہیں' بہنیں ہیں' معذور اور لاچار باپ ہے' انہیں کس کے سہارے پہ چھوڑ جاؤں ادھر میں گھر سے باہر قدم رکھوں گا۔ ادھر وہ بے سہارا ہو جائیں گے۔ لوگ گدھ کی طرح نوچنے کے لیے آجائیں گے ان کو۔۔۔ میری عزت' میری بہنیں غیر محفوظ ہو کے رہ جائیں گی۔ کون تحفظ دے گا ان کو' کون حفاظت کرے گا ان کی ہونہہ۔۔۔ میرا گھر سے بھاگنا آسان نہیں ہے یار۔ میں چھڑا چھانٹ نہیں ہوں کہ بھاگ جاؤں۔۔۔ میرے گھر میں میری عزت ہے۔ کل کو میں بھاگ جاتا ہوں تو کیا میرے گھر پہ پولیس نہیں آئے گی' کیا میرے گھر کی تلاشی نہیں لیں گے' میری ماں' بہنوں سے پوچھ پڑتال نہیں کریں گے' دھمکیاں نہیں دیں گے' تنگ نہیں کریں گے' کیا آئے روز میرے گھر کی کنڈی نہیں کھڑکے گی۔ اگر یہ سب ہوگا تو کیا عزت رہ جائے گی میری اور کیا فائدہ میرے بھاگنے کا۔ اس لیے اس سے بہتر ہے کہ میں سامنے جا کر حالات کا مقابلہ کروں کہ آخر ہوتا کیا ہے۔"

"بس تم اگر دوست ہو تو اس برے وقت میں میرا ساتھ دو' مجھے تم لوگوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔" عدیل نے اپنی جگہ سے ہٹنے کی بجائے جم جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ حالات کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔

"ایک بار پھر سوچ لو استاد۔" شہریار نے آخری کوشش کی تھی۔

"تم نے سوچنے کا وقت کب دیا ہے' چھوٹے' نیند بھی توڑ دی اور خواب بھی۔"

عدیل شکوہ کناں لہجے میں کہتا تلخی سے سر جھٹک کر اندر آگیا تھا۔ مریم اور عابدہ خاتون اتنی سردی کے باوجود بغیر کسی گرم کپڑے کے برآمدے میں ستون کے قریب کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بیٹا! کون ہے؟ کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نا۔" عابدہ خاتون اس کے پیچھے کمرے تک آئی تھیں۔

"جی امی۔۔۔ اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے۔ بس ایک دوست پہ پولیس کیس بن گیا ہے' اس کے لیے جا رہے ہیں' آپ دعا کیجیے گا کہ زیادہ مسئلہ نہ بنے۔" عدیل نے اپنی گرم چادر اٹھا کر کندھوں پہ پھیلائی تھی۔

"اللہ خیر۔۔۔ اللہ خیر۔۔۔! اللہ رحم کرے سب پہ۔۔۔ جلدی گھر آجانا۔" وہ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولی تھیں۔

"ان شاء اللہ جلدی گھر آجاؤں گا' آپ ذرا مریم کو اندر بھیج دیں۔" اس نے بوٹ پہنتے ہوئے کہا تھا اور عابدہ خاتون باہر نکل گئیں اور وہ بوٹ پہننے کے بعد کھڑا ہوا ہی تھا کہ مریم اندر آگئی تھی۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" مریم کا لہجہ سنجیدہ اور نپا تلا سا تھا اور عدیل اس کے سوال پہ رک گیا تھا اور پھر اس کے سامنے آکر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"دیکھو مریم۔۔۔ مجھے پتا ہے کہ تم بہت بہادر ہو' نیک ہو' عزت دار ہو' میرے لیے ہمیشہ بہن نہیں بلکہ بھائی ثابت ہوئی ہو' تمہارے صبر اور ہمت کی داد دیتا ہوں' تم نے کبھی اپنا یا ہمارا حوصلہ گرنے نہیں دیا اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ تم اپنا بھی حوصلہ بلند رکھوگی اور باقی سب کو بھی ہمت اور حوصلہ دوگی' خصوصاً" امی اور ابا جی کو۔"

عدیل نے اسے سمجھانے کے لیے تمہید باندھی تھی اور مریم کا دل کانپ گیا تھا۔

"آپ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ سب کیوں کہہ رہے ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہیں آپ' ہوا کیا ہے؟" مریم کے چہرے کا

رنگ بدل گیا تھا اور تفکر کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"مریم پلیز۔۔۔ تم نے پریشان نہیں ہونا' اگر تم پریشان ہو گئیں تو سمجھو کہ ہمارا پورا گھر پریشان ہو جائے گا۔ ان حالات میں ہمارے گھر کو اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ ہے تمہاری ہمت' بہادری اور سمجھ داری اور مجھے یقین ہے کہ تم سب کچھ سنبھال کے رکھوگی اور سب کا خیال بھی رکھوگی' یہ گھر اور اس گھر کی عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ سنوار بھی سکتی ہو اور بگاڑ بھی سکتی ہو۔ یہ وقت شاید ہم دونوں بہن' بھائی کے لیے آزمائش کا وقت ہے۔ دعا کرو اللہ ہمیں اس آزمائش میں سرخرو کرے۔" عدیل نے کہتے ہوئے مریم کا ہاتھ تھام کے تھپکا تھا۔

"لیکن آپ یہ کیوں نہیں بتا رہے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں' کیا ہوا ہے؟" مریم جھنجلائی گئی تھی۔ اس کی جان مٹھی میں آئی ہوئی تھی اور عدیل تھا کہ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔

"وہ دراصل ورکشاپ میں آگ لگ گئی ہے۔ کافی نقصان ہوا ہے اور یقیناً" اس نقصان کا ذمہ دار مجھے ہی ٹھہرایا جائے گا۔ اس لیے اس نقصان کی وجہ سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں جا رہا ہوں' اگر کل دوپہر تک واپس نہ آیا تو سمجھ لینا کہ مجھے جیل ہو گئی ہے۔ لیکن خیر جو بھی ہوگا میرا کولیگ ہے ایک' شہریار نام ہے اس کا' وہ آکر آپ لوگوں کو ساری بات بتا دے گا۔"

عدیل کو بتانا ہی پڑا تھا اور مریم کے تو پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"کیا۔۔۔ آپ جیل جا رہے ہیں۔" مریم کو لگا جیسے کسی نے اس کے سر سے سائبان چھین کر اسے تپتے صحرا میں دھکیل دیا ہو' وہ چکرا گئی تھی۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا' ابھی جاؤں گا تو پتا چلے گا کہ میرے لیے کیا سزا ہے۔" عدیل نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔

"لیکن عدیل بھائی آپ۔۔۔" مریم نے کچھ کہنا چاہا تھا' لیکن عدیل نے اسے روک دیا تھا۔

"بس۔۔۔ زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ شہریار باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے۔ اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا' تم دعا کرنا اور سب کو تسلی دینا۔" عدیل نے کہہ کر اس کا سر تھپکا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ مریم تڑپ کے اس کے پیچھے لپکی تھی۔ لیکن عدیل تب تک عابدہ خاتون سے مل کر گھر کی دہلیز عبور کر گیا تھا۔

"استاد۔۔۔ ایک بار پھر سوچ لو۔ ایسے معاملے لمبے چوڑے ہو جاتے ہیں۔ جتنا بھی سلجھانے کی کوشش کرو الٹا اور الجھتے ہیں اور آپ کے پیچھے تو اور کوئی بھی نہیں ہے' جو آپ کے لیے بھاگ دوڑ کرے گا۔" چھوٹے نے ٹیکسی سے اترنے سے پہلے اسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"میرے لیے اللہ تو ہے نا' سب کچھ کرنا والا۔ میری کوئی غلطی' میرا کوئی قصور نہیں ہے' اس لیے میرا انصاف وہی کرے گا' جو سب سے بڑا عادل ہے۔" عدیل نے پورے یقین اور بھروسے سے کہا تھا اور ٹیکسی سے اتر آیا تھا۔

ورکشاپ کے باہر پولیس اور فائر بریگیڈ والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں' چند آس پاس کی دکانوں والے لوگ بھی جمع تھے اور لوگوں کے ہجوم میں امتیاز کاشمیری (باؤ امتیاز) کھڑے تھے۔ عدیل مضبوط قدموں سے چلتا ہوا قریب آگیا تھا۔

"باؤ عدیل آگیا۔" سب سے پہلے اس پہ چائے کے ڈھابے والے بھٹی صاحب کی نظر پڑی تھی اور پھر پورا ہجوم عدیل کی سمت متوجہ ہو گیا تھا۔ جبکہ باؤ امتیاز تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔

"یہی ہے میری بربادی کا ذمہ دار۔" باؤ امتیاز دھاڑ اٹھا تھا اور چھوٹے' جیدی اور سلو کا دل مٹھی میں آگیا تھا۔ پولیس کانسٹیبل لپک کے عدیل کو گھیر چکے تھے اور پھر وہی ہوا تھا جس سے بچنے کے لیے چھوٹے نے اسے بارہا سمجھایا تھا۔ عدیل عمر کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور سب دیکھتے رہ گئے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمایے)

✲ ✲

اقصیٰ اسلام

آخری پریڈ چل رہا تھا۔ کلاس کی لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔ کلاس میں کوئی میڈم یا ٹیچر نہ تھی۔ سب ہی باتوں میں مصروف تھیں مگر وہ ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ اس کی ایک دوست بھی تھی۔ دونوں کو ان دوسری لڑکیوں کا شور بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگران کا تو یہ روز کا کام تھا۔ ایک لڑکی ان کی طرف آئی اور بولی۔

"دعا! تم بھی آؤ۔ ہمارے ساتھ باتیں کرو۔" اس نے اپنی دوست کا نام لیتے ہوئے کہا۔

"سحر اس کو بتاؤ کہ مجھے باتیں کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔" اس سب کے دوران اس نے کتاب اپنے منہ سے نہ ہٹائی۔ اور وہ لڑکی وہاں سے چلی گئی۔ سحر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دعا تم شور ہنگامے سے اتنا کیوں دور رہتی ہو۔" سحر نے کتاب کے پیچھے منہ چھپاتے ہوئے اسے دیکھا۔

"یہ سب مجھے اچھا نہیں لگتا ہے اور پھر ہم یہاں علم حاصل کرنے آتے ہیں۔ باتیں کرنے میں وقت ضائع کرنے نہیں۔" اور پریڈ ختم ہونے کی بیل بجی تو دعا اور سحر نے اپنی کتابیں اپنے بیگ میں ڈالیں اور باہر گیٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ انہیں آتے دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا دعا اور سحر گاڑی میں بیٹھ گئیں تو دعا نے ڈرائیور سے کہا۔

"بھائی دلبر! پہلے سحر کو اس کے گھر چھوڑنا ہے۔" سحر نے دعا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار دعا تم روزانہ اس طرح مجھے گھر چھوڑنے مت آیا کرو مجھے اچھا نہیں لگتا۔" دعا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"اپنا منہ بند رکھو اور آج کے بعد ایسی کوئی بات نہ کرنا۔" کچھ دیر بعد اس کا گھر آگیا اور وہ وہاں اتر گئی۔ اور گاڑی ٹاؤن کی طرف مڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

گاڑی رکی تو اس نے دیکھا ایک شخص گیٹ پر چوکیدار سے کوئی بات کر رہا تھا اور وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ وہ ایک بزرگ آدمی تھا۔

مگر چوکیدار اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بزرگ کو دھکا دیا اور گیٹ کھول دیا۔

دعا نے اپنی کتابیں اور بیگ گاڑی میں ہی چھوڑا اور بھاگ کر اس بزرگ کو گرنے سے بچایا اسے کھڑا کیا۔ پھر اس سے پوچھا۔

"آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟" "نہیں بیٹا کوئی چوٹ نہیں لگی۔ مگر جو چوٹ خدا نے دی ہے اس کے آگے ایسی چوٹیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔" ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دعا نے چوکیدار کو سخت نظروں سے گھورا۔

"تمہیں نظر نہیں آتا یہ بزرگ تمہارے باپ کی عمر کے ہیں اور تم ان کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہو۔ جلدی کرو ان سے ابھی معافی مانگو۔" چوکیدار نے ان سے معافی مانگی اور دعا اس بزرگ کو اپنے ساتھ اندر لے گئی اندر دروازے پر ممانی جان کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں اس کے ساتھ اس بزرگ کو دیکھ کر وہ سمجھ گئیں۔ کہ آج پھر کچھ نیا ہوا ہے دعا نے ان کو سلام کیا جس کا انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور اندر آنے کو کہا۔ دعا کے کہنے سے پہلے ہی مامی جان نے (رشیدہ "گھر کا کام کرنے والی) کو اس بزرگ کے لیے کھانا لانے کو کہا۔

رشیدہ نے کھانا ٹیبل پر لگا لیا۔ بزرگ کھانا دیکھتے ہی کھانے کی طرف بڑھا اور کھانا شروع کر دیا۔ دعا چند لمحے وہاں کھڑی دیکھتی رہی اور دل میں سوچا کہ "اے اللہ۔ کسی کو اتنا دیا ہے کہ اس کو سنبھالنے کی فکر اور کسی کو کچھ بھی نہیں دیا اور اسے کھانے کی فکر ایسا کیوں میرے اللہ؟

اتنے میں اس نے اپنے کندھے پر ممانی جان کا ہاتھ محسوس کیا۔

"کیا سوچ رہی ہو تم دعا۔۔۔" اس نے اس بزرگ

کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ممانی جان کیا آپ ان کو میرے لیے کام پر رکھیں گی؟"

"یہ کیا کام کر سکتے ہیں تمہارے لیے۔" ممانی نے پھر اپنا سوال دوہراتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کام کر سکتے ہیں۔ ان کی عمر تو دیکھو تم۔" اتنے میں ماموں کی آواز آئی۔

"اگر ہماری بیٹی کہہ رہی ہے تو ان کو کام پر رکھ لو۔" دعا نے اور مامی نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا تو ماموں ہاتھ میں کچھ شاپنگ بیگز لیے ہوئے تھے۔ وہ بھاگ کر ماموں کی طرف گئی اور ان کے گلے لگ گئی۔ انہوں نے اس کے ماتھے کو چوما اور بولے۔

"آج سے یہ بزرگ ہمارے لان کے مالی ہیں۔ اور یہ لو میں تمہارے لیے کپڑے لایا ہوں۔" دعا نے ان کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی اس بزرگ کو یہ خوشخبری سنائی انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ماموں نے رشیدہ کو کہا کہ "اس بزرگ کو اپنے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں دوسرا کمرہ کھول دو اب یہ وہاں رہیں گے۔" رشیدہ اس بزرگ کو لے گئی۔

"ماموں جان آپ کا شکریہ۔" دعا نے ان کے پاس جا کر کہا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے کہا۔

"بیٹا میں آپ کو یہ نہیں کہتا کہ آپ دوسروں کے ساتھ ہمدردی نہ کرو۔"

"کیا ہوا ماموں جی۔۔۔؟" اس نے حیرانی سے سوال کیا۔ ماموں جی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔

"تمہیں یاد ہے نا کہ ایک بار پہلے بھی ایک بڑھیا کو تم نے اپنے کمرے کی صفائی کے لیے رکھا تھا اور وہ کمرے سے چوری کر کے بھاگ گئی تھی۔"

"جی ماموں جان!" اس نے ندامت سے کہا۔

"بس میں چاہتا ہوں تم محتاط رہا کرو۔"

"جی ماموں میں احتیاط کروں گی۔" دعا نے آہستگی سے کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی اسے سحر سے ضروری کام تھا اس نے فون ملایا۔

سحر کی ہیلو سنائی دی۔ اس کے گھر شاید کوئی جھگڑا ہو رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" میں نے سحر سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں یار ہر روز کی طرح آج پھر بھائی اور پاپا کے درمیان جھگڑا ہو رہا ہے۔" سحر نے اداس لہجے میں کہا۔

"آخر ہر روز کس بات پر جھگڑتے ہیں دونوں۔" اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یار دعا پاپا نے محنت مزدوری کر کے بھائی کو پڑھایا اور اب ان کو کوئی اچھی نوکری نہیں مل رہی۔ سب سفارش اور رشوت مانگتے ہیں۔ اب پاپا اس۔ مہنگائی کے دور میں کہاں سے لائیں رقم رشوت کے لیے۔"

اس بار سحر کی آواز میں ایک خاص پریشانی اور مایوسی تھی۔ اس نے سحر کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"یار تم پریشان نہ ہو میں اپنے ماموں سے بات کرتی ہوں وہ تمہارے بھائی کو ضرور کوئی کام دے دیں گے۔ میں ماموں سے بات کر کے بتاتی ہوں تمہیں۔"

"شکریہ۔" سحر نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

"دعا ماموں سے بات کرنے کے لیے ان کے کمرے میں گئی تو وہ ممانی سے اس کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔ وہ ممانی کو کہہ رہے تھے۔

"اللہ نے دعا کی صورت میں ہمیں جو بیٹی دی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہماری زندگی آج کیسی عجیب ہوتی۔ اس نے ہمارے چہروں پر ایک ہنسی بکھیر دی ہے۔ میں اس کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔۔۔ کچھ بھی۔" اتنے میں دعا ان کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

"پھر آپ میرا ایک اور کام کر دیں۔"

"کیا کام ہے بیٹا؟ آپ بولو ہم ضرور کریں گے۔" ماموں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ دراصل ہماری دوست سحر کو تو آپ جانتے ہے نا ماموں جی۔"

"ہاں ہم جانتے ہیں اسے۔" ماموں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اس کا بڑا بھائی پڑھا لکھا ہے مگر اسے کوئی جاب نہیں مل رہی اگر آپ اس سلسلے میں کوئی مدد کر دیں۔

کوئی کام کرنے کو دے سکتے ہیں تو ــــــ" دعا نے ماموں سے اس کی سفارش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب آپ کا کام ہو جائے گا لیکن آپ کو اس کے لیے رشوت دینی ہو گی۔" ماموں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کک کیا مطلب؟" ممانی نے ماموں جی سے پہلے سوال کیا۔

"اسے ہمارے لیے ایک ایک کپ چائے بنانی ہو گی اپنے ہاتھوں سے۔" ممانی مسکراتے ہوئے بولیں۔ اس کے ساتھ ہی دعا اور ماموں بھی مسکرا اٹھے۔

"اتنا بڑا کام تو نہیں کہا میں نے جو اتنی بڑی رشوت دوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہاں سے نکل گئی۔

اس نے چائے بنا کر ماموں ممانی کو دی اور باہر لان میں گئی اور مالی کو دیکھا۔ جو پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ دعا اس کے پاس چلی گئی۔ اس نے اسے دیکھتے ہی کام چھوڑا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ کا نام کیا ہے بیٹا؟"

"میرا نام دعا ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت ہی خوب صورت نام ہے۔"

"کیا میں آپ کو بابا کہہ سکتی ہوں؟" دعا کے یہ سوال کرتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دعا کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ شروع سے گداگر نہیں تھے۔

"میری بھی ایک فیملی تھی۔ جس میں میری بیوی اور بیٹی تھی۔ میری بیٹی بھی مجھے بابا کہتی تھی ایک دن اپنی فیملی کے ساتھ سیر کے لیے لاہور آیا تھا۔ اسی دوران ایک دہشت گردی کے واقعہ میں مجھے اپنی بیوی اور بیٹی کو کھونا پڑا۔ پھر ــــ واپس اپنے شہر آنے کے بعد مجھے اپنا مال اور گھر بار بھی چھوڑنا پڑا۔ شاید میری قسمت مجھ سے روٹھ گئی تھی۔" اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن کالج سے واپسی کے لیے اس نے ایک ٹیکسی روک لی کیوں کہ صبح ماموں نے بتا دیا تھا کہ گاڑی کی سروس کروانی ہے اس لیے واپسی پر تم ٹیکسی میں آجانا اس نے گھر جانے کے لیے ایک ٹیکسی والے کو روکا تو اسے دیکھ کر سحر نے اس سے کہا۔

"ہم اس ٹیکسی سے نہیں جائیں گے۔" اس نے حیران ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اس کی کیا وجہ ہے؟" وہ بولی۔

"بب' بب' بس ویسے ہی۔ ہم اس پر نہیں جائیں گے۔" اتنے میں وہ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی سے نکلا اور دونوں کے پاس آ کر بولا۔

"سحر آج تو میں حلال کی کمائی کر رہا ہوں۔ آجاؤ گاڑی میں بیٹھو۔" دعا ــ حیرانی سے ان دونوں کا منہ دیکھ رہی تھی تھوڑی دیر بحث کے بعد وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور دیکھنے میں اچھا اور پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ دعا نے سحر سے اس کے بارے میں پوچھا۔

"یہ کون ہے اور تم اسے کیسے جانتی ہو۔" سحر نے اپنی نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے وہی بڑے بھائی ہیں جن کے بارے میں کل تمہیں بتا رہی تھی۔ ان کا نام عمر فاروق ہے۔"

اتنے میں سحر کا گھر آ گیا وہ اتر گئی۔ دعا نے انہیں اپنے گھر کا ایڈریس بتایا۔ انہوں نے اسے وہاں چھوڑا اور جب اس نے اس کا کرایہ دینا چاہا تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ دعا نے ان کو یہ کہتے ہوئے کرایہ دوبارہ پیش کیا۔

"آپ نے آج ہی یہ کام شروع کیا ہے۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ آپ کو اس میں کوئی نقصان ہو۔" دعا نے اصرار کیا تو انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کرایہ اپنی جیب میں ڈالا گاڑی آگے بڑھا لی۔

دعا گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو دیکھا کہ بابا پودوں کو پانی ڈال رہے تھے۔

السلام علیکم۔" جواب سن انہوں نے اسے ہمیشہ خوش رہنے کی دعا دی اور پوچھا۔

"دعا بیٹا تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے اچھی جا رہی ہے اور اس کے علاوہ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"وہ تو جب تک میں زندہ ہوں تمہیں دیتا رہوں گا۔" بابا کی آنکھوں میں پھر آنسو آنے لگے۔ وہ انہیں دیکھ کر سستی سے آگے بڑھ گئی۔

"بیٹا آج آنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا نا۔" ممانی نے پوچھا۔

"نہیں ممانی ہم ٹیکسی پر آ گئے تھے۔" دعا نے ان کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لیتے ہوئے کہا۔ اتنے میں چوکیدار اندر داخل ہوا اور بولا۔

"میڈم جی وہ ٹیکسی ڈرائیور آیا ہے آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے اسے اندر آنے دو۔" پھر ممانی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پتا نہیں۔" اتنے میں عمر اندر داخل ہوا اور اس نے دعا کی طرف دیکھا مامی کو سلام کیا اور بولا۔

"آپ اپنا موبائل وہاں میری گاڑی میں بھول آئی ہیں۔ جیسے ہی آپ اندر آئیں تو سحر کا فون آ گیا لیکن میں نے کال ریسیو نہیں کی۔ یہ آپ کی امانت۔"

دعا نے اس سے فون لیتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر مامی کو بتایا کہ یہ سحر کا بھائی ہے۔ جس کے بارے میں کل اس نے ماموں جی سے بات کی تھی۔"

"ہاں یاد آیا! آؤ بیٹا بیٹھو۔"

"میں چلتا ہوں آج کام کا پہلا دن ہے۔" ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد اس کے موبائل پر ماموں کا فون آ گیا۔

"بیٹا سحر کے بھائی کو کل آفس آنے کو کہو اور وہ ساتھ اپنے سارے ڈاکومنٹ لے کر آئے۔"

سنتے ہی اس نے فون بند کر کے سحر کو فون کیا اور اس کو بتایا کہ "ماموں جی نے کل بھائی کو اپنے دفتر بلایا ہے ان شاء اللہ ان کو کوئی اچھی نوکری مل جائے گی۔"

سحر نے خوشی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

رات کے کھانے کے بعد جب وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی تو عمر فاروق کا چہرہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ نہ جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ پھر دماغ کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ دل کے آگے ہار گئی اور سحر کو فون کر دیا (سحر کو فون تو کر دیا تھا اب سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کہے گی) پھر کچھ ایسا ہی ہوا سحر نے فون ریسیو کرتے ہی پہلا سوال یہ ہی کیا۔

"خیریت تو ہے۔ اتنی رات کو فون کیا جناب نے؟" وہ پہلے ہی کسی کشمکش میں تھی گھبراہٹ میں بولی۔

"کی۔ کی کیوں۔ کیا تم سے بات کرنے کے لیے مجھے ٹائم کا پابند ہونے پڑے گا۔"

"نہیں نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔" سحر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پوچھنے لگی۔

"رات کے بارہ بج گئے اور تم ابھی سوئی کیوں نہیں۔"

"میں نے تمہیں یہ یاد دلانے کے لیے فون کیا ہے کہ کل تم اپنے بھائی کو ٹائم سے ماموں جی کے پاس بھیج دینا۔"

"بس اتنی سی بات تھی۔ اس لیے تم نے مجھے کال کی۔"

"اگر تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں تو ٹھیک ہے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور بے بسی سے فون کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن صبح ماموں کے دفتر جانے سے پہلے اس نے ماموں کو پھر یاد کروایا کہ آپ کے پاس عمر فاروق نام کا شخص آئے گا۔ جس کی جاب کا کرنا ہے۔

"جی بیٹا مجھے یاد ہے وہ آ جائے اگر اللہ کا حکم ہوا تو اسے کام ضرور مل جائے گا۔" اور وہ پیار دیتے ہوئے دفتر کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ دعا بھی ناشتا کرنے کے بعد کالج چلی گئی۔

کالج کے بعد جب وہ واپس گھر آئی تو ماموں جان اس سے پہلے گھر آ گئے تھے۔ اس نے ان کے کمرے میں عمر فاروق ڈاکٹر اور ممانی جان کو دیکھا تو پریشان ہو گئی۔

"کیا ہو گیا ماموں جی آپ کو۔" ڈاکٹر ماموں جی کے سر پر بینڈیج لگا رہا تھا۔ وہ بھاگ کر ماموں جی کے پاس گئی اور ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔

"یہ کیا ہو گیا ماموں جی۔"

"کچھ نہیں بیٹا چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ بس معمولی سی چوٹ آئی ہے جلدی آرام آ جائے گا۔" مامی جان اسے ایک طرف لے جاتے ہوئے بولیں اور انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکا ان کو گھر لے کر آیا ہے۔ اس نے عمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ عمر صاحب آپ نے میرے ماموں جی کی اتنی مدد کی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ اس کی جزا دے گا۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"نہیں شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو میں اس کی مدد بھی ضرور کرتا۔"

"کیا تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو۔" ماموں جی نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ماموں جی یہ وہی ہیں۔ سحر کے بھائی جن کے بارے میں میں نے آپ سے بات کی تھی۔"

"اچھا تو یہ ہیں وہ صاحب جن کے لیے ہماری بیٹی نے ہم سے سفارش کی تھی۔" ماموں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں بھی چلتا ہوں۔" عمر نے جانے کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا تم اس دن بھی ایسے چلے گئے تھے آج چائے پی کر جانا۔" مامی نے اسے جانے سے روکا۔

مامی جان چائے بنانے چلی گئیں۔

"بیٹا آپ کے ڈاکومنٹس کہاں ہیں؟" ماموں جان نے عمر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جی وہ باہر گاڑی میں ہیں۔" عمر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"جاؤ لے کر آؤ۔ بلکہ رہنے دو۔" ماموں نے راجہ کو بلایا اور اسے عمر کی گاڑی سے ڈاکومنٹس لانے کو کہا عمر نے اسے گاڑی کی چابی دی۔

"یہ گاڑی کس کی ہے اور کتنی تنخواہ دیتا ہے وہ۔" ماموں جی نے عمر سے اس کی آمدنی کے بارے میں پوچھا۔

"یہ گاڑی تو ٹھیکیدار علی محمد کی ہے اور وہ مجھے تین سو روزانہ اور ہر سواری پر کچھ کمیشن بھی دیتا ہے اس طرح تقریباً" چودہ ہزار ہو جاتا ہے۔ ایک ماہ کا۔"

اتنے میں راجہ اس کے ڈاکومنٹس لے کر آ گیا۔ ماموں جی نے — ڈاکومنٹس دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس ایک انچارج کی پوسٹ خالی ہے۔ اگر تم وہاں کام کرنا پسند کرو تو تم اپنے ڈاکومنٹس جمع کروا دو اور کل کام پر آ جانا۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ نوکری میری مدد کرنے کی سفارش پر دے رہا ہوں۔ بلکہ تم اس کے قابل ہو۔"

اتنے میں مامی بھی چائے اور بسکٹ لے کر آ گئی تھیں۔ ماموں جی نے عمر کو بتایا کہ یہ نوکری ابھی عارضی ہے کچھ عرصہ تک تمہاری نوکری پکی ہو جائے گی۔ چائے پینے کے بعد عمر وہاں سے چلا گیا۔ دعا ان کے پاس بیٹھ کر شکایت کرنے لگی۔

"ماموں جان آپ اپنا بالکل خیال نہیں رکھتے۔"

"نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یہ سب اچانک ہوا کہ مجھے پتا نہیں چلا۔" ماموں نے مسکراتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو ان پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں۔ تم کیوں ان کے سامنے اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔" مامی نے غصے میں کہا۔

"باپ رے باپ اتنا غصہ۔" ماموں جی مسکراتے ہوئے بولے۔

"ٹھیک ہے ماموں جی اب آپ آرام کریں میں بعد میں آپ کے پاس آتی ہوں۔" دعا دونوں کو چھوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد سحر کی کال آئی۔ اس نے سب سے پہلے شکریہ ادا کیا اور پھر ماموں جی کا حال پوچھا۔

عمر اکثر ان کے گھر آتا رہتا۔ دعا نے سحر کے سیل سے اس کا نمبر لے لیا تھا اور پھر ایک رات اس کا نمبر

ڈائل کیا اور صرف اس کی آواز سن کر فون بند کر دیا۔
شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے عمر فاروق سے محبت ہو گئی ہے۔ اس سے اگلے دن کالج سے واپس آئی تو موبائل پر ایک فون آیا اس پر سحر کا نام روشن ہوا۔ وہ چونک گئی کیونکہ یہ نمبر تو عمر کا تھا۔ اس نے سحر کے موبائل سے نکالا تھا۔
اس نے کال ریسیو کی اور ہیلو کہا دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔
کافی دیر تک دونوں ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز سنتے رہے۔ پھر اس نے ہی ہمت کر کے کہا۔
"کیا حال ہے آپ کا عمر.....؟"
"مم مم..... میں ٹھیک ہوں..... آپ سنائیں۔"
"میں بھی ٹھیک ہوں۔" اس طرح دونوں کی فون پر بات ہونا شروع ہو گئی۔
وہ ماموں کے کام سے گھر آتا وہیں دونوں کی ملاقات بھی ہو جاتی۔ ایک دن اس نے دعا سے اس کی فیملی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ سیلاب میں اس نے اپنے والدین کو کھو دیا اور اس کے بعد آج تک اپنے ماموں اور مامی کے پاس ہے اس طرح دونوں فون پر بات کرتے رہتے اور اکثر اوقات گھر پر بھی مل لیتے جب وہ ماموں کے کام سے آتا۔
ماہ رمضان آگیا تھا۔ لیکن ابھی تک ان کی محبت کے بارے میں کسی کو نہ پتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہوتی کہ اس رمضان میں اس نے عمر کو پایا تھا۔ اسی طرح دن گزرتے رہے اور عید قریب آگئی۔ اس نے عمر کو عید کا تحفہ دینے کے لیے ایک والٹ خریدا جب اس نے اس کو یہ تحفہ دیا تو اس سے اگلے دن سحر نے اسے ایک گفٹ بکس دیا اور بولی۔
"یہ تمہارے لیے کسی نے بھیجا ہے۔" وہ سمجھ گئی تھی کہ عمر نے بھیجا ہو گا لیکن پھر یہ سوچ کر چونک گئی اگر سحر کو اس کے اور عمر کے رشتے کے بارے میں پتا تھا۔ تو اس نے پہلے کبھی ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس نے اس کے سامنے گفٹ بکس کھولا اس میں ایک خوب صورت رنگ تھی۔ سحر رنگ کی تعریف کرتے ہوئے بولی۔
"واہ خوب صورت ہاتھ کے لیے خوب صورت رنگ۔"
وقت گزرنے کے ساتھ عید بھی آگئی ایک دن وہ عمر سے فون پر بات کر رہی تھی کہ مامی جان نے سن لیا۔
انہوں نے اس سے پوچھا تو اس نے اپنے اور عمر کے بارے میں سب کچھ سچ بتا دیا۔ مامی پہلے تھوڑا سا غصہ تو ہوئیں لیکن پھر اچانک وہاں سے چلی گئیں اور کچھ دیر بعد ماموں اور مامی دونوں اس کے کمرے میں آ گئے دعا ان دونوں کی اس طرح اچانک آمد سے حیران ہو گئی۔ ماموں جان آگے بڑھتے ہوئے اس کے پاس آئے اور بولے۔
"جو تم نے فیصلہ لیا ہے کیا تم اس کے بارے میں سنجیدہ ہو۔" اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔
"جی جی ماموں جان بس آپ کی رضامندی باقی ہے۔" ماموں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے اگر تم نے سوچ لیا ہے تو ہم اس فیصلے میں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم جلدی ہی جا کر عمر کے گھر والوں سے بات کریں گے۔" کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔
اس نے اسی وقت عمر کو فون کر کے بتایا۔ یہ سن کر عمر بھی خوش ہو گیا۔
وقت گزرتا گیا اور اسی طرح دو ماہ گزر گئے۔ لیکن ماموں نے عمر کے گھر والوں سے بات نہ کی ایک دن اچانک عمر کا فون آیا کہ "اس کی ماں کی طبیعت بہت خراب ہے ڈاکٹروں نے ان کو جواب دے دیا ہے۔ بس تم دعا کرو اور اس نے بتایا کہ ہم نے فون کر کے سب رشتے داروں کو بلا لیا ہے۔" اور فون بند کر دیا۔
اسی دوران سحر کی والدہ کا انتقال ہو گیا دعا پرسے کے لیے گئی تھی اس کے بعد اس کا اور عمر کا کوئی رابطہ نہ ہوا تقریباً" چالیس دن بعد عمر کی کال آگئی۔
"کیسی ہو؟" دعا نے اسے بتایا۔
"تمہارے بغیر کیسی ہو سکتی ہوں؟" دعا نے کہا۔
"مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے پہلے تم بتاؤ۔" پہلے وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر گویا ہوا۔

"جو میں اب بتانے جا رہا ہوں غور سے سننا۔ تمہیں یاد ہوگا والدہ کی موت سے پہلے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ سب رشتہ دار آگئے تھے۔

مرنے سے ایک دن پہلے ماں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنی خالہ کی بیٹی نائلہ سے شادی کرلوں اور اتنے رشتے داروں اور ماں کی آخری خواہش کے آگے ہار گیا اور نائلہ سے شادی کرلی۔"

یہ سنتے ہی اسے جھٹکا سا لگا۔ جیسے سانس ہی بند ہو گئی اور ـــــ ہاتھ سے بے اختیار میرا موبائل نیچے گر گیا۔ موبائل کی آواز سن کر ممانی بھی کمرے میں آگئیں۔ دعا نے ان کو سارا واقعہ سنایا تو وہ بھی اس کی طرح بے سدھ ہوگئیں۔

تھوڑی دیر بعد ماموں جان آہی گئے۔

"آج میں بہت خوش ہوں! کیونکہ ہمارے ہونے والے داماد کی پرموشن ہوگئی۔" ماموں کا اتنا کہنا تھا کہ ممانی ناراضی سے بولیں۔

"اب وہ ہمارا داماد نہیں رہا۔"

"کیا ہوگیا؟" ماموں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ تو ممانی نے ان کو وہ سارا واقعہ سنادیا ماموں نے کچھ نہ کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے اس کے بعد مامی بھی ان کے پیچھے چلی گئیں اور دعا بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات کے کھانے پر ماموں نے کہا۔

"میں کل دفتر میں عمر سے بات کروں گا۔"

لیکن دعا نے یہ کہتے ہوئے ماموں کو منع کردیا کہ "اس کی کوئی مجبوری ہوگی ورنہ وہ تو اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ آپ کو میری قسم آپ اسے کچھ نہیں کہیں گے۔" ماموں غصے میں آکر کھانا چھوڑ کر چلے گئے اور ممانی بھی پیچھے چلی گئیں۔

دن گزرتے رہے اور وہ سب کو دکھانے کے لیے اسے بھول گئی۔

کالج میں اس کی اور سحر کی دوستی اسی طرح تھی۔ دعا تقریباً" ہر روز سحر عمر اور نائلہ کا حال دریافت کرتی رہتی اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ ایک دن سحر کا فون آیا۔

"نائلہ بھابھی کے گھر بیٹی پیدا ہوئی ہے۔"

"عمر اور نائلہ کو میری طرف سے مبارک دینا اور عمر سے کہنا اس بیٹی کا نام آپ میرے کہنے پر سدرہ رکھو گے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

اتنا کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

پھر رات کو عمر کی کال آئی وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگئی۔ کال ریسیو کی تو ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو میں نائلہ ہوں میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں عمر نے مجھے آپ کے بارے میں پہلے دن ہی بتادیا تھا اور آج جب سحر نے بتایا کہ آپ ہماری بیٹی کا نام سدرہ رکھنا چاہتی ہیں تو اس کا نام سدرہ ہی رکھا گیا ہے اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو کیا کل آپ سدرہ کو دیکھنے گھر آسکتی ہیں۔"

اس کے ذہن سے عمر کے بارے میں جو ایک غلط تصویر بن گئی تھی وہ ختم ہوگئی کہ وہ اسے بھول گیا ہے۔ یہ جان کر خوش تھی کہ اس نے نائلہ کو اس کے بارے میں سب کچھ بتایا ہے۔

اگلے دن دعا سحر کے ساتھ کالج سے ان کے گھر چلی گئی۔ وہاں ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ میری بھابھی نائلہ ہیں۔" سحر نے تعارف کروایا "یہ دعا ہے۔"

نائلہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ لیکن دعا وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہری اور گھر واپس آگئی۔

کچھ دن سے سحر کالج نہیں آرہی تھی۔ دعا نے فون کیا تو سحر نے غمگین لہجے میں بتایا بھائی کو برین کینسر ہے وہ ہفتے بھر سے ہسپتال میں ہیں ڈاکٹر نے بتایا ہے ان کے پاس صرف دو ماہ ہیں اور روتے ہوئے فون بند کر دیا۔

دعا نے یہ سب کچھ جا کر اپنی ممانی کو بتایا تو مامی بھی غمگین ہوگئیں اور اس کے لیے دعا کرنے لگیں۔

تقریباً" پندرہ دن گزر گئے اور نائلہ کی طبیعت میں دن بہ دن بگاڑ پیدا ہوتا گیا ایک دن اطلاع ملی کہ نائلہ کا انتقال ہوگیا ہے دعا افسوس کے لیے ممانی کے ساتھ ہی گئی تھی۔ سحر ایک طرف نائلہ کے غم میں دکھی تھی تو دوسری طرف وہ اپنی بھتیجی کو بھی سنبھال رہی تھی۔ دن گزر رہے تھے رمضان کا مہینہ شروع ہوگیا تھا کہ ایک دن ماموں دعا کے پاس آئے اور بولے۔

"بیٹا میں آج آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔"

"جی ماموں جی بولیے آپ کیا بات ہے؟" اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹا اب میں جو کہنے جا رہا ہوں غور سے سننا۔" ماموں نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور سانس لیتے ہوئے گویا ہوئے۔

"اگر میں تم سے کہوں کہ ہم نے تمہارا رشتہ کسی کے ساتھ طے کردیا ہے۔ تو تم اس لڑکے سے شادی کر لوگی کیا؟" ماموں کے اس سوال نے اس کے سوچنے کی صلاحیت کو منجمد کردیا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ پھر ماموں نے دوبارہ پوچھا۔

"تمہارا فیصلہ کیا ہوگا بیٹا؟"

"آپ میرے بڑے ہیں آپ جو فیصلہ کریں گے میرے لیے وہ اچھا ہوگا۔" ماموں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی بیٹا اور کیا اب یہ نہیں پوچھو گی کہ ہم نے تمہارا رشتہ کس سے طے کیا ہے۔"

"وہ جو بھی ہو آپ نے پسند کیا ہے مجھے بھی پسند ہے۔" اس نے رضامند ہوتے ہوئے کہا پھر ماموں کچھ کہے بغیر وہاں سے چلے گئے اس نے سحر کو فون کر کے بتایا کہ ماموں نے اس کا رشتہ طے کردیا ہے سحر یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ سحر نے لڑکے کے بارے میں پوچھا جس سے اس کا رشتہ طے ہوا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔

"تم یہ کیا کر رہی ہو اس کے بارے میں پوچھو کون ہے کیا کرتا ہے کیسا ہے وہ۔"

"وہ میرے ماموں نے پسند کیا ہے جیسا بھی ہوگا اچھا ہوگا۔" دعا نے کہا۔

"ٹھیک ہے بھئی تمہاری مرضی۔" اور اس نے فون بند کردیا۔

اس دن ساتواں روزہ تھا اور جمعہ کا دن تھا ماموں اور ممانی دونوں اس کے کمرے میں آئے دونوں کے ہاتھ میں ڈھیر سارا سامان تھا۔ انہوں نے سامان ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا اس عید کے دوسرے دن تمہاری شادی ہوگی ہم بہت خوش ہیں۔ چلو تمہیں لڑکے کے بارے میں بتاتے ہیں۔" اچانک ماموں کا فون بجا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے اور جاتے وقت ممانی کو کہہ گئے تم اسے بتاؤ میں ابھی آتا ہوں۔ مامی نے بتایا۔

"وہ لڑکا تمہارے ماموں کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کا نام ـــــ اس کا نام عمر ہے۔" اس نے چونک کر ممانی کی طرف دیکھا۔ مامی کے چہرے پر ایک خوشی کی لہر تھی۔

"ہاں بیٹا وہی عمر ہے۔" مامی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ممانی نے بتایا کہ اس دن عمر کے والد کی کال آئی تھی انہوں نے مجھے اور تمہارے ماموں کو بلوایا تھا۔

"ان کا کہنا تھا عمر تمہیں پسند کرتا تھا۔ مگر ماں کی نافرمانی نہیں کی اور ان کا کہا مان لیا۔ نائلہ کی زندگی اتنی ہی تھی۔ سدرہ بن ماں کی بچی ہے۔ جتنی محبت اسے دعا دے سکتی ہے کوئی اور نہیں دے سکتا اگر دعا مان جائے تو ہم اسے اپنی بہو بنالیں گے تمہارے ماموں کو پتا ہے کہ تم عمر سے کتنی محبت کرتی ہو اور عمر بھی اب تک تمہیں چاہتا ہے اب تم بتاؤ تمہارے ماموں کا فیصلہ درست ہے یا ـــــ" کہہ کر ممانی خاموش ہوگئیں دعا نے ان کی طرف دیکھا اور فرماں برداری سے گردن جھکا دی۔ وہ جانتی تھی ماموں کبھی بھی اس کا برا نہیں سوچ سکتے اور پھر خود اس کے دل میں بھی تو اب تک عمر بستا تھا۔

یہ عید اس کے لیے ڈھیروں خوشیاں لا رہی تھی۔ دعا نے سکون سے اقرار میں گردن ہلادی۔

☆ ☆

مہوش افتخار

آسمان پہ چھائی کالی گھٹاؤں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لان میں لہراتے درختوں اور پودوں کو دیکھتے ہوئے میرے لبوں پہ از خود نرم سی مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔

کتنا پیارا موسم ہو رہا تھا' بالکل پکنک والا! مگر یہاں تو سب کو دروازے بند کیے سونے کی پڑی تھی اور چونکہ مجھے دوپہر میں نیند نہیں آتی تھی' اس لیے اتنے خوب صورت موسم کے ہاتھ سے نکل جانے پہ میں سخت بدمزا ہو رہی تھی۔

"ایک دفعہ عائشہ اور رافعہ کو چیک کرتی ہوں' کیا پتا

مکمل ناول

جاگ رہی ہوں۔" دل ہی دل میں سوچتی میں کمرے سے نکل کر تایا ابو کے پورشن کی جانب بڑھی تھی۔ جو وسیع و عریض لان کے دوسری جانب تھا۔

مگر لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اردگرد چھائی خاموشی سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں سبھی حسب معمول قیلولہ فرما رہے تھے۔

عائشہ اور رافعہ کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے میں وہیں سے ہی پلٹ کے باہر نکل آئی۔ آسمان پہ چھائے بادلوں سے اب ننھی منی بوندوں نے برسنا شروع کر دیا تھا اور میرا دل بے اختیار مچل اٹھا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار' ٹھنڈی نم ہوا اور پرندوں کی چہچہاہٹ نے سماں سا باندھ دیا تھا۔

میرے لیے مزید خود پہ قابو پانا مشکل ہو گیا تو میں اس سوئے ہوئے محل پہ دو حرف بھیج کے تیز قدموں سے گیٹ کی طرف چلی آئی۔ چلو پکنک نہ سہی کم از کم کالونی کی خوب صورت سڑکوں پہ واک تو انجوائے کر ہی سکتی تھی۔

ہماری کالونی چونکہ شہر کی ایک پوش کالونی تھی اس لیے یہاں سیکیورٹی کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ گارڈز کا ایک پورا عملہ تھا جو ہمہ وقت چوکس رہتا تھا۔

دوپٹہ درست کرتے ہوئے میں نے ایک نظر اپنے حلیے پہ ڈالی اور پھر مطمئن سی چوکیدار کو اپنے جانے کا بتا کے مین گیٹ کھول کے باہر نکل آئی تھی۔

"واہ! کیا موسم ہے۔" خراماں خراماں قدم اٹھاتے ہوئے میں نے سراہتی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا تھا۔ اکا دکا اسکیٹنگ کرتے بچوں کے علاوہ دور تک شفاف سڑک پہ کوئی نہ تھا۔

"کتنے بدذوق لوگ ہیں۔" میں نے بچوں کو مہارت سے اسکیٹرز پہ خود کو بیلنس کرتا دیکھ کے ایک نظر بھاں بھاں کرتے بنگلوں پر ڈالتے ہوئے سوچا۔

بچے اب ایک دوسرے کے آگے پیچھے اسکیٹ کرتے کافی دور نکل کے سڑک کا موڑ مڑ چکے تھے۔

دھیمے سروں میں گنگناتے ہوئے میں اپنی دھن میں چلی جا رہی تھی' جب اچانک میرے پیچھے دور سے بائیک کی آواز بلند ہوئی تھی۔ بے اختیار رکتے ہوئے میں نے پلٹ کے دیکھا تھا' جہاں سڑک کے دوسرے سرے سے بلیک کلر کی ہیوی بائیک اڑتی ہوئی آ رہی تھی۔

واپس رخ موڑتے ہوئے' میں ہوا سے اڑتے اپنے دوپٹے کو سنبھالتی ابھی چند قدم ہی آگے بڑھ پائی تھی' جب اس بائیک نے فراٹے سے مجھے کراس کیا۔ ناچاہتے ہوئے بھی میری نظریں سوار کی پشت سے ٹکرائی تھیں' جو بنا ہیلمٹ کے بلیک پینٹ اور گرے ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔

نجانے کیوں مجھے یہ بندہ اور یہ بائیک دونوں ہی جانی پہچانی سی محسوس ہوئی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ میری الجھن دور ہو پاتی' میرے دیکھتے ہی دیکھتے بائیک ہلکا سا ڈگمگائی تھی اور اگلے ہی لمحے سوار معہ اپنی سواری کے گیلی سڑک پہ دور تک گھسٹتا چلا گیا تھا۔ ہلکی سی چیخ کے ساتھ میرا ہاتھ میرے لبوں پہ آن ٹھہرا تھا۔ جبکہ پھٹی پھٹی سی آنکھیں' سڑک کے بیچوں بیچ پڑے اس کے بے حس و حرکت وجود پہ جم سی گئی تھیں۔ اس کی بائیک تھوڑی آگے کو دائیں جانب لگے بڑے سے پیڑ کے ساتھ پڑی تھی۔

"او گاڈ!" ہوش میں آتے ہوئے میں بے اختیاری کے عالم میں اس کی جانب دوڑی تھی۔ نزدیک پہنچنے پہ میری نظریں اس کے چہرے سے ٹکرائی تھیں اور میں ایک لمحے کو حیران رہ گئی۔

وہ ہماری کلاس میں آنے والا نیا لڑکا ”اویس خضر“ تھا‘ جس نے دو ہفتہ پہلے ہی یونیورسٹی جوائن کی تھی اور آتے ہی خاصا مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی مشہوری کی ایک نہیں دو تین وجوہات تھیں۔ پہلی اس کی بے پناہ وجاہت‘ دوسرا اس کا مغرور اور اکھڑ انداز اور تیسرا امریکہ سے اپنی پڑھائی چھوڑ کے یہاں پاکستان کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا‘ کیوں؟ فی الحال کوئی نہیں جانتا تھا۔

کلاس میں اس کی چند ہی اسٹوڈنٹس سے ہیلو ہائے تھی۔ لیکن ان سے بھی وہ زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی ذات اور اس کی مسٹری آج کل کلاس کا ”ہاٹ ٹاپک“ بنی ہوئی تھی۔

اور اب اسی مسٹری مین کو اپنے قدموں کے قریب بے ہوش پڑا دیکھ کے میرے اپنے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے مدد کی تلاش میں اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے میں بے اختیار اس کے قریب زمین پہ دو زانو جھک گئی تھی۔

”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں؟“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے اس کے بازو کو دھیرے سے ہلاتے ہوئے اک پریشان سی نگاہ اس کی پیشانی پہ ڈالی جہاں سے خون کی باریک سی لکیر بہہ کر اس کی کنپٹی میں جذب ہو رہی تھی۔

”او گاڈ! اس کا تو خون بھی نکل رہا ہے۔“ خون سے ہوتے ہوئے میری نظریں بے اختیار اس کے ساحر نقوش میں الجھی تھیں۔

سیدھی کھڑی ناک کے نیچے بھرے بھرے سے خوب صورت لب..... بند آنکھیں..... پھیلی لمبی گھنیری پلکیں اور پیشانی پہ بکھرے ہیلکش براؤن بال ۔وہ واقعی مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔

”اس کی پلکیں کتنی خوب صورت ہیں۔“ میری نظریں ایک بار پھر اس کی مڑی ہوئی پلکوں میں الجھیں تو دماغ نے اس نازک سچویشن اور میری بے وقت کی راگنی کا ڈپٹ کے مجھے احساس دلایا۔

”لاحول ولا قوۃ..... میں بھی کس وقت پہ کون سی باتوں میں الجھ گئی۔“ خود کو لتاڑتے ہوئے میں نے ایک نظر اس کے بے سدھ وجود پہ ڈالی۔

”ہوش کریں مسٹر!“ جھجکتے ہوئے میں نے دائیں ہاتھ سے اس کا گال تھپتھپایا‘ مگر بے سود!

”اسے ہوش میں کیسے لاؤں؟“ لب کچلتے ہوئے میں نے ابتدائی طبی امداد کا وہ سبق یاد کرنا چاہا جو ہم نے کسی زمانے میں اسکول میں پڑھا تھا۔

”کیا تھا؟ کیا تھا؟ ہاں.....“ ذہن پہ زور دیتے ہوئے میں نے یک لخت چٹکی بجائی۔

”مریض کے سینے پہ دونوں ہاتھوں سے دباؤ ڈالیں۔“ اونچی آواز میں دہراتے ہوئے میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پہ رکھے تھے مگر تبھی ایک اور نقطہ میری یادداشت میں تازہ ہوا تھا۔

”مگر یہ تو ہارٹ اٹیک کے لیے دی جانے والی فرسٹ ایڈ ہے۔“ گڑبڑا کے میں نے فوراً ہی اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے تھے۔

”یاد کرو‘ یاد کرو ثمو!“ بولتے ہوئے میں نے ذہن پہ دباؤ ڈالا۔

”ہاں! مریض کو مصنوعی سانس دیں۔“ اپنی کامیابی پہ میری آنکھیں بے اختیار چمک اٹھیں۔ لیکن جونہی مصنوعی سانس دینے کا طریقہ یاد آیا۔ میرے حواس جھنجھنا اٹھے۔

”استغفار استغفار یہ بے ہوش ہی ٹھیک ہے۔“ نظریں چراتے ہوئے میں شرمندہ ہونے میں اتنی مصروف تھی کہ مجھے اس کے ہوش میں آنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

”آہ!“ کراہنے کی آواز میرے قریب سے بلند ہوئی تو میں نے چونکتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

”ارے آپ ہوش میں آ گئے تھینکس گاڈ!“ اسے آہستگی سے آنکھیں کھولتا دیکھ کے میں نے بے اختیار سکھ کا سانس لیا۔

میری آواز پہ اس کی بوجھل آنکھیں دھیرے سے میری طرف اٹھی تھیں اور بے تاثر انداز میں مجھ پہ جم سی گئی تھیں۔ وہ شاید نہیں یقیناً ”یہ سمجھنے کی کوشش

کر رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور میں کون ہوں؟ لیکن اس کی کیفیت سمجھنے کے باوجود ان سبز آنکھوں کا خود کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھنا مجھے ایک لمحے کے لیے کنفیوز کر گیا تھا۔

”آ..... آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا تو اس کے چہرے کا بے تاثر انداز غائب ہونے لگا۔ نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے اس نے ہلنے کی کوشش کی تو بے اختیار کراہ کر رہ گیا۔

”او گاڈ! کہیں آپ کی کوئی ہڈی فریکچر تو نہیں ہو گئی؟“ اس کے چہرے سے چھلکتی تکلیف کو دیکھتے ہوئے میں نے تشویش سے کہا۔

”آپ پلیز ہلیں مت۔“

”آ..... آپ ڈاکٹر ہیں؟“ اپنا درد ضبط کرتے اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے شرمندگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ میرے جواب پہ اک گہری سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔

اگلے ہی لمحے اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

”دیکھیں آپ ہلیں مت۔ ایسا نہ ہو کہ.....“

”محترمہ میں ہلوں گا تو ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا نا۔“ جھنجھلا کر اس نے ایک تیز نظر مجھ پہ ڈالی تو میں خفیف سی خاموش ہو گئی۔ وہ بھی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہاں لیٹے لیٹے تو علاج ہونے سے رہا۔

اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے وہ اب اٹھ بیٹھا تھا۔ اسے بیٹھتا دیکھ کے میں آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میرے اٹھنے پہ اس کی نظریں میری طرف اٹھی تھیں۔

”آئی ایم سوری‘ مجھے آپ سے اسی طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ قدرے دھیمے لہجے میں بولا تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں پہ اپنی چھب دکھلا کے غائب ہو گئی۔

”اٹس او کے..... آپ اٹھ سکیں گے یا میں آپ کی ہیلپ کروں؟“ میرے اندر کی مدر ٹریسا ایک بار پھر جاگی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ میرے استفسار پہ پہلی بار اس کی آنکھوں نے دلچسپی سے میرا جائزہ لیا تھا۔ اگلے ہی پل اس کے لبوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی مسکرا دی تھیں۔

”نہیں میں اٹھ جاؤں گا۔“ نرمی سے کہتے ہوئے اس نے اپنی دونوں ٹانگیں سمیٹی تھیں اور پھر آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دوران میں اسے پریشانی سے دیکھتی رہی تھی۔

”شکر ہے کوئی گہری چوٹ نہیں آئی۔“ اسے اپنے پیروں پہ کھڑا دیکھ کے میں اپنے دھیان میں بولی تو اس کی سبز آنکھیں ایک بار پھر میری جانب اٹھ گئیں۔

”آئی تھنک مجھے اب چلنا چاہیے۔“ اس کی آنکھوں سے چھلکتے محظوظ کن تاثر کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنی شفقت کو لگام ڈالی۔ حالانکہ مجھے ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ہیوی بائیک کو اکیلا کیسے اٹھائے گا؟ اور پھر ڈاکٹر تک کیسے جائے گا؟

”تھینک یو!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں اپنی تشویش کو دبائے۔ ”اٹس آل رائٹ۔“ کہتی پلٹ کے گھر کی جانب چل دی۔ لیکن تھوڑی دور جا کے میں اپنی رقیق طبیعت کے ہاتھوں خود کو پلٹ کر دیکھنے سے روک نہ سکی تھی۔

قدرے لنگڑا کر چلتے ہوئے وہ اپنی بائیک کے پاس پہنچ کر نیچے کو جھکا تھا اور پھر اچھی خاصی طاقت لگاتے ہوئے وہ اس دیوہیکل بائیک کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”اف!“ ادھر بے اختیار میرے لبوں سے سکھ کا سانس بلند ہوا تھا اور ادھر اس کی نگاہیں میری طرف اٹھی تھیں۔ اس بار ان میں مسکراہٹ ہی نہیں بلکہ شوخی بھی تھی یوں جیسے میرے رک کر دیکھنے کا اسے اندازہ نہیں بلکہ یقین تھا۔

”توبہ! کتنی بولتی آنکھیں ہیں اس کی۔“ گڑبڑا کر رخ موڑتے ہوئے میں نے قدموں کی رفتار بڑھا دی

تھی۔ لیکن کسی کی نظروں کا ارتکاز اپنی پشت پہ مجھے بآسانی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اب پیچھے دیکھنے کی غلطی میں دوہرانا نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ساری رات' وہ امریکہ پلٹ مشرقی مین 'اپنی سبز آنکھوں' لمبی پلکوں اور لنگڑی ٹانگ سمیت میرے ذہن میں گھومتا رہا۔ جس کے نتیجے میں صبح میں یونیورسٹی کے لیے اٹھی تو میرا سر بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔

لیکن چونکہ آج یونیورسٹی جانا ضروری تھا۔ اس لیے میں ناشتے کے بعد ٹیبلٹ کھا کے خود کو زبردستی گھسیٹتی یونیورسٹی چلی آئی تھی۔

"کیا بات ہے' اتنی تھکی تھکی کیوں لگ رہی ہو؟" فرسٹ پیریڈ کے اختتام پہ میری اکلوتی سہیلی مریم نے میرا چہرہ تکتے ہوئے پوچھا تو بے اختیار میری نظریں اس سمت اٹھ گئیں جہاں وہ "عموماً" بیٹھا کرتا تھا۔ مگر آج اس کی جگہ پہ کسی اور کو بیٹھا دیکھ کے میرا دھیان ایک بار پھر اس کی جانب چلا گیا تھا۔ پتا نہیں اس کی چوٹیں اب کیسی تھیں۔

"بس یار صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس کے خیال کو جھٹکتے ہوئے میں نے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔

"پتا نہیں مجھے کل کے واقعے کا مریم سے ذکر کرنا چاہیے بھی یا نہیں۔" دل ہی دل میں سوچتے ہوئے میں زندگی میں پہلی بار کوئی بات مریم سے شیئر کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اویس خضر پہ پہلی ہی نظر میں بری طرح فریفتہ ہو گئی تھی اور میں جو مریم کی خاموش طبیعت سے بخوبی واقف تھی' اسے اکثر و بیشتر زور و شور سے اویس کی تعریف میں رطب اللسان دیکھ کے اسے چھیڑے بنا نہیں رہ سکی تھی اور جواباً "اس کی مسکراہٹ اور چہرے پہ پھیلتے رنگوں نے مجھ پہ اس کا حال دل بیان کرنے میں لمحہ نہیں لگایا تھا۔

"پتا نہیں یہ آج اویس کیوں نہیں آیا؟ رات میں نے اس کے لیے اچھا خواب نہیں دیکھا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولی تو میری آنکھوں میں حیرت در آئی۔

"کیا؟" اس کی بات نے حقیقتاً "مجھے حیران کر دیا تھا اور وہ سمجھی تھی کہ میں اسے تنگ کر رہی ہوں۔

"دیکھو پلیز اب تم شروع مت ہو جانا۔" بے بس سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے وہ التجائیہ انداز میں بولی تو چند لمحے بلیک اسکارف کے ہالے میں مقید اس کے چہرے کو گہری نظروں سے تکنے کے بعد میں سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"کیا تم اس کے بارے میں سیریس ہو مریم؟" میرے سوال پہ اس کے لبوں پہ اک زخم خوردہ مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"اصولاً" ہونا تو نہیں چاہیے' لیکن کیا کروں دل تو دل ہے نا۔" اس کی آنکھوں میں یک لخت نمی تیرنے لگی تو اس کا جواب مجھے اپنے سوال کے غلط ہونے کا احساس دلا گیا۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا بے وقوف لڑکی۔" اپنی عقل کو کوستے ہوئے میں نے بے ساختہ اسے ڈپٹا۔

"میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ تم اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتیں' وہ کون ہے' کیسا ہے' کس فیملی سے بی لانگ کرتا ہے؟ پھر بھلا تم کیسے اس کے بارے میں سیریس ہو سکتی ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس سب سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے کون سا اس کے ساتھ شادی کرنی ہے۔" وہ اک تلخ مسکراہٹ لیے لاپروائی سے بولی تو میرا دل اس کے یوں دھڑلے سے سچائی بیان کرنے پہ کٹ کر رہ گیا۔

"مگر اسے دیکھ کر میرے دل نے پہلی بار یہ خواہش کی ہے ثمو کہ کاش وہ میرا ہو سکتا۔" بے بسی اور نارسائی کا احساس اس کا لہجہ بوجھل کر گیا تو میں قصداً بات کو ہلکا رخ دینے کو شوخی سے بولی۔

"او! تو تمہارا اویس خضر سے فلرٹ کرنے کا ارادہ ہے؟"

"اے ہائے! کاش مجھ میں اتنی خوبیاں ہوتیں۔"

ہمیشہ کی طرح آن واحد میں خود کو بہادری سے سنبھالتے ہوئے وہ بدو بولی تو میں بھی اس کا ساتھ نبھاتے ہوئے دھیرے سے ہنس دی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی سے واپسی پہ میں اپنے دھیان میں گاڑی میں بیٹھی' کھڑکی سے بھاگتے دوڑتے منظر پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔

اپنے مخصوص راستے سے ہوتے ہوئے' ہم کالونی کے داخلی گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو اردگرد پھیلے سکون کو محسوس کرتے ہوئے۔ بے اختیار میں نے سکھ کا سانس لیا۔

گاڑی اب تیزی سے گھر کی جانب رواں دواں تھی' مگر اس سے پہلے کہ ہم اپنی سڑک پہ مڑتے صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک بوڑھے سے انکل مجھے فٹ پاتھ پہ درخت کے تنے سے سر ٹکائے بیٹھے نظر آئے۔ شاید ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ انہیں اسی گرمی میں یوں نڈھال بیٹھا دیکھ کے بے اختیار میرے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"عبدل ایک منٹ گاڑی روکنا۔" پلٹ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے ڈرائیور سے کہا تو بیک ویو مرر میں حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے گاڑی روک دی۔

میرے کہنے پہ اس نے گاڑی بیک کر کے ان انکل کے سامنے لا کھڑی کی اور پھر خود بھی میرے ساتھ اتر کر ان کے قریب چلا آیا۔

ہماری موجودگی کا احساس ہوتے ہی انہوں نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے ہماری جانب دیکھا تو میں قدرے ہچکچا گئی۔

"انکل آپ یہاں اسی طرح اتنی گرمی میں کیوں بیٹھے ہیں؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ان کے چہرے پہ نگاہیں جمائے میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا تو وہ ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے سادگی سے بولے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا لیکن مجھے گھر نہیں مل رہا۔" ان کے جواب پہ عبدل اور میں نے بیک وقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"آپ راستہ بھول گئے ہیں انکل یا آپ کسی کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں؟" ان کی طرف پلٹتے ہوئے میں نے پریشانی سے پوچھا۔

"اپنا گھر ڈھونڈ رہا ہوں بیٹا۔" وہ اسی سادگی سے بولے تو میں سمجھ گئی کہ وہ راستہ بھول گئے ہیں۔

"اب؟ اب کیا کریں عبدل؟" میں نے پریشانی سے عبدل کی جانب دیکھا۔

"پتا نہیں یہ اسی کالونی کے رہنے والے ہیں یا باہر سے اندر آئے ہیں؟ تم نے انہیں اردگرد دیکھا ہے کبھی؟"

"نہیں بی بی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ایسا کرتے ہیں گارڈز سے پوچھتے ہیں شاید وہ جانتے ہوں۔" اس کے معقول مشورے پہ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آئیں انکل آپ کا گھر ڈھونڈتے ہیں۔" میں نے ان انکل سے کہتے ہوئے عبدل کو آگے بڑھ کر ان کی مدد کرنے کا اشارہ کیا۔

انہیں گاڑی میں بٹھا کر ہم ایک بار پھر گیٹ پہ چلے آئے اور صد شکر کہ آن ڈیوٹی گارڈز نے انہیں نا صرف پہچان لیا بلکہ ان کے گھر کا پتا بھی عبدل کو سمجھا دیا۔ وہ اسی کالونی کے رہائشی تھے۔

خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ہم نے گاڑی واپس موڑی تھی اور اگلے چند لمحوں میں ہم ایک خوب صورت سے بنگلے کے باہر کھڑے تھے۔

عبدل کے بیل بجانے پہ آن واحد میں گیٹ وا ہوا تھا۔ یوں جیسے کوئی منتظر سا گیٹ کے پاس ہی کھڑا ہو۔ اس کی بات سن کے گیٹ کھولنے والا تیز قدموں سے باہر آیا تھا اور میں ایک بار پھر اویس خضر کو اپنے روبرو پا کے حیران رہ گئی تھی۔ یہ ہماری کالونی میں رہتا تھا؟

لیکن چونکہ اس کی نگاہیں فرنٹ سیٹ پہ براجمان انکل پہ جمی تھیں اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ پایا تھا۔

دوسری جانب وہ بھی اسے اپنے سامنے پا کے کھل اٹھے تھے۔

"یہ' یہ میرا بیٹا ہے اویس۔" وہ پلٹ کر مجھے مطلع کرتے دروازہ کھولنے لگے مگر تب تک مضطرب سا اویس دروازہ کھول چکا تھا۔

"بابا آپ کہاں چلے گئے تھے؟ آپ کو پتا ہے میں کتنا پریشان ہو گیا تھا۔" اپنے دھیان میں بولتا وہ جھک کر ان کا بازو تھام گیا تو میں نے گہری نظروں سے اس کے چہرے پہ چھائی پریشانی کو دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی کی طرف دیکھا جہاں بینڈیج کی ہوئی تھی۔

تبھی اس کی نگاہیں پچھلی سیٹ کی جانب اٹھی تھیں اور وہ چونک گیا۔

"آپ؟"

"السلام علیکم۔" میں نے ہلکے سے مسکرا کر سلام کیا تو وہ میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے انکل کا ہاتھ تھام کے انہیں اتارنے لگا۔

پیچھے کھڑے ملازم کو انہیں اندر لے جانے کا کہہ کر وہ دوبارہ گاڑی کی جانب پلٹا تو میں اخلاقاً" باہر نکل آئی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ میرے مقابل آ کھڑا ہوا تو میں نے ایک نظر اس کے خوبرو چہرے پہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"قدرے بہتر ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے بابا کی نا صرف ہیلپ کی بلکہ انہیں گھر تک بھی پہنچایا...... میں ایکچولی میڈیسن لے کر سو گیا تھا۔ ابھی دس منٹ پہلے آنکھ کھلی تو انہیں نہ پا کر میں نے ملازموں کو باہر دوڑایا اور اب خود بھی نکلنے والا تھا کہ آپ انہیں لے کر آ گئیں۔" وہ اپنی سبز آنکھوں میں ممنونیت کے رنگ سموئے دھیمے لہجے میں بولا تو میں چونک گئی۔

"آپ کے گھر میں اور کوئی نہیں ہوتا؟"

"جی نہیں۔ بس میں اور میرے گرینڈ فادر ہی ہوتے ہیں۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا تو میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ پتا نہیں اس مشرقی مین کی کیا کہانی تھی؟

"او کے...... میں چلتی ہوں اب۔" دل میں مچلتے سوالوں کا گلا دبائے' میں دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"نہیں پلیز' آپ تھوڑی دیر کے لیے اندر تو آئیں۔" اس نے کسی اچھے میزبان کی طرح شائستگی سے اصرار کیا تو اس کے انداز پہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ اویس خضر پہ یہ آداب میزبانی کچھ جچ نہیں رہے تھے۔

"پھر کبھی۔ یونیورسٹی سے نکلے مجھے کافی دیر ہو گئی ہے' ممی پریشان ہو رہی ہوں گی۔" اپنی ہنسی قابو کرتے ہوئے میں نے بھی شائستگی سے معذرت کی۔

"کہاں پڑھتی ہیں آپ؟" اس نے سرسری سے لہجے میں پوچھا تو میری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"میں آپ کی کلاس فیلو ہوں۔"

"اچھا!" اس کے چہرے اور آنکھوں میں خوشگوار سی حیرت در آئی۔

"لیکن میں نے تو آپ کو اب تک نہیں دیکھا؟" اور میرے جی میں آیا کہ کہوں۔

"محترم! آپ نے اب تک ہم غریبوں کو اس قابل جانا ہی کہاں ہے۔" لیکن بظاہر میں مسکراتے ہوئے صرف اتنا ہی بولی۔

"آپ کو آئے ہوئے ابھی ٹائم بھی تو بہت کم ہوا ہے۔"

"صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔ لیکن یقین مانیں آپ کو اپنی کلاس فیلو کے طور پہ جان کے مجھے بہت اچھا لگا ہے۔" یکایک اس کی سبز آنکھیں شوخی پہ اتر آئیں تو میں بوکھلا کے نگاہیں چرا گئی۔

"آں' تھینک یو۔" میں گڑبڑا کے بولی تو وہ شرارت سے مسکرا دیا۔

"یو آر ویلکم مس......؟" وہ قصداً" رکا تو میں تیزی سے بولی۔

"ثمرہ' ثمرہ اکرام۔"

"او کے ثمرہ پھر کل کلاس میں ملتے ہیں۔" وہ اپنی سبز آنکھیں مجھ پہ جمائے ہوئے بولا تو میں ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ضرور' اللہ حافظ۔" میں پلٹ کے گاڑی میں جا بیٹھی۔ میرے بیٹھتے ہی عبدل نے گاڑی اسٹارٹ کی تو اویس نے مسکراتے ہوئے دھیرے سے اپنا دایاں ہاتھ ہلایا۔ جواباً" میں بھی اسے ہلکے سے ویو کرتی سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

دو دن میں دو اتفاقی ملاقات اور دونوں ہی میں' میں ریسکیو ون فائیو کی ایجنٹ بن کے اویس خضر کی مدد کے لیے پہنچی تھی۔

میرا نام یقیناً" اس کی گڈ بک میں شامل ہو گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کل یونیورسٹی میں مجھ سے مسکرا مسکرا کے سلام دعا کرتا' مجھے آج کا واقعہ مریم کے گوش گزار کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہائے! کتنی افسانوی سچویشن ہے نا۔ کاش تمہاری جگہ میں ہوتی۔" مریم کی ایکسائیٹڈ سی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تو میرے لب مسکرا دیے۔

"پھر تمہاری جگہ میں ہوتی اور اویس خضر سے محبت بھی میں کرتی۔" میں نے قصداً" اسے چھیڑا۔

"اللہ نہ کرے کہ تم میری جگہ ہو۔" اس نے یک لخت سنجیدگی سے مجھے ٹوک دیا تو میں بے اختیار خاموش ہو گئی۔

"تم نے لاہور کب جانا ہے؟" میں نے آہستگی سے پوچھا تو وہ اک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"اگلے ہفتے...... اچھا اب میری بات سنو تم۔" وہ آن واحد میں موضوع بدل گئی تو میں نے ایک لحظے کو نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

"ہاں بولو۔"

"کل جب اویس تم سے ہیلو ہائے کرے تو مجھے ضرور انٹروڈیوس کروانا۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولی تو میں بھی مسکرا دی۔

"اپنی بیسٹ فرینڈ کے طور پہ یا اس کی محبوبہ کے طور پہ؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"کاش میں اس کی محبوبہ کے عہدے پہ فائز ہو سکتی۔" اس کے لہجے کی شریر سی حسرت میری مسکراہٹ گہری کر گئی۔

"فی الحال تو اپنی بیسٹ فرینڈ کے طور پہ ہی متعارف کروا دینا۔" وہ مارے باندھے بولی تو میں شرارت سے بولی۔

"نہیں اب ایسی بھی کوئی زبردستی نہیں۔"

"نہیں اٹس آل رائٹ۔ میں انکار کر کے تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی۔" دوسری طرف سے وہ بھی دوبدو گویا ہوئی تو میں کھل کر ہنس پڑی۔

☼ ☼ ☼

میں اور مریم طاہر ایک دوسرے کی زندگی کا لازم و ملزوم حصہ تھے۔ کب سے؟ صحیح سے یاد نہیں۔ ہاں دھندلی سی جو تصویر ذہن میں موجود ہے اس میں' میں اسکول کے پہلے دن کلاس روم میں روتے ہوئے اچانک غائب ہو جانے والی ممی کو ڈھونڈ رہی تھی' جب ٹیچر نے مجھے چپ کرواتے ہوئے' پنک فراک پہنے ایک پیاری سی بچی کے پاس لا کھڑا کیا جو مزے سے سامنے رکھے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔

ٹیچر کے کہنے پہ اس نے نا صرف کھلونے میرے ساتھ شیئر کیے تھے بلکہ مجھے سمجھایا بھی تھا کہ ہم سب کی ممی اور پاپا تھوڑی دیر میں ہم سب کو یہاں سے آ کے لے جائیں گے۔ اس کے سمجھانے پہ میں نا صرف چپ ہو گئی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ مل کر کھلونوں سے کھیلنے بھی لگی تھی۔ پھر ہم روز ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے لگے تھے اور ایک دوسرے کی پکی فرینڈز بن گئے تھے۔

اسکول کا زمانہ گزرا' کالج کا دور ختم ہوا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے علاوہ کبھی کسی تیسرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ دو بہنوں اور دو بھائیوں میں دوسرے نمبر پہ تھی اور میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ مزاجاً" ہم دونوں کی طبیعتوں میں کافی فرق تھا' وہ سمجھ دار اور کمپرومائزنگ تھی اور میں بے حد حساس لیکن ہنس مکھ سی تھی۔ وہ ہر کام سوچ سمجھ کر

کرنے کی عادی تھی اور میں بلا سوچے سمجھے بس کر گزرنے کی قائل تھی۔ مگر اس سب کے باوجود ہماری دوستی خوب جمی تھی۔ حتیٰ کہ ہم دونوں کی فیملیز بھی ہماری بدولت ایک دوسرے سے ملنے لگی تھیں۔

سب کچھ ٹھیک تھا جب اچانک چھ ماہ قبل مریم کے ساتھ ساتھ ہم سب کی زندگیوں میں بھی ایک بھونچال در آیا تھا۔ بے یقینی' دکھ اور اذیت کا بھونچال۔ جس نے مریم رضا کی پوری ہستی' اس کے خواب' اس کی ترجیحات ہر چیز بدل کر رکھ دی تھی اور ہم سب خاموش تماشائی بنے' چپ چاپ کھڑے دیکھنے کے سوا' چاہ کر بھی کچھ نہ کر سکے تھے۔

☼ ☼ ☼

اویس خضر اگلے دن تو کیا پورا ہفتہ یونیورسٹی نہیں آیا تھا اور مریم اس سے متعارف ہونے کی حسرت دل میں لیے لاہور چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں یونیورسٹی میں بولائی بولائی پھرتی تھی۔ حالانکہ کلاس کی بھی لڑکیوں کے ساتھ ہم دونوں کی اچھی خاصی علیک سلیک تھی اور اب ان میں سے چند کے ساتھ میرا آج کل اٹھنا بیٹھنا بھی تھا۔ مگر میرا دل مریم کے بنا اداس تھا اور میں گن گن کے اس کی واپسی کے دن گزار رہی تھی۔ اس دوران مجھے کتنی ہی بار اویس کا بھی خیال آیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیوں نہیں آ رہا تھا؟ حالانکہ یونیورسٹی جوائن کرنے کے محض ہفتے بعد اتنی لمبی چھٹی اسے خاصی مہنگی پڑ سکتی تھی۔ مگر نجانے وہ کیا سوچ کر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ایپلیکیشن تک بھجوانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

ایک دو بار تو میرے دل میں آیا بھی کہ میں یونیورسٹی سے واپسی پہ اس کا حال احوال پوچھتی چلوں' مگر پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ کہیں وہ میرے اپنے گھر تک آنے کو کوئی اور رنگ دیتے ہوئے مجھے کوئی چیپ سی لڑکی نہ سمجھے۔ لیکن اب تو پروفیسرز بھی اس کے بارے میں پوچھنے لگے تھے نا چاہتے ہوئے بھی میں اس کے اور اس کے بابا کے لیے پریشان ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں عینی گروپ کے ساتھ کیفے ٹیریا میں بیٹھی کولڈ ڈرنک اور برگر سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب اچانک بات کرتے کرتے تابندہ کی نظر سامنے کی جانب اٹھی تھی اور وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اسے رکتا دیکھ کے نادیہ نے بھنویں سکوڑتے ہوئے پوچھا۔

"تم لوگ پیچھے پلٹ کے مت دیکھنا مگر گیس کرو کہ ابھی ابھی کیفے ٹیریا میں کون داخل ہوا ہے؟" اس نے شرارت سے ہمارے چہرے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو ہم چاروں جن کی پشت دروازے کی جانب تھی سوچ میں پڑ گئیں۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم کوئی جواب دیتیں' تابندہ کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل سی گئیں۔

"تمہاری صورت دیکھ کے تو لگ رہا ہے خاصی وحشت ناک چیز داخل ہوئی ہے۔ ارے کہیں سر رضوان تو نہیں؟" عینی نے مسکراتے ہوئے کہا تو تابندہ نے سرعت سے خود پہ قابو پاتے ہوئے دانت پیسے۔

"بکو مت۔" اس کے انداز پہ جہاں ہم سب نے ایک دوسرے کو الجھ کے دیکھا تھا وہیں ہمارے پیچھے سے یک لخت بلند ہونے والی ایک بھاری سی "ہیلو۔" نے ہمیں پلٹنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

ہم سے ذرا فاصلے پہ اویس خضر' اپنی تمام تر وجاہت سمیت کھڑا تھا۔ ہمارے پلٹ کر دیکھنے پہ وہ دھیرے سے مسکرایا تو مجھے تابندہ کی حیرت کی وجہ سمجھ میں آ گئی' جواب میں بنا دیکھے بھی نادیہ' عینی اور سارہ کے چہروں پہ منتقل ہوتی محسوس کر سکتی تھی۔

"ثمرہ! اگر آپ فارغ ہیں تو کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ آ سکتی ہیں؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بنا کسی پس و پیش کے پوچھا تو ان چاروں کی پھٹی ہوئی آنکھیں مجھ پہ آن ٹھہریں۔ ان چاروں کے تاثرات مجھے نا چاہتے ہوئے بھی ایک پل کے لیے کنفیوز کر گئے تھے۔

"جی۔" دھیرے سے کہتی ہوئی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" بک اٹھاتے ہوئے میں نے ان چاروں سے کہا تو ان سب کے لبوں پہ معنی خیز سی مسکراہٹ در آئی۔

"شیور۔ کہو تو اگلے پیریڈ میں ہم تمہاری اٹینڈینس لگوا دیں؟" تابندہ نے مجھے دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا تو میں اسے گھورتے ہوئے اویس خضر کے ساتھ چل دی۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہیں آپ؟" لائبریری کی سیڑھیوں پہ بیٹھتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا تو میں ایک نظر اس کے تھکے تھکے سے چہرے پہ ڈالتے ہوئے قدرے فاصلے پہ بیٹھ گئی۔

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ اتنے دنوں سے کیوں نہیں آ رہے؟"

"بس بابا کو اچانک ہسپتال ایڈمٹ کرنا پڑ گیا تھا۔ ان کی شوگر بہت ہائی ہو گئی تھی۔" وہ دھیرے سے بولا تو میں پریشان ہو گئی۔

"اوہو۔ اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟"

"بہتر ہیں پہلے سے۔ میں آج اسی سلسلے میں یونیورسٹی آیا تھا کہ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ سے بات کر کے انہیں اپنی پرابلم بتا سکوں۔ میں نے چند دنوں کی مزید چھٹی لی ہے۔"

"لیکن اسی طرح تو آپ کا بہت حرج ہو جائے گا آپ پہلے ہی خاصے لیٹ آئے ہیں۔" اس کی بات سن کے میں پریشانی سے بولی تو بے اختیار وہ اک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"کیا کیا جا سکتا ہے۔ بابا میرے بغیر ایک منٹ رہنے کے لیے تیار نہیں۔"

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں ایک بات پوچھوں؟" اس کی بات پہ میرے ذہن میں وہی بنیادی سوال ایک بار پھر سر اٹھانے لگا تو میں نے قدرے جھجکتے ہوئے اویس سے پوچھا۔

"جی پوچھیں۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا' یوں جیسے اسے علم تھا کہ میں کیا پوچھنے والی ہوں۔

"آپ کی فیملی میں کیا آپ دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں؟" اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا تو وہ رسان سے بولا۔

"کیوں نہیں سب ہیں۔"

"تو پھر آپ دونوں یہاں اکیلے......" میں نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بوجھل سے انداز میں مسکرا دیا۔

"ایکچولی بابا میرے نانا ہیں۔ میری مدر اپنے پیرینٹس کی اکلوتی اولاد تھیں۔ شادی کے بعد پاپا نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر امریکہ میں بزنس اسٹارٹ کیا تو کچھ عرصے بعد مجھے اور مما کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ پھر رفتہ رفتہ میرے دونوں چچا بھی امریکہ آ گئے۔ تینوں پھپھو کی شادی اور دادا دادی کی ڈیتھ کے بعد پاکستان سے ہمارا تعلق صرف بابا اور نانو کی حد تک رہ گیا تھا۔

پھر اچانک مما کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی۔ ان کی اچانک موت کا نانو نے اتنا غم کیا کہ محض ایک سال بعد نانو بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد بابا بالکل اکیلے رہ گئے' مگر انہوں نے اپنے غم کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا' حتیٰ کہ مجھ سے بھی نہیں جسے وہ اپنا بیٹا مانتے تھے۔ لیکن میں چونکہ خود ان کی طرح اپنی عزیز از جان ہستی کے چھن جانے کے کرب سے گزر رہا تھا۔ اس لیے بنا کچھ کہے سنے بھی ان کے دکھ کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا جو اپنی شریک سفر کے ساتھ ساتھ اپنی اکلوتی اولاد کے چلے جانے کا بھی غم جھیل رہے تھے۔

پاپا اس دوران دوسری شادی کر کے نئے سرے سے زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ وہ امریکہ میں رہ کے اچھے

خاصے امریکن ہو چکے تھے اور میں وہاں پل بڑھ کے بھی اپنے اندر کے جذبات اور اپنی حساس طبیعت کو بدل نہیں سکا تھا۔

پھر ایک دن بابا کے ملازم کا فون آیا۔ بابا ہاسپٹلائز تھے۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پاکستان پہنچ گیا اور یہاں آ کے میری روح کانپ گئی۔" بات کرتے کرتے اس کی آواز یک لخت بھرا گئی تو میں جو ساکت بیٹھی اس کی روداد سن رہی تھی اپنی آنکھوں کو بھیگنے سے روک نہ سکی۔

"ہم خوب صورت چہروں اور عالیشان گھروں میں رہنے والوں کو دیکھ کر عموما" یہ سوچتے ہیں کہ شاید ان کی زندگی میں کوئی کمی، کوئی غم نہیں۔ لیکن تب ہم ایک بات بھول جاتے ہیں کہ اگر قسمتیں صورت اور دولت کی محتاج ہوتیں تو شاید کوئی خوب صورت آدمی کبھی کسی دکھ کی شکل تک نہ دیکھتا اور کوئی کم صورت انسان کبھی قسمت کا دھنی نہ ہوتا۔

بستر پہ دراز وہ نحیف وجود جو کتنی ہی دیر بعد مجھے پہچاننے کے قابل ہوا تھا، کہیں سے بھی اس شاندار اور رعب و دبدبے والے ڈی آئی جی وحید ریاض سے نہیں مل رہا تھا جن کی پوری زندگی ہمت و شجاعت کا منہ بولتا ثبوت رہی تھی۔ مگر اب جو تنہائی سے ہار گئے تھے۔ اکیلے مرنے سے ڈر گئے تھے اور تب زندگی میں پہلی بار مجھے انسان کی حقیقت اور اس دنیا کے فانی ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اپنے آنے والے وقت کا احساس ہوا تھا، جب اس بستر پہ میں نے ہونا تھا اور چونکہ میں مرتے وقت اپنے بچوں، اپنے پیاروں کا ساتھ چاہتا تھا اس لیے میں نے ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ان کے بڑھاپے کو سہارا دینے کا فیصلہ کیا تاکہ کل کو میرے کمزور وجود کو کوئی توانا کندھا مل سکے۔" بھرائے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی نم آنکھوں کا زاویہ بدل لیا تو میں جو اپنے آنسوؤں کو چھلکنے سے روک نہ سکی تھی آہستگی سے چہرہ جھکا گئی۔

اس کی عمر کا کوئی نوجوان اس طرح بھی سوچ سکتا ہے میں حیران تھی۔ ہمارے ملک کے کتنے ہی نوجوان اپنے ماں باپ، بہن بھائی گھر بار ہر چیز امریکہ افریقہ پہ قربان کرنے کے لیے تیار تھے اور ایک یہ تھا جو ایک بوڑھے کی تنہائی سے گھبرا کے یہاں بھاگ آیا تھا۔ پتا نہیں یہ نادان تھا یا وہ؟ میں سچ مچ سمجھنے سے قاصر تھی۔

☼ ☼ ☼

پندرہ بیس منٹ کی وہ مختصر ملاقات سارا دن میرے ذہن میں گھومتی رہی تھی۔ رہ رہ کے مجھے اویس کی دوہری مشکل کا خیال ستاتا رہا تھا۔ میں اس کی مدد کرنا چاہ رہی تھی مگر اس کے لیے مجھے ممی کی اجازت درکار تھی۔ بالآخر میں نے ممی کو ساری بات بتا کے انہیں اپنے خیال سے آگاہ کیا تھا۔ میری بات سن کے وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔ لیکن پھر انہوں نے مجھے حفیظ (ملازم) کے ساتھ اس کے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔

"ثمو آپ؟"

"جی میں۔" اگلی شام میں حفیظ کو ساتھ لیے اس کے گھر چلی آئی تھی۔ ڈرائینگ روم میں بیٹھی میں اس کی منتظر تھی، جب اپنے دھیان میں اندر داخل ہوتا اویس مجھے دیکھ کے حیران رہ گیا تھا۔ اس کی حیرت پہ میں مسکراتی ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب بابا کی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنائیں؟" اس نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے میرے مقابل نشست سنبھالی۔ اس کے چہرے پہ خوشگوار سا تاثر دیکھ کے مجھے بھی اپنے یوں اچانک آنے پہ اطمینان سا ہوا تھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ ایکچولی میں نے سوچا کہ بابا کا حال احوال پتا کر آؤں اور کچھ آپ کی بھی ہیلپ کر دوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو میرے اندازے کے مطابق وہ چونک گیا۔

"میری ہیلپ؟"

"کیوں آپ کو نہیں پوچھنا کہ پچھلے ایک ہفتے میں آپ کا کتنا کورس مس ہوا ہے؟" میں نے رسان سے کہا تو اس کے چہرے پہ چھائی الجھن میں خوشگواری گھل گئی۔

"پوچھنا کیوں نہیں۔ ان فیکٹ مجھے تو پچھلے تین ماہ کی بھی کورس آوٹ لائن چاہیے۔ لیکن میری وجہ سے آپ کو زحمت اٹھانی پڑے۔ یہ مجھے مناسب نہیں لگتا۔" وہ میری بات سمجھ کے نرمی سے بولا۔

"زحمت کیسی؟ میں قریب میں ہی رہتی ہوں۔ سو اگر میری تھوڑی سی ہیلپ سے آپ کی پڑھائی کی ٹینشن کچھ کم ہو جاتی ہے تو اٹ ول بی مائی پلیژر ٹو ہیلپ یو۔ ویسے بھی آپ کے توسط سے اگر تھوڑی سی نیکی میں بھی کما لوں تو کیا مضائقہ ہے۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے میں آخر میں دھیرے سے مسکرائی تو اویس کے لب بھی مسکرا دیے۔ اس کی سبز آنکھوں کی چمک یک لخت بڑھ سی گئی تھی۔

"آپ کو پتا ہے ثمو آپ بہت اچھی لڑکی ہیں۔" مسکراتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا تو میں اپنی مسکراہٹ دبائے شان بے نیازی سے بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔ اب چل کے بابا سے بھی مل لیں؟" میرے جواب پہ وہ کھل کے ہنستا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"چلیں۔" اور مسکراتے ہوئے میں اٹھ کے اس کے ساتھ چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

اویس کی طرف آتے ہوئے مجھے پانچ چھ دن ہو گئے تھے۔ بابا اب پہلے سے کافی بہتر تھے اس لیے اویس اب اگلے ہفتے سے یونیورسٹی واپس جوائن کرنے والا تھا۔ ادھر مریم کی بھی اتوار کو واپسی تھی اور اگلے پیر سے وہ بھی یونیورسٹی آنے والی تھی۔ اس دوران میری اس سے دو تین بار بات ہو چکی تھی اور ہر بار وہ اویس کے بارے میں پوچھے بنا نہ رہ سکی تھی۔ میں نے قصدا" مریم کو ڈسٹرب نہ کرنے کی نیت سے اب تک اویس کے گھر آنے یا اس کی پڑھائی میں مدد کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی اور میں چاہتی تھی کہ اویس بھی اس کے سامنے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کرے۔

سو آج میں نے یونہی باتوں باتوں میں اس کے متعلق کلاس میں کسی سے بھی کچھ نہ کہنے کے لیے کہا تھا، جس پہ اس نے مجھے یہ کہتے ہوئے مطمئن کر دیا تھا کہ وہ خود بھی نہیں چاہتا کہ یہ بات باہر نکلے اور کوئی فضول افواہ یونیورسٹی میں پھیلے۔

اس کی اس یقین دہانی کے بعد میں آج کے لیکچرز اس سے ڈسکس کرنے لگی جب بابا لاؤنج کا داخلی دروازہ کھول کے باہر برآمدے میں چلے آئے تھے۔ انہیں باہر آتا دیکھ کے اویس اٹھ کر تیز قدموں سے ان کی جانب بڑھ گیا تھا اور پھر احتیاط" ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا لان میں چلا آیا تھا۔

"السلام علیکم بابا۔" ان کے قریب آنے پہ میں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"وعلیکم السلام، کیسی ہو بیٹا؟" وہ چونکہ مجھے اب اویس کی کلاس فیلو کی حیثیت سے پہچاننے لگے تھے اس لیے مجھ سے ان کا رویہ خاصا مشفقانہ اور اپنایت بھرا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آج جب آئی تو آپ سو رہے تھے، اس لیے آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔" ان کے کرسی سنبھالنے پہ میں اپنی کرسی ان کے قریب کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"اسی لیے تو میں اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے باہر چلا آیا۔" وہ مسکراتے ہوئے شفقت سے بولے تو میرے لب بھی کھل اٹھے۔

"بہت اچھا کیا۔ ویسے بھی اب موسم خوشگوار ہو گیا ہے، آپ کو روز تھوڑی دیر لان میں آ کے بیٹھنا چاہیے۔"

"میں اور اویس واک کے لیے جاتے ہیں۔" انہوں نے ایک محبت بھری نگاہ نواسے پہ ڈالی۔

"اچھا جی، واک پہ جاتے ہیں اور میرے گھر اب تک نہیں آئے۔" میں نے انہیں مصنوعی خفگی سے دیکھا تو ان کی جگہ اویس بولا۔

"تو آپ نے ہمیں کون سا انوائیٹ کیا ہے محترمہ ـــــ"

"بابا کو کسی انویٹیشن کی ضرورت نہیں محترم' ہی از آل ویز ویلکم۔" میں نے اسے دوبدو جواب دیا تو وہ تیزی سے بولا۔

"اور میں؟"

"آپ ـــــ؟" میں اسے دیکھتے ہوئے ایک لحظے کو رکی۔

"سوچ کے بتاؤں گی۔" میری شرارت پہ جہاں اویس نے مجھے گھورا وہیں بابا بھی ہنس دیے۔

"نہیں میں اپنی بیٹی کے گھر جلد آؤں گا اور مٹھائی لے کے آؤں گا۔"

"مٹھائی؟" ان کی بات پہ ہم دونوں نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ تو وہ ہماری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا دیے۔

"ہاں ـــــ اویس بیٹا تم ذرا اندر سے میرا قریب کا چشمہ تو لانا۔" انہوں نے یک لخت اویس سے کہا تو وہ انہیں گہری نظروں سے دیکھتا اٹھ کے اندر کی جانب بڑھ گیا' جبکہ ان کے یوں بات پلٹنے پہ میں نے الجھ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ نے بات کیوں پلٹ دی؟" میں نے بنا کسی پس وپیش کے اپنی سوچ کو زبان دی تو ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"اس لیے کہ میں اویس کو یہاں سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔"

"لیکن کیوں بابا؟" ان کی بات میری الجھن کو بڑھا گئی تھی۔ میں بغور انہیں دیکھتی سیدھی ہو بیٹھی۔

"تمہارا کہیں رشتہ طے ہوا ہے بیٹا؟" انہوں نے مجھے جواب دینے کے بجائے ایک انتہائی غیر متوقع سوال کیا تو مجھے اپنی "کیوں" کے ساتھ ساتھ ان کی پوری بات سمجھ میں آ گئی۔ نا چاہتے ہوئے بھی میری آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں اور گردن میکانکی انداز میں نفی میں ہل گئی۔

"تو کیا تم میرے اویس کی دلہن بننا پسند کرو گی؟" انہوں نے شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا تو اب کے میرا منہ بھی کھل گیا۔

"آ ـــــ آپ غلط سمجھے ہیں بابا' ہم دونوں صرف اچھے کلاس فیلوز ہیں۔" میں نے ہکلاتے ہوئے صفائی دینا چاہی تو وہ رسان سے مسکرا دیے۔

"میں جانتا ہوں۔ یہ تو میری خواہش ہے بچی۔ مجھے اپنے اویس کے لیے تمہاری جیسی ہی اچھی اور پر خلوص بچی چاہیے تھی۔ مگر سوچتا تھا کہ ایسی لڑکی ڈھونڈوں گا کہاں سے' یہ خود تو سدا کا بے نیاز ہے' اسے میرے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔ لیکن میں تو اس کا بابا ہوں نا۔ مجھے تو اس کی فکر ستاتی ہے۔ تم سے ملا تو یوں لگا جیسے اللہ نے میری سن لی ہو۔ مجھ بوڑھے کی مشکل آسان کر دی ہو۔ اویس بھی تمہاری بہت تعریف کرتا ہے اور مجھے یقین ہے تم دونوں ایک ساتھ بہت خوش رہو گے۔" میرے سر پہ ہاتھ رکھے وہ محبت سے گویا ہوئے تو نجانے کیوں میری نظریں جھک گئیں۔

"اس خاموشی کو کیا سمجھوں بیٹا؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے دھیمے لہجے میں پوچھا تو میں مضطرب سی بولی۔

"پتا نہیں بابا۔" میرے اضطراب پہ وہ ہولے سے مسکرا دیے۔

"اچھا تسلی سے سوچو' پھر مجھے جواب دینا۔" ان کی بات پہ میں لب کاٹتی آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا بابا میں چلتی ہوں۔" جھک کر بک اور بیگ اٹھاتی میں کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی تو انہوں نے بھی بنا کچھ کہے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس وقت میری کیفیت سے بخوبی واقف لگ رہے تھے۔

اپنے دھیان میں گم میں جونہی جانے کے لیے پلٹی خود سے ذرا فاصلے پہ اویس کو کھڑا دیکھ کے میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ میری نظریں

اس کی سبز آنکھوں سے ٹکرائیں تو دل کی دھڑکنوں میں اک ارتعاش سا برپا ہو گیا۔ وہ کب سے وہاں کھڑا تھا اور کیا کچھ سن چکا تھا' اس خیال کے ذہن میں آتے ہی مجھے اپنا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ پڑتا محسوس ہوا تھا۔

اس کی سبز آنکھوں میں مزید دیکھنا میرے لیے ممکن نہ رہا تو میں پلکیں جھکائے تیز قدموں سے اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئی تھی اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس نے بھی مجھے نہیں روکا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

بابا نے مجھے اس بات پہ تسلی سے سوچنے کے لیے کہا تھا اور یہاں بے چینی اور بے قراری نے میرا دامن کچھ اس طرح سے تھاما تھا کہ میں چاہ کر بھی خود کو پر سکون نہیں کر پا رہی تھی اوپر سے میرے دل کی بدلتی ہوئی لے' میں نا چاہتے ہوئے بھی خود سے نظریں چرانے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

مریم کی باتیں' اس کے احساسات' اویس کا متوقع رد عمل' اپنے دل کی حالت زار سب چیزوں نے مل کر دماغ میں وہ اودھم مچایا تھا کہ بالآخر تھک کر میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ ایسے میں موبائل کی اچانک ہونے والی بیل مجھے بہت بری طرح چبھی تھی۔

"ہیلو!" بنا نمبر دیکھے میں خاصی بے زاری سے گویا ہوئی تھی۔

"میں تو سمجھا تھا آپ سو رہی ہوں گی۔" میری ہیلو کے جواب میں ایک مسکراتا ہوا لہجہ میری سماعتوں سے ٹکرایا تو آن کی آن میں میری کوفت اور جھنجلاہٹ کی جگہ حیرت نے لے لی' اویس؟ اور اس وقت؟

"کیا بات ہے نیند نہیں آ رہی کیا؟" میری خاموشی کے جواب میں وہ شرارت سے بولا تو میں جھنجلا گئی۔

"میں سو ہی رہی تھی۔" میں چبا کر بولی تو دوسری جانب سے ابھرنے والی اس کی گمبھیر ہنسی میرے دل کی دھڑکن تیز کر گئی۔

"میرے لیے یہاں آنکھیں بند کرنا محال ہے اور آپ وہاں سو رہی ہوں' اتنے بے اثر جذبے نہیں میرے۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا تو ایک لحظے کے لیے میری سانس تھم سی گئی۔ یہ کیا کہہ رہا تھا وہ؟

"کسی نے صحیح کہا ہے ماں باپ اپنے بچوں کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں۔ جو اعتراف میں کل تک خود سے بھی کرنے سے ہچکچا رہا تھا آج بابا نے اسے اپنی خواہش کا نام دے کے جس طرح سے آپ کے سامنے بیان کیا ہے میں اس حقیقت کا دل سے قائل ہو گیا ہوں انہوں نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی ہے اور اب مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ میں آپ کی صرف تعریف نہیں بلکہ بہت عزت بھی کرتا ہوں۔ آپ کے نرم دل اور حساس طبیعت نے مجھے پہلی ہی ملاقات میں آپ کی جانب متوجہ کر دیا تھا اور بعد میں ہونے والی ہر ملاقات نے اس احساس کو مزید مضبوط کیا تھا۔ یہاں تک کہ میں اپنے دل کو آپ کی جانب کھنچنے سے روک نہیں سکا تھا۔ آپ کی باتیں' آپ کی ہنسی حتیٰ کہ آپ کے آنسو بھی مجھے اچھے لگنے لگے ہیں ثمر اور میں چاہتا ہوں کہ فیصلہ کرنے سے قبل آپ اس بات کو یاد رکھیں کہ میں آپ کو چاہنے لگا ہوں۔" جذبوں سے بھرپور لہجے میں بولتا وہ میری ذات کو معتبر کرتا چلا گیا تو بے اختیار میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

اویس خضر جیسا اچھا شخص مجھے چاہنے لگا تھا یہ حقیقت میری خوش نصیبی تھی۔ وہ صرف صورت میں ہی نہیں بلکہ سیرت میں بھی بے مثال تھا۔ لیکن مریم میں اس کا کیا کرتی جو میری بچپن کی سہیلی تھی اور جس کی پہلی نہیں بلکہ آخری خواہش اویس خضر تھا۔ آخری!

اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو بے اختیار میرا ہاتھ میرے لبوں پہ آن ٹھہرا تھا۔ جبکہ دوسری جانب میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اویس کے انداز میں بے چینی در آئی تھی۔

"ہیلو ثمو۔۔۔" اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا میں نے لرزتے ہاتھوں سے کال ڈسکنیکٹ کرتے ہوئے موبائل آف کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ساری رات آنکھوں میں کاٹنے کے باوجود میں اگلی صبح یونیورسٹی چلی آئی تھی۔ میرے لیے مزید اس تکلیف دہ صورت حال سے نپٹنا ناممکن ہو گیا تھا۔ سو میں اپنے اندر برپا شور سے فرار کی خواہش میں یہاں بھاگ آئی تھی۔

مگر ڈپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی میرا وجود جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ سامنے لابی میں سیڑھیوں کے قریب ہی اویس کھڑا تھا۔ جو یقیناً "میرا منتظر تھا۔

اسے یوں اچانک اپنے سامنے پا کے میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کیا کروں۔ تبھی اس کی نظریں میری جانب اٹھی تھیں اور وہ جو دیوار سے کندھا ٹکائے کھڑا تھا بے اختیار سیدھا ہوا تھا۔

اسے اپنی جانب متوجہ دیکھ کے میں تذبذب کے عالم میں لب کاٹتی نظریں چرا گئی تھی اور اس سے پہلے کہ میں واپسی کے لیے قدم اٹھاتی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

"میرے جذبوں کو جو پذیرائی آپ نے بخشی ہے اس کے بعد میرا اتنا حق تو بنتا ہے کہ میں بنا اجازت آپ کے قیمتی وقت میں سے تھوڑا وقت لے سکتا ہوں۔" میرے جھکے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ سرد لہجے میں بولتا' میرے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے اجنبی انداز پہ بے اختیار میری آنکھوں میں جلن اتر آئی تھی۔

دھندلی نظروں سے اس کی چوڑی پشت کو دیکھتے ہوئے میں چپ چاپ خود کو گھسیٹتی اس کے پیچھے چل دی تھی۔ جو ایک بار بھی پلٹے بنا تیز قدموں سے چلتا پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔

میرے پہنچنے تک وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے بیک کرتا ایک جھٹکے سے میرے قریب رکا تو میں ایک نظر اس کے اکھڑے تیوروں پہ ڈالتی خاموشی سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کے بیٹھ گئی۔

میرے بیٹھتے ہی گاڑی فراٹے سے یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر نکلی تھی۔ دہل کے میں نے اپنے ساتھ بیٹھے اویس کی جانب دیکھا تھا جو سختی سے لب بھینچے نظریں روڈ پہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ اس وقت کہیں سے بھی وہ نرم خو اویس خضر نہیں لگ رہا تھا جس سے میں بنا جھجکے بہت سی باتیں کرنے لگی تھی۔

اس کا انداز نا چاہتے ہوئے بھی مجھے خائف کر گیا تھا۔ تھوڑی دور جا کے ایک نسبتاً "پرسکون جگہ پر گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی اور اگر میں جلدی سے ڈیش بورڈ کو نہ تھامتی تو یقیناً "میرا چہرہ بری طرح سامنے ٹکرا گیا ہوتا۔

"کیوں؟ کیوں کیا ثمو آپ نے ایسا؟ میں نے تو بڑی سچائی کے ساتھ اپنا دل آپ کے سامنے کھولا تھا' اس یقین کے ساتھ کہ آپ بھی مجھے ناپسند نہیں کرتیں۔ لیکن آپ نے تو سنگدلی کی حد۔۔۔ کر دی۔ آپ کے لیے اگر میرے جذبے' میرا پرپوزل قابل قبول نہیں تھا تو آپ مجھے صاف لفظوں میں منع کر دیتیں' باخدا میں دوبارہ کبھی اس بات کا ذکر تک نہیں کرتا۔ لیکن یوں بغیر کچھ کہے کال ڈسکنیکٹ کر کے موبائل آف کر دینا' نا صرف میرے جذبوں کی بلکہ میری ذات کی بھی تذلیل ہے۔ کوئی غیر یہ حرکت کرتا تو شاید مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی لیکن آپ کو میں دل ہی دل میں اپنا سمجھنے لگا تھا' جس کا میری نظر میں بہت اچھا امیج تھا' آپ نے یہ حرکت کر کے حقیقتاً "مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔ مجھے رہ رہ کے اس لمحے پہ افسوس ہو رہا ہے' جب میں نے اپنے جذبے آپ پہ عیاں کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔" میری جانب رخ موڑتے ہوئے اس نے شدید غصے کے عالم میں بولنا شروع کیا تھا۔ مگر آخر میں اس کی آواز شدت جذبات سے مدھم ہو گئی تو میں جو ساکت بیٹھی اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ پھیلتے درد کو دیکھ کے بے اختیار نظریں جھکا گئی۔

"میں نے سوچا تھا کہ زندگی کے اس سفر میں ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اچھے شریک سفر ثابت ہو سکیں گے، لیکن آپ نے میری اس سوچ کو تو کیا اس خیال کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں، کیونکہ اگر ایسا کچھ ہوتا تو آپ کل رات مجھ پہ اپنی بے زاری ظاہر کرنے کو فون نہیں بند کرتیں بلکہ اچھے دوستوں کی طرح مجھ سے اپنی فیلینگز شیئر کرتیں۔ یا پھر میں ہی خوش فہم تھا جو آج تک آپ کو اپنا دوست سمجھے ہوئے تھا، ورنہ آپ تو شاید محض اپنی ہمدردانہ فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کے میری مدد کر رہی تھیں۔" بات کرتے کرتے اس کا لہجہ استہزائیہ رنگ اختیار کر گیا تو میں بلبلا اٹھی۔

"اب آپ زیادتی کر رہے ہیں اویس۔" میں نے اپنی آنکھوں میں اترتی نمی حلق میں اتارتے ہوئے کہا تو اس کے لبوں پہ اک طنزیہ مسکراہٹ در آئی۔

"زیادتی؟ اور رات جو سلوک آپ نے میرے ساتھ کیا ہے اسے آپ کیا کہیں گی؟ دیکھیں ثمو میں کوئی امیچور بچہ نہیں جو لوگوں کے رویوں سے ان کے دلوں کی بات سمجھ نہ سکوں۔ میرے لیے میری عزت نفس سب سے بڑھ کر ہے۔ کسی کا احسان لینا یا کسی کے ساتھ رسمی یا منہ دکھاوے کے تعلقات نبھانا مجھے پسند نہیں اس لیے میرا اور آپ کا ساتھ یہیں تک تھا۔ آئندہ جب کبھی مجھے کسی مشکل میں دیکھیں تو پلیز مجھ پہ ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔" درشتگی سے اپنی بات مکمل کرتا وہ ایک تیز نظر مجھ پہ ڈالتا ہوا، رخ موڑ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تو میرا ضبط بھی جواب دے گیا۔

"اور مجھے بھی کسی ایسے شخص سے تعلق رکھنے کا کوئی شوق نہیں جو میری نیک نیتی اور خلوص کو احسان اور ترس کا نام دے۔" اک کھولتی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالتے ہوئے میں نے ایک جھٹکے سے اپنا چہرہ سیدھا کیا تو وہ بے اختیار چلا اٹھا۔

"پلیز ثمو اپنی غلطی کو ماننا سیکھو اور اگر تمہاری نظر میں تم نے کچھ غلط نہیں کیا تو پھر اپنے کہے پہ قائم رہنا سیکھو۔" اس کے یوں اچانک چلا اٹھنے پہ میں ایک لحظے کو سہم گئی تھی۔ مگر اگلے ہی پل میرا غصہ عود کر آیا تھا۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا اور نہ ہی میں اپنی کہی کس بات سے مکر رہی ہوں!" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے میں نے بھی باآواز بلند جواب دیا تو اس کی آنکھوں سے لپکتے شعلوں میں اضافہ ہو گیا۔

"ہاں تو پھر کہو نا کہ میری انسلٹ کر کے، میری محبت کو ٹھکرا کے تمہیں کوئی ملال کوئی شرمندگی نہیں۔"

"ہے، حد سے زیادہ تکلیف ہے مجھے کیونکہ میں نے یہ سب اپنی خوشی اپنی رضا سے نہیں کیا۔" اس کے الزام پہ میں نے تڑپ کے دوبدو اعتراف کیا تو ایک پل کے لیے میرے لفظوں نے اسے ساکت کر دیا۔ جبکہ میں اپنے منہ سے نکلنے والے اس غیر ارادی جملے پہ لب بھینچے رخ موڑ گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں خود پہ جمی اس کی نگاہیں باآسانی محسوس کر رہی تھی۔

"کیا میں تمہاری مجبوری پوچھ سکتا ہوں؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تو اس میں پہلی سی تندی مفقود تھی۔

"میری دوست مریم۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے سچ بتانے کی ٹھان لی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا جواب اسے حیران کر دے گا کیونکہ وہ تو شاید کسی منگنی یا ذات برادری یا ایسی ہی کسی دوسری مجبوری کو سوچے ہوئے ہوگا اور وہی ہوا تھا۔

"کیا؟" اس کی آواز میں در آنے والی الجھن بھری حیرت نے مجھے اس کی جانب دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"ہاں، وہ آپ کو پسند کرتی ہے اویس۔" میں مدہم لہجے میں بولی۔

"تو؟" اس کے چہرے پہ "میں کیا کروں" والے اثرات دیکھ کے میں ایک لحظے کو خاموش ہو گئی۔

"تو یہ کہ میں اس کی آخری خواہش کو اس کی اذیت بڑھانے کا سامان نہیں بنا سکتی۔"

"کیا مطلب؟" اس نے الجھ کر میری جانب دیکھا تو میں بے اختیار اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا گئی۔

"مریم، مریم کو برین ٹیومر ہے اویس اور وہ محض چند ماہ کی مہمان ہے۔" بات کرتے ہوئے میری آواز اور آنکھیں دونوں بھر آئیں تو میں خود پہ قابو پانے کو نظریں چراتے ہوئے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

"آپ مجھے چاہنے لگے ہیں، مجھے اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتے ہیں یہ احساس میرے لیے بہت خوش کن، بہت دلفریب ہے۔ لیکن فی الحال میرے لیے آپ کے پرپوزل کو قبول کرنا ممکن نہیں۔ میری واحد سہیلی، میری بچپن کی دوست، جس کے عمر بھر کے خواب، آرزوئیں اور خواہشات پہلے ہی تل تل مرنے کے اذیت ناک احساس نے کچل ڈالی ہیں۔ اس نے بڑی حسرت سے آپ کی خواہش کی ہے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں اس کی بجھتی آنکھوں کا خواب نوچ کر اپنی آنکھوں میں سجالوں۔ میں چھپ کر بھی آپ سے محبت نہیں کر سکتی اویس۔ اس کے آخری دنوں میں میری ذات اس کے لیے دکھ اور اذیت کا باعث بنے یا میری جانب سے اسے کوئی دھوکا ملے یہ مجھے منظور نہیں، میرے ضمیر کو منظور نہیں!" دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ مجھے یوں روتا دیکھ کے اویس مجھے جذباتی قرار دے رہا تھا یا پاگل۔ میرے لیے اگر کچھ اہم تھا تو خود سے نظریں ملنا، اپنی ذات کے آگے سرخرو ہونا۔

اور سرخروئی کا یہ احساس اپنے ساتھ کیسا اطمینان لاتا ہے اس حقیقت کا ادراک صرف وہی کر سکتا ہے جو اس اطمینان کی لذت سے آشنا ہو، جو زندہ ضمیر کا مالک ہو۔

"میں نے غلط کہا تھا ثمو، تم بہت اچھی نہیں بلکہ بہترین لڑکی ہو۔ میرے لیے فی الحال یہی بہت ہے کہ تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔ باقی رہا اقرار محبت تو اس کے لیے تو ایک عمر پڑی ہے۔" اپنے شانے پہ اس کے مضبوط ہاتھ کا احساس ہوا تو بے اختیار میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں تیزی در آئی تھی وہ میرے احساسات کو سمجھ گیا تھا یہ میرے لیے بہت بڑی بات تھی۔ میرے نصیب میں اللہ نے زندہ انسانوں میں سے ایک زندہ انسان لکھ دیا تھا مجھے بھلا اور کیا چاہیے تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہو تم؟ میں نے تمہیں اس بار بہت مس کیا۔" میرے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی مریم مسکراتے ہوئے اٹھ کر تیزی سے میرے گلے آ لگی تھی وہ لاہور گھومنے پھرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے علاج کے لیے گئی تھی اس کی والہانہ محبت پہ میں نے بھی اسے گرم جوشی سے خود سے لگا لیا تھا۔

"میں نے بھی تمہیں بہت مس کیا۔" اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے میں نے آف وائٹ اسکارف کے ہالے میں اس کے کملائے ہوئے چہرے کا بغور جائزہ لیا تھا۔

بادامی آنکھوں کے گرد حلقے بے حد نمایاں ہو رہے تھے۔ گری ہوئی صحت اور گلابیاں چھلکاتی رنگت میں گھلی زردی اس بات کی غماز تھی کہ وہ کتنے تکلیف دہ مراحل سے گزر کر آ رہی تھی۔ مگر لبوں پہ کھیلتی مسکراہٹ اور لہجے کی کھنک میں رتی برابر کمی واقع نہ ہوئی تھی۔

اتنی ہمت، اتنا حوصلہ اس میں کہاں سے آ گیا تھا، میں اکثر سوچا کرتی تھی۔

اس کی نظریں خود پہ مرکوز پا کے میں نے اپنے تاثرات کو چہرے پر آنے سے روکتے ہوئے نارمل لہجے میں استفسار کیا۔

"وہاں سب ٹھیک رہا؟" پتا نہیں اس کی بیماری، علاج، ڈاکٹرز، ان سب کے بارے میں بات کرنا میرے لیے اتنا مشکل کیوں ہو جاتا تھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہی تھا۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی تو ایک لمحے کے لیے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں مزید کیا پوچھوں۔ درد، تکلیف، موت ان میں سے کچھ بھی تو قابل ذکر نہ تھا۔

میری اس مشکل کو اس نے خود ہی آسان کر دیا۔

"پھر اویس سے تمہاری دوبارہ ہیلو ہائے ہوئی؟" اس نے تجسس سے پوچھا تو میں دھیرے سے مسکرادی۔

"کافی دفعہ۔ بلکہ اب تو ہماری ہلکی پھلکی بات چیت بھی ہونے لگی ہے۔"

"ہیں۔ تم نے اسے میرے بارے میں بتایا؟" مارے اشتیاق کے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں۔" میرے جواب پہ اس کے لبوں کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی کھل اٹھا۔

"ویری گڈ۔ پھر آج جب وہ آئے تو اسے مجھ سے ضرور ملوانا۔" اس نے چہکتے ہوئے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلا دیا۔

مگر اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ پہلے پیریڈ کے بعد جب پندرہ منٹ کا بریک آیا تو اویس خود ہی ہم دونوں کے پاس برآمدے میں چلا آیا۔ اس روز گاڑی میں میں اسے بتا چکی تھی کہ میں مریم سے ہم دونوں کی دوسری ملاقات کا تفصیلی ذکر کرچکی ہوں، لہٰذا وہ مجھ سے اس کے سامنے بھی ہلکے پھلکے انداز میں بات کر سکتا ہے۔

"السلام علیکم، کیسی ہیں آپ؟" ہمارے قریب آنے پہ وہ مجھ سے شائستگی سے مخاطب ہوا تو مریم جو پہلے ہی اسے ہماری جانب آتا دیکھ کے دبے دبے پرجوش انداز میں مجھے مطلع کرچکی تھی۔ کنفیوز سی نظریں چرا گئی۔

"وعلیکم السلام۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں؟" میں نے سنبھل کر دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تو وہ ایک زینہ چھوڑ کے وہیں ہمارے قریب سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" مجھ سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں مریم پہ جا ٹھہریں۔

"اگر میں غلط نہیں تو یہ یقیناً" آپ کی فرینڈ مریم ہیں۔" اس کی بات پہ مریم نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ جبکہ میں نے قصداً" ایک شوخ نگاہ مریم کے چہرے پہ ڈالتے ہوئے اویس کی طرف دیکھا۔

"جی آپ قطعاً" غلط نہیں، یہی میری فرینڈ مریم ہے۔ لیکن آپ نے کیسے پہچانا؟"

"آپ کے چہرے سے۔ آج آپ خاصی خوش اور مگن ہیں اور یہ کمال سوائے مریم صاحبہ کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو ہم دونوں بھی ہنس دیں۔

"صحیح کہا، ہم دونوں واقعی ایک دوسرے کے لیے جادوئی ایفیکٹ رکھتی ہیں۔ اینی ہاؤ آپ تو اسے پہچان ہی چکے ہیں اور مریم یہ ہیں ہمارے نئے کلاس فیلو اویس خضر۔" میں نے اس کی خواہش کے عین مطابق اسے باقاعدہ طور پہ اویس سے متعارف کروایا۔

"نیا تو نہیں اب تو پرانا ہوچکا ہوں۔ بہرحال دیر سے ہی سہی لیکن آپ سے مل کے بہت خوشی ہوئی مس مریم۔" وہ دوستانہ لہجے میں بولتا، مریم کی طرف دیکھ کے مسکرایا تو مریم کے زرد چہرے پہ ہلکی سی سرخی چھا گئی۔ نا چاہتے ہوئے بھی اس کی کیفیت پہ میری مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔

"مجھے بھی۔ آپ کو یہاں ایڈجسٹ ہونے میں کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی۔" اس نے اویس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"بالکل بھی نہیں۔ ان فیکٹ مجھے ہمیشہ اپنایت کا زیادہ احساس پاکستان میں ہوتا ہے۔ باہر تو سب اپنا ہو کر بھی اپنا نہیں لگتا۔" اویس سنجیدگی سے بولا تو مریم مسکراتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھی پاکستان کے علاوہ رہنے کے لیے کبھی کسی ملک نے اپیل نہیں کیا۔ ہاں گھومنے پھرنے کے لحاظ سے دل چاہتا ہے کہ ساری دنیا دیکھی جائے لیکن رہنے کے لیے صرف اپنا ملک۔ وہ کیا شعر ہے کہ گھوم پھر کر اسی کوچے کی طرف آئیں گے......"

"دل سے نکلے بھی اگر ہم تو کہاں جائیں گے۔" اگلا مصرع بے اختیار اویس نے مکمل کیا تو میں نے چونک کر اویس کی جانب دیکھا۔ اسے شعروشاعری سے دلچسپی تھی مجھے آج پتا چلا تھا۔

"زبردست! اس شعر کا اتنا خوب صورت استعمال اس سے پہلے میری نظر سے کبھی نہیں گزرا۔" وہ ستائشی انداز میں مریم سے مخاطب ہوا تو وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے "تھینک یو" کہتی، اس کے شاعرانہ ذوق کے بارے میں سوال کرنے لگی اور چونکہ مجھے شعروشاعری سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی اس لیے میں خاموشی سے دونوں کو دیکھتے ہوئے سننے لگی جو خاصے ذوق و شوق سے اپنے پسندیدہ موضوع پہ بول رہے تھے۔

"ثمو آپ کے فیورٹ شاعر کون سے ہیں؟" اچانک اویس نے مجھ سے سوال کیا تو میں ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گئی۔ میری صورت دیکھ کے مریم بے اختیار اپنی مسکراہٹ چھپا گئی۔

"مجھے شاعری پسند نہیں۔" میں نے کلاس کے کسی نکمے بچے کی طرح نظریں چراتے ہوئے ڈھیلے سے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا؟" اویس کی تعجب بھری آواز پہ جہاں میں نے شرمندگی سے اس کی جانب دیکھا تھا وہیں مریم کھل کے ہنس دی تھی۔

اس کی ہنسی کے جل ترنگ نے ہم دونوں کو بھی مسکرانے پہ مجبور کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہم تینوں کی دوستی کی تکون بہت تیزی سے تشکیل پائی تھی۔ حیرت انگیز طور پہ اویس اور مریم کی سوچ پسند ناپسند بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتی تھی۔ اس ذہنی ہم آہنگی نے انہیں بہت جلد ایک دوسرے کا اچھا دوست بنا دیا تھا۔

مریم، اویس کو اپنے قریب پا کے بہت خوش تھی اور میں اس کی خوشی میں خوش تھی۔

اویس جو پہلے پہل شاید میری خاطر یا پھر انسانی ہمدردی میں مریم سے دوستانہ انداز میں بات کیا کرتا تھا اب اسے دل سے اپنا دوست ماننے لگا تھا اور اس بات سے مجھے بہت اطمینان ہوا تھا۔ میری زندگی میں موجود دو اہم لوگ ایک دوسرے کے لیے بھی اہمیت اختیار کر گئے تھے، اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔

مریم کے سامنے اویس نے کبھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو میری پوزیشن اس کے سامنے آکورڈ کردیتی، ہاں لیکن کبھی تنہائی میں یا اکثر ہونے والی فون کالز میں وہ اپنے جذبات کا اظہار کیے بنا نہیں رہتا تھا اور گو کہ میں اس کے جذبات کا اسی شدت سے جواب دینے سے ہچکچاتی تھی لیکن اندر ہی اندر اس کا ہر اقرار محبت میرے دل کو اپنی قسمت پہ نازاں کیے جاتا تھا۔

مریم اب بھی مجھ سے اویس کے متعلق اپنی پسندیدگی شیئر کرتی رہتی تھی اور میں ایک اچھی دوست کا کردار نبھاتے ہوئے اس کا ہر احساس اپنے اندر سموتی چلی جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس راہ کی مسافر ہے اس لیے اس نے بھی نا صرف اویس کی ہمراہی کے خواب کو دوستی کے رشتے تک محدود کردیا تھا۔ بلکہ ایک دن اسے خود ہی اپنی بیماری کے متعلق بھی بتا دیا تھا۔

لیکن کچھ دنوں سے مجھے وہ عجیب کھوئی کھوئی سی لگنے لگی تھی۔ میرے پوچھنے پہ اس نے مجھے سہولت سے ٹال دیا تھا۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے اتنے مزاج آشنا تو تھے ہی کہ کسی گڑبڑ کا اندازہ کچھ کہے سنے بنا بھی لگا سکتے تھے۔ لیکن وہ اپنی پریشانی مجھ سے کیوں چھپا رہی تھی یہ بات الجھن کا باعث تھی۔

مگر میری اس الجھن کا سرا یوں میرے ہاتھ آئے گا، میں نے سوچا نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ معمول کے مطابق شروع ہونے والا ایک عام سا دن تھا۔ اویس نے آج بابا کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کے جانا تھا۔ اس لیے اس نے آج چھٹی کی تھی۔

مریم آج صبح سے ہی خاصی چپ چپ سی تھی۔ اس کی طبیعت کے پیش نظر ہم تیسرا پیریڈ بنک کرکے لان کی طرف جا رہے تھے جب لابی کراس کرکے

ڈپارٹمنٹ سے باہر آتے ہوئے' مریم کو اس زور کا چکر آیا تھا کہ وہ بے اختیار میرا بازو تھام گئی تھی۔

اس کی متغیر ہوتی رنگت اور بند ہوتی آنکھیں دیکھ کے میں نے بوکھلا کے تیزی سے اسے سنبھالنا چاہا تھا۔ مگر وہ کسی بے جان پتلے کی مانند میرے بازوؤں میں جھولتی زمین پہ گرتی چلی گئی تھی۔ بے اختیاری کے عالم میں بلند ہونے والی میری چیخوں نے درودیوار کو ہلا ڈالا تھا۔

☼ ☼ ☼

دواؤں کے زیر اثر سوئی ہوئی مریم کے چہرے پہ نگاہ ڈالتے ہوئے میں نے اک گہری سانس لیتے ہوئے کمرے میں موجود اس کی امی اور بہن کی طرف دیکھا تھا جو متفکر سی بیٹھی نجانے کیا سوچ رہی تھیں۔

گو کہ اس کی حالت اب بہت بہتر تھی لیکن اس کی اس اچانک بے ہوشی نے سبھی کے قدموں تلے سے زمین نکال دی تھی۔

یونیورسٹی سے اسے سیدھا ہسپتال کی ایمرجنسی میں لایا گیا تھا۔ جہاں اسے فوری طور پہ ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کردی گئی تھیں۔ اس دوران مریم کے امی' ابو' بہن بھائی اور باقی گھر والے بھی پہنچ گئے تھے۔ انہیں میں نے راستے میں ہی فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کردیا تھا۔

طاہر انکل نے ہسپتال پہنچ کر ڈاکٹرز سے ملنے کے بعد فوراً" لاہور میں موجود ان ڈاکٹر صاحب سے رابطہ کیا تھا' جن کے زیر علاج مریم تھی۔ اتفاق سے وہ پنڈی میں ہی موجود تھے۔

ساری صورت حال جاننے کے بعد وہ فوراً" مطلوبہ ہسپتال چلے آئے تھے۔ ان کے آنے پہ سب نے بے اختیار شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

ڈاکٹر پاشا نے آتے ہی اس کا ٹریٹمنٹ شروع کیا تھا' جس کے بعد مریم ہوش میں آگئی تھی اور اب تقریباً" ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد اسے روم میں شفٹ کردیا گیا تھا' جہاں وہ تو دواؤں کے زیر اثر سو گئی تھی' لیکن باقی سب پہ یوں خاموشی چھا گئی تھی' جیسے طوفان کے گزر جانے کے بعد ہر ذی النفس پہ خاموشی اور تھکن چھا جاتی ہے۔

میں اب اویس کو فون کرنے کا سوچ رہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر پاشا کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کے مجھے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کے جبین آنٹی ایک بار پھر سسک اٹھی تھیں۔ انہیں روتا دیکھ کے میں اور زارا بھی رونے لگی تھیں۔ ہم سب کو تسلی دیتے ہوئے وہ وہیں صوفے پہ بیٹھ گئے تھے۔ کچھ دیر آنٹی کے بے قراری سے پوچھے گئے سوالوں کا جواب دینے کے بعد' انہوں نے مریم کے متعلق آنٹی سے ایک آدھ سوال کیا تھا اور اس کے بعد جو انہوں نے پوچھا تھا وہ مجھے ایک پل کے لیے ساکت کر گیا تھا۔

"یہ اویس کون ہے مسز طاہر۔" اور جبین آنٹی سمیت زارا بھی الجھ کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی تھیں۔

"ہم تو کسی اویس کو نہیں جانتے ڈاکٹر صاحب۔"

آنٹی کے الجھن بھرے چہرے نے جہاں ایک لحظے کو ڈاکٹر پاشا کو خاموش ہونے پہ مجبور کردیا تھا۔ وہیں میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

"لیکن آپ اس کے بارے میں ہم سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" آنٹی نے اسی الجھن بھرے انداز میں سوال کیا تو ڈاکٹر پاشا ایک نظر مجھ پہ ڈالتے ہوئے بولے۔

"یہ بچی کون ہے؟" اور میرے دل کی دھڑکن بے اختیار تیز ہو گئی تھی۔

"یہ مریم کی بچپن کی فرینڈ ہے ثمو یہی اسے آج یونیورسٹی سے ہسپتال لے کر آئی تھی۔" آنٹی کے جواب پہ انہوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تو میں دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"دیکھیں مسز طاہر' مریم کی جو کنڈیشن ہے اس میں' میں نے آپ سے کہا تھا کہ اسے کسی قسم کا ذہنی دباؤ' پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ ایسے مریضوں کے ذہن اور اعصاب پہ پہلے ہی اپنی بیماری کا بہت بوجھ ہوتا ہے۔ ایسے میں ہلکا پھلکا سا بھی بیرونی پریشر ان کی ہمت اور حوصلے کا بہت بڑا امتحان ثابت ہو سکتا ہے اور یہی آج مریم کے ساتھ ہوا ہے۔" وہ متفکر سے گویا ہوئے تو آنٹی بے قراری سے بولیں۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب' ہم نے تو ہمیشہ اس بات کا بہت خیال رکھا ہے کہ مریم کو کبھی کوئی پریشانی نہ ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے مسئلے مسائل اس کے ساتھ لگے ہی رہیں گے۔ دکھ' سکھ' خواہشات' آرزوئیں یہ سب زندگی کا حصہ ہیں اور مریم کوئی ہم سے الگ تو نہیں۔"

"میں آپ کی بات سمجھ نہیں پارہی' آپ پلیز کھل کر بات کریں نا۔" ڈاکٹر صاحب کی بات پہ جبین آنٹی بے چینی سے بولیں تو ڈاکٹر پاشا رسان سے بولے۔

"بات یہ ہے مسز طاہر کہ اپنی بے ہوشی میں مریم نے تین چار بار اویس نامی شخص کا نام لیا تھا۔ اسی لیے میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ اویس کون ہے۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ بات کچھ اور ہے اور مریم کے لیے پریشانی کا باعث بھی ہے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے طاہر صاحب کے بجائے آپ سے بات کی۔ میں نہیں جانتا کہ آپ اب اس معاملے تک کیسے پہنچیں گی لیکن میرا مشورہ آپ کو یہی ہے کہ مریم کی اس پریشانی کو جتنی جلدی ہو سکے دور کردیں کیونکہ ٹینشن مریم کے لیے کسی بھی لحاظ سے اچھی نہیں۔" انہوں نے کھل کر بات بیان کر ڈالی تو آنٹی کے ساتھ ساتھ زارا کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ جبکہ میری تو کاٹو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو چلی تھی۔

اویس کے لیے مریم کی خاموش محبت کب اتنی شدت اختیار کر گئی تھی کہ اس کے تھکے ہوئے اعصاب ان شدتوں کو برداشت نہیں کر سکے تھے' مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

یک لخت میری آنکھوں میں اس کی کھوئی کھوئی سی صورت گھوم گئی تو بے اختیار دو آنسو میری آنکھوں سے نکل کر گالوں پہ لڑھک آئے۔ وہ کتنی بے بس اور کتنی لاچار تھی' اس تلخ حقیقت کا ایک بار پھر مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا تھا۔

مگر میں تو بے بس اور لاچار نہیں تھی۔ مجھے تو ہر قیمت پہ اپنی بیمار دوست کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ سو دل ہی دل میں کچھ سوچتی ہوئی' میں ڈاکٹر صاحب کے باہر جاتے ہی پریشان حال بیٹھی آنٹی اور زارا کے قریب چلی آئی تھی۔ اویس کون تھا؟ میں دھیمے لہجے میں انہیں بتانے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟" میری بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ اویس نے بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے ٹوک دیا۔

میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کے گھر پہنچی تھی۔ مجھے یوں اچانک اپنے گھر آتا دیکھ کے وہ پریشان ہو گیا تھا اور جب میں نے اسے مریم کی اچانک بے ہوشی سے لے کر اس کے ہاسپٹلائز ہونے تک کی تمام روداد کہہ سنائی تو اس کی پریشانی حد سے سوا ہو گئی تھی۔

میری بات سن کے وہ فوراً" میرے ساتھ ہاسپٹل جانا چاہتا تھا' مگر جب میں نے اسے ڈاکٹر پاشا کی بات بتاتے ہوئے مریم کی اس اچانک بے ہوشی کی وجہ بتائی تو اس کا چہرہ فق ہو گیا۔

لیکن جب اسے وہ پتا چلا جو میں آنٹی اور زارا سے کہہ آئی تھی اور جو میں اسے سمجھانے کے لیے یہاں تک آئی تھی تو اس کا پورا وجود جیسے زلزلے کی زد میں آ گیا تھا۔

"تم' تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟" میری جانب دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

"اتنی بڑی بات تم نے مجھ سے پوچھے بغیر ان لوگوں سے کیوں کہی؟"

"میں جانتی ہوں کہ مجھے پہلے تم سے بات کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اویس' مریم کے لیے اس حالت میں کسی بھی قسم کی پریشانی خطرے کا باعث ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر پاشا نے صاف لفظوں میں اسے ہر طرح کی

ٹینشن سے دور رکھنے کے لیے کہا ہے۔"

"اور تم نے اس کا یہ طریقہ نکالا اس کی امی اور بہن کو یہ کہہ دیا کہ اویس اور مریم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" وہ غصے سے بولا تو میں بھی جھنجلا گئی۔

"ہاں تو کیا کہتی کہ آپ کی بیمار بیٹی جس اویس نامی شخص کو بے ہوشی میں پکارتی رہی ہے وہ اس کی یک طرفہ خاموش محبت ہے؟ اور یہ کہ آنٹی چاہے جو بھی کر لیں' جتنا بھی علاج کروالیں وہ کم از کم اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں؟ فار گاڈ سیک اویس وہ پہلے ہی بہت تکلیف میں ہے' تل تل مر رہی ہے۔ تمہاری لاحاصل محبت نے اسے وقت سے پہلے بستر سے لگا دیا ہے۔ ایسے میں اگر تمہارا اقرار محبت اس کے بے جان ہوتے وجود میں چند دنوں کے لیے نئی روح پھونک دے تو کیا برا ہے؟"

"برائی ہے۔ وہ مجھ سے سچی محبت کرتی ہے ثمو اور میں اس سے جھوٹا اقرار محبت کر کے اس کے پاکیزہ جذبوں کا مذاق نہیں اڑا سکتا۔ میں اسے اور اس کی فیملی کو اتنا بڑا دھوکا نہیں دے سکتا یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ پلیز مجھے فورس مت کرو۔" میری بات کے جواب میں وہ دو ٹوک لہجے میں بولا تو میں چند لمحے اسے غصے سے دیکھنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے نہیں کروں گی فورس۔ لیکن اگر تمہاری اس خاموش محبت نے اسے کل کے بجائے آج قبر میں اتار دیا ناں تو پلیز اس کے جنازے میں آنے کی فارملیٹی مت نبھانا۔"

اس کے چہرے پہ اک تلخ نگاہ ڈالتی میں پلٹ کے دروازے سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ اتنے نازک موقع پہ سچ جھوٹ کا بکھیڑا کیسے کھڑا کر سکتا تھا؟ فرسٹریشن کے مارے میری آنکھوں سے سیل رواں جاری ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح میں ممی اور پاپا کے ساتھ ہاسپٹل گئی تھی۔ چونکہ میں نے یونیورسٹی سے تین دن کی چھٹی لی تھی۔ اس لیے ان دونوں کے جانے کے بعد میں تسلی سے مریم کے پاس رک گئی تھی۔ وہ اب کل سے بہتر تھی۔ مگر ایک عجیب سی خاموشی تھی جس نے اس کی ذات کا احاطہ کر رکھا تھا اور میں اس کا حال دل جاننے کے باوجود اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

ممی اور پاپا کے جانے کے بعد آنٹی نے مجھے ایک جانب لے جا کر اویس کی بابت پوچھا تھا کہ میری اس سے بات ہوئی تھی یا نہیں' کیونکہ اویس کے متوقع رد عمل کو سوچتے ہوئے میں نے کل ہی آنٹی اور زارا کو اس کے اور مریم کے متعلق بتا کے یہ بہانہ کر دیا تھا کہ وہ پچھلے دو دنوں سے لاہور گیا ہوا ہے۔ سو آج جب انہوں نے مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا تو میں مایوسی سے نفی میں سر ہلانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکی تھی۔

کاش کہ اویس میری بات مان جاتا تو آج مریم کے چہرے پر رنگ ہی کچھ اور ہوتا' مگر شاید اس کے نصیب میں سختیاں کچھ زیادہ ہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"بس یار اور نہیں پیا جا رہا۔" میں مریم کو سوپ پلا رہی تھی' جب آدھا پیالہ پینے کے بعد ہی اس نے منع کر دیا تھا۔

"تھوڑا سا اور پی لو۔" میں نے نرمی سے اصرار کیا تو وہ نفی میں سر ہلاتی' پشت پہ رکھے تکیے پہ سر ٹکا گئی تھی۔

میں پیالہ زارا کے حوالے کر کے آنٹی کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی' جو مریم کو دوپہر میں دی جانے والی دوائیں الگ کر رہی تھیں۔

تبھی دروازہ پہ دستک دے کے کوئی اندر داخل ہوا تھا اور ہم چاروں جو اپنے دھیان میں دروازے کی جانب متوجہ ہوئی تھیں' نو وارد کو اندر آتا دیکھ کے ٹھٹک گئی تھیں۔

"جی؟" زارا نے سوالیہ نظروں سے سامنے کھڑے اجنبی کی طرف دیکھا تو مریم دھیرے سے سیدھی ہو بیٹھی۔

"آئیں اویس۔ امی یہ ہمارے کلاس فیلو ہیں اویس خضر۔" اور جبین آنٹی کے ساتھ ساتھ زارا کی آنکھوں میں بھی بے اختیار ستائش در آئی تھی۔ جبکہ میں نے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے سینے پہ ہاتھ باندھ لیے تھے۔

"السلام علیکم آنٹی!" وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا تو جبین آنٹی اس کی جانب بڑھ گئیں۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو بیٹا؟"

"میں ٹھیک ہوں آنٹی معذرت چاہتا ہوں مجھے ـــ"

"لاہور سے کب آئے؟" میں نے اپنی تمام تر خفگی بھلائے اسے تیزی سے ٹوک دیا تو اویس کے ساتھ ساتھ مریم نے بھی مجھے چونک کر دیکھا۔

"صبح آیا ہوں۔" لمحے کے توقف کے بعد وہ سنبھلتے ہوئے بولا تو میں نے اندر ہی اندر سکھ کا سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مریم کی طبیعت کیسی ہے اب؟" مجھ سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے اس نے آنٹی سے استفسار کیا تو اک پھیکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

"کل سے بہتر ہے۔ تم خود پوچھ لو ناں۔" وہ اس کے گریز کو جھجک پہ محمول کرتے ہوئے نرمی سے بولیں تو اویس کے چہرے پہ چھائی سنجیدگی میں اضافہ ہو گیا۔

اک کڑی نگاہ مجھ پہ ڈالتا وہ مریم کے قریب جا کھڑا ہوا۔ تو میری نظریں بے اختیار اس کے نچلے لب پہ جا ٹھہریں جسے وہ اضطرابی کیفیت میں دھیرے دھیرے کچل رہا تھا۔ وہ اس وقت آنٹی اور زارا کے سامنے کتنا آکورڈ محسوس کر رہا تھا' میں اچھی طرح سے سمجھ سکتی تھی۔

"کیسی ہو تم؟" وہ دھیرے سے بولا تو مریم کے چہرے پہ چھائی تھکن میں مجھے یک لخت اضافہ ہوتا محسوس ہوا۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں بابا کیسے ہیں؟" اس نے نڈھال سے انداز میں سر تکیے پہ ڈالتے ہوئے پوچھا تو میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ کیا اویس کو مریم کے چہرے پہ چھائی بے بسی میں لپٹی محبت نظر نہیں آ رہی تھی؟ وہ اتنا سنگدل کیسے ہو سکتا تھا؟

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔" سنجیدگی سے کہتا وہ خاموش ہو گیا تو میرا دل چاہا کہ میں اسے جھنجھوڑ کر رکھ دوں۔ میرے لیے مزید یہ سب برداشت کرنا مشکل ہو گیا تو میں بے اختیار زارا کو پکار بیٹھی۔

"چلو زارا باہر دیکھ کر آئیں' ڈاکٹر پاشا آئے ہیں یا نہیں۔" میں نے اک سرد نظر اویس پر ڈالتے ہوئے زارا کی طرف دیکھا تو وہ اسے میری جانب سے اشارہ سمجھ کے اثبات میں سر ہلا گئی۔ جبکہ آنکھ کے کونے سے اویس کو لب بھینچتا دیکھ کے مجھے اپنے اندر ڈھیروں سکون اترتا محسوس ہوا تھا۔

"تم یہیں رکو ثمو بیٹا' میں زارا کے ساتھ جا کے دیکھتی ہوں۔" میرے اس سکون کو آنٹی کے جملے نے اگلے ہی پل ختم کر ڈالا تو مجھے ـــ ناچار وہاں رکنا پڑا' لیکن ان دونوں کے کمرے سے نکلنے کے چند لمحوں بعد ہی میں مریم کی پروا کیے بنا اویس پہ اک قہر بھری نظر ڈالتی' تیز قدموں سے دروازہ کھول کے باہر نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

تقریباً" دس منٹ بعد میں کمرے میں واپس آئی تو اویس جا چکا تھا اور مریم آنکھوں پہ بازو رکھے ہوئے لیٹی تھی۔ وہ کہیں رو نہ رہی ہو' اس خیال کے آتے ہی میں سرعت سے اس کی جانب بڑھی تھی۔

"مریم!" پریشانی سے اسے پکارتے ہوئے میں نے نرمی سے اس کا بازو چھوا تو وہ آہستگی سے اپنا بازو ہٹاتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی خشک آنکھیں دیکھ کر بے اختیار میں نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔

"اویس کب گیا!" اس کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے بات بناتے ہوئے پوچھا۔ لیکن وہ میرے سوال کو نظر انداز کیے ایک ٹک میری طرف دیکھے گئی تو مجھے پریشانی نے آن گھیرا۔

"کیا ہوا؟" میں نے الجھ کر اس کی جانب دیکھا۔ تو وہ

اپنی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اویس لاہور کب گیا تھا؟" اس کے سوال پہ میں ایک لمحے کو گڑبڑا سی گئی۔ پتا نہیں اویس نے اسے اس بارے میں کیا کہا تھا۔ لیکن چونکہ اس نے تھوڑی دیر قبل میری بات رکھی تھی اس لیے میں یہی بات ذہن میں رکھتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں۔ لیکن کل جب میں نے اسے تمہارے بارے میں بتانے کے لیے فون کیا تو اس کا موبائل آف تھا۔ پھر جب میں نے گھر پہ ٹرائی کیا تو ملازم نے بتایا کہ وہ کسی ارجنٹ کام کے سلسلے میں لاہور کے لیے نکلا ہے۔"

"پھر اسے میرے بارے میں کیسے پتا چلا؟" اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے انداز مجھے اندر ہی اندر ٹھٹکا گئے تھے۔ لیکن میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"یار صبح میں نے اسے میسج کیا تھا۔ لیکن تم اتنے تفتیشی انداز میں کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"پتا ہے اویس نے مجھ سے کیا کہا ہے؟" اس نے ایک بار پھر میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں کہا تو میرا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

"یا اللہ! کہیں اویس نے اسے سب کچھ بتا تو نہیں دیا؟" ہول کر سوچتے ہوئے میں نے اس کے بے تاثر چہرے کی جانب دیکھا۔

"کیا؟"

"یہ کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"کیا!" میرے سنسناتے ہوئے دماغ نے دو سیکنڈ لیے تھے، اس غیر متوقع بات کو سمجھنے کے لیے اور جونہی مجھے اس کی کہی بات سمجھ میں آئی تھی۔ میرا منہ مارے بے یقینی کے کھل گیا تھا۔ اویس نے بالآخر میری درخواست مان لی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔

"او گاڈ! اویس خضر تم سے اظہار محبت کر کے گیا ہے۔ آئی جسٹ کانٹ بلیو اٹ!" خوشگوار حیرت کے زیر اثر میں نے اگلے ہی پل جوش سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اویس سے میری ناراضی لمحوں میں ہوا ہو گئی تھی۔

"تم، تم خوش ہو رہی ہو؟" اس نے ٹھٹک کر میری جانب دیکھا۔

"کیوں نہیں ہونا چاہیے کیا؟" میں نے مصنوعی خفگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "بلکہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے کیوں منہ پہ بارہ بجا رکھے ہیں؟"

"مجھے یقین نہیں آرہا، کوئی بھلا اس حد تک کیسے جا سکتا ہے؟" وہ مجھے دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولی تو میرے لبوں پہ بھرپور مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"جا سکتا ہے، بالکل جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے جذبات سچے ہوں اور نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔ تم نے کبھی خواب میں بھی سوچا تھا کہ تمہاری خاموش محبت یوں رنگ لائے گی کہ اویس خضر خود چل کر تمہارے پاس آکھڑا ہو گا؟" میں نے اس کا گم صم سا چہرہ دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ آہستگی سے نفی میں سر ہلا گئی۔

"پھر اس سے اندازہ لگاؤ کہ مایوسی کتنا بڑا گناہ ہے۔ ہم چاہے، جو بھی سوچتے رہیں، ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ کسے اور کب وسیلہ بناتا ہے ہمیں پتا بھی نہیں چلتا۔ اویس کب اور کیسے تم سے محبت کرنے لگا ان بے معنی سوالوں کو رہنے دو اور ہر بے یقینی کو اپنے اندر سے جھٹک کر اپنے دل کو جی بھر کے خوش ہو لینے دو۔ خدشات اور اندیشوں کے بوجھ سے خود کو نجات دلا دو پلیز۔" اس کا ہاتھ تھامے میں محبت سے اسے سمجھانے لگی تو اس کی کھوئی کھوئی سی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

"اگر یہ سب، کچھ دن پہلے ہوا ہوتا تو شاید مجھے بھی یہ یقین آجاتا کہ میرے نصیب میں بھی خوشی نام کی کوئی چیز موجود ہے۔ لیکن اب میرے لیے اپنی خوش بختی پہ یقین کرنا ممکن نہیں۔"

"کیوں؟ کیوں ممکن نہیں؟ ان چند دنوں میں بھلا ایسی کون سی بات ہو گئی ہے جو تم اتنی مایوس ہو گئی

ہو؟" اس کی بات مجھے بے اختیار غصہ دلا گئی تھی۔

"تم نے تو بہت حوصلے، بہت صبر سے سارے حالات کو فیس کیا ہے مریم، پھر اب بھلا ایسا کیا ہو گیا ہے جو تم اپنی خوش بختی پہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں؟" اس کی یہ طویل خاموشی مجھے اب جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"میں مایوس نہیں ناراض ہوں خود سے اور آج میری یہ ناراضی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اویس خضر کبھی مجھ سے اظہار محبت کرے گا، ایسا میں نے واقعی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اور آج جب وہ حقیقت میں میرا ہاتھ تھام کے مجھے اپنی محبت کی نوید دے گیا ہے تو میرا دل شدت سے اس بات کا خواہش مند ہے کہ کاش یہ سب ایک خوب صورت خواب ہوتا لیکن حقیقت نہیں، کم از کم میرا اندر اتنا بوجھل تو نہ ہوتا۔" آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر اس کی کنپٹیوں میں جذب ہونے لگے تو میں جو بغور اسے سن رہی تھی۔ اس کی الجھن سمجھ گئی۔

"تمہیں شاید اویس کے لیے تکلیف ہو رہی ہے۔ تم نہیں چاہتیں کہ اسے نارسائی کا درد سہنا پڑے۔ لیکن مریم محبت کرنا اگر کسی کے بس میں ہوتا ناں تو ہر کوئی بہترین محبوب تلاش کرتا، وہ جو دنیاوی اعتبار سے مکمل ہوتا۔ لیکن یہی تو سچی محبت کی خوب صورتی ہے کہ اسے اپنا عام سا محبوب بھی دنیا کے لاکھوں، کروڑوں خاص لوگوں سے بڑھ کے لگنے لگتا ہے، اس حد تک کہ انسان سود زیاں کے ہر حساب سے مبرا ہو جاتا ہے۔ سو اگر اویس خضر بھی ہر بات جانتے ہوئے تمہاری جانب بڑھا ہے تو اپنے دل کو بوجھل مت کرو۔ زندگی کا تو کسی کو بھی بھروسہ نہیں۔ ہر کوئی امید پہ جی رہا ہے۔ کیا تم، کیا میں۔" میں نے نرمی سے اس کے آنسو اپنی پوروں پہ سمیٹ لیے تو وہ جو ایک ٹک میری جانب دیکھ رہی تھی دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھامتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اس کا یوں سسک اٹھنا، مجھے بھی تڑپا گیا تھا۔ بے اختیار میں جھک کر اس سے لپٹ گئی تھی۔

"کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے پیاروں سے جدا ہونا، مولا!" میرے دل نے بلکتے ہوئے جیسے استدعا کی تھی۔ لیکن میرے ہونٹ اس کے کانوں میں تشفی کے الفاظ دہرا رہے تھے اور وہ فقط ایک ہی جملہ کہے جا رہی تھی۔

"تم بہت، بہت اچھی ہو ثمو۔ خدا تمہیں زندگی کی ہر خوشی سے نوازے اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے!"

☼ ☼ ☼

اویس کا نمبر ملاتے ہوئے مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ میری کال ریسیو کرے گا۔ لیکن تیسری بیل پہ جب اس کی "ہیلو" سنائی دی تو میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔

"کیسے ہو؟" میں نے محبت سے پوچھا۔

"ٹھیک۔" اس کا جواب مجھے ایک لمحے کو نادم کر گیا۔ میں نے حقیقتاً اسے بہت مشکل امتحان سے دوچار کر دیا تھا۔

"ناراض ہو؟" میں نے تشویش سے پوچھا تو وہ تھکے سے لہجے میں بولا۔

"ناراض نہیں لیکن مطمئن بھی نہیں ہوں۔"

"اگر ایسی بات تھی تو مریم سے کچھ بھی کہنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے دھیمے لہجے میں کہا تو وہ اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"پتا نہیں۔ حالانکہ ہسپتال جانے تک حتیٰ کہ کمرے میں داخل ہو کر بھی میں اپنے ارادے پہ قائم تھا۔ تمہاری حرکتیں مجھے غصہ ضرور دلا رہی تھیں، مگر میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانے والا تھا جو میرے نزدیک ایک احمقانہ فعل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن جس طرح میرے قریب جانے پہ مریم کی آنکھوں اور لہجے میں صدیوں کی تھکاوٹ در آئی تھی، اس نے مجھے ایک لمحے کو اندر ہی اندر نادم کر دیا تھا۔ اس کا نظریں چرانا، زبردستی مسکرا کر خود کو نارمل ظاہر کرنا میری اس ندامت میں اضافہ کر رہا تھا اور باوجود اس کے کہ میرا کہیں بھی کوئی قصور نہ تھا اسے یوں اپنی وجہ سے بستر سے لگا دیکھ کے میرے لیے اس سے نظریں ملانا دوبھر ہو گیا۔

اور جب تم غصے سے باہر نکلیں تب وہ بری طرح گھبرا گئی تھی اسے یوں پریشان دیکھ کے میں نے نرمی سے اسے ریلیکس رہنے کے لیے کہا تھا۔ تبھی میری نظریں اس کی آنسو بھری آنکھوں پہ جا ٹھہری تھیں اور میں ایک پل کو ٹھٹک گیا تھا۔ کیا اوقات تھی میری یا میری محبت کی جو وہ بیمار لڑکی اس مقام پہ آپہنچی تھی؟ میں اس کی تکلیف کو دور نہ سہی لیکن کم تو کر ہی سکتا تھا۔ یکایک ہر مصلحت اور عقل کا ہر تقاضا جیسے کہیں دور سو گیا تھا اور اہم رہ گیا تھا تو صرف ایک انسانی جان کا سوال۔ میری ذات کسی کو وقت سے پہلے قبر میں اتار دے یہ میرے ضمیر کو گوارہ نہ تھا۔ بس اسی لیے میں نے مریم سے وہ سب کہہ دیا جو پتا نہیں مجھے کہنا چاہیے بھی تھا یا نہیں؟" بوجھل لہجے میں بولتا وہ خاموش ہو گیا تو میں جو اسے سنتے سنتے بے آواز رونے لگی تھی اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ اویس۔ میں جانتی ہوں تم نے جو بھی کیا وہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن اگر تم ایک بار مریم کا بے یقین چہرہ دیکھ لیتے نا تو شاید تمہاری مشکل، مشکل نہیں رہتی۔" مریم کا گم سم سا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے لہرایا تو بے اختیار میرے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"جانتا ہوں۔ وہ اتنی حیران رہ گئی تھی کہ پلکیں تک جھپکنا بھول گئی تھی۔" اویس بھی قدرے ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تو میری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں خود اتنا عجیب سا فیل کر رہا تھا کہ اس کے بعد مجھ سے وہاں زیادہ دیر ٹھہرا ہی نہیں جا سکا۔" وہ شرمندہ سا بولا تو میری مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ نا چاہتے ہوئے بھی خاموشی ہمارے درمیان آٹھہری تھی۔

"ہم، ہم ٹھیک تو کر رہے ہیں نا ثمو؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اویس کی متفکر آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تو میں بے اختیار اک بوجھل سانس کھینچ کر رہ گئی۔

"ہماری نیت تو ٹھیک ہی کرنے کی ہے اویس۔ اب آگے جو مرضی معبود۔" میں دھیمے لہجے میں بولی تو دوسری جانب پر سوچ خاموشی چھا گئی۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دو دنوں میں مریم ٹھیک ہو کے گھر آگئی تھی۔ اویس اس دوران ایک بار پھر ہاسپٹل آیا تھا، لیکن مریم سوتی بن گئی اور میں اس کی سختی سے کی گئی ہدایت کے پیش نظر خاموش رہنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ فون پر بھی وہ اویس سے زیادہ لمبی بات کرنے سے احتراز کر رہی تھی۔

اس کا رویہ مجھے الجھا گیا تھا میرے مطابق تو اس کی خوشی دیدنی ہونی چاہیے تھی، لیکن یہاں تو سب کچھ برعکس تھا۔ وہ یکایک کیوں اویس سے گریزاں تھی، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس کی طبیعت کے پیش نظر میں نے اس سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا، لیکن اویس سے میں اس کا یہ عجیب رویہ ڈسکس کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ میری بات سن کے اس نے مجھے فی الوقت اس کے حال پہ چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تھا۔ جسے میں نے اپنی الجھن کے باوجود قبول کر لیا تھا۔

لیکن جب یونیورسٹی دوبارہ جوائن کرنے سے پہلے اس نے مجھے خاص طور پہ بلا کے اویس کو یہ پیغام دینے کے لیے کہا کہ وہ دوبارہ اس سے ایسی کوئی بات نہیں کرے گا، تب میں بے اختیار جھلا اٹھی تھی۔ میری ساری تقریر کے جواب میں اس نے فقط ایک ہی جملہ کہا تھا کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا اور اویس نے خاموشی اختیار نہ کی تو وہ نا صرف یونیورسٹی چھوڑ دے گی بلکہ ہم دونوں سے بھی قطع تعلق کر لے گی۔

اس کے لہجے کی قطعیت ایک پل کو مجھے حیران کر گئی۔ بالآخر میں نے اس کے کہے پہ عمل کرتے ہوئے اویس تک اس کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ جو پوری بات سن کے خود بھی بے حد مطمئن ہو گیا تھا۔ ہر چیز جیسے واپس اپنی جگہ پہ آگئی تھی۔ ہماری دوستی کا تکون بنا کسی کھنچاؤ کے قائم تھا۔ مریم کی وہ خاموش الجھن بھری کیفیت بھی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے دوبارہ پھر کبھی مجھ سے اویس کے متعلق اپنے جذبات شیئر نہیں کیے تھے۔ اس نے اپنے دل کی پہلی اور آخری خواہش، وہ بھی اس وقت جب کہ وہ مجسم ہونے کو تھی، کیوں سمیٹ لی تھی میں سمجھنے سے قاصر تھی۔

☼ ☼ ☼

زندگی اس نارمل ڈگر پہ فقط دو مہینے اور بارہ دن ہی چلی تھی جس کے بعد ہم سب ایک بار پھر ہسپتال کی اسی سرد اور بوجھل فضا میں آکھڑے تھے۔ لیکن اس بار حوصلہ بڑھانے کو امید کی کوئی کرن نہ تھی۔

مریم کی طبیعت اچانک بگڑی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آئی سی یو میں جا پہنچی تھی۔ مشینوں میں جکڑا اس کا وجود اب صرف دعاؤں کا محتاج تھا۔ لیکن شاید جان، مالک حقیقی کے حوالے کرنے کا وقت آگیا تھا۔ اسی لیے وہ ہم سب کی دوہائیوں اور نالوں کے باوجود نہ رکی تھی اور ہم سب بے بسی کی تصویر بنے دیکھتے رہ گئے تھے۔

روکو مجھے مت کہ اب میں نہ رکوں گا
جانا ہے بہت دور کہ اب میں نہ رکوں گا

مریم کے چالیسویں کے اختتام پہ جبین آنٹی نے ایک بند لفافہ لا کر مجھے دیا تھا جو انہیں اس کی الماری میں سے ملا تھا۔

اس پہ لکھے الفاظ "صرف ثمو کے لیے" مجھے حیران کر گئے تھے۔ گھر واپسی پہ میں نے فوراً اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔ دروازہ بند کر کے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے میں نے بے قراری سے بیگ میں سے وہ لفافہ نکالا تھا۔

ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے اس کی تحریر کو دیکھتے ہوئے میں نے احتیاط سے لفافہ چاک کر کے اس کے اندر موجود پرچہ نکال کر پڑھنا شروع کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے ہاتھ پہ کسی کے مضبوط ہاتھ کا محبت بھرا لمس، مجھے اپنی بوجھل آنکھیں کھولنے پہ مجبور کر گیا تھا۔ بے اختیار خشک لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے میں نے اپنے اردگرد موجود اجنبی در و دیوار کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ میں کہاں ہوں۔ تبھی میرے دائیں جانب سے ایک مانوس چہرے نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے جھکتے ہوئے بہت محبت سے اپنے لب میری سرد پیشانی پہ رکھ دیے تھے۔

"بیٹی کی آمد مبارک ہو۔" نرمی سے کہتے ہوئے اس نے یونہی جھکے ہوئے ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکا تو میرے ذہن کی خالی اسکرین جیسے یک لخت روشن ہو گئی۔

"آپ کو بھی!" مسکرا کر کہتے ہوئے میں نے اس کے پر جوش چہرے کی جانب دیکھا تو اس نے وارفتگی سے میرا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا۔ تبھی دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا تو وہ دھیرے سے سیدھا ہوتا آنے والے کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"لو بھئی اپنی لاڈلی کا دیدار کرو۔" ممی نے مسکراتے ہوئے بے بی بلینکٹ میں لپٹا وجود اویس کی طرف بڑھایا تو اس نے سرعت سے اپنی بانہیں پھیلاتے ہوئے اپنے گھر میں اترنے والی رحمت خداوندی کو سمیٹ لیا۔

"ماشاء اللہ کتنی پیاری ہے میری بیٹی۔" والہانہ انداز میں اسے چومتے ہوئے وہ بغور اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیٹی بچی کو تکتے ہوئے بولا۔ تو میں بے قراری سے ممی کے سہارے اٹھ بیٹھی۔

مجھے اٹھتا دیکھ کے اویس نے مسکراتے ہوئے نرمی سے اس چھوٹے سے وجود کو میری نظروں کے سامنے کیا تو ایک پل کے لیے وقت جیسے تھم سا گیا۔

گلابی کمبل میں محو خواب وہ روئی کے گالوں سا نازک وجود، میرے ہی جسم کا ایک حصہ تھا، مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔

کپکپاتے ہونٹوں اور نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ دھیرے سے اسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے میں نے بے اختیاری کے عالم میں اسے اپنے لمس سے آشنا کیا تو وہ ننھی سی پری کسمسا گئی۔

"کیا نام سوچا ہے تم دونوں نے میری نواسی کا؟" ممی کی آواز مجھے اس بے خودی کے عالم سے باہر نکال لائی تھی۔

"مریم' مریم اویس۔" میری اور اویس کی زبان سے بیک وقت ہماری بیٹی کا نام ادا ہوا تو ممی دھیرے سے مسکرا دیں۔

بے اختیار میری محبت پاش نظریں اپنے قابل فخر شریک سفر کی جانب اٹھی تھیں' جو واقعی میرے لیے کس نعمت خداوندی سے کم ثابت نہ ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم کے لیے گرم پانی کا تھرموس سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے میں نے گھڑی کی جانب دیکھا تھا' جہاں رات کے گیارہ بج کے اٹھاون منٹ ہو رہے تھے ایک نظر سوئے ہوئے اویس پہ ڈال کے میں پلٹ کر دیوار گیر الماری کی طرف چلی آئی تھی۔ آہستگی سے الماری کھول کے میں نے اندر موجود لاکر کھولا تھا اور پھر اس میں موجود ایک ہلکا گلابی لفافہ نکال کے میں الماری بند کرتی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی۔ تبھی دیوار پہ لگی گھڑی نے بارہ بجائے تھے۔

"ہیپی برتھ ڈے مائی ڈیئر فرینڈ!" دھیرے سے کہتے ہوئے میں نے ہاتھ میں پکڑے لفافے پہ نرمی سے انگلیاں پھیری تھیں' جس پہ لکھا "صرف ثمو کے لیے" یکایک دھندلا گیا تھا۔

آنکھوں میں آئی نمی حلق میں اتارتے ہوئے میں نے اس لفافے میں موجود' کئی بار کا پڑھا ہوا خط' ایک بار پھر نکال کے پڑھنا شروع کیا تھا۔

عزیز از جان ثمو!

میں یہ تو نہیں جانتی یہ خط تمہیں کب ملے گا' لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جب یہ تمہیں ملے گا' تب میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گی۔ کیونکہ میں اسے اپنی زندگی میں تو کبھی تمہارے حوالے نہیں کروں گی۔ ہاں لیکن میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد یہ تمہیں جلد از جلد مل جائے۔ اس میں وہ سب ہے' جو شاید مجھے وقت کہنے کی مہلت نہ دے یا جو شاید میں خود سے کبھی نہ کہہ سکوں۔

"شکریہ! اس پیار' اپنائیت اور خلوص کے بے بہا خزانے کے لیے جو تم نے ہر ہر لمحہ مجھ پہ نچھاور کیا' ہماری دوستی پہ قربان کیا۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا جو میں بھی تمہارے حق میں اتنی ہی اچھی دوست ثابت ہوئی ہوتی' جتنی کہ تم میرے لیے ہوئیں۔ مجھے اس بات کا گلہ مرتے دم تک خود سے رہے گا کہ جو حقیقت مجھے تمہاری آنکھوں سے پڑھ لینی چاہیے تھی وہ کیوں مجھ پہ ایک بے جان ڈائری نے آشکار کی؟ کیوں تم مجھ سے اپنے دل کی بات چھپانے میں کامیاب ہو گئیں؟ اور میں' میں کیسی دوست تھی تمہاری جو اپنی ہی بچپن کی سہیلی کے اندر کا حال نہ جان سکی۔ جس نے صرف میری خاطر اپنی محبت کو نا صرف انتظار کی سولی پہ لٹکا دیا بلکہ پہروں بیٹھ کے اپنے ہی محبوب کے متعلق میری شدتوں کو بھی سنتی رہی۔

ہاں ثمو' میں اویس کی ڈائری کے ذریعے یہ بات جان گئی تھی کہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو' اور یہ انکشاف کس طرح مجھے میری ہی نظروں میں گرا گیا تھا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ بے لوث محبتیں اور بے غرض چاہتیں کیسے کبھی کبھی آپ کے وجود کو ان دیکھے بوجھ تلے دبا جاتی ہیں یہ میں نے ان دنوں محسوس کیا تھا۔ تم دونوں نے تو حقیقتاً" مجھے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اور تنہا میرے لیے اس بار ندامت کو سہنا مشکل ہو گیا تھا' شاید تبھی میرے اعصاب نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

بعد میں مجھے اپنی اس کمزوری پہ ڈھیروں غصہ آیا تھا۔ میں کیوں اب تک خاموش رہی' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں ہر حال میں تمہیں ساری حقیقت بتا کے تمہاری اچھی طرح خبر لوں گی۔ مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ میرا واسطہ ایک سرپھری سے پڑا ہے۔ جو محبتوں میں صرف کر گزرنے کی قائل ہے سوچنے کی نہیں ہم تم میری محبت میں اس حد تک چلی جاؤ گی' میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا میری پریشانی کو اویس کی خاموش محبت سے منسوب کر کے تم میرے لیے اتنا بڑا قدم اٹھانے پر تیار ہو گئیں کہ اگر کوئی سنے تو شاید یقین نہ کرے۔ اویس کا اظہار محبت اور تمہارا رد عمل' لمحوں میں مجھ پہ یہ حقیقت کھول گیا تھا کہ تم مجھ سے اویس خضر کو بانٹنے چلی تھیں اور وہ بھی اتنی خاموشی سے کہ مجھ ہی کو علم نہ ہو۔

اس لمحے میرے کیا احساسات تھے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں کہیں اپنے اندر چھپا لوں' جہاں کوئی مجھ سے کبھی تمہاری انمول چاہت کا خزانہ چھین نہ سکے۔ تمہارے لیے دائمی خوشیوں کی اتنی دعائیں کروں کہ کوئی غم کبھی تمہیں چھو کر بھی نہ گزر سکے اور تب میں نے خود سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اب سے میں بھی تمہاری راہیں' اتنی ہی خاموشی سے آسان کرنے کی کوشش کروں گی' جتنی کہ ہر لمحہ تم نے میرے لیے کیں اور جن کا علم صرف تمہیں میرے مرنے کے بعد اس خط کے ذریعے ہو سکے۔ تم میرے لیے' اپنا محبوب بانٹنے کے لیے تیار ہو سکتی تھیں تو کیا میں تمہارے لیے' اپنی محبت نہیں سمیٹ سکتی تھی؟ کیا دوستی نبھانا صرف ثمو اکرام جانتی تھی مریم طاہر نہیں؟

بچپن کے بے غرض اور معصوم دور میں جڑنے والے ہمارے اس کھرے اور خوب صورت رشتے کا انجام بھی اتنی ہی سچائی کے ساتھ ہو' میری صرف اتنی ہی تمنا تھی۔ اپنی اس آخری کوشش میں' میں کس حد تک کامیاب رہی میں یہ تو نہیں جانتی۔ لیکن میری دعا ہے کہ اللہ میرے دونوں بے مثال دوستوں کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے نصیب میں لکھ دے جو اتنے بے غرض اور حساس ہیں کہ انہیں اتنا بھی نہیں پتا کہ ہر چیز بانٹنے کے لیے نہیں ہوتی۔ مجھے اپنی یادوں میں ہمیشہ شامل رکھنا۔

تمہاری مریم طاہر۔"

آنسو قطروں کی صورت میرے چہرے کو بھگوتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو نم کرنے لگے تو میں نے سرعت سے اپنی آنکھیں خشک کر ڈالیں۔

دلوں سے جڑی ہستیاں اور ان ہستیوں سے جڑے رشتے کبھی نہیں بھولتے اور مریم طاہر بھی میرے لیے ایسی ہی ہستی تھی۔ ثمو اکرام کے آگے تو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے ساری زندگی پڑی تھی۔ مگر اس کے پاس تو محض چند ماہ تھے۔ لیکن اس نے ان چند مہینوں کے لیے بھی اپنے دل کی پہلی اور آخری محبت کو اپنی دوستی پہ حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ اس نے ساری حقیقت جان لینے کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی اپنی دوستی سے خیانت نہیں برتی۔ پھر چاہے اویس خضر خود کیوں نہ اس کے لیے آزمائش بن کے آکھڑا ہوا۔

اتنی ہمت اور اتنی بے غرضی کا مظاہرہ بھلا کون کر سکتا ہے۔ مگر اس نے اپنا وعدہ وفا کر کے دکھایا۔ اس نے یہ ثابت کر کے دکھایا کہ دوستی نبھانے میں وہ' ثمو اکرام سے بھی دو ہاتھ آگے تھی مگر...... تھوڑے سرپھرے تو ہم بھی ہیں۔

میں نے پلٹ کر مسکراتی نظروں سے بیڈ کی جانب دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہاں سوئی ننھی پری کے پاس آ بیٹھی۔

اس نے ہم سے خود کو اپنی یادوں میں شامل رکھنے کے لیے کہا تھا مگر ہم دونوں نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی کے اہم ترین جز کے طور پہ شامل کر لیا تھا۔ ہم نے اپنی لاڈلی کو اس کا نام دے کر اسے مریم اویس کے وجود میں سمیٹ دیا تھا۔

☼ ☼

عتیقہ ملک

اعتبار حال دل سلامت

ڈوبتے سورج کی لالی اس کی آنکھوں میں انتظار کی کٹھن گھڑی بن کر آن بسی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کی ریاضت ختم ہونے کو تھی مگر ایمان فیروز کی آنکھیں ایک اور رتجگے کی منتظر تھیں۔

اماں ابھی ابھی اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں مگر اس کا جواب ہنوز وہی تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ وہ گزشتہ آٹھ سال سے ہجر کا دکھ اپنی محبت کے ساتھ پال رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسامہ علی اس کے لیے سراپا امید ہے مگر وہ غافل تھی۔ اگر کوئی اسے نئے موسموں کا بلاوا دیتا تو وہ سہم جاتی۔ عشق میں انسان صرف اور صرف محبوب کے نام کا ورد کرتا ہے۔ اس کے آگے ساری دنیا ہیچ ہوتی ہے۔ ہجر کے موسم میں ایک یقین محبت کے ساتھ پلتا رہتا ہے کہ اگر اس نے کسی اور کی طرف قدم بڑھائے تو وہ پتھر کا ہو جائے گا۔

ہجر کا دکھ اس کی ذات میں کہاں سے در آیا تھا؟ محبت کی جوت میں جلنے والی آنکھیں اداسی سے ہجر کے روز و شب دیکھتیں، اس کے دل کی سرزمین پر صرف اور صرف محبت قابض تھی۔

"ہجر کا پودا صرف محبت کی زمین پر پنپ سکتا ہے، کیا اسے میرے دل کی زمین ہی ملی تھی؟" اپنے آپ سے سوال کرتی وہ نڈھال ہو جاتی۔

"جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔" گزرتی ہوا سرگوشیاں کرتی۔

"میرا یقین۔" اس کا دل کرلاتا۔

"اس نے لوٹ کر آنا ہوتا تو وہ جاتا ہی کیوں۔" خاموشی صدا دیتی۔

"کوئی وجہ تو ہوگی جانے کی۔" اس کا دل سراپا احتجاج بنا روتا رہتا۔

"میں جب تک جان نہ لوں اس ہجر کے پودے کی آبیاری کروں گی۔ یہ پودا مرجھا گیا تو ایمان فیروز کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ دے گی۔" اس کا اپنے آپ سے عہد پختہ ہو جاتا۔

☼ ☼ ☼

شب تنہائی نے ان کے دل پر ایک مرتبہ پھر دستک دی تھی اور انہوں نے اپنی ذات کے در وا کر دیے تھے۔ بھاپ اڑاتی چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ کھڑکی سے باہر اندھیرے کو گھور رہے تھے۔ ابھی ابھی اماں انہیں یہ خبر سنا کر گئی تھیں۔ سرما کی سرد ہوا شور مچاتی پھر رہی تھی۔ درختوں کی شاخیں کھڑکی کی سلاخوں پر سر پٹخ رہی تھیں۔ ایسے میں ان ٹہنیوں کا وجود انہیں اپنی ذات سے مشابہہ لگتا تھا۔ وہ بھی تو یوں ہی لاحاصل محبت کے بے آباد جزیرے پر تنہا ہجر کا بن باس کاٹ رہے تھے۔

انہوں نے بھاپ اڑاتی چائے پر ایک نظر ڈالی اور بغیر پیے سائیڈ ٹیبل پر رکھی کتاب کھولی اور سطروں پر نظریں دوڑانے لگے مگر الفاظ جیسے گڈمڈ ہو کر نظروں کے سامنے ناچنے لگے۔ کتاب بند کر کے انہوں نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی سے باہر نظریں جما دیں، جہاں صرف گھور اندھیرا تھا۔

سرسراتی ہوا کا شور، بارش کی ٹپ ٹپ کے بعد گہری خاموشی اور اندھیرے میں ریشم کے گچھوں کی مانند الجھ جانے والی بے سبب سوچیں۔۔۔ رات بہت لمبی ہو گئی تھی مگر ـــــ رت جگے کے مسافر تنہائی کے زہر کو قطرہ قطرہ جاں میں انڈیل رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

لائبریری میں بیٹھ کر نوٹس بناتے ہوئے ان میں سے کسی کو بھی وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا تھا مگر جب ایمان نے گھڑی پر نظر دوڑائی تو جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ڈھائی بج رہے تھے اس وقت تک تو وہ دونوں گھر پہنچ چکی ہوتی تھیں۔

"او مائی گاڈ مریم! جلدی اٹھو۔ ڈھائی تو یہیں بج گئے۔" جلدی جلدی سارے کاغذات فائل میں لگا کر کتابیں سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی تو مریم نے بھی اس عجلت میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

"ٹھہرو نا اکٹھے ہی نکلتے ہیں۔" فروا نے ٹیبل پر رکھی کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار تم لوگ ادھر نکلے ادھر پہنچ گئے۔ ہمیں تو

گاڑی کا انتظار بھی کرنا ہوگا۔" مریم نے تیز تیز بولتے ہوئے اللہ حافظ کہا۔

صبح سے اچھی خاصی دھوپ تھی۔ مگر اب موسم اپنا رنگ بدل رہا تھا۔ بادل اور سورج کی آنکھ مچولی کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ مگر اس وقت موسم کی یہ مستی قطعاً" اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ بس اسٹینڈ پر کھڑی ایک بس نکل رہی تھی۔ مگر ابھی اس نے رفتار نہ پکڑی تھی۔

"باجی جانا ہے آپ نے۔" پائیدان پر کھڑے کنڈیکٹر نے دور سے ہی انہیں دیکھ کر آواز لگائی تھی۔ قصبے تک جانے والی روزانہ کی سواریاں انہیں یوں بھی یاد رہتی تھیں۔ ان کے قریب پہنچنے پر بس کی رفتار قدرے ہلکی ہوئی تو وہ جلدی سے اگلے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھیں۔ یہ واپسی کا آخری اسٹاپ تھا۔ سیٹ تو کوئی خالی نہ تھی۔ مگر درمیان میں بھی ایسی بھیڑ تھی کہ کھڑا ہونا بھی محال لگ رہا تھا۔ کنڈیکٹر بے نیاز بنا دروازے کے بیچ براجمان تھا۔ باقی رہ گئے استاد جی وہ تو سڑک پر نگاہ جمائے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا "چمٹا تاں وجدا" سنتے ہوئے ڈرائیونگ کررہے تھے۔

تیزی سے چلتی ہوئی بس ہچکولے کھارہی تھی۔ ایک جھٹکے پر مریم نے اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش میں ساتھ کھڑے شخص کا بازو پکڑا اور پھر ایک دم ہی بیٹھ گئی تو اس نے زور سے بس کی چھت کو دھڑ دھڑا کر بس ڈرائیور کو رکنے کا سگنل دیا تھا۔

"کس نے اترنا ہے بھئی۔" کنڈیکٹر نے مڑ کر اندر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"استاد پہلے لیڈیز کے لیے سیٹیں ارینج کریں' اس کے بعد گاڑی چلے گی۔" استاد نے مڑ کر پنک شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس چھبیس' ستائیس سالہ بارعب نوجوان کے حتمی انداز کو بغور دیکھا تھا۔

"اوئے لاچی چل بچیوں کے لیے جگہ بنا' نظر نہیں آتا تجھے۔" لاچی نے بھاگم بھاگ سواریاں ادھر ادھر کرتے ہوئے استاد کے حکم کی تعمیل شروع کی تھی۔

"امی کس قدر پریشان ہورہی ہوں گی۔" کھڑکی کے قریب سیٹ پر بیٹھ کر اس نے خود سے قیاس کیا تھا۔ بس کوال گاؤں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ آسمان پر چھائے بادل گھرے ہورہے تھے۔ سیدھی سڑک کے دونوں طرف گندم کے لہلہاتے کھیت شروع ہورہے تھے۔ تیزی سے چلتی ہوئی ہوا کی بدولت جب گندم کے خوشے ایک دوسرے سے ٹکراتے تو کھیتوں میں لہریں سی اٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ مگر قدرت کی اس خوب صورتی سے بے نیاز اس کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ مریم تمام صورت حال سے بے نیاز بنی بس کے مسافروں کا بغور جائزہ لے رہی تھی جو اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

"بھائی ذرا نالے کے پاس روکیے گا۔" کنڈیکٹر کو کرایہ پکڑاتے ہوئے کم از کم چوتھی مرتبہ یاد دہانی کروانے پر مریم قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"ارے یہ تو وہی بندہ ہے۔" بس کے دوسرے دروازے سے نکل کر ان کے آگے چلتے شخص کو دیکھ کر مریم نے بے اختیار کہا تھا۔

"وہی کون؟" ایمان کو کچھ یاد نہ آیا۔

"ارے وہی پنک شرٹ اور بلیک پینٹ والا۔"

"اندھی نہیں ہوں' مجھے بھی نظر آرہا ہے۔" ایمان نے تپ کر جواب دیا۔

"یار وہی جس منحوس نے تھوڑی دیر پہلے ہمیں خواتین کہا تھا۔" مریم نے انتہائی رنجیدہ لہجے میں دانت پیس کر کہا تو ایمان کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔

"یار وہ ڈرائیور نے بچیاں کہہ کر تلافی بھی تو کردی تھی۔" ایمان نے اسے یاد دلایا تھا۔

"ویسے یار لگ رہا ہے یہ تمہیں گھر تک چھوڑنے جارہا ہے۔" مریم کو ایک نیا نکتہ سوجھا تھا۔

"شبنم کی طرح اس کے قدموں میں بیٹھ کر آنکھیں تم پٹپٹا رہی تھیں' الزام مجھ پر دھر رہی ہو۔" ایمان ہنس کر کہتے ہوئے گلی کا موڑ مڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

خیال تھا امی دروازے کے باہر سراپا انتظار ہوں گی۔ مگر ایسا کچھ نہ تھا۔ بلکہ گھر کے اندر آکر بھی اس کی آمد کا کسی نے نوٹس نہ لیا۔

"فٹافٹ چینج کرکے کچن میں آجاؤ۔" امی جو برآمدے میں کھڑے اریشہ کو ہدایات دے رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر حکم صادر کرتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئیں تو وہ سکون کا سانس لیتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔ اریشہ اور فیصل کسی بات پر لڑ رہے تھے۔ ان کی آوازیں کمرے میں بھی باآسانی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ باہر نکلی تو امی نے کچن سے آواز لگائی تھی۔

"فیصل میں نے تمہیں بریانی کا مسالا لینے بھیجا تھا۔ ابھی تم گئے نہیں۔"

"بس امی ابھی گیا۔"

"اریشہ آج کوئی خاص بات ہے۔" اس نے برآمدے کے دھلے فرش کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ برآمدے میں رکھے ہوئے صوفے پر چڑھا نیا کور بھی ماحول کی کسی بڑی تبدیلی کا عکاس تھا۔

"آپی تمہیں کسی نے نہیں بتایا۔ فیصل آباد سے پھوپھو آئی ہوئی ہیں۔ ابا انہیں لینے گئے ہیں۔"

"نہیں سچ؟" وہ یک دم خوش ہوگئی۔

"ویسے کیا وہ ہمارے گھر آئیں گی۔ پھوپھا انہیں اجازت دے دیں گے۔" ساتھ ہی اسے ایک نئی فکر نے آن گھیرا تھا۔

پھوپھو زرینہ کی شادی وٹے سٹے کی بنیاد پر عبدالرحمان سے ہوئی تھی۔ مگر عبدالرحمان کی بہن کم عمر تھی اور پھر فیروز زمان تعلیم حاصل کررہے تھے۔ یوں زرینہ کی شادی انجام پاگئی اور ان کی نند نبیلہ اور فیروز کی شادی چند سال بعد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر یہ چند سال اختتام پذیر ہونے سے پہلے ہی حادثاتی طور پر تقدیر نے فیروز زمان کو ایمان کی ماں نجمہ بیگم کے ساتھ اس بندھن میں باندھ دیا جس پر عبدالرحمان کے پورے خاندان کو جھٹکا لگا۔ زرینہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھیں۔ مگر عبدالرحمان کے پورے خاندان نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ زرینہ کو طلاق دے دیں۔ انہوں نے ہر دباؤ کا سامنا کرتے ہوئے اپنی خوش گوار ازدواجی زندگی کو بچائے رکھا۔ مگر اس شرط پر کہ زرینہ بیگم اپنے میکے سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گی۔ ساتھ ہی انہوں نے زرینہ کو فیصل آباد لے جانے کا فیصلہ کرلیا جہاں وہ ایک مل میں سینئر سپروائزر کے عہدے پر کام کررہے تھے۔ جانتے تھے کہ سسرال میں زرینہ پر زندگی اجیرن ہوجائے گی۔ اپنی بیوی اور بچوں کو انہوں نے زمانے کے سرد و گرم سے بچائے رکھا' سوائے اس کے کہ زرینہ اپنے میکے والوں سے نہیں مل سکتی تھیں۔ پچھلے سال ماں کی شدید بیماری میں شوہر نے انہیں از خود ماں سے ملنے کی اجازت دی اور یوں میکے آنے کی سبیل بنی۔ ماں کے انتقال پر مزید کچھ گلے شکوے دور ہوئے۔

فیروز خان اپنے کسی کام سے فیصل آباد گئے تو بہن کو اطلاع دی کہ وہ زمین' جائیداد کے کچھ معاملات پر بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ عبدالرحمان کو پتا چلا کہ وہ ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ تو فوراً" ہی بیٹے کو لے کر انہیں لینے آگئے۔ فیروز خان' بہن اور بہنوئی کے اس درجہ التفات پر بہت خوش تھے۔ لہٰذا جوں ہی پتا چلا کہ زرینہ اپنی فیملی کے ساتھ گاؤں آئی ہیں اور جیٹھ کے ہاں ٹھہری ہیں تو فوراً" ہی انہیں لینے چلے گئے۔ نجمہ ان کے پیشگی استقبال کے لیے پھرتی سے تیاریاں کررہی تھیں۔

"اماں پھوپھو آئیں گی تو سہی نا۔" ایمان کھانا کھا کر برآمدے میں امی کے پاس چلی آئی' جہاں وہ تمام کاموں سے فارغ ہوکر کمر سیدھی کررہی تھی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں آئیں گی' بھئی یہ ان کی ماں کا گھر ہے اور پھر تمہارے پھوپھا' پھوپھی بڑے سادہ مزاج تھے۔"

"اماں' پھوپھو تو اچھی لگتی ہیں۔ مگر پھوپھا کو سادہ مزاج نہ کہیں۔ بہت گھنے میسنے لگتے ہیں اور کچھ سڑیل۔"

"بدتمیز بڑوں کے بارے میں ایسی رائے دیتے ہیں۔" اماں نے ایک دھموکا اس کی کمر میں جڑ دیا تو اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"اماں میں آپ کو اس لیے کہہ رہا تھا کہ آپ کہیں تصویر کا ایک ہی رخ نہ دیکھتی رہیں۔" وہ کھسیا کر بولا۔
"اچھا بڑا آیا ماں کو رخ دکھانے والا ماں کا باپ۔" تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔
"دیکھو جا کر دروازے پر کون ہے؟" اماں نے کہا۔
"ہمارا گھر کوئی کلفٹن کے ساحل پر تو نہیں بنا ہو کہ ہر وقت دروازے پر کنڈی چڑھائے رکھتے ہیں۔ خوامخواہ میری دوڑیں لگتی رہتی ہیں۔" فیصل بھنا کر بولا اور پھر دروازہ کھولنے چلا گیا۔
"آپ اکیلے ہی آگئے۔" اماں نے ابا کو آتے دیکھ کر اچنبھے سے پوچھا تھا۔
"بتاتا ہوں بھئی' ذرا سانس تو لینے دو۔"
"جا ارشی' ابا کے لیے پانی لا۔" عریشہ سے کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔
"اصل میں عبدالرحمان کے خاندان سے کئی لوگ زرینہ اور بچوں سے ملنے آرہے تھے اور اس کے بھائی اور بھابھی بھی رکنے پر اصرار کررہے تھے تو زرینہ نے کہا کہ کل وہ ہماری طرف آئے گی۔"
"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔" اماں نے اطمینان کا سانس لیا۔
"زرینہ اب مستقل طور پر گاؤں میں رہنے کا سوچ رہی ہے۔ مگر اس کے مکان کی حالت رہنے کے قابل نہیں۔ جب تک کچھ مرمت وغیرہ نہ ہوجائے' میں کہہ آیا ہوں مہینہ لگے یا دو مہینے' جب تک گھر ٹھیک نہیں ہوجاتا' وہ لوگ ادھر ہی رہیں گے۔" ابا نے حتمی انداز میں کہا تو اماں نے اثبات میں سرہلادیا۔

☼ ☼ ☼

دونوں بس سے اتر کر ایک مرتبہ پھر کچی سڑک پر تھیں۔ اچانک سامنے والی گلی سے نمودار ہونے والا بندہ ان کے آگے چلنے لگا مریم چونک گئی۔
"ارے یہ تو وہی ہے۔" یہ اس کی عادت تھی وہ تجسس پھیلانے کی غرض سے اکثر و بیشتر اس طرح کہہ جاتی تھی۔ ایمان نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔
"نہیں یار میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یہ وہی منحوس ہے جس نے ہمیں وہ خطاب دیا تھا۔" کالج کی وائس پرنسپل کچھ تنگ مزاج قسم کی خاتون تھیں۔ بچیوں کو بڑے طنز سے خواتین' خاتون کہہ کر بلاتیں۔ مریم کو اس لفظ سے خاصی چڑ تھی۔ جس کا وہ اکثر و بیشتر ڈھول بھی پیٹا کرتی تھی۔
"ویسے آج پھر یہ اپنی شبو کو چھوڑنے جارہا ہے نا۔" ایمان نے اس کی بات کا بدلہ لیا تھا۔ جہاں سے ان دونوں کے راستے جدا ہوتے تھے' آگے چلنے والا دائیں طرف مڑ گیا تو مریم کھلکھلا کے اللہ حافظ کہتے ہوئے اپنے راستے پر ہولی۔
اس کے آگے چلنے والا شخص یک دم گلی کے اختتام پر رک گیا۔ دائیں اور بائیں دیکھا اور پھر مڑ کر ایمان کو دیکھا تو اس کی جیسے جان ہوا ہوگئی۔
"ایکسکیوزمی۔" وہ اس کے قریب سے گزرنے لگی تو بجائے رکنے کے اس نے اپنی رفتار مزید تیز کرلی بس بھاگنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔
"آپ بہری تو نہیں ہیں۔" اسے اپنے پیچھے جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ جب وہ گھر کے دروازے سے اندر داخل ہونے ہی والی تھی۔ اس نے جلدی سے اندر داخل ہوکر زور سے دروازہ بند کرکے سکون کا سانس لیا تھا۔
"ارے۔" برآمدے تک پہنچ کر اسے اپنے پیچھے گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی تو اس نے مڑ کر دیکھا اور حق دق رہ گئی۔ "اس کی اتنی جرات" وہ بڑے اطمینان سے اندر چلا آرہا تھا۔ برآمدہ خالی تھا۔ وہ تقریباً" بھاگ کر کچن میں داخل ہوئی تھی۔ کیونکہ امی کی آواز یہیں سے آرہی تھی۔
"امی وہ ذرا باہر۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ امی کے ساتھ باتیں کرتی پیڑھی پر براجمان خاتون نے مڑ کر اسے دیکھا۔
"ارے میری بیٹی' میری گڑیا۔" زرینہ پھوپھو نے

اٹھ کر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔
"ممانی یہ لیں' کچھ سامان ماموں نے بھجوایا ہے۔" وہ کچن میں ایک شاپر امی کو پکڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے ہونق کھڑی ایمان پر ایک نظر ڈالی تھی۔
"السلام علیکم۔" ایمان کو یوں لگا اس کی شفاف آنکھوں میں مسکراہٹ جگمگائی ہے۔ اس نے بے دھیانی سے سرہلادیا۔

☼ ☼ ☼

کھانے کی ٹرے اریشہ کمرے میں ہی دے گئی تھی۔ کھانا کھا کر باہر نکلی تو سب چائے پی رہے تھے۔
"ممانی آپ کو مزے کی بات بتاؤں۔" ایمان پر نظر پڑتے ہی اسے یک دم جیسے کوئی لطیفہ یاد آگیا تھا۔
"میں یہاں آتے آتے ایک' دو جگہ راستہ بھول گیا۔ میں نے پاس سے گزرتی ایک خاتون سے پوچھنا چاہا' مگر وہ تو یوں بھاگیں کہ مجھے شک ہونے لگا کہیں جن' بھوت تو نہیں۔"
"شکر ہے اس نے اماں کے سامنے میرا نام نہیں لیا' ورنہ کتنی ڈانٹ پڑتی۔" اس نے خجل ہوکر سوچا تھا۔
"اور جو مریم اس کا "خاتون" کہہ کر مخاطب کرنا سن لے تو کیسے آگ بگولا ہوجائے۔" اچھی خاصی اضطراری حالت میں بھی یہ بات سوچ کر اسے ہنسی آگئی۔ مقابل نے اس کے چہرے پر ابھرنے والی مسکراہٹ کو خاصی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ "تو یہ ہیں عادل رحمان' پھوپھو کے سب سے بڑے سپوت۔" رات کو بستر پر لیٹ کر سونے سے پہلے اس نے خاصی دیر تک سوچا تھا کہ وہ مریم کو کیسے اسی کے انداز میں اطلاع دے گی۔ سوچتے سوچتے نیند کی دیوی مہربان ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

پھوپھو کا گاؤں آکر ان کے گھر قیام کرنا اس بات کا ثبوت تھا کہ رنجشوں کی دیوار مکمل طور پر گرچکی ہے۔ اگرچہ پھوپھو کے سسرال میں بہت سے لوگوں کو ان کا یوں بھائی کے گھر قیام کرنا کھل رہا تھا۔ مگر گزرتا وقت بہت سے لوگوں کے مقام تبدیل کرگیا تھا۔ لہٰذا ان کے اعتراضات کا پلڑا ہوا میں ڈانواں ڈول ہورہا تھا۔ کیونکہ رحمان پھوپھا کا خیال تھا کہ تقدیر کے لکھے کو وہ کسی کے لیے مزید سزا نہیں بنائیں گے۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جانے میں ہی بہتری ہے۔ ان کی بہن نبیلہ اپنے گھر میں شادو آباد تھیں اور یہی ان کے لیے اہم تھا۔ جو کچھ ہوا اس پر اب وقت کی دھول بیٹھ چکی تھی۔
امی' ابا کے انداز میں زرینہ پھوپھو کے لیے بہت گرم جوشی تھی' تو پھوپھو بھی سرخوشی کی کیفیت میں تھیں۔ عریشہ کی فرزانہ سے بہت دوستی ہوگئی تھی۔ بلکہ وہ تو عادل کے بھی بہت آگے پیچھے پھر رہی تھی۔ عادل کے وجود نے اس کے لیے بڑے بھائی کی کمی دور کردی تھی۔ مگر ایمان اس سے جھجک محسوس کرتی تھی۔ لہٰذا ریزروہی رہتی۔ چند ہی دنوں میں ایک بات تو اس نے مان لی کہ پھوپھو کے دونوں بچے بہت سلجھے ہوئے تھے۔ گڑیا سی دکھنے والی فرزانہ شوخ و چنچل طبیعت کی شرارتی سی مؤدب بچی تھی۔ ہمہ وقت مصروف رہنے والا عادل رحمان' متناسب قد' خوب صورت شکل کے ساتھ سوبر سے انداز' ہونٹوں پر ہر وقت کھلنے والی دوستانہ سی مسکراہٹ اس کی شان دار شخصیت میں مزید اضافہ کرتی تھی۔
پھوپھو تقریباً" پندرہ سال سے فیصل آباد میں تھیں۔ ان کا یہاں گاؤں میں گھر اتنے عرصے سے بند ہونے کی وجہ سے رہائش کے قابل نہیں تھا۔ کچھ رینوویشن اور کنسٹرکشن کی ضرورت تھی۔ عادل آتے ہی اس کام میں لگ گیا۔ اس سلسلے میں زیادہ تر غائب رہتا۔ مگر جب بھی آتا اس کا واسطہ ایمان سے پڑتا۔ کیونکہ وہی سب کے کھانے پینے اور دیگر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ امی یا تو کچن میں مصروف رہتیں' باقی تمام وقت آنے جانے' خوشی غمی اور دیگر سوشل سرگرمیوں میں پھوپھو کے ساتھ گزار دیتیں۔ پہلے دن کی بدحواسی پر اس نے خود کو دل ہی دل میں کوسا تھا۔ اور اب

نہایت محتاط طریقے سے اعتماد کے ساتھ وہ عادل سے مخاطب ہوتی۔ مگر ادب و آداب کا بھی خیال رکھتی۔

ان سب کا علی انکل کے باغ میں جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ وہ جانے پر ہرگز تیار نہ تھی۔ مگر فرزانہ اور عریشہ نے اسے زبردستی گھسیٹ لیا۔

"دیکھیں نا امی اپی کو کتنا تنگ کر رہی ہیں ہمیں۔" فرزانہ نے پھوپھو سے اس کی شکایت کی تھی۔

"نہیں خیر تنگ تو تم لوگ کر رہے ہو ایمان کو۔"

"بیٹا چلی جاؤ' سب بہن' بھائی اصرار کر رہے ہیں۔" پھوپھو نے بھی ان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

"مگر پھوپھو اتنا سارا کام پڑا ہے' پھر میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟"

"کام' میں اور بھابھی کر لیں گے اور یہ جو ہر وقت کتابی کیڑا بنی رہتی ہو' یا کچن میں گھسی ہوتی ہو تو تمہاری بھی تھوڑی سی آؤٹنگ ہو جائے گی۔" پھوپھو کے اصرار پر بالآخر اسے بھی ماننا پڑا تھا۔

پانچ منٹ کی واک پر وہ سب یہاں تھے۔ وہ' دو افراد کی دو ٹیمیں بنا کر میچ کھیلا جا رہا تھا۔ جبکہ وہ نالے کے قریب پتھریلی چٹانوں پر بیٹھی پانی میں پتھر پھینکنے کا شغل کر رہی تھی۔

"آپ یہاں آکر کیوں بیٹھ گئیں' کھیلنے سے دلچسپی نہیں تھی تو دیکھ ہی لیتیں کم از کم ایک تماشائی تو ہوتا۔" عادل اس کے قریب چٹان پر آکر بیٹھ گیا۔

"مجھے اس کھیل کے بارے میں کچھ علم نہیں اور یوں بھی یہاں بیٹھنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیتے ہوئے اپنا شغل جاری رکھا۔

"واقعی آپ یہاں بیٹھے' بہت اچھی لگ رہی تھیں سب سے الگ' سب سے منفرد' جیسے کسی مصور کا کوئی شاہکار' کوئی خوب صورت پینٹنگ۔" اس لمحے ایمان نے بے ساختہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا' مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"میرا دل چاہ رہا تھا میں اس سامنے والی چٹان پر جا کر وہاں سے آپ کو دیکھوں یقیناً" یہ منظر وہاں سے اور بھی خوب صورت لگتا ہوگا۔" ایمان کا پتھر پھینکتا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔ عادل رحمان نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور اس لمحے اس کی جگر جگر کرتی شفاف آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ ایمان کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے یک دم نظریں جھکا لیں

"بھائی جان ایک اور میچ ہو جائے۔" فیصل بھاگ کر اس طرف آیا تو جیسے ماحول کا سحر ٹوٹ گیا۔ اس نے ان دونوں کو جاتے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر گزرے لمحے کے سود و زیاں کا حساب کرنا چاہا۔ شاید وہ لمحہ ان دونوں پر بھاری گزرا تھا۔ ہاں یقیناً" ایسا ہی تھا کہ تیزی سے گزرتا وقت اس کے نشان چھوڑ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھوپھو اپنے گھر شفٹ ہو گئیں تو وقت جیسے تھم گیا۔ گھر میں پھیلا سناٹا اسے عجیب سے خالی پن کا احساس دلاتا تھا۔ مگر شام کو پھوپھو اپنی فیملی کے ساتھ آجاتیں تو ماحول پر چھایا جمود جیسے ٹوٹ سا جاتا تھا۔ امی برآمدے میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ وہ صفائی سے فارغ ہو کر کمرے میں بیٹھی۔ پھوپھو کی آواز سن کر باہر نکلی۔ وہ امی کے ساتھ چارپائی پر براجمان نہ جانے کس کی بیماری کا حال سنا رہی تھیں۔ وہ بھی انہیں سلام کرتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔

"ایمان بیٹا! میرے لیے ایک کپ چائے تو بنا لاؤ۔ آج دو' تین گھروں میں جانا تھا۔ بہت تھکن ہو گئی ہے۔" وہ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد چارپائی پر ایزی ہو کر اس سے کہنے لگیں تو ایمان کو یوں لگا جیسے وہ اسے وہاں سے ٹالنا چاہ رہی ہیں۔ سو وہ کچن کی طرف چل دی۔

"یہ سچ ہے آپا کہ اسامہ کی ماں بچپن سے ہی ایمان کے لیے کہتی آئی تھیں۔ مجھے اور فیروز کو بھی اعتراض نہ تھا۔ مگر اب میرا دل نہیں مانتا اور پھر مجھے یہ بھی امید نہیں ہے کہ آپ کے بھائی اس رشتے کے لیے مانیں گے' اس لیے وہ بات تو ختم سمجھیں۔ یوں بھی کون سا بات پکی ہوئی تھی۔" چائے دینے آئی تو اماں انہیں بتا

رہی تھیں۔ موضوع ایسا تھا کہ اسے بیٹھنا مناسب نہ لگا اس لیے اپنے کمرے میں آگئی۔

اسامہ علی ' خالہ زینب کے بیٹے تھے۔ اعلا تعلیم یافتہ اور خوب صورت ' واپڈا میں انجینئر تھے۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں ٹانگ فریکچر ہوئی اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ پھر صحیح طرح اپنے پاؤں پر نہ چل سکے۔ لاٹھی کے ساتھ لنگڑا کر چلتے تھے۔ اس ایکسیڈنٹ کے بعد انہوں نے اپنی جاب سے استعفیٰ دے دیا تھا اور مقامی کالج میں سائنس ٹیچر کی جاب اختیار کرلی۔ اگر کوئی بات تھی تو ایمان اس سے ناواقف تھی اور اس بات سے بھی بے خبر کہ اسامہ علی اب بھی وہی خواب دیکھتے تھے، جو اولین عمر میں ان کی پلکوں پر اترا تھا۔

☼ ☼ ☼
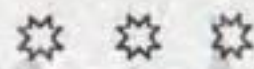
"آج دن کے وقت آپا آئی تھیں۔" سونے سے پہلے وہ گرم دودھ کا گلاس ابا کو دینے آئی جب اماں کی آواز پر اس کے قدم تھم گئے۔

"تو اس میں کون سی نئی بات ہے۔ وہ تو آتی ہی رہتی ہیں۔" ابا نے لاپروائی سے کہا۔

"آج وہ ایک خاص مقصد سے آئی تھیں۔ ایمان کے لیے کہہ رہی تھیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ ایمان کو وہ اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔"

"اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے کہ ایمان ' آپا جان کے گھر جائے۔" ابا کی آواز میں خوشی کی کیفیت محسوس کی جاسکتی تھی۔

"یوں بھی وہ ہماری بڑی ہیں۔ ہم ان کی بات رد نہیں کرسکتے ہیں۔" اماں کہہ رہی تھیں۔

"میں نے بھی کہہ دیا کہ ایمان آپ کی بیٹی ہے ' آپ اس کے بارے میں جو فیصلہ کریں گی سر آنکھوں پر۔"

بتا رہی تھیں کہ جمعہ کو رحمان بھائی کے ساتھ باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گی۔" اماں مزید تفصیل بتا رہی تھیں۔ ایمان پلٹ کر کچن میں آگئی۔ اسے اماں ' ابا کا سامنا کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس سے پہلے کہ پھوپھو کی فیملی رسمی طور پر ان کے ہاں حاضری دیتی۔ پھوپھو کے جیٹھ مراد اپنی بیوی شہربانو کے ساتھ ان کے گھر آن پہنچے۔ ابا بھی گھر پر موجود تھے۔ حیران تو بہت ہوئے ' کیونکہ ' بہن ' بھائی کا ملنا ملانا انہیں سب سے زیادہ ناگوار گزرتا تھا۔ مگر خیر بڑے ادب واحترام سے ' بیٹھک میں بٹھایا اور ایمان کو چائے ' پانی کا انتظام کرنے کو کہا تھا۔

"ارے نہیں بھائی صاحب ' اس کی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔ وہ منظور ہوگئی تو مل بیٹھ کر چائے بھی پییں گے اور مٹھائی بھی کھائیں گے۔" مراد چاچا نے بولنا شروع کیا تھا۔

"جی حکم کریں۔" ابا ٹھٹک گئے۔

"بات یہ ہے بھائی صاحب ' ہم چاہتے ہیں کہ..... پرانی رنجشیں اور....."

"اف اوہ آپ تو... میں بتاتی ہوں۔" شہربانو خالہ کو کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔

"اصل میں ہم لوگ آپ کے آگے جھولی پھیلانے آئے ہیں۔ اپنے پتر سجاد کے لیے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر....." ابا نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"انکار مت کیجیے گا بھائی صاحب ' ہم بڑی امید لے کر آئے ہیں۔ اصل میں ہمارا اک ہی تو پتر ہے ہم اس کے لیے کوئی گنوں والی کڑی چاہتے ہیں۔" دیگچی میں پانی ابل ابل کر خشک ہو رہا تھا مگر ایمان ' بیٹھک سے آتی آوازیں سن کر حق دق کھڑی تھی۔

"بات یہ ہے بھاء فیروز اور نجمہ بھرجائی ' ہماری دھی رشمال کی بات تو رحمان کے پتر کے ساتھ بچپن سے ہی پکی ہے۔ اللہ بخشے ہماری ساس جنت مکانی وہ یہ بات طے کر گئی تھیں۔" شہربانو خالہ کی آواز پر ایمان کے ہاتھ سے پتی کا ڈبا چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

"بہن شیراں اور بھاء مراد آپ لوگ ہماری بھی تو

☼ ☼ ☼

امی کی خالہ زاد بہن زہراں کے بیٹے کی شادی تھی، اگرچہ اس کے پاس بالکل بھی ٹائم نہیں تھا۔ مگر امی اور عریشہ کے اصرار پر مہندی کی رسم میں شریک ہوئی تھی۔ سب سے الگ تھلگ پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی وہ مختلف رسمیں انجوائے کر رہی تھی جب ریشماں اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوئی۔ ریشماں جواب دینے کے بجائے ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔" ایمان نے الجھ کر پوچھا۔

"دیکھ رہی ہوں کہ کیا ہے ایسا تم میں جو وہ مجھے چھوڑ کر تمہیں اپنانے کی ضد کر بیٹھا۔"

"تو اسی سے پوچھ لیتا تھا۔" اس نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔

"مگر میں تو پہلے سے ہی جانتی ہوں۔"

"کیا؟"

"کہ جسے ہاتھ بڑھا کر چھونے کی تمنا لیے بیٹھا ہے وہ تو در اصل داغ لگا چاند ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" ایمان غرائی تھی۔

"سچ کڑوا ہوتا ہے مگر دو سال پہلے... گاؤں...." ایمان اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

جس روز اس کا آخری پیپر ختم ہوا، اس سے اگلے روز اسے مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ مہندی سے ایک روز پہلے پھوپھو حواس باختہ سی ان کے گھر آئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں وہ پرچا تھا جو عادل کے کمرے سے ملا تھا۔

"امی! میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں، شاید کبھی لوٹ کر نہ آسکوں، مجھے معاف کر دیجیے گا۔ آپ کا نافرمان بیٹا عادل۔"

وہ صبح سے گھر سے غائب تھا۔ صبح دوپہر میں اور دوپہر شام میں بدل گئی تو پورے گھر میں اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور پھر اس کے کمرے کی رائٹنگ ٹیبل سے یہ تحریر ملی تھی وہ گھر چھوڑ کر کیوں چلا گیا اس کا جواب پھوپھو سمیت کسی کے پاس نہ تھا۔ مگر ایمان فیروز نے اس جواب کی جستجو میں اپنے آپ کو رول دیا تھا۔

"آخر کیوں؟" اس کی روح کرلاتی سوال کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"آپی کو یوں ویران و تنہا دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے اسامہ بھائی۔" عریشہ اپنے گول مٹول بچے کے ہمراہ ان سے ملنے چلی آئی تھی۔

"آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں۔ وہ لاحاصل انتظار میں خود کو کیوں برباد کر رہی ہیں۔" عریشہ الٹا ان سے الجھ رہی تھی۔

"واقعی مجھے ایک دفعہ اس بات تو کرنی چاہیے۔" وہ اس وقت کہاں ہوگی یہ ان سے بہتر کون جا سکتا تھا۔ سو وہ وہیں چلے آئے تھے۔

ہر جمعرات کی شام وہ چلن شاہ کے دربار پر دیا جلاتی تھی، اس نے کہیں سنا تھا یوں دیا جلانے سے بھٹک جانے والے مسافر لوٹ آیا کرتے ہیں اور ہر شام آتے جاتے وہ گھنٹوں انگڑ کے کنارے چٹانوں پر بیٹھتی پانی میں پتھر پھینکا کرتی، پانی میں ایک عکس بنتا بگڑتا رہتا، وہ ہر شے سے بے نیاز ہو جاتی، نالے کے رواں پانی کے سکوت میں وہ عکس پانی میں سے ابھر کر مخاطب ہوتا۔

"واقعی آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں، سب سے جدا، سب سے منفرد جیسے کسی مصور کا کوئی شاہکار۔"

"سامنے والے پتھر سے یہ منظر اور بھی بھلا لگتا ہوگا۔" برسوں پہلے کا ظالم لمحہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا، اور اس کا ہاتھ ایک مرتبہ پھر فضا میں معلق رہ جاتا۔ اپنے پیچھے آہٹ پر اس نے سر اٹھایا تھا۔ آج پہلی بار اسامہ علی اسے یوں ڈھونڈنے نکلے تھے۔

"جہاں محبت بسیرا کر کے کوچ کر جائے وہ دل کھنڈر ہو جاتے ہیں اور کھنڈرات میں انسان پناہ نہیں لیتے، جن بھوت اپنے ٹھکانے بنایا کرتے ہیں۔" ان کے کچھ کہنے سے پیشتر وہ بول اٹھی تھی۔

"میری ذات سے آپ کو کوئی خوشی نہیں مل سکتی اسامہ بھائی۔" وہ یک ٹک اسے دیکھتے رہ گئے انہیں لگا کچھ بھی کہنا بے کار ہوگا۔

"جب وہ اپنے دل کو نہیں سمجھا سکتے تو کوئی اور واپسی کا نشاں کیسے ڈھونڈ سکتا ہے۔" اسامہ علی سے بہتر کون جا سکتا تھا کہ محبت، عشق اور جنون کی راہوں میں واپسی کا کوئی نشان نہیں ملتا، بے سبب مسافت ہر راہی کا مقدر ہوتی ہے چاہے کسی کو منزل ملے یا پھر کوئی سراب کی آس لگائے راستہ کھو بیٹھے، نہ جانے اس روز ایمان فیروز کے دل میں کیا سمائی اس نے کسی کی واپسی کی تمنا کرنے کے بجائے دیا جلاتے ہوئے اپنے دل کے آباد ہونے کی دعا مانگی تھی۔

شاید یہ گزشتہ رات کا اعجاز تھا جو اسامہ علی نے اس مزار کے احاطے میں دیوار سے ٹیک کر لگا کر گزاری تھی۔

واپسی پر اسے شاہ والی بن کے پاس ریشماں جاتی ہوئی دکھائی دی اور شاید یہ پہلی بار ہوا تھا کہ ایمان کا سامنا ہونے پر نہ تو اس کی آنکھیں مسکرائیں اور نہ ان میں استہزا کی کوئی جھلک دکھائی دی تھی۔ زرد چہرے، اجڑے بالوں اور ساکت آنکھوں کے ساتھ وہ اسے ریشماں کی روح لگی جو بھٹک رہی تھی۔ ڈیڑھ سال پہلے ریشماں کی شادی دوسرے گاؤں ہوئی تھی مگر اس کا شوہر صرف نو ماہ کے قلیل عرصے میں ٹی بی کا شکار ہو کر داغ مفارقت دے گیا تھا اور اپنی اس بدنصیبی کی ذمہ دار بھی وہ خود ہی ٹھہرائی گئی، ایمان نے گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے دیکھا، ریشماں کھجوروں کے جھنڈ کے پاس رک کر اس پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک ملگجی سی شام پھوپھو ایک مرتبہ پھر حواس باختہ مگر خوش خوش بھائی کے گھر آئی تھیں۔ عادل رحمان

واپس آگیا تھا اور یہ ان سب کے لیے اتنی بڑی خوش خبری تھی کہ کسی نے بھی بزور اصرار اس سے جانے کی وجہ نہیں پوچھی تھی۔
"کیا یہ کافی نہیں کہ میں واپس آگیا ہوں پچھلی باتوں کو دہرانا بہت ضروری ہے کیا؟" رحمان پھوپھا کے پوچھنے پر اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔
"کیا کرتے ہیں آپ بھی یوں ہی بچے کو پریشان کررہے ہیں۔" پھوپھو نے الٹا انہیں لتاڑ دیا تھا۔
"کسی کے لیے جاننا بے شک ضروری نہ ہو مگر اس کے لیے تھا جس نے ایک عرصہ تک سماج کی سوالیہ نظروں اور جملوں کا سامنا کرتے ہوئے کانٹوں بھرے اس راستے پر چلنے کا سودا کیا تھا۔ آج سے آٹھ سال' ایک ماہ اور اٹھارہ دن پہلے کی اس شام عادل رحمان اسے زمانے کے سامنے رسوا کیوں کر گیا تھا؟" وہ اس کے سامنے نہیں آئی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے خود آکر بتائے گا۔ پھوپھو بہت ہی جلدی میں نکاح کی کوئی تاریخ رکھنا چاہ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

عادل نے عریشہ کے ہاتھ ایک لمبا چوڑا خط بھیجا تھا اور وہ خط پڑھ کر اسے اپنا آپ ڈوبتا ہوا محسوس ہوا جس آس میں اس نے خود کو رول دیا تھا وہ آس تو ایک دھوکا تھی۔ ایک ایسا دھوکا جس نے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کردیا تھا۔ سردیوں کی طویل راتوں میں جاگ کر اور گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں تنہا بھٹکتے ہوئے اس کے دل نے جس یقین کا ورد کیا تھا وہ یقین تو ایک سراب تھا آنسو اس کے گال بھگو رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ارے یہ تو گیٹ پر تالا لگا ہے۔" عرشی اور ابا اتوار کے روز اس سے ملنے ہاسٹل آئے تھے۔ مگر گیٹ پر تالا لگا دیکھ کر تو جیسے ان کی جان نکل گئی' گورنمنٹ کی طرف سے ہاسٹل بلڈنگ زیر تعمیر ہونے کی وجہ سے کالج کے ساتھ کوٹھی کرائے پر لے کر ہاسٹل چلایا جارہا تھا جس کا انتظام پرنسپل کے پاس تھا۔

"ارے بیٹا بات سننا' یہ ہاسٹل والے کہاں گئے۔" فیروز صاحب نے پاس سے گزرتے ایک نوجوان کو روکا جو دودھ کی کیتلی اٹھائے گلی سے گزر رہا تھا۔
"بزرگو کالج میں چھٹیاں ہوگئی ہیں تو ظاہر ہے ہاسٹل بھی بند ہوچکا ہے۔"
"نہیں بیٹا... مگر... میری بیٹی ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔"
"آپ بھی بہت معصوم ہو بزرگو اب کالج بند ہونے کے بعد ہاسٹل کھلا ہونے کا کیا جواز ہوگا؟"
"ابا آپی کہاں گئیں۔" عرشی تو رونے پر آگئی تھی۔
"بیٹا پریشان نہیں ہوتا' مل جائے گی ایمان۔" فیروز صاحب اس پریشانی کے عالم میں بیٹی کو تسلی دے رہے تھے اور پھر انہوں نے قریبی پی سی او سے گاؤں میں ایک دو قریبی لوگوں کو فون کرکے پہنچنے کو کہا کہ ایمان گم ہوگئی ہے اور کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ چونکہ گاؤں میں گھر گھر فون نہیں تھے لہٰذا انہوں نے جنرل اسٹور پر فون کرکے یہ پیغام بھجوایا تھا۔
"یہ آپ لوگوں کا کیا مسئلہ ہے بھائی صاحب۔" فیروز جہاں سے فون کررہے تھے پی سی او کے کاؤنٹر پر بیٹھا شخص ان کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اور یوں فیروز صاحب نے اسے تمام تفصیل بتادی۔
"میرا خیال ہے کالج سے چند گز کے فاصلے پر پرنسپل کا گھر ہے ان سے پتا کرلیں بلکہ ٹھہریں میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ اوئے کاکے ذرا میری دکان کا خیال رکھنا۔" وہ شخص سامنے والے اسٹور کیپر کو ہدایت کرکے ان کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔
"بچیاں تو ہاسٹل میں ہیں۔ موسم گرما کی تعطیلات کے باعث باقی کلاسز کی بچیاں تو گھر چلی گئی ہیں۔ سیکنڈ ایر کی چند بچیاں پیپرز کی وجہ سے رہ رہی ہیں۔" پرنسپل نے ان کی بات سن کر اطمینان سے جواب دیا تھا۔
"مگر وہ گیٹ پر تالا..." اور پھر تمام تر تفصیل سن کر ان کی جان میں جان آگئی تھی۔ ہاسٹل پر ڈیوٹی دینے والا ایک پیون کسی ضروری کام پر چھٹی پر تھا۔ دوسرے گھر سے ایمرجنسی کی اطلاع آگئی تو وارڈن نے اسے

پرنسپل کے گھر کی طرف روانہ کیا تاکہ انہیں بتا کر اجازت لے اور ساتھ ہی وہ اپنا ذاتی ملازم گیٹ پر بیٹھنے کے لیے بھجوادیں' جاتے ہوئے وہ ملازم گیٹ پر تالا لگا گیا کہ ابھی دوسرا ملازم آکر کھول دے گا۔ جب تک فیروز علی کے ہوش ٹھکانے آئے تب تک گاؤں میں جنرل اسٹور کا مالک یہ واقعہ چند لوگوں کے گوش گزار کرچکا تھا۔ بات اگرچہ زیادہ نہ پھیلی مگر اس واقعہ سے دلبرداشتہ ہوکر فیروز صاحب نے آئندہ ایمان کو ہاسٹل نہ بھیجا بلکہ وہ روزانہ بس پر آتی جاتی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ویسے تو ایمان اچھی لڑکی ہے مگر شاید تم اس کے بارے میں سب کچھ نہیں جانتے۔" شادی سے چند روز پہلے ریشماں نے اس سے کہا تھا۔
"کیا مطلب؟"
"جب وہ ہاسٹل میں رہتی تھی تو کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور بڑی کوششوں کے بعد اسے واپس لایا گیا تھا۔"
"تمہیں شرم آنی چاہیے اس طرح کی بات کرتے ہوئے تم بھی چاچا چاچی کی طرح..." عادل کا خون کھول اٹھا تھا۔
"میری بات پر یقین نہیں آتا تو اپنے ماموں جان کے پورے خاندان سے تصدیق کرلو۔"
"مجھے کسی سے تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں' میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"
"میں تمہیں اتنی بڑی گارنٹی دے رہی ہوں' پھر بھی میری بات کا یقین نہ کرو تمہاری مرضی۔"
"کیسی گارنٹی؟" اس کے اندر کا شکی مرد جاتے جاتے پلٹ پڑا تھا۔
"یہی کہ اگر تم اس کے گھر والوں سے پوچھ لو تو وہ بھی اس بات سے انکار نہیں کریں گے۔" اور وہ اس کی بات پر حیرت کا بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔
"حیران ہوگئے ہو نا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ ایمان گم ہوگئی تھی پھر مل گئی۔ اور اس بارے میں کوئی فرضی کہانی گھڑ کر سنادیں گے۔" عادل خاموش رہا مگر ریشماں کا پر یقین لہجہ الجھن میں ڈال رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ارے عادل بھائی یہ بھی بڑے مزے کی بات ہے' میں اور ابا آپی سے ملنے ہاسٹل گئے اور آگے سے ہاسٹل بند..." اس کے پوچھنے پر عریشہ نے اسے بہت پر تجسس انداز میں بتانا شروع کیا تھا۔
"ایک بندے سے ابا نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ چھٹیوں کی وجہ سے ہاسٹل تو بند ہوچکا ہے۔" مزے مزے سے بات کرتے ہوئے اس نے یہ تک نہ دیکھا کہ عادل کا چہرہ کس طرح دھواں دھواں ہورہا ہے۔
"عرشی عادل بھائی کے لیے چائے لے جاؤ۔" کچن میں کام کرتی اماں نے اسے آواز دی تھی۔
"میں آپ کو واپس آکر بتاتی ہوں۔" وہ چائے لینے گئی۔ مگر واپس آئی تو برآمدے میں کوئی بھی نہ تھا۔
"کمال ہے عادل بھائی چائے پیے بغیر کیوں چلے گئے۔" حیرت سے کندھے اچکا کر اس نے چائے کا

کپ منہ سے لگالیا تھا۔

اور پھر اس نے گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ فون کی تیزی سے پھیلتی سہولت کی بدولت اس کا صرف ریشماں سے رابطہ رہا اور پھر وہ رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔ یادوں پر وقت کی گرد پڑتی چلی گئی جب ایک روز اسے ریشماں کا خط موصول ہوا تھا۔ وہ اجڑ گئی تھی اور اس کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھتی تھی کیونکہ اس نے دو دلوں کو برباد کیا تھا ریشماں کا خیال تھا اس کی خوشیاں اس وجہ سے ہی روٹھ گئی تھیں اور تمام تر حقیقت عادل کو بتا کر اس نے معافی مانگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آبلہ پائی کے اس سفر میں' میں تنہا تھی۔ تم میرے ساتھ نہیں تھے عادل رحمان۔ تم میرے لیے لوٹ آتے تو کوئی بات بھی تھی۔ مگر تم نے تو اپنے لیے واپسی کا راستہ چنا ہے زندگی کے اتنے موسم بیت جانے کے بعد تمہیں ایک ایسے ہم سفر کی ضرورت ہے جس کی ذات ایسا صاف شفاف آئینہ ہو جس میں تمہیں اپنی جھلک نظر آئے' مگر اب یہ کیسے ممکن ہو گا؟ تمہاری جدائی نے بہت سے لوگوں کے لیے میری ذات کو سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔" وہ خود کلامی کرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی اور پھر یک دم بھاگتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

صبح سے بارش کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور ابھی ابھی موسم کی شدت میں معمولی سا ٹھہراؤ آیا تھا۔ دسمبر کی اس سرد سی شام میں جب اس گاؤں کے مکین ٹھنڈ سے بچنے کے لیے آتش دانوں کے آگے بیٹھے تھے۔ ایمان تیز قدم اٹھاتی کبھی بھاگنے لگتی۔ خالہ کے گھر تک پہنچنے کے لیے اس نے کھیتوں کا راستہ اختیار کیا تھا۔ پاؤں میں چبھنے والے کانٹوں اور دامن سے الجھنے والی جھاڑیوں کی پروا کیے بغیر وہ چلتی چلی گئی۔ سرد ہوا اس کے گالوں پر گلابیاں بکھیر رہی تھی۔ فضا میں موجود نمی نے آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں سے مل کر اس کے چہرے کو مزید گیلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہو کر اس نے آنسو صاف کیے اور اس دروازے پر شاید پہلی اور آخری مرتبہ دستک دی تھی۔ دروازہ پہلی دستک پر کھل گیا اور اسامہ اسے یوں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا **نقصان** بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
کچھ راکھ لیے جھولی میں اور سر پر ساہوکار کھڑا
جب دھرتی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سر سنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
کچھ الفاظ جنہیں معانی نہ ملے
کچھ گیت شکستہ جانوں کے
کچھ پر پاگل پروانوں کے

آج جب اسامہ علی کے گھر کی منڈیروں پر برقی **قمقمے** رقصاں تھے۔ عادل رحمان انکڑ کے کنارے' جسم و جاں کو چیر دینے والی سردی میں کسی بھی سویٹر شال سے بے نیاز اسی چٹان پر بیٹھا پانی میں پتھر پھینک رہا تھا۔ جہاں پہلی مرتبہ اس کے دل کے ایوان میں محبت کی پہلی کرن بکھری تھی۔ وہ چہرے پہچاننے کے ہنر سے ناواقف تھا یا محبت نبھانے کے رموز سے ناآشنا!

ایک بات تو اچھی طرح جان گیا تھا کہ محبت اعتبار کے بغیر ہمیشہ ادھوری رہتی ہے۔ اور ادھوری محبتیں کبھی پروان نہیں چڑھتیں اپنی منزل کے راستے میں دم توڑ دیتی ہیں۔ اندھیرے کے بڑھتے سایوں میں انکڑ کے پانی میں گرنے کی آواز دور سے آتی ڈھول کی تھاپ میں معدوم ہوتی چلی گئی تھی۔

☼ ☼

رب کریم کی تخلیقات میں جن وانس، چرند پرند، زمینی و آبی جانور سمیت کیڑے مکوڑے اور بے شمار قسم کے حشرات الارض دنیا میں موجود ہیں۔ مالک دو جہاں نے رنگ رنگ کے جاندار پیدا فرمائے اور تمام مخلوقات میں سے افضل ترین درجہ انسان کو عطا کیا گیا اسے "اشرف المخلوقات" کہا گیا۔ اسے زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجا، اسے عقل ودیعت کی اور اسی کے فائدے کے لیے بے شمار زمینی و آبی جانور، نباتات، چرند پرند تخلیق فرمائے تاکہ اپنی افضل ترین مخلوق کے لیے آسانیاں پیدا کر سکے۔

"اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"

وہ سب کا رب ہے، اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کے پیار کرنے والا، اس کی زبان و رنگ، نسل، ذات، شکل و ہیت سے بے نیاز اس پر رحم کرنے والا، اس کی ہونٹوں کے قفل میں بند دعاؤں کو قبول کرنے والا، اس کے لاشعور کے نہاں خانوں میں دفن حاجتیں پوری کرنے والا، وہ نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کی اپنے بندوں سے محبت اور مہربانی کی عکاس ایک حدیث قدسیہ کا مفہوم ہے کہ "قیامت کے روز حقوق اللہ تو معاف کر دیے جائیں گے مگر حقوق العباد نہیں۔"

☼ ☼ ☼

تین نفوس پر مشتمل تیسری جنس سے تعلق رکھنے والا وہ گروہ نومبر کی ٹھنڈی اور قدرے روشن دوپہر میں "روزی" کمانے کے لیے ایک متوسط طبقہ کے علاقے کی گلیوں میں بھٹک رہا تھا۔ ان میں سے دو پیشہ ور اور ہوشیار تھے۔ سرما کی ان سرد دوپہروں میں، جب سورج ہلکی سی جھلک دکھا کر چھپ جاتا لحافوں میں لپٹی قیلولہ کرتی خواتین جب دستک کی آواز پر پاؤں گھسیٹتے گیٹ تک آتیں اور بھیک کی صدا پر صلواتیں سناتیں تو وہ کمال اطمینان سے ان کے سامنے دست سوال دراز رکھتے کیونکہ یہی ان کا کام تھا، اور بھیک وصولتے ان جماہیوں کو روکتی عورتوں کو ڈھیر دعائیں دینا بھی ان کی ہی مہارت تھی۔

لیکن تیسرا فرد ابھی نیا تھا۔ اسے بھیک مانگنے کے لیے نہ بے دھڑک ہاتھ پھیلانے کی تربیت تھی نہ ڈوپٹہ پھیلا پھیلا کر دعائیں دینے میں ہی ملکہ حاصل تھا۔ جھجکتا گھبراتا باقی دونوں کے پیچھے چلتا ہوا وہ وجود "نیلی" کا تھا۔

دھاری دار گلابی جارجٹ کی قمیص پر فیروزی و گلابی ڈوپٹہ گلے میں ڈالے وہ سردی سے دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ مہارت سے کیے ہوئے مگر چنگھاڑتے میک اپ سے مزین چہرے پر بد حواسی لیے پریشان نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا وہ اک نیا "ہیجڑا" تھا جو چند روز قبل ہی ان کے گروہ کے "سایہ شفقت" میں آیا تھا لیکن حقیقت کو تسلیم کرنے، حالات سے سمجھوتہ کرنے میں ہی اسے پورا ہفتہ لگ گیا تھا۔

آج گروہ کے خاص چیلے نے اپنے کرخت ہاتھوں سے بڑی مہارت سے "نو آموز" کے چہرے پر میک اپ کی تہیں جما کر اس کے نقوش کو بدل ڈالا تھا۔ ہاں مگر زنانہ لباس زیب تن کرنے میں نیلی متامل تھی کہ فطرت کے خلاف پہلا موقع تھا جب اسے کسی دلہن کی طرح سجایا گیا تھا نقلی جوڑے پر لباس سے ہم رنگ پھول سجائے گئے تھے اور ملبوس پر — زنانہ مہک انڈیلی گئی تھی۔ فطرت کے خلاف لباس تھا یا — اپنا وجود؟ نیلی سمجھ نہ سکی۔

باقی دو مخنث ریما اور ریشماں کے سنگ آج پہلی بار اسے روزگار کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ایک طرح سے یہ نیلی کی ٹریننگ کا پہلا دن تھا۔ نئے ہونے کے باعث اس سے ابھی "سخت" کام نہیں لیے جا رہے تھے۔ شروعات بھیک مانگنے سے ہوئی تھی۔ لہک لہک کر بازاروں میں چلتے و گلی محلوں کے تھڑوں پر بیٹھے لوگوں اور پان سگریٹ کی دکانوں پر کھڑے منچلوں کی نفرین اور پر تضحیک جملوں کو نظر انداز کیے انہی سے لگاوٹ کے مظاہروں پر مانگی جانے والی بھیک پر کبھی چند سکوں اور کبھی ملنے والی دھتکار کو سمیٹتے اب وہ رہائشی ایریا کی طرف آ نکلے تھے۔ سڑکوں، بازاروں سے گزر کر گلیوں کی پر سکون تنہائی میں آتے آتے نیلی کو تمسخرانہ نگاہوں اور ٹھٹھے لگاتے چھیڑتے ہوئے مردوں نے پسینے پسینے کر ڈالا تھا۔ سترہ سالوں میں پہلی بار اس پر زندگی کی ہولناکی کا انکشاف ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

فیصل آباد کے ایک نواحی علاقے میں ایک کمرے اور مختصر سے صحن میں لگے آم کے پیڑ والا گھر حاجراں کا تھا۔ شادی کے دوسرے سال پہلی اولاد اس کے بطن میں پرورش پا رہی تھی جب اس کا شوہر فضل دین نشے کی زیادتی سے وفات پا گیا۔ حاجراں کی قسمت نے پہلے کب یاوری کی تھی جو اب کرتی یتیمی کی زندگی بسر کرنے کے بعد سائبان ملا تھا تو وہ بھی کھوکھلا نکلا لیکن تھا وہ سر کا سائیں۔ وہ سائبان بھی چھن گیا مگر حاجراں نے صبر سے وقت کاٹا۔ تمام عمر محرومیوں سے پر مسکینوں کی سی زندگی کے بعد بیوگی کی چادر بھی اس نے چپ چاپ اوڑھ لی لیکن ہر قدم پر مضبوط اور صابر رہنے والی حاجراں اپنی کوکھ سے جنے بچے کو دیکھ کر بلک بلک کر رو پڑی۔۔۔ بیٹا ہوتا تو وہ اپنے بڑھاپے کا سہارا مل جانے پر مطمئن ہوتی اور اگر بیٹی ہوتی تب بھی وہ قسمت پر شاکر ہو جاتی۔ لیکن اسے سخت آزمائش میں ڈالا گیا تھا۔

حاجراں ایک پرہیز گار اور نیک دل عورت تھی۔ صابر رہنے کی خو اس کی فطرت میں شامل کی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے گوشت پوست کے اس ننھے وجود کو اپنے ساتھ لپٹا لیا کہ غیر فطری ہی سہی پر وہ اس کی اولاد تھی۔ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی حاجراں سلائی کر کے اپنا پیٹ اور فضل کا نشہ پورا کر رہی تھی، اس کے مرنے کے بعد بھی اسی کام نے اسے زندگی کا پہیہ رواں رکھنے میں مدد کی تھی۔ لوگوں کی نظروں سے بچا کر وہ اپنے لخت جگر کو پروان چڑھا رہی تھی اور اس کا نام نوید رکھا لیکن حقیقتاً وہ حاجراں کے لیے "نوید" نہ تھا۔ وہ جب بھی اس کے پاس بیٹھی ہوئی اسے اپنے ساتھ لپٹاتی اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتی تو جانے کس درد سے اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں، نوید کبھی سمجھ نہ سکا۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھنے کی کوشش کرتا۔

"اماں تم دوائی لے لو۔" اس کا چھوٹا سا ذہن اپنی دانست میں ماں کو ان ان دیکھی تکلیف سے نجات دلانے کی سعی کرتا۔

حاجراں کو دمے کا عارضہ تھا لیکن محلے کے حکیم فیض کے نسخے بھی اسے بیماری سے چھٹکارا نہ دلا سکے تھے۔ جیسے تیسے اس کی زندگی کی ڈور بندھی ہی تھی۔ نوید کے لیے حاجراں سراپا ٹھنڈک تھی، تناور درخت کی گھنی چھاؤں کی مانند بچپن میں جب بچہ بے فکری سے گلیوں میں کھیلتا پھرتا ہے، چھوٹی چھوٹی خواہشات کی تکمیل کے لیے والدین سے ضد کرتا ہے، اسی عمر میں نوید میں صبر کرنے کی صفت پروان چڑھتی رہی۔ شعور میں پہلا قدم دھرنے پر حاجراں نے اسے نماز کی ادائیگی کرنا سکھا دیا۔ بارہ سال کی عمر میں اسے محلے کی سرخ اینٹوں سے بنی نئی تعمیر کردہ مسجد میں بھیجا جانے لگا۔ اسلام کی مکمل واقفیت کے ساتھ حاجراں اسے ایک عام انسان کی طرح مکمل دیکھنا چاہتی تھی۔

مسجد کے امام صاحب بڑے رحمدل اور ہمدرد انسان تھے اور نوید کو پوری توجہ و محبت سے قرآن کا درس دیتے، گھر سے باہر ایک یہی تو وہ جگہ تھی جہاں حاجراں اسے بھیجنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی اس کا ماننا تھا کہ اگر رب تعالیٰ نے انہیں اس کڑی آزمائش میں ڈالا تھا تو وہی اس کے اگلے رستے کو بھی روشن کرنے والا تھا۔

بے شک اس ذات پاک نے ہر ذی روح کی تخلیق کا مقصد رکھا ہے۔۔۔

لیکن ایسے لوگ جنہیں معاشرہ نہ مردوں میں گنتا ہے نہ عورتوں میں گردانتا ہے، ایسے لوگ جن پر نام نہاد تہذیب یافتہ معاشرے نے زندگی کا دائرہ تنگ کر رکھا ہے بھلا وہ کس زمرے میں آتے ہیں؟؟

"رب پاک تیرے لیے آسانیاں پیدا

کرے۔" حاجراں اپنے لخت جگر پر جب بھی نظر ڈالتی اس کی ہر سانس ایک ہی ورد میں پروئی جاتی۔

حاجراں کو گھر کے مختصر سے صحن میں لگے آم کے پیڑ سے بھی انتہائی عشق تھا جتنا نوید سے پیار۔۔۔ موسم کی کیریاں جب بھی آتیں، حاجراں نوید کا من پسند کیری کا مربہ تام چینی کے مرتبان میں بھر کے رکھ دیتی۔ ماں کے ۔ پیار کو وصولتے ہوئے نوید آم کے اس گھنے پیڑ پر نگاہ جمائے سوچے چلا جاتا۔

"ہر سال یہ درخت کھٹی میٹھی کیریوں سے لد سا جاتا ہے۔ کھلتا پھولتا ہے، اس پر پھل لگنا ختم ہی نہیں ہوتا۔" اسے لگتا اس کی خواہشات بھی آم کے اس پیڑ پر لگی کیریوں کی طرح ہیں جو پھلتی پھولتی رہتی ہیں اور ہر آنے والے سال میں پہلے کی نسبت زیادہ تعداد میں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں اور مضبوط اور شدید۔۔۔

اپنی پہچان کے قابل فخر ہونے کی حسرت۔

بنا کسی تذلیل کے مسجد سے گھر تک کا فاصلہ طے کرنے کی خواہش۔

اپنی اماں کا بہادر اور مضبوط سہارا بننے کی لگن۔

رب پاک کے کرم کی منتظر نگاہ آسمان سے ہو کر پھر سے پیڑ پر آ ٹکتی۔ گرمیوں کی حبس زدہ شامیں ہوں یا سردیوں کی ٹھٹھرتی ماحول کو یخ کرتی راتیں۔۔۔ وہ اپنے متعلق سوچتا تو گھنٹوں یونہی گم صم سا رہتا۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ رات بھر کی نیند لے کر صبح دم بے دار ہو گا تو خوش نصیبی مسکراتے ہوئے اس سے معانقہ کرنے کی منتظر ہوگی۔ اور وہ گلی کوچوں، بازاروں سے بنا ڈرے بنا گھبرائے سینہ تان کے گزر کے ماضی کو بھیانک خواب سمجھ کے بھول جائے گا۔

"بھلا راتوں کے گھپ اندھیروں میں دیکھے جانے والے ان گنت خواب یوں بھی کبھی سچ ہوئے ہیں؟"

نوید کو یوں لگتا اس کی زندگی سے آسانیاں تقریباً" ناپید ہیں۔ مسجد کے اندر تو بچے اور نو عمر لڑکے امام صاحب کے غصہ کی بدولت خاموش رہتے لیکن مسجد سے گھر تک کا فاصلہ طے کرنا نوید کے لیے دشوار کن مرحلہ ہوتا۔ یوں لگتا جیسے تمام رستے پر شیشہ کوٹ کر بچھا دیا گیا ہو اور اسے ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے وہ فاصلہ طے کرنا ہو۔ ہر گلی، ہر نکڑ پر دکان پر موجود بھانت بھانت کے لوگوں کی نظریں اس کا مضحکہ اڑاتی محسوس ہوتیں۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ شرارتی لڑکوں اور بچوں کا ایک ٹولہ گھر تک اس کا پیچھا کرتا کہ یہ ان کے لیے بہترین تفریح تھی۔ تمام رستے وہ پیچھے سے آوازیں کستے۔

"ارے او نوید۔۔۔ رک کہاں بھاگا جارہا ہے۔" پشت سے آواز سنائی دیتی اور اس کے قدموں کی رفتار مزید تیز ہو جاتی۔

"یہ مٹک مٹک کر کس کو دکھا رہا ہے۔ زنانہ چکیلی چال میں تو، تو نے زنانیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔" کسی چلبلے کی بات پر زبردست قہقہہ پڑتا۔

"ذرا ایک آدھا ٹھمکا لگا کے دل ہی خوش کر دے میری جان۔" کوئی فرمائشی فقرہ چست کرتا۔

نوید تقریباً" بھاگتے ہوئے گھر کا بیرونی دروازہ عبور کرتا اور اس کی روہانسی صورت دیکھ کر حاجراں کا کلیجہ شق ہو جاتا۔ وہ دروازے سے نکل کر پیچھے آنے والوں کو کوستی۔

"او بے غیرتو! کیوں ستاتے ہو نمانے کو۔ ڈرو رب سے کہ اس نے تمہیں ٹھیک پیدا کیا اور آج تم اس کی مخلوق کا مخول بناتے ہو۔" حاجراں کے گھر کنے پر پوری چنڈال چوکڑی کھی کھی کرتی منتشر ہو جاتی، پر اگلے دن پھر وہی گلیاں اور پھر وہی تذلیل کرتی آوازیں نوید کا پیچھا کرتیں۔ نوید ہر بار اماں سے شکوہ کناں ہوتا۔

"اماں میں اب مسجد نہیں جاؤں گا، بھلے تو جو بھی کہہ لے۔ سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔" نوید سسک اٹھا۔

"نہ میرا پتر! ایسے نہیں کہتے مسجد تو اللہ پاک کا گھر ہے، ادھر جائے گا تو رب سوہنا تجھ پر اپنی رحمت کے در وا کر دے گا۔" ماں روتے بلکتے نوید کو اپنی بوسیدہ سیاہ اوڑھنی کے بڑے سے پلو میں چھپا لیتی جیسے مرغی اپنے چوزے کو سرد و گرم سے بچانے کے لیے پروں میں چھپا لیتی ہے۔ مسجد جانا تو نوید کو بھی بہت پسند تھا کہ وہاں امام صاحب کا پرنور وجود اس کے ساتھ بے حد شفقت سے پیش آتا۔ بس اسے راستے میں ملنے والی دھتکار سے خوف آتا تھا۔

حاجراں اس کے ڈر کو سمجھتی تھی۔ اس لیے اس نے نوید کی دنیا کا دائرہ اتنا تنگ کر دیا تھا کہ لوگوں کی برچھیاں دکھاتی نظریں اور زبانوں کے وار اسے لہولہان نہ کردیں۔ گاؤں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جن کی آنکھیں اس کے بدن کی نزاکت اور چال کے بانکپن کو دیکھ کر حیرت استعجاب و تضحیک و نفرت و تذلیل لیے ہوئے نہ ہوں۔ لیکن اماں کے بعد امام صاحب کا وجود اس کے لیے گھنے سائے جیسا تھا۔

دین کی طرف نوید کی رغبت اور قرآن کو بے حد محبت و احترام سے پڑھنے کے شوق نے امام صاحب کو اور توجہ و دھیان سے تعلیم کلام پاک دینے پر مجبور کر دیا۔ سارا وقت نوید انہیں آگے پیچھے ہل ہل کر تلاوت قرآن پاک میں مگن ملتا۔ جمعہ کے روز وہ خطبہ دیتے تو نوید اپنا چہرہ گھٹنوں پر رکھے ان کا لفظ لفظ تولے جاتا۔ مساوات اور برابری پر درس دیتے تو اس کا انہماک دیکھنے سے لائق ہوتا۔

"کسی عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، مگر صرف تقویٰ کی بنا پر۔" اسے کچھ خاص سمجھ تو نہ آتا، مگر وہ پورے دھیان سے امام صاحب کا حرف حرف سنتا۔

اس کی زندگی دو ہی مداروں کے گرد گھومتی تھی۔ اماں کی پر شفقت گھنیری چھاؤں میں اور امام صاحب کے پرنور ہالے میں۔ کبھی کبھی تو وہ سوچے چلا جاتا کہ اسے ماں سے زیادہ محبت ہے یا امام صاحب سے زیادہ عقیدت، دین سے محبت اس نے ان ہی سے سیکھی تھی۔ نماز کو پر اہتمام طریقے سے بہترین طور پر ادا کرنے کے نکات اسے امام صاحب کی تقلید نے ہی سکھائے تھے۔

اکثر مسجد میں امام صاحب نوافل ادا کرتے پائے جاتے تو وہ بھی اپنا ناتواں سا وجود ان کے پیچھے لے جا کے نوافل کی نیت باندھ لیتا۔

"دعا عبادت کا مغز ہے۔" امام صاحب اکثر کہا کرتے اور خود بھی ہمہ وقت رب کریم کے در پہ بیٹھے ہاتھ اٹھائے جانے کیا کچھ مانگا کرتے۔ طویل دعائیں مانگنے کی یہ خو بھی اس میں امام صاحب سے منتقل ہوئی تھی۔ جب وہ گلابی نرم ہتھیلیاں آسمان کی طرف بلند کیے لبوں سے آہستہ آہستہ قرآنی آیات کا ورد کرتا تو بے ساختہ اسے اپنی سیاہ چادر میں لپٹی محبت سے لبریز ماں یاد آجاتی اور ان کے لیے دعا مانگتا چلا جاتا۔ وہ بس اماں کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

"بھلا امام صاحب کیا اور کس کے لیے اتنی دعائیں مانگتے ہیں؟" اس کے دل میں سوال مچلتا جسے ایک دن وہ زبان دے بیٹھا۔ امام صاحب مسکرائے اور بولے۔

"یہ جو دعا ہوتی ہے نا پتر! یہ بندے کو اپنے رب کے سامنے ہاتھ اٹھا کے عاجزی سے مانگنا سکھاتی ہے اور پروردگار اسے عطا کرتا ہے، عاجزی اور سچے دل سے مانگی گئی ہر جائز دعا وہ ضرور پوری کرتا ہے، یوں بندے اور اس کے مالک کے درمیان ایک الوہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔" امام صاحب کی پوری بات اس نے بڑے دھیان سے سنی تھی اور پھر اسے ہمیشہ کے لیے رخت سفر کے طور پر ساتھ باندھ لی۔

"عاجزی اور سچے دل سے مانگی گئی ہر دعا وہ ضرور پوری کرتا ہے۔"

"مجھے بھی عام انسانوں جیسا کر دے۔" ایک دعا خود بخود اس کے لبوں سے آزاد ہوئی اور اس کے اندر جڑ پکڑ گئی۔ خشوع و خضوع سے سجدے میں سر رکھتے، قیام میں، رکوع کی حالت میں اللہ پاک کی حمد کرتے ہوئے ایک ہی خواہش، ایک ہی حسرت اس کے دل میں پنپتی رہتی، کیونکہ دعاؤں کے۔۔۔ مستجاب ہونے کا یقین اس کے ننھے ذہن کو امام صاحب نے عطا کیا تھا۔

لیکن زندگی بھی سفاک شے ہے یہ کبھی بھی ہمارے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط پر قدم نہیں دھرتی

جانے اس کے سینے میں کتنی ہولناک کتنی سفاکی موجزن ہے کہ جینے والے کو حیرت و یاس کی تصویر بنا کر گور تک پہنچا دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک سفاک و سرما کی ٹھٹھرتی سیاہ رات کے آخری پہر ـــــ نے حاجراں کا دم ایسا اکھیڑا کہ سانس بھرنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور اس کی روح قفس عنصری سے رہا ہو گئی۔

پاس سویا نوید اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کی گھنیری ٹھنڈی چھاؤں اس کے سر سے اٹھ گئی ہے اور اب ظالم تپتی دھوپ اس کا بدن جھلسانے کے لیے نکل آئی ہے۔

بے رحم وقت نے اسے سڑک پہ لا کھڑا کیا تھا۔ جانے کہاں سے اس کے باپ کا چچازاد بھائی اچانک نمودار ہوا اور مکان پر قابض ہو گیا۔

"یہ ہیجڑا ہماری نسل نہیں پتا نہیں کس کا گندا خون ہے چل نکل یہاں سے۔"

بری طرح مار کر اسے دھکے دے کے گھر سے نکال دیا گیا۔ روتا بلکتا نوید سن دماغ لیے گھر کے بند دروازے پر بیٹھا رہا۔ گلی کے رہائشی کرم داد نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا اور بولا۔

"پتر تو بڑی آزمائش میں ہے، پر رب کی کرنی وہی جانے، یہ دنیا تجھ جیسوں کو کہیں جینے نہیں دیتی، تو میرے ساتھ چل، اپنے جیسوں میں ہی تو رہ سکتا ہے، ورنہ یہ لوگ تجھے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔" نوید ماؤف ذہن کے ساتھ اردگرد سے بے نیاز کرم داد کے ہمراہ چلا بس میں آ بیٹھا۔ کرم داد نے فون پر کسی سے نوید کے متعلق بات کی اور ان کا یہ سفر لاہور شہر کے دروازے ٹیکسالی گیٹ کے مشہور بازار کی پرہجوم گلی میں موجود لکڑی کے چھوٹے سے نیم وا دروازے پر ختم ہوا تھا۔ کرم داد اندر بڑھ گیا۔ تنگ سی نیم تاریک راہ داری کے بائیں طرف بنی سیڑھیوں کے اختتام پر ایک اور دروازہ تھا۔ جس کے دوسری طرف ایک اور ہی دنیا آباد تھی۔ لکڑی کی اس چوکھٹ کے پار ایک عجیب زندگی اس کی منتظر تھی، جس کا اس نے کبھی گمان بھی نہ کیا تھا۔

دروازہ کھولنے والا پکی عمر کا قدرے سانولے رنگ اور مضبوط جثے والا وجود اسے گرمجوشی سے اپنے ساتھ لپٹا کر اندر لے گیا۔ کرم داد دروازے سے ہی پلٹ گیا تھا۔ ہال کمرے میں ادھر سے ادھر تک پھیلے زنانہ ملبوسات اور میک اپ کے لوازمات کے درمیان گھرے باقی دو ہیجڑے بھی اٹھ کر اس سے یوں ملے جیسے بچھڑے ہوئے یار ملے ہوں۔ نوید ہونق بنا ان کو تکتا رہا۔

"میری سوہنی تو کیوں پریشان ہوتی ہے پگلی؟ یہ دنیا ہے ہی۔۔۔" پکی عمر والے ـــــ نے موٹی سی گالی دے کر اپنی بات پوری کی، وہ شاید ان کا سربراہ تھا۔

"تو فکر نہ کر، مجھے اپنی ماں سمجھ دیکھ رانی، ادھر لوگ ہم جیسوں کو سنگسار تو کر دیں گے، مگر ایک عام انسان کی حیثیت سے جینے نہیں دیں گے۔" نوید لب بھینچے ٹکر ٹکر ان کی شکلیں دیکھتا رہا۔

"کیا اب مجھے ان جیسا بن کے رہنا ہے؟" ذہن پر مسلسل ہتھوڑے برس رہے تھے۔

بچپن میں وہ بے خبر ہی تھا کہ ہر کوئی طنز میں ڈوبی نیزے کی انی لیے اس پر کیوں چڑھ دوڑتا ہے، لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا یہ معمہ بھی حل ہوتا گیا۔

"وہ عام انسانوں جیسا نہیں۔" کیڑا کلبلایا۔

"لیکن ہوں تو میں انسان ہی، امام صاحب کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی نظر میں تمام انسان برابر۔" دل سے اٹھتے درد نے اس کی سوچ کے دھارے کو موڑ ڈالا تھا۔

"امام صاحب! میں ان کے پاس کیوں نہیں گیا میں۔۔۔" کچھ بہت غلط ہو جانے نے اس کی آنکھیں بھگو دیں۔

"نہ نہ میری سوہنی یوں روتے نہیں چندا۔" گرو نے اسے اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی۔

لیکن اسے نہ تو ان کی لگاوٹ نظر آ رہی تھی، نہ ان سے لوگوں کے بے رحمانہ رویے اور دھتکار کی زمانہ شناس باتیں اسے سمجھ آ رہی تھیں۔ وہ بس خالی خالی نظروں سے ان تینوں کو کبھی فرش پہ پھیلے شوخ رنگوں کے زرق برق ملبوسات اور میک اپ کے پھیلاوے کو دیکھے گیا۔

"آج سے تو میری نیلی ہے۔ نی ریما جا بن کے واسطے کھانا والا لے کے آ۔" گرو نے اس کو ایک نیا نام دیتے ہوئے ایک ـــــ کو ہدایت دی تھی۔ یہاں شاید کوئی بھی اپنے حقیقی نام سے نہیں پکارا جاتا تھا۔

"بہن۔" سترہ سالہ ذہن اتنا ناپختہ بھی نہ تھا اس میں یہ لفظ گڑ سا گیا تھا۔

"کیا یہ لوگ میری جنس کا تعین کرنے والے ہیں؟" دکھتا ذہن اس نئی حقیقت کو ماننے سے انکاری تھا، لیکن لب ساکت تھے۔ ایسے میں اسے اپنی ماں کا مشفق وجود یاد آیا اور بے ساختہ اس کی بوسیدہ سی سیاہ اوڑھنی میں چھپ جانے کی خواہش سر پٹخنے لگی۔

"مائیں نی میں کینوں آکھاں۔" گلی کی کسی دکان پر کیسٹ پلیئر سے نکلی پرسوز صدا اسے اپنے دل کی عکاس لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار پر تھرکتے ناچتے یہ وجود دیکھنے والوں کی تفریح کا باعث بنتے ہیں۔ تیز رفتار زندگی میں تیزی سے گزرتے آگے بڑھتے لوگ چند لمحوں کے لیے رک کر اس تفریح سے لطف اندوز ہوتے ہیں چند بے باک قسم کے فقرے چست کرتے ہیں اور دل خوش ہونے پر بہت ہی سخاوت دکھاتے تو چند سکے ان کی طرف اچھال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لوگ انہیں مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔

کھسرا، زنانہ، خواجہ سرا، مخنث۔۔۔ مختلف لوگوں کا ان کی طرف طرز عمل بھی مختلف ہوتا ہے کچھ ان پر ترس کھاتے نظر آتے ہیں جبکہ کچھ ناک پر رومال رکھے دور سے گزر جاتے ہیں جیسے کسی مردہ جانور سے باس آ رہی ہو۔

خواجہ سراؤں کی اس برادری میں بھی ایک ترتیب شدہ نظام دکھائی دیتا ہے۔ ان میں جو پختہ عمر اور سوجھ بوجھ کا حامل ہوتا ہے اسے اپنا سربراہ تسلیم کر لیا جاتا ہے جسے "گرو" کہتے ہیں۔ ایک گروہ کے ساتھ عموماً تین سے چار خواجہ سرا رہتے ہیں۔ جب یہ اپنے لیے گرو منتخب کرتے ہیں تو "دستار بندی" جیسی ایک رسم ادا کی جاتی ہے ایک چھوٹی سی تقریب میں پوری برادری کو مدعو کیا جاتا ہے، متعلقہ خواجہ سرا کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے اور آنے والے تمام مہمان اپنی اپنی بساط کے مطابق اسے مبارک باد کے ساتھ پیسے بھی دیتے ہیں اور ناچ گا کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں بعدازاں اس کو گرو کے طور پر تعظیم دی جاتی ہے گروہ کے ساتھ رہنے والے دیگر ساتھی اس کے "چیلے" کہلاتے ہیں جو اپنی "کمائیوں" کا بڑا حصہ گرو کے ہاتھ پر رکھتے ہیں اور وہ ان کی ضروریات، لباس، دوا، علاج معالجے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ان کے مابین جھگڑوں، رنجشوں کو دور کر کے صلح کروانا بھی اسی کے فرائض میں شامل ہوتا ہے یعنی بطریق احسن گھر کے نظام کو چلانا اس کے سپرد ہوتا ہے۔

یہی چیلے گروہ کے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں کیونکہ ان کی اپنی اولاد تو ہوتی نہیں یوں عام مرد و عورت کے گھر نامکمل ـــــ شناخت کے ساتھ پیدا ہونے والا بچہ خواجہ سراؤں کے "باضابطہ خاندان" کا فرد بن جاتا ہے۔ نوید بھی نیلی کی صورت میں اس کا حصہ بن گیا تھا۔ یہاں آنے کے تین چار روز تک اس کا سکتہ ہی نہ ٹوٹا تھا۔ حالات کا غیر معمولی پن اس کے حواس سلب کیے ہوئے تھا لیکن کب تک۔۔۔ اسے حقیقت قبولنا ہی تھی۔۔۔ اور اس نے حقیقت قبول کر لی۔ اپنے اصل کے ساتھ جینے کا دشوار ترین فیصلہ بھی کر ہی لیا۔ اس دن اس کے ساتھی ریما نے مہارت سے میک اپ کر کے اسے بدل کے رکھ دیا، ریشماں نے زرتار سرخ آنچل والا زرد لباس منتخب کیا، گرو نے چٹاچٹ اس کی بلائیں لے ڈالیں۔ آخر کو وہ "نوید" سے "نیلی" تک کا سفر طے کر گیا تھا۔ اس روز گھر میں اچھا کھانا بنا، ریما اور ریشماں میں سے کوئی بھی "دیہاڑی" پر نہیں گیا۔ کیسٹ پلیئر آن کر کے وہ دونوں اسے اپنے ساتھ کھینچ کر ناچتی رہیں۔

پھر نیلی کو بھی ریشماں اور ریما کے ساتھ بھیک مانگنے کے لیے بھیجا جانے لگا لیکن ابھی تک اس سے "سخت" کام نہیں لیا گیا تھا۔ شروع کی جھجک اور گھبراہٹ اب بے حسی میں ڈھل گئی تھی۔ نیلی اب اس تمسخر کی عادی ہو گئی تھی جو ابتدا میں اس کا خون تک منجمد کر دیتا۔ اسے بھی بھیک مانگنے کے لیے سڑکوں پر رواں گاڑیوں کے شیشے بجا بجا کر ہاتھ پھیلانا آگیا تھا۔ کیونکہ ضروریات زندگی کے لیے اب ان کی زندگیاں بھیک مانگنے اور جسم فروشی تک ہی محدود ہو گئی ہیں۔ یوں خود بخود ہی بھیک کے لیے اپنے اپنے علاقے متعین ہوتے چلے گئے۔ جہاں سے مختلف ایام میں ریزگاری اکٹھی کی جاتی۔ اور اگر وہ مخصوص کردہ حلقے سے باہر کے بھی محلوں سے بھیک وصولتے تو متعلقہ علاقے کے مخنث ان پر دھاوا بول دیتے کہ یہ ایک طرح سے ان کا حق چھیننے کا جرم تھا۔ نیلی کے گرو کا دوسرے علاقے کے **چھیمو** گرو کے ساتھ بھی ایسا ہی تنازعہ تھا اور ایک دو بار ان کے چیلوں کی آپس میں مڈبھیڑ بھی ہو چکی تھی لیکن بات گالم گلوچ تک ہی تھی۔ برادری کے "بڑوں" نے صلح کی بارہا کوشش کی جو دونوں گروؤں کے اکھڑ رویے کی بدولت ناکام رہی۔ نیلی اس سب سے ناواقف تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کے دماغ پر چھائی دھند ہلکی ہونا شروع ہو گئی تھی اور نیم خوابیدہ ذہن نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اتنی ٹھنڈ اور ہولناک سناٹا۔ اس نے کھل کر سانس لینے کی کوشش کی اور اس کوشش نے اسے تڑپا کے رکھ دیا تھا کیونکہ گھنٹوں پہلو کے بل ایک ہی حالت میں پڑے رہنے سے اس کی پسلیاں شدید دکھ رہی تھیں۔ اسے لگا درد نے اس کے اندر آگ لگا دی ہے۔ نیم وا آنکھوں کو پوری کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔ دور ایک کمرے کے کوارٹر کے بند دروازے کے اوپر زرد سی روشنی لیے بلب ساکت تھا۔ اسی ملگجے سے اجالے میں زمین پر سر رکھے رکھے ہی اس نے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ ٹوٹی چپلیں، ردی کاغذ، گتے کے ڈبے، پلاسٹک کی بوتلوں کے علاوہ شاید کوڑا کرکٹ بھی تھا جہاں سے اٹھتا تعفن اس کا دم گھونٹ رہا تھا شاید وہ کسی پلاٹ میں پڑا تھا۔

"لیکن رات کے آخری پہر وہ یہاں کیوں تھا؟" تعجب نے اسے گھیرا۔

نظر ایک بار پھر زرد سی روشنی والے بلب پر ٹھہر گئی جو رگوں میں خون جما دینے والی ٹھنڈ میں دھند کی چادر میں لپٹی رات کو اجالنے میں بے حال نظر آ رہا تھا۔ بلب کو تکتے تکتے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"نی چڑیلو! ذرا جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ' جے چوہدری دا دماغ پھر گیا تے پے منٹ گئی سمجھو۔" گرو جی کی پاٹ دار آواز پر آنکھوں میں بھر بھر کے کاجل لگاتی ریما نے ہنستے ہوئے قریب ہی بیٹھی اپنے سوٹ کی ہم رنگ شلوار ڈھونڈتی **ریشماں** کی پشت پر کرارا سا ہاتھ جڑ دیا۔

"گرو جی! اے میسنی آج دیر کرائے ہی کرائے۔"

"پہلے تو تو کسی طرح اپنا سنگھار پورا کر لے۔" **ریشماں** نے اس دھپ کا نوٹس لیے بغیر جواب دے کے مطلوبہ چیز دریافت کی اور تیار ہونے چل دی۔ افراتفری میں میک اپ کی لیپا پوتی کرتی وزرتار ڈوپٹوں اور جھلملاتے شوخ رنگوں کے اپنے اب تک کے بہترین سوٹ زیب تن کیے تیاری کرتی یہ نفری تین گلی چھوڑ کر رہائش پذیر چوہدری حاکم دین کے پہلے پوتے کی خوشی میں دی جانے والی ایک تقریب میں "کمائی" کرنے جا رہی تھی۔ چوہدری شاہ خرچ آدمی تھا۔ دو گھنٹے ناچ کر "ودائیوں" کے طور پر انہیں کافی تگڑی رقم وصول ہونے کی توقع تھی چنانچہ ان کا جوش بھی دیدنی تھا۔ لیکن سوموار ہونے کی وجہ سے کسی کو گلی محلوں کا بھی پھیرا لازمی لگانا تھا اور یہ کام نیلی کو سونپا گیا تھا کہ یہ بہرکیف قدرے آسان کام تھا۔

آج نیلی اکیلی ہی جانی پہچانی گلیوں میں قدم دھرتی

آگے بڑھتی رہی جہاں وہ ریما اور کبھی ریشماں کے ساتھ کئی بار آچکی تھی۔ اس کی گھبراہٹ قدرے کم ہو چکی تھی کیونکہ اندرون لاہور کی ان نیم تاریک اور تنگ گلیوں کے باسی اتنے بھی تنگ دل نہ تھے۔ بہت سی عورتیں ان سے احترام سے پیش آتیں کچھ تو باقاعدہ حال چال دریافت کرتیں کھانے کا بھی پوچھ لیتی تھیں۔ اتنی عزت پر نیلی انہیں حیرت سے دیکھنے لگتی جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کی باسی ہوں۔

کچھ سال قبل خواجہ سرا گھروں میں ہونے والی شادی بیاہ کی تقریبات اور بچوں کی پیدائش پر لازمی سمجھے جاتے تھے۔ ناچتے گاتے جھولی بھر بھر دعائیں دیتے یہ لوگوں کی تفریح کا سبب تو بنتے تھے لیکن عزت و احترام کے حق دار وہ تب بھی نہ تھے۔ پھر وقت بدلا اور خوشی کے موقعوں پر ان خواجہ سراؤں کی موجودگی ختم سی ہوتی چلی گئی۔ نیا دور 'نئی روایات' نئے رواج اور نئی تبدیلیاں ان کو گھر گھر گلی محلوں 'سڑکوں پر بھیک مانگنے پر لے آئی تھیں۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ کسی شادی بیاہ کے پروگرام میں ان کے لیے بلاوا آتا ورنہ ان کی زندگی کا پہیہ بھیک اور "دوسرے کاموں" کی بدولت ہی رواں تھا۔ ڈھلتی شام اور بڑھتی ہوئی ٹھنڈ میں نیلی بازار سے گزر کر بہت سے گلیوں سے حاصل ہونے والی "کمائی" مٹھی میں دبائے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک... **چھیمو** گرو کے خاص چیلے مخصوص انداز میں تالی بجاتے ہوئے اس کے مقابل آگئے۔

"نی تو کدھر ہمارے علاقے میں پیسے اکٹھے کرتی پھر رہی ہے؟" لانبے قد کے ساتھ یہ مخنث دوسرے علاقے کا تھا۔

"وہ... وہ مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ علاقہ آپ کا ہے۔" نیلی نے نادانستگی میں ہونے والی اس خطا پر صفائی دینے کی نامکمل سی کوشش کی۔

"اچھا... اتنی ہی بھولی گائے ہے نا تو... لگتا ہے تیرے اس گرو کو ہمارے ساتھ پنگا لینے کا بڑا شوق چڑھا ہے۔" دوسرے والے ــــ نے بات کے اختتام پر اس کے ہاتھ میں دبے تڑے مڑے نوٹ اور سکے

چھیننے کی کوشش کی۔ نیلی ہلکی سی مزاحمت سے دو قدم پیچھے ہٹی اور ہمت مجتمع کرکے بولی

"میں آئندہ اس طرف نہیں آؤں گی۔ ابھی مجھے جانے دو۔"

"واہ مہارانی تجھے کیسے جانے دیں۔ تجھے چھوڑ دیا تو تیرے اس گرو کا دماغ کیسے ٹھکانے لگائیں گے۔"

آؤ دیکھا نہ تاؤ دونوں نیلی پر پل پڑے۔ اسی دوران وہاں سے معمول کے راؤنڈ پر پولیس کی گاڑی گزری اور ہاتھا پائی کرتے دیکھ کر انہیں وین میں بٹھا کر تھانے لے گئی۔ لیکن وہاں پوچھ گچھ کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھانیدار چھیمو گرو کا "خاص" جاننے والا تھا۔ نیلی جیسا نوخیز خسرا دیکھ کے تھانیدار اور اس کے دیگر ساتھیوں نے اس سے اپنے اپنے انداز میں تفتیش کی اور معاشرے میں بے حیائی پھیلانے کا جرم عائد کرکے اسے خود ہی سزا سناتے رہے یا نفس کی بھوک مٹاتے رہے، نیلی یہ فیصلہ نہ کرسکی۔ پوری طرح سزا دے چکنے کے بعد اسے انہی دونوں کے حوالے کردیا گیا جنہوں نے بری طرح زدوکوب کرکے اس کے گرو سے اپنی کسی دیرینہ دشمنی کی آگ ٹھنڈی کی تھی۔

فقط لاتوں، گھونسوں اور ٹھوکروں پر ہی اکتفا نہ کیا گیا تھا بلکہ لوہے کی ایک پائپ سے کئی بار اس کی روح کو جسم سے آزاد کردینے والے وار کیے گئے۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا ناک اور منہ سے بہتے خون کی سرسراہٹ اسے خوف میں جکڑتی رہی۔ اس کی کمزور سی مزاحمت رائیگاں جارہی تھی۔ دونوں ڈیل ڈول اور قد کاٹھ میں نیلی کے ناتواں وجود پر بھاری تھے۔ گالیاں بکتے، مسلسل ہاتھوں پیروں کو چلاتے وہ اسے پیٹے چلے جارہے تھے۔

"ہم سے پنگا لے گا تیرا وہ گرو۔۔۔ یہ سبق وہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔" بے ہوش ہوتی نیلی پر آخری ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بڑی سفاکی سے تبصرہ کیا گیا تھا۔

ہوش و خرد سے بے گانہ ہوتی نیلی کو قدرے ویران جگہ موجود پلاٹ میں پھینک دیا گیا جہاں کاٹھ کباڑ کے علاوہ لوگ گھروں کا کوڑا پھینک دیتے تھے۔ اور اب۔۔۔

اس ویران تعفن زدہ پلاٹ کی سرد بے حس زمین پر پڑے اسے شاید آدھی سے زیادہ رات بیت گئی تھی۔ نیلی کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے ملبوس سے تار تار کیا گیا نوید کا وجود برہنہ ہورہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے برف کی سینکڑوں وزنی سلیں اس کی پشت پر رکھ دی گئی ہیں اور وہ کبھی ہل نہیں پائے گا۔ رات کے واقعات ایک بار پھر دماغ کی اسکرین پر چلنے لگے۔۔۔ کریہہ صورت وہ تھانیدار، خوفناک دہانے والے اس کے اہلکاروں نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ ڈالا تھا۔ اسے ایکائی سی آئی۔ یہ اس کا پیشہ نہیں تھا پہلی بار اس طرح کے تشدد نے اسے گنگ کر ڈالا تھا۔ اذیت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے حیرت سے اپنے قریب زمین پر گرتے گرم سیال کو دیکھا۔

"میری تو روح تک منجمد ہوچکی ہے پھر یہ آنسو کیوں نہیں جمے؟" اس نے دھیرے سے آنکھیں بند کرلیں آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر زمین کے بنجر سینے میں جذب ہوتے رہے۔

لوہے کی پائپ سے دی گئی ضربوں سے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لہولہان چہرے پر جابجا نیل اور زخموں کے نشان تھے۔ درد سے پھٹتے سر کو جھٹکتے ہوئے اس نے اپنی پوری ہمت مجتمع کرکے زمین سے اٹھنے کی کوشش کی اور درد کی ایک تیز لہر اس کے سر سے پاؤں تک گزر گئی۔

"آہ۔" وہ کراہا اور پھر بے دم سا ہو کر مٹی پر ڈھیر ہوگیا۔

"رب سوہنا تیرے لیے آسانیاں پیدا کرے گا۔" پاس ہی کہیں سے اس کی ماں کی محبت میں گندھی آواز ابھری تھی اس نے بے اختیار سر اٹھا کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے مارے سر نہ اٹھا سکا۔ اس کے لبوں سے بے اختیار سسکی نکلی۔

"اماں۔"

آج کتنے عرصے بعد اسے ماں کی اتنی شدت سے یاد آئی تھی۔ یکدم اسے اماں کی سیاہ اوڑھنی کی طلب ہوئی جس کی گرماہٹ اس کے یخ منجمد وجود پر سجے

زخموں کو چوس ڈالے۔ اسے اپنی ماں کی قرآنی آیات کا ورد کرتی اس نرم گرم پھونک کی حسرت ہوئی جو اس کی روح میں پلتے آبلوں کو مٹا کر اسے سکون کی نگری میں پہنچادے۔

ٹھنڈی زمین پر چہرہ رکھے وہ اپنے زخم زخم جسم کو سردی سے اکڑتا محسوس کرتا رہا۔ اسے پورے وجود میں شدید اینٹھن ہورہی تھی۔ پھر اسے اپنے گرو کی یاد آئی۔ وہ ان جیسا نہیں پر اس نے نیلی کو اپنا پن دیا تھا۔ جب اس کی زندگی خاتمہ کی طرف بڑھ رہی تھی تب اسی کرخت بدن اور عجیب ہیت و ساخت کے نقوش والے بدنام شخص نے سہارا دیا تھا۔ اسے سمیٹا تھا، بے حس ہو کر اسی ظالم معاشرے میں زندہ رہنا سکھایا تھا کہ اسے اس روپ میں آنا ہی تھا ورنہ اس کی ہستی کا نمود شرفاء کے بیچ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ پاتا۔

"گرو جی۔۔۔ ہاں گرو جی پریشان ہورہے ہوں گے میری گمشدگی پہ۔۔۔ مجھے جانا چاہیے۔" دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کے اس نے ایک بار پھر پوری جان لگا کے اپنے وجود کا بوجھ پیچھے دھکیل کر اٹھنے کی سعی کی جو اس بار کسی حد تک کامیاب ہوئی تھی اور وہ زخمی گھٹنوں کے بل بیٹھ چکا تھا۔ ٹیسیں اٹھتے دماغ کو جھٹک کر اس نے آنکھیں پوری کھولنا چاہیں اور سرعت سے گھٹنوں کو سیدھا کرکے کھڑا ہوگیا مگر قدم بڑھاتے ہی لڑکھڑایا اور سہارے کے لیے اندھیرے میں ہاتھ چلایا لیکن ایک بار پھر وہ زمین بوس ہوچکا تھا۔

"اللہ۔" اب تکلیف چار گنا زیادہ ہوچکی تھی۔

"شاید میں مرنے والا ہوں۔" سن ہوتے دماغ میں سنسناتی ہوئی سوچ اتری تھی۔

"لیکن جی کے بھی کیا کروں گا، قدم قدم پہ گالیاں، کوسنے، طعنے، مار، تذلیل سہہ کر بھیک مانگ کے یا اپنا آپ زدوکوب کروا کے زندگی کو برتنے سے بہتر ہے سانس کی ڈوری ٹوٹ ہی جائے۔" اس کے نیم مردہ وجود اور دکھتے دماغ پہ سوچیں حاوی ہورہی تھیں۔

"وہ دعائیں سنتا ہے، اس نے بشر کو اشرف المخلوقات کے مرتبے پر فائز کیا ہے وہ اپنے بندے سے ماں سے ستر گنا بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ اسے عطا کرتا ہے۔" امام صاحب کی مانوس سی آواز کی خوشبو اس کے چاروں اور پھیل گئی۔ وہ بلک بلک کر رو پڑا۔ نوید عرف نیلی بے بسی کی انتہا پر تھا۔

"عاجزی اور سچے دل سے مانگی گئی ہر جائز دعا وہ ضرور پوری کرتا ہے۔" اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اسے زندگی میں کبھی اپنے وجود سے اتنی نفرت نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت ہورہی تھی۔

"میری دعاؤں میں اثر نہیں شاید۔" اس کی پہچان اس کی زندگی کا سب سے سیاہ باب تھا جس کی سیاہی نے اسے اندر باہر سے مٹا ڈالا تھا۔ اسے خاک کر ڈالا تھا۔

اس نے اٹھنے کی ایک اور کوشش کی اور گھٹنوں کے بل بیٹھنے میں اس کی منہ سے سسکاری نکلی اور وہ وہیں سجدہ ریز ہوگیا۔

"یا اللہ رحم فرما۔"

پرنور ہالے میں گھرے سفید داڑھی والے سرخ و

سپید چہرے پر مہربان سی مسکراہٹ لیے امام صاحب اس کے شعور میں چلے آئے۔ مسجد کے صحن کا منظر بڑا روشن تھا۔ ہاتھ میں تسبیح تھامے وہ دھیرے دھیرے درس دے رہے تھے۔

"اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ جو رنگ نسل و ذات پات اور جنس سے بالاتر ہو کر ہر انسان کے حقوق متعین کرتا ہے خواہ وہ مرد و زن ہوں یا خواجہ سرا۔"

"حقوق۔" سر میں اٹھتی درد کی لہریں ایک بار پھر شدت اختیار کر چکی تھیں۔

"اے اللہ تیری اتنی بڑی دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہیں پھر سب مجھ پر کیوں نفرین بھیجتے ہیں۔۔۔ تمام انسان برابر ہیں تو میں کیوں اتنا کم مایہ ہوں کہ لوگ مجھے کیڑے مکوڑے کی طرح کچل دینا چاہتے ہیں۔" بلکتا ہوا وہ غیر فطری وجود اپنے خالق کو پکار رہا تھا۔

"آؤ بھلائی کی طرف۔" موذن نے فجر کی نماز کے لیے لوگوں کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے رونے میں شدت آگئی۔

"وہ دنیا میں کیا لینے آیا تھا اور کیا لے کر جائے گا۔" سجدے میں پڑے اس تیسری صنف کے وجود پر لرزہ طاری تھا۔ امام صاحب کی خوشبو اسے اپنے حصار میں لیتی رہی۔ اسے اپنے اندر توانائی سی محسوس ہوئی سر اٹھا کر دیکھا نیم وا آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔ منظر واضح ہو گیا تھا۔ سردی کی شدت میں اضافے کے ساتھ ساتھ دھند بھی دبیز ہو چکی تھی لیکن وہ دیکھ سکتا تھا۔ امام صاحب کا مشفق وجود اس سے کہہ رہا تھا۔

"وہ سب کا رب ہے' سب پر کرم کرنے والا' سب کی حاجتیں پوری کرنے والا' وہ نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔" اب کی بار بنا کوئی سسکاری لیے اس نے گھٹنوں سے پاؤں پر کھڑے ہونے کا سفر طے کیا تھا۔ آبلہ پا روح کو سمیٹتے ہوئے اس نے ٹھنڈ سے اکڑے اپنے بازو کو موڑ کے ہاتھ کی پشت سے اپنا بھیگا چہرہ اور نم آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کی۔ اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا راستہ پاٹنے لگا۔ نوید سے نیلی بننے کے سفر میں اس نے کیا کھویا تھا۔ گھر اور اس کے اندر ماں کا بحر بیکراں سموئے اماں حاجراں امام صاحب کی پدرانہ شفقت' خدا اور بندے کے مابین لڑی در لڑی مضبوط ہوتے تعلق کو کھویا یا پھر خود نوید کو۔ سن ہوتی پوروں پر گنتے گنتے وہ تھک سا گیا سود و زیاں کا یہ حساب بڑا کٹھن اور اذیت ناک تھا۔

"اتنا کچھ کھویا لیکن پایا کیا۔" اس نے خود کلامی کی۔

اپنے ہی گھر سے دربدری۔

ماں کی شفقت سے محروم' گلیوں میں رلتا پھرا۔

تذلیل و رسوائی' مار پیٹ' کوسنے و دھتکار۔

روح کی دھجیاں اڑاتا تشدد۔

نیلی بن کے بھی موت سے بدتر زندگی۔

اصل کو تسلیم کر کے بھی اپنے پہچان کا عذاب بھگتتی طویل حیاتی چلتے چلتے اسے ٹھوکر لگی۔ ہاں کھونے سے زیادہ اس نے پایا تھا۔ دکھتے پیروں پر نیل زدہ جسم کا بوجھ ڈالے لڑکھڑاتے قدموں سے دائیں سمت والی تاریک ٹوٹی پھوٹی گلی کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کہ اسے ایک بار پھر اپنے اصل میں زندہ دفن ہونا تھا' تھپڑوں سے سوجے چہرے کو میک اپ کی مصنوعی تہ میں چھپا کر پھٹے ہوئے خون آلود ہونٹ کو سرخی سے رنگین کرنا تھا' ٹوٹتے وجود پر رنگ برنگ ملبوس سجا کر ایک بار پھر لوگوں کی تفریح کا ذریعہ بننا تھا۔ اسے ایک بار پھر نوید سے نیلی کے روپ میں پلٹنا تھا۔ کہ یہی اس کا اصل تھا اور یہی اس کا مقدر رہنا تھا۔

نامکمل ـــــ شناخت والے اس بے توقیر وجود کو گلی کا اندھیرا نگل چکا تھا۔ مقام فکر ہے کہ انسان معاشرتی حیوان ہے اگر معاشرہ ہی اسے قبول نہ کرے تو وہ کہاں جائے۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی یارب
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

✡ ✡

فاخرہ گل

آج چھٹی کا روز تھا۔ ہمیشہ کی طرح نرگس خاتون صبح سے مصروف تھیں۔ سارے گھر کی بیڈ شیٹس تبدیل کیں' دھونے والے کپڑے جمع کیے' دیواروں سے جالے صاف کیے' کپ بورڈز ٹھیک کیں اور اب کچن میں موجود تھیں۔

ایک ایک چیز کو نخوت سے اٹھا کر دیکھتیں اور پھر اسے دھونا یا صاف کرنا شروع ہو جاتیں۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس وقت اکیلی تھیں۔ نزہت' ان کی اکلوتی بہو ہتھیلیاں مسلتی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ گھڑی پر نظر ڈالتی تو حماد کے آنے کا وقت نزدیک معلوم ہوتا۔ نرگس خاتون کو دیکھتی تو ان کی صفائی کا جوش جنون کی صورت میں سر چڑھ کر بولتا محسوس ہوتا' جو بڑی دل جمعی سے کیبنٹس' سلیب' چولہا اور اب فریج صاف کر رہی تھیں۔

ایسا نہیں تھا کہ نزہت کوئی کام نہیں کرتی تھی' مگر مسئلہ صرف یہ تھا کہ انہیں کسی اور کا کیا کام پسند نہیں آتا تھا۔ اسی لیے آج تک نہ تو کوئی کام والی رکھی گئی اور نہ ہی کسی سے مدد لی اور پھر ایک ہی تو بیٹا تھا ان کا۔ وہ بھی نہایت سلجھا ہوا اور انتہائی باوقار' بچپن سے ہی منظم اطوار کا مالک حماد سے انہیں کوئی شکایت کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں شکایت تھی تو نزہت سے' جو بقول ان کے گھر کو ان ہی کی طرح نہیں سنبھال پا رہی تھی۔ نزہت کے سلیقے اور صفائی ستھرائی کی چاہے دنیا تعریف کرتی' لیکن وہ کبھی مطمئن نہ ہوتیں۔

شروع شروع میں تو ہر وقت گھر میں بس انہی کی آواز گونجتی جس میں وہ نزہت کے پھوہڑ پن کو بیان کرتی سنائی دیتیں۔ کرتیں بھی تو کیا کہ عادت سے مجبور تھیں۔ چاہتی تو یہ ضرور تھیں کہ گھر کی ساری باگ ڈور اب نزہت کے حوالے کردیں۔ مگر ایسا کر نہیں پائی تھیں۔ جبھی کسی دوست کے مشورے پر انہوں نے ہفتے میں ایک دن گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے مختص کردیا تھا۔ باقی دنوں میں وہ نزہت کے کام کاج کرنے کے طریقہ کار کو تنقیدی نظروں سے دیکھتیں اور اتوار کے روز ایک ایک چیز کو یوں صاف کرتیں جیسے ناپاکی کا شبہ ہو۔

صرف انہیں پسند نہ آنے کی وجہ سے اب کپڑے دھلنے اور استری کے لیے لانڈری بھیجے جاتے' وجہ ان کی حد درجہ نفاست نہیں تھی' بلکہ ایسی بہو تھی جس کے آنے سے انہیں بیٹے کے دل میں اپنی محبت کم ہونے کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا اور دل نے اعلا ظرفی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے نزہت کو رقیب اول قرار دیا تو اس کے ہر کام میں نقص نظر آنے لازمی تھے۔

☼ ☼ ☼

حماد پچھلے بیس منٹ سے سیاہ تارکول کی تپتی سڑک پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ آج چھٹی تھی اور وہ نزہت کی دی گئی لسٹ کے مطابق ہفتہ بھر کا سودا خریدنے تو نکلا' مگر واپس گھر جانے کے لیے پیٹرول کی تنگی نے ساتھ نہ دیا۔ سونے پہ سہاگہ کہ آج پیٹرول کی بندش تھی اور جس جگہ چوری چھپے یا ساز باز کر کے پیٹرول فراہم کیا جا رہا تھا۔ وہ یہاں سے کافی دور تھی۔ جبھی اس نے موٹر سائیکل ایک دوست کی دکان پر کھڑی کی' پیٹرول ڈلوانے کا ارادہ کل تک کے لیے ملتوی کرتے ہوئے سودا سلف کے شاپرز اٹھائے اور بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا جہاں آج معمول سے کہیں زیادہ رش تھا' نہ صرف یہ بلکہ آج بسوں پر بھی من مانے کرائے وصول کیے جا رہے تھے۔ یعنی پیٹرول کی بندش نے ان کی قبل از وقت عید کروادی تھی۔

مختلف ماڈلز اور رنگوں کی گاڑیاں اس کے قریب سے زن زن کر کے گزرتیں' مسافر دھکم پیل کر کے بسوں میں چڑھتے اور پھر فاتحانہ انداز میں باقی رہ جانے والوں کو یوں دیکھتے گویا ہمالیہ سر کیے کھڑے ہیں۔ حماد کے ہاتھوں میں سودا چونکہ بہت زیادہ تھا۔ اس لیے بھاگ دوڑ کر نہ تو بس میں چڑھنے کا رسک لینا چاہتا تھا اور نہ ہی اتنی دور ٹیکسی یا رکشے میں جانا چاہتا تھا' سو دوسرے مسافروں کی طرح انتظار کرنا مجبوری تھا کہ اچانک اس کا دھیان گھر میں اس کا انتظار کرتی نزہت کی طرف چلا گیا۔ جو یقیناً" اس کے انتظار میں بھوکی

بیٹھی ہو گی۔

اماں کو چونکہ دوا کی پابندی کرنا لازمی تھی، سو نزہت انہیں باقاعدگی سے پورے وقت پر کھانا کھلا دیا کرتی۔ حماد جانتا تھا کہ خود نزہت بھوک کی کس قدر کچی ہے۔ ذرا سی بھوک برداشت کرنے پر اس کے سر میں درد ہونے لگتا اور چکر آنے لگتا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود اسے کبھی بھی حماد کے بغیر کھانا کھانا گوارا نہ تھا۔ ہاں البتہ بعد میں دوا لینا ضرور منظور تھا۔ نزہت کا خیال آتے ہی چلچلاتی دھوپ میں بھی حماد کو سکون محسوس ہوا تھا۔ لو کے تھپیڑوں پر باد نسیم کا گمان ہوا تو اس نے ایک نظر اک دوجے کے دست و گریباں ہو کر بس میں چڑھتے مسافروں کو دیکھا اور پھر پیچھے آتی ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ دے کر شاپرز سنبھالتا اس کی طرف چل دیا۔

☼ ☼ ☼

ابھی تو نرگس خاتون نے کچن کیبنٹس سے سارے ڈبے نکال کر چیک کرنے تھے۔ یہ دیکھنا تھا کہ جن ڈبوں کے اوپر مارکر سے مختلف دالوں یا مسالوں کا نام لکھا ہے کیا اندر بھی وہی ہیں یا نزہت نے ادھر ادھر کر دیے ہیں اور اگر دال کے ڈبے میں واقعی دال ہے تو کیا چن کے رکھی گئی ہے یا ویسے ہی کنکر پتھر سمیت ڈبے میں شاپر انڈیل دیا گیا ہے۔ مگر بھلا ہو ان کی دوست کا کہ جن کے آنے پر انہیں اپنی اس مصروفیت کو ترک کر کے ان کے پاس بیٹھنا پڑا تو نزہت کے ہاتھوں میں گویا چابی بھر دی گئی ہو۔ بڑی سرعت سے بکھرے ہوئے ڈبے سمیٹے، گوشت دھویا اور پیاز، ٹماٹر کاٹنے لگی۔

ویسے بھی چھٹی کے دن کا مینو کافی عرصے سے ایک ہی چل رہا تھا۔ صبح دہی اور آلو کے پراٹھے دوپہر میں بریانی کے ساتھ رائتہ میٹھے میں ٹھنڈی ٹھنڈی کسٹرڈ سویاں اور رات میں صرف رساول جسے اکثر وہ تینوں دوپہر کی بریانی کے ساتھ بھی مکس کر کے کھا لیتے۔ چھٹی کے دن کیونکہ وہ اماں کے ساتھ ہی کام میں لگی رہتی تھی اس لیے دوپہر کے لیے میٹھا ہمیشہ ہی ہفتے کی رات میں تیار کر کے رکھ دیتی۔ آج اس نے سب سے پہلے چولہے پر چائے چڑھائی، ساتھ ہی بریانی کی تیاری کرنے لگی۔ حماد کے آنے میں ابھی تقریباً" ایک گھنٹہ باقی تھا سو اندر چائے سرو کرنے کے بعد بریانی کے لیے گوشت بھوننے لگی۔

یوں بھی بچے تو ابھی تھے نہیں کہ ان کے ناز اٹھاتی یا ان کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف رہا کرتی۔ بس ہر وقت نرگس خاتون کو خوش رکھنے کی کوشش میں خود ڈھونڈ ڈھونڈ کر کام نکالتی کہ نزہت کا فارغ بیٹھنا انہیں بے حد ناگوار گزرتا۔

بریانی بن کر تیار ہوئی تو پودینے اور باریک کٹے ٹماٹروں سے دم پر لگا کر نزہت نے اندر کا رخ کیا صرف یہ جاننے کے لیے کہ نرگس خاتون کی دوست اب تک موجود ہیں یا جا چکیں۔

"سلیمہ میری بہو جیسی بھولی اور خدمت گزار لڑکی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی تمہیں۔ میں اسے جو کام کہوں، جس انداز میں مخاطب کروں مجال ہے جو اس کی پیشانی پر کوئی بل آجائے۔"

نزہت نے اپنے بارے میں نرگس خاتون کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو زیر لب مسکرا دی۔ طمانیت کا پرسکون حصار جیسے چاروں طرف بننے لگا تھا۔ یہ بات وہ پہلے بھی جانتی تھی کہ نرگس خاتون دل کی بری نہیں ہیں بس ذرا اظہار کے معاملے میں کنجوس ہیں۔ ایسی ہی باتیں اسے پہلے بھی کئی بار سننے کو ملی تھیں مگر ہمیشہ اسی طرح بالواسطہ۔

مسکراتے لبوں سے وہ پیچھے پلٹنے کو ہی تھی جب سلیمہ خالہ کی کراکری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے نرگس خاتون لیکن کیا تمہارا دل نہیں چاہتا پوتے پوتیوں کو گود میں کھلانے کا، توتلی زبان میں ان کی باتیں سننے اور رات کو انہیں کہانیاں سنانے کا۔ ارے مانا کہ تمہاری بہو بہت گنوں والی ہے مگر اس کمی کے آگے تو سب ہیچ ہے کہ نہیں۔۔۔"

کچن کی طرف بڑھتے نزہت کے قدم وہیں رک گئے تھے۔ سانس گویا برف کی بن کر کہیں اندر ہی جم گئی تھی۔

"حماد ابھی جوان ہے۔ گورا چٹا ہے نہ صرف قد کاٹھ اچھا ہے بلکہ کردار بھی اعلا ہے تو کب تک اس کے جذبات کو نظر انداز کرو گی۔"

"لیکن۔۔۔"

"ارے وہ منہ سے تو کبھی نہیں کہے گا۔۔۔ مگر خود سوچو چھ سال ہونے کو آئے شادی کو۔۔۔ پھر یہ بات تو تمہارے کرنے کی تھی ناجو آج میں کر رہی ہوں۔"

وہ اب وہاں رکنا نہیں چاہ رہی تھی مگر کیا کرتی قدموں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا چاہنے کے باوجود وہ چلنا تو دور خود کو گھسیٹ بھی نہیں پا رہی تھی۔ سو انہیں قدموں پر وہیں ڈرائنگ روم کے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

"ارے ایک ہی ایک تو تمہارا بیٹا ہے، اس کی زندگی کے لیے کچھ کر لو ورنہ یہ نزہت تو اپنے میسنے پن سے نہ صرف تمہارے ہونٹ سی دے گی بلکہ آنکھیں بھی بند کر دے گی۔"

نزت سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ان کی کہی گئی ایک ایک بات کو بڑی گہرائی میں سوچ رہی تھی کہ اچانک وال کلاک میں ہوتی ٹن ٹن سے چونک گئی۔

"وہ اماں کے تو کھانے کا وقت ہو گیا ہے اور ابھی دوا بھی لینی ہے۔" دل تو چاہ رہا تھا کہ کسی سے بھی بغیر کچھ کہے سنے بس وہیں بیٹھی رہے لیکن ایسا نہیں تھا اور پھر ہمیشہ وہ کب ہوتا ہے۔ جو ہمارا دل خواہش کرتا ہے۔

خواہشوں کا بھی کوئی معیار ہوا کرتا ہے
کیسی خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر ہوتا

بادل ناخواستہ کچن میں جا کر اس نے نرگس خاتون اور سلیمہ خالہ کے لیے ٹرے میں کھانا سیٹ کیا اور ان کے بیڈ روم میں ہی سرو بھی کر کے آئی۔ واپسی میں اس نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا تو وہ بھی اسی کو دیکھ رہی تھیں۔ نرگس خاتون تو اسے سوچتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں مگر سلیمہ خالہ کا انداز بالکل ویسا تھا جیسے قصاب کا بکرے کو ذبح کرنے سے پہلے ہوتا ہے۔ اس قدر عجیب نظروں سے دیکھنا نزہت کے لیے بہت تکلیف کا باعث تھا جبھی وہاں رکے بغیر ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موندے حماد کا انتظار کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ٹیکسی فراٹے بھرتی سیاہ سڑک کو اپنے پہیوں تلے روندتی جا رہی تھی کہ اچانک آگے ٹریفک جام ہونے پر رفتار کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ دور دور تک گاڑیوں کی لمبی قطار ہونے کی وجہ سے جلدی گھر پہنچنے کا امکان تقریباً" دم توڑنے لگا تھا۔ موٹر سائیکل سوار البتہ زگ زیگ کی صورت میں مختلف گاڑیوں کے درمیان سے جگہ بناتے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے تب حماد کو بھی اپنی موٹر سائیکل یاد آئی مگر اس سے پہلے کہ وہ اس یاد کے ساتھ کچھ وقت گزارتا گاڑی کے کھلے شیشے سے آتی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"حماد بھائی۔" چہکتی ہوئی آواز میں مخاطب کرنے والا آخر یہ ہے کون، حماد نے گردن موڑ کر دیکھا تو سامنے سلیمہ خالہ کی تینوں بیٹیاں میک اپ سے لش پش ہوئیں اس ٹریفک جام کے عین بیچوں بیچ کھڑی تھیں۔

"تم لوگ۔۔۔ یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کیا آپ گھر جا رہے ہیں؟" منجھلی بیٹی سنبلہ نے سوال کے جواب میں بھی سوال داغ دیا تھا۔

"ہاں لیکن تم سب۔۔۔؟" حماد کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا کہ اس بدترین ٹریفک جام کے دوران آخر وہ اس کی ٹیکسی تک پہنچیں تو کیسے۔

"ہمیں بھی گھر جانا ہے کیا آپ کے ساتھ بیٹھ جائیں؟"

"میرے ساتھ؟" حماد نے پہلے تو حیرت سے ان تینوں کو اور پھر ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا جو کچھ دیر پہلے تک تو ٹریفک جام کی وجہ سے بے زار تھا مگر اب "صحرا میں پھول" کھلتے دیکھ کر خوا مخواہ مسکرائے جا رہا تھا۔ حماد کو پس و پیش کا شکار دیکھ کر خود ٹیکسی ڈرائیور نے پہلے تو گود

میں رکھے رومال سے منہ میں جمع پان کی پیک صاف کی جو اب رال کی صورت بہنے کو تھی پھر گل قندنی ان تینوں لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے حماد سے مخاطب ہوا۔

"صاحب خیر ہے اگر روٹ وہی ہے تو بٹھالوان کو بھی... میں فالتو کرایہ نہیں لوں گا۔"

"روٹ کیا' ہماری تو گلی بھی ایک ہی ہے۔ جہاں یہ اتریں گے وہیں ہم بھی اتر جائیں گے۔" بڑی تسکین نے ڈرائیور کو مطمئن کرنے کو کہا تو ساتھ ہی ان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول دیا گیا البتہ ان کے بیٹھتے ہی گاڑی میں گویا خوشبو کا ایک طوفان امڈ آیا تھا۔ ڈرائیور نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر بیک مرران پر سیٹ کیا اور اسٹیئرنگ پر انگلیوں سے گویا پیانو کی مشق کرنے لگا۔

"حماد بھائی کہاں گئے تھے آپ؟" منیلہ نے حماد کو مخاطب کیا جو انتہائی کوفت سے سامنے نظر آنے والی گاڑیوں کی لمبی قطار کو گننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ سرخ و سفید حماد گرمی کی حدت سے مکمل طور پر پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

"ذرا مارکیٹ تک گیا تھا۔"

"تو آج آپ کی اپنی بائیک کہاں گئی جو ٹیکسی استعمال کر رہے ہیں۔"

"دوست کے پاس ہے۔" وہی مختصر جواب اور نپا تلا انداز... عموماً" وہ لڑکیوں سے اسی انداز میں بات کرتا تھا۔ یہ تینوں تو محلے کی تھیں۔ وہ اپنے آفس میں بھی کولیگز کے ساتھ ریزرو ہی رہتا۔ جس پر اسے کئی خطابات سے نوازا جاتا لیکن اس کا یہ رویہ صرف فی میل کولیگز کے ساتھ ہی ہوتا۔ باقی میل اسٹاف کے ساتھ وہ خاصا فرینک رہتا۔ خوش مزاجی کے ساتھ فارغ اوقات میں گپیں مارنا' قہقہے لگانا' پارٹیز وغیرہ میں انجوائے کرنا۔ ہر طرح سے وہ زندگی انجوائے کرتا مگر ہاں لڑکیاں اس کی نظر التفات سے محروم ہی رہتیں۔ بہانے بہانے سے اس سے بات کرنے کی کوشش کرنا' جان بوجھ کر اس کی ٹیبل پر اپنی کوئی چیز بھولنا' صرف اسے متوجہ کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرنا' مگر سب بے سود ثابت ہوتا تو بس اس انتہائی ہینڈسم بندے کو آتے جاتے دیکھ کر صرف حسرت سے آہیں بھرا کرتیں۔

یہ جاننے کے باوجود کہ یہ حسین شہزادہ اپنے دل کی سلطنت کسی اور کے نام کر چکا ہے وہ چند لمحے ہی سہی مگر اس سے بات کر کے اپنے دل کی تسکین چاہتی تھیں مگر حماد کو کون سمجھاتا کہ جسے زہت کے علاوہ کسی اور سے بات کرنے کی نہ چاہ تھی نہ طلب۔

شادی کو چھ سال گزر جانے کے باوجود گھر سے باہر ہوتا تو چند لمحے بھی فالتو نہ گزارتا آفس میں بھی ٹائم آف ہوتے ہی اپنی موٹر سائیکل کی طرف لپکتا تو دیکھنے والے زہت کی قسمت پر رشک کیے بنا نہ رہتے جسے یوں دیوانگی کی حد تک چاہنے والا جیون ساتھی ملا ہے۔

"ہم دراصل پیچھے والے رکشے میں تھے۔ آپ کو ٹیکسی میں دیکھا تو سوچا ایک ہی جگہ تو جانا ہے خوامخواہ الگ الگ پیسے دینے کا بھلا کیا فائدہ؟؟"

حماد نے سر ہلا کر یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ان کی بات سن رہا ہے۔ جواب دینا یا ان کے اس عمل پر تبصرہ کرنا البتہ اس نے ہرگز ضروری خیال نہیں کیا تھا۔ ٹریفک رواں ہونے کا فی الحال دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا اوپر سے دوپہر کا وقت اور بلا کی گرمی...

"کیا ٹیکسی میں اے سی نہیں ہے؟"

تسکین نے براہ راست بیک مرر میں دیکھتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا تو وہ کھل سا گیا وہ خود کتنی ہی دیر سے ان تینوں کو دیکھے جا رہا تھا اب جو براہ راست اسے مخاطب کیا گیا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔

ایک بار پھر پہلے تو اس نے پان کی پیک کو اپنے سرخ ہونٹوں کے کناروں سے بہہ جانے سے روکا اور پھر اے سی کا بٹن دباتے ہوئے باقاعدہ پیچھے مڑا۔

"اے سی چلنے کے پیسے اضافی دینے ہوں گے کرایہ میں جمع کر کے۔"

"ہاں تو کیا ہم تمہیں اتنے ہی گئے گزرے لگتے ہیں کہ اضافی دو ڈھائی سو بھی نہیں دے پائیں گے۔" سلونی' سلیمہ خالہ کی سب سے چھوٹی بیٹی پہلی مرتبہ بولی تھی مگر یوں کہ کتنی ہی دیر اس کی آواز اے سی کی نرم نرم خنکی کے ساتھ ٹیکسی کی فضا میں اپنا اثر قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔

کمان سے ابرو آنکھوں سے کہیں زیادہ بالوں کے نزدیک معلوم ہو رہے تھے۔ ہونٹوں کے کٹاؤ کو بے حد نمایاں کر کے لگائی گئی سرخ لپ اسٹک اور کاجل سے لبریز آنکھیں... وہ تسکین اور منیلہ کے مقابلے میں نہایت "سادہ" تھی۔ اور وہ بھی اس لیے کہ عمر میں ان دونوں سے چھوٹی تھی مگر بات کرنے کا انداز ان دونوں سے کہیں زیادہ مضبوط معلوم ہوتا۔

کچھ دیر تو ٹیکسی میں خاموشی رہی لیکن آخر کب تک... وقت گزاری کے لیے باتیں ہی کرنا تھیں سو منیلہ ایک بار پھر خاموشی توڑنے کا سبب بنی۔

"حماد بھائی آپ کو پتا ہے سلونی بیوٹیشن کا کورس کر رہی ہے۔" موبائل پر زہت کو میسج ٹائپ کرتے حماد نے اپنا نام سن کر پہلے تو سر اٹھایا لیکن پھر خموشی سے اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

"آج ایک ادارے کی طرف سے "بیوٹی کونٹیسٹ" تھا میں نے اور تسکین نے بھی سلونی سے پارٹی میک اپ کروایا تھا اور پتہ ہے ادارے نے اسے سرٹیفکیٹ بھی دیا ہے تاکہ جب یہ اپنا پارلر بنائے۔ فریم کروا کر اس میں لگوا دے... ویلیو بڑھتی ہے نا اس طرح کسٹمرز کے سامنے۔"

"مجھ سے باتیں کر کے تم خوامخواہ وقت ضائع کر رہی ہو منیلہ' کیونکہ نہ تو مجھے تمہاری باتوں میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی سلونی میں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم خاموش رہو۔"

اس کے اسی رویے کی وجہ سے کچھ لڑکیاں اسے روڈ کہا کرتی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور البتہ حماد کے اس رویے پر بڑا حیران ہوا تھا اور سوچ میں پڑ گیا تھا کہ کیا دنیا میں اس شخص سا ناشکرا کوئی اور بھی ہو گا جو ایک نہ دو بلکہ تین لڑکیوں کو یوں نظر انداز کر دے۔

منیلہ تو اس کے جواب پر ہونہہ کر کے موبائل نکالنے لگی مگر سلونی کو اس لمحے اپنی بے حد ہتک محسوس ہوئی تھی۔ غصے سے دانت بھینچے انگلیوں میں انگلیوں کو پھنسائے وہ خاموش رہی کہ اس وقت عقلمندی کا تقاضا یہی تھا۔

لائن سے لگی گاڑیاں چیونٹی کی رفتار سے آہستہ آہستہ رینگنے لگیں تو سب نے سکون کا سانس لیا کہ آہستہ ہی مگر فاصلہ اب طے ہو ہی جائے گا۔

چونکہ حماد نے فون پر میسج کر کے اپنے دیر سے آنے کے متعلق بتا دیا تھا اس لیے زہت مطمئن تھی لیکن حماد کے اصرار کرنے کے باوجود البتہ اس نے اکیلا کھانا کھانا گوارا نہیں کیا تھا۔ محض یہی ایک بات تھی جس پر وہ حماد کی نافرمانی کی مرتکب ہوتی اس کے علاوہ اس نے حماد کو حقیقی طور پر اگر اپنا مجازی خدا کہا تھا تو دل سے مانتے ہوئے اس کی ہر بات کو ماننا اور ہر خواہش کو پورا کرنا بھی خود پر فرض رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حماد اس کا مقام کسی کو دینے کو تیار نہ تھا۔

آج سلیمہ آنٹی کے جانے کے بعد سے زہت کا دل چاہ رہا تھا کہ فورا" سے پیشتر حماد سے بات کرے اس سے پوچھے کہ وہ اس بارے میں کیا سوچتا ہے؟ ورنہ وہ تو اب تک کے وقت کو شاید ہنی مون پیریڈ ہی سمجھتی رہتی کہ سلیمہ خالہ نے آ کر اس سہانے خواب سے جگا دیا۔

خواب سے حقیقت کا سفر انتہائی واہموں اور خدشات سے بھری اس پگڈنڈی کا سا تھا جہاں اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ اگلا قدم رکھنے کو جگہ مل پائے گی بھی کہ نہیں۔ یہی سوچتے سوچتے جانے وہ کہاں تک سوچ چلی جاتی کہ باہر سے ٹیکسی کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔ اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکایا تو حماد کے ساتھ سلیمہ خالہ کی تینوں بیٹیاں ایک ایک کر کے گاڑی سے اترتی دکھائی دیں۔

سودا چونکہ زیادہ تھا اس لیے حماد کے کرایہ ادا کرنے تک تینوں بہنوں نے سودے کے شاپرز ٹیکسی سے نکال کر باہر رکھے۔ ٹیکسی ڈرائیور الوداعی نظروں سے دیکھتا رخصت ہوا تو اتنی دیر میں منیلہ اور تسکین شاپرز اٹھائے گھر کی بیل دے چکی تھیں۔ تین گھر

چھوڑ کر تو ان کا گھر تھا تبھی شاپرز گھر کی دہلیز پر چھوڑے اپنے گھر کی طرف چل دیں۔ مگر اس سے پہلے کہ سودے کے کچھ شاپرز سلونی لے کر ان کے گھر تک پہنچتی۔ حماد نے فوراً" اسے ٹوک دیا۔

"سلونی یہ سب تم لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے کیا ہو گیا ہے آج تم تینوں کو... اگر میں یہ سودا وہاں سے خرید سکتا ہوں تو صرف اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ اسے گھر تک لے جاؤں گا... پلیز... لڑکیوں کی زندگی بہت نازک موتیوں سے جڑی ہوتی ہے اگر ایک بھی ٹوٹ جائے تو باقی موتی کبھی پہلے سی شکل میں نہیں آپاتے... حیرت ہے سلیمہ آنٹی تم لوگوں کو یہ باتیں کیوں نہیں سمجھاتیں۔"

بے انتہا زچ ہو کر حماد نے اس کے ہاتھ میں موجود شاپرز لینا چاہے مگر شاپرز منتقل کرنے کے دوران سلونی نے اس کے مضبوط ہاتھ پر اپنے نرم ہاتھوں کا لمس بھرپور طریقے سے منتقل کیا اور آنکھوں سے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"میری بات چھوڑو، تم اتنے سمجھ دار ہو، یہ سب باتیں کیوں نہیں سمجھتے۔"

عین دوپہر کا وقت تھا۔ گلی سنسان ہونے کی وجہ سے آج سلونی حماد تک اپنے دل کی بات پہنچانے کی جرات کر تو بیٹھی مگر عین اسی وقت نزہت نے گیٹ کھولا گھبراہٹ میں سلونی نے تو حماد کا ہاتھ چھوڑا ہی مگر خود حماد کے ہاتھ سے بوکھلاہٹ میں شاپر چھوٹا اور اندر موجود سبزی وہیں گیٹ کے سامنے بکھر کر رہ گئی۔

نزہت نا سمجھی سے کبھی خجالت سے سر کھجاتی حماد کو دیکھتی تو کبھی قیامت خیز فٹنگ کے ساتھ کمر مٹکاتی سلونی کی پشت کو۔ ابھی بمشکل اٹھارہ کی ہوتی سلونی کو دیکھ کر کوئی بھی اس کی حقیقی عمر کا تعین نہ کرتا۔ جسامت اور اٹھان ایسی تھی کہ باقی سب بہنیں اپنے گھر میں کھلتی اس نوخیز کلی کو حسرت سے دیکھا کرتیں۔

"تم یہ باقی سودا لے کر اندر جاؤ میں یہ سب سمیٹ لاتا ہوں۔"

حماد کی آواز پر نزہت چونکی اور سامان اندر لے جانے میں حماد کا ساتھ دینے لگی۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا اقبال سے ابھی تک تم نے کوئی بات نہیں کی۔" سنبلہ نے دوسرے نمبر والی شمیم کے ہاتھ سے پائپ لے کر صحن میں پانی ڈالنا شروع کیا تو سرخ اینٹوں کا صحن کھل سا اٹھا اس سے پہلے وہ دونوں مل کر برآمدہ دھو چکی تھیں۔

"کی تھی..." شمیم کے مختصر سے جواب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر پھیلے مایوسی کے تاثرات نے سنبلہ کے ہاتھ سے پائپ نیچے رکھوا دیا۔ تسکین، سلونی کو ساتھ لگا کر صحن میں چارپائیاں بچھا کر رات کا انتظام کر رہی تھی تاکہ لائٹ جانے سے پہلے پہلے سب کے بستر سیٹ کر دیے جائیں۔

"سلونی یہ پائپ لپیٹ کر موٹر والی سائیڈ پر ٹانگ دو اور ہاں ایک بار پھر موٹر چلا کر دیکھ لینا پانی آیا ہے کہ نہیں۔"

سلونی صحن میں بچھی چارپائیوں پر چادریں ڈالتی فوراً" پائپ لے کر موٹر کی طرف بڑھی اور تھوڑی ہی دیر میں موٹر چلنے کی مخصوص آواز پورے گھر میں یہاں سے وہاں دوڑنے لگی۔

"بات کی تھی تو پھر کیا کہتا ہے؟"

"ساری عمر مجھے بٹھا کر کھلانے کو تیار ہے مگر کہتا ہے شادی نہیں کر سکتا۔"

"نہیں کر سکتا؟ کیا مطلب ہے اس کا اور... اور پھر کیا مطلب ہے ان تحفوں کا جو وہ ہر دوسرے دن تجھ پر واری صدقے ہو کر دیتا رہتا ہے۔"

"کہتا ہے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں تائے کی بیٹی سے منگنی بھی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود پہلے چاروں بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں پوری کرے گا پھر کہیں اپنے بارے میں سوچے گا۔"

"اپنے...؟ یعنی تمہارے اور اپنے بارے میں نا؟"

"نہیں یہ فیصلہ بھی وہ بعد میں کرے گا کہ شادی کس سے کرنی ہے۔"

"بھاڑ میں جائے وہ اور اس کے سب بہن بھائی... فیکٹری میں تمہارے ساتھ ٹائم پاس کرتا ہے وہ اور بس۔" غصے سے سنبلہ کی آنکھیں سرخ ہونے کو تھیں۔ آواز پر قابو رہا تھا نہ لہجے کی تختی پر۔ وہ تو یہ بھی بھول بیٹھی تھی کہ خود شمیم کا دل اس وقت شکست خوردہ ہے اور اسے تسلی کے دو میٹھے بول سننے کی کس قدر آس تھی۔

اندر سے باپ کے کھانسنے کی آواز آئی تو سنبلہ مزید کھول گئی۔

"ابا کو بھی اٹھا لانا تھا اندر سے... ساری عمر ہماری کمائی کھا کھا کر جب ہمیں کچھ دینے کی باری آئی تو بستر سے لگ گیا... ہونہہ۔"

"سنبلہ زبان کو لگام دو اپنی... جیسا بھی ہے ہمارا باپ ہے وہ، تمہیں اس دنیا میں لانے کا وسیلہ..."

"ایک قطار سے بیٹیاں پیدا کرنے کا شوق تھا بس، یہ نہیں سوچا تھا کبھی وسیلہ بنتے ہوئے کہ آگے جا کر ان کی شادیاں کرنے کی بھی سکت ہو گی کہ نہیں۔"

تسکین کی ڈانٹ بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں کر پائی تھی۔ سلونی نے سات چارپائیوں کے تقریباً" وسط میں ٹیبل رکھا اور تھوڑی دیر میں کولر میں برف ڈالے دوسرے ہاتھ میں ہینڈ فین تھامے آموجود ہوئی، برف والا کولر ٹیبل پر اور ہاتھ کے پنکھے سب کی چارپائیوں پر تکیے کے بالکل ساتھ رکھنے کے بعد اب وہ فارغ تھی۔ سو ان کے ساتھ آبیٹھی۔

"کیوں پریشان ہو رہی ہو اتنا۔ اور وہ بھی اب جبکہ اماں ابا نے ہم سب کو اپنی مرضی کی شادی کا اختیار سونپ دیا ہے۔"

"ہونہہ چنے کھانے کو ملے بھی تو تب جب منہ میں دانت ہی نہ رہے... کیا فائدہ پھر ان کے ملنے کا۔" شمیم کے لہجے میں حسرت نما سوگ اترا ہوا تھا۔

"تم اس بات پر خوش ہو سکتی ہو سلونی کیونکہ ابھی تم کم عمر ہو لیکن یہ... یہ شمیم آپا جو صرف اماں ابا کی ضد کی وجہ سے آج بیالیسویں سال میں پہنچ گئی ہیں، انہیں اب اس بات کا کوئی فائدہ نہیں اور کیا سمجھتی ہو رخسانہ آپا جو پینتالیس کی ہونے کے باوجود آج اماں کے ساتھ اسکن وائٹننگ فیشل کروانے گئی ہیں تو کیا اپنی ڈھلکتی ہوئی جلد کو قابو میں کر لیں گی؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا سلونی آج نہ کل۔"

"لیکن کوشش کرنے، میرا مطلب ہے قسمت آزمانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" سلونی نے بات کرتے ہوئے تائید حاصل کرنے کی غرض سے ایک ایک کر کے سب کو دیکھا مگر سبھی کے چہرے پر مایوسی پاؤں پسارے بیٹھے معلوم ہوئی۔

"گڑیا یہ شادی کی بات ہو رہی ہے کسی پرائز بونڈ کو جیتنے کی نہیں کہ اگر ایک دفعہ نہ مل سکا تو پھر دوسری مرتبہ قسمت آزمالی جائے اور پھر یہ جو اماں ابا ہیں نا انہیں میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔" شمیم آپا کے الفاظ بلاشبہ سادے مگر لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔

"اب آ کے اگر انہوں نے ہم سب کو اپنی مرضی کی شادی کا اختیار دیا ہے تو صرف اس لیے تاکہ کل کو ہم اپنی زندگیوں کے بے کار ہونے یا تنہا رہ جانے پر انہیں مورد الزام نہ ٹھہرا سکیں۔ ہمارے سامنے سرخرو اور دنیا کے سامنے بری الذمہ ہونے کا بھلا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہوتا۔"

"جب لوگ خود طلب گار تھے بڑی چاہ سے ہمارا ہاتھ تھامنے گھر تک آتے تب تو انہیں ایک ایک شخص میں کتنی ہی خامیاں نظر آتیں تو اب کیسے بھاگیں ماضی کے پیچھے۔ وہی لوگ آج اپنے دو دو، تین تین بچوں کے ساتھ خوش باش زندگی گزار رہے ہیں۔"

تسکین کے اندر چھپا کوئی درد کسمسانے لگا تو اس نے کولر سے پانی کا گلاس بھر کر منہ کو لگا لیا۔ مقصد اپنی پیاس بجھانے سے زیادہ خود کو ان سب کی نظروں سے چھپانے کا تھا جو اس کا دکھ اپنے سینے میں محسوس کرتے ہوئے ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"غلطی اماں ابا سے کہیں زیادہ تم سب کی تھی جو اپنی زندگی کے لیے خوشیاں، راستہ معلوم ہونے کے

باوجود خرید نہ سکیں۔۔۔ لیکن میں اب ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی' جسے چاہوں گی اسے ہر قیمت پر پا کر رہوں گی۔"

دل ہی دل میں خود سے عہد کرتی سلونی نے ایک سرور کی سی کیفیت میں آنکھیں بند کیں تو ذہن میں حماد اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ آن موجود ہوا نہ صرف یہ بلکہ آج دوپہر کا واقعہ یاد آتے ہی اس کے ہونٹ خود بخود مسکرانے لگے جبھی وہ بڑی لگاوٹ سے اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگی۔

☆ ☆ ☆

یہ بات صرف آج کی نہیں تھی بلکہ شروع سے ہی نزہت کی یہی عادت رہی تھی کہ کبھی حماد کی باہر کی سرگرمیوں کو کریدنے یا ان کا کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہاں اگر وہ خود سے کچھ ڈسکس کرتا تو بڑی دلچسپی سے اس کی پوری بات سنتی اور اپنی رائے بھی دیتی۔

آج گو کہ اس کا ذہن متجسس ضرور تھا مگر اس کے باوجود دوپہر سے رات ہونے کو آئی تھی اور اس نے اب تک حماد سے آج دوپہر کے واقعے کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا تھا۔

رات کو دونوں نے اماں کے ساتھ کھانا کھایا انہیں دوائی دی' کچھ دیر وہیں بیٹھ کر ان کے ساتھ گپ شپ کی۔ اس دوران کئی مرتبہ اماں کا دل چاہا کہ نزہت اٹھ جائے تاکہ وہ حماد سے سلیمہ خالہ کے مشورے کے مطابق بات کریں۔ لیکن ایسا ہو نہ سکا اور وہ محض پہلو بدلتی رہیں۔

حیران تو زیادہ وہ اس بات پر تھیں کہ ماں ہوتے ہوئے آج تک انہیں اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا۔ شاید اس لیے کہ اپنی خوش اخلاقی اور خدمت سے نزہت نے اپنا اس قدر گرویدہ بنا رکھا تھا کہ جب کبھی ذہن میں خیال آتا بھی تو وہ رضائے الٰہی سمجھ کر دل کو سمجھا لیا کرتیں۔ لیکن آج یہ سلیمہ خالہ کیسی جوت جگا گئی تھیں ان کے من میں۔

ایک نظر انہوں نے سامنے بیٹھے حماد اور نزہت کو دیکھا جو چائے کی چسکی لینے کے ساتھ کسی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس رہے تھے۔ نزہت کے چہرے کی شرمگیں مسکراہٹ میں ابھی تک نئی نویلی دلہن کی چھب معلوم ہوتی اور اماں کے سامنے حماد بھی اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے زیر لب جانے کیا کہتا کہ وہ گھبرا کر پہلے اماں کو دیکھتی۔

شرمیلی سی مسکراہٹ لبوں پر بعد میں بکھرتی جب اماں کے کچھ نہ سننے کا یقین ہوتا۔

"کیا ان دونوں کو معلوم نہیں ہے کہ ان کی شادی کو چھ دن نہیں بلکہ پورے چھ سال گزر چکے ہیں۔" اماں اکثر انہیں دیکھ کر سوچا کرتیں پھر اللہ کا شکر بجالاتیں۔

لیکن آج ایک سوچ اس کے علاوہ بھی ذہن کی چار دیواری پھلانگ کر آدھمکی تھی۔

"کیا انہیں اپنی زندگی میں موجود اس خلا کا احساس ہے بھی کہ نہیں۔۔۔؟"

"کیا ان کی سماعتیں ماما' پاپا جیسا پیارے الفاظ سننے کو ترستی نہیں ہوں گی۔۔۔؟"

"ایک ہی ایک تو میرا بیٹا ہے کیا میں اسی طرح بے ثمر رہنے دوں گی۔۔۔؟"

"نہیں آج نہیں تو کل میں حماد سے بات کر کے رہوں گی۔" فیصلہ کن انداز میں سوچتے ہوئے انہوں نے خود کلامی کی تھی۔

"اماں آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" نزہت نے کپ پکڑ کر ان کی طرف بڑھایا۔

"ہاں بس خیال ہی نہیں رہا۔" نرگس خاتون نے کپ لیا اور گھونٹ گھونٹ کر کے چائے حلق سے اتارنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"اچھا تو یہ تھا آپ کا دیر سے گھر آنے کا قصہ۔"

اماں کے چائے پی چکنے کے بعد حسب معمول ان سے اجازت لے کر وہ دونوں واک پر نکلے تھے' لائٹ جا چکی تھی مگر گھر میں جنریٹر ہونے کی وجہ سے اماں اپنے کمرے میں سکون سے لیٹی تھیں اور وہ دونوں قریب ہی واقع عید گاہ سے ملحقہ پارک میں چہل قدمی کرنے چلے آئے اور یہ ان کا آج کا نہیں پچھلے چھ سالوں کا معمول تھا۔

اسی وقت وہ دونوں اپنے دن بھر کی مصروفیات و معمولات کو بیان کیا کرتے اور آج بھی حماد نے اسے اپنی موٹر سائیکل میں پیٹرول ختم ہونے سے لے کر سلیمہ خالہ کی تینوں بیٹیوں سمیت گھر پہنچنے کی سنائی تو وہ مسکرائی دی۔

"سلیمہ خالہ آج کل اپنی بیٹیوں کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ اماں بتا رہی تھیں کہ انہوں نے ذات پات رنگ نسل ہر چیز کا فرق ختم کر دیا ہے بلکہ اپنی بیٹیوں تک سے ان کی مرضی پوچھتے ہوئے انہیں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جس کی پہلے بات بن جائے' چھوٹی ہو یا بڑی وہ اسی کی شادی کر دیں گی۔"

"چلو اچھا ہے سلیمہ خالہ کو بھی عقل آئی۔" چلتے چلتے حماد پارک میں لگی بڑی سی اسٹریٹ لائٹ کے نیچے موجود سنگی بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔

"تھک گئے ہو شاید۔" نزہت نے اس کے چہرے سے اندازہ لگانا چاہا۔

"ارے نہیں یار' آج تو چھٹی کا دن تھا' آج بھلا کیسے تھک جاتا۔" وہ ہنسا تھا۔

"نہیں تو تمہارے خیال سے بیٹھ گیا تھا۔ چھٹی کے دن اماں کے پیچھے پیچھے کام کر کے تھک جاتی ہو گی نا؟" آنکھوں میں جہاں بھر کا پیار سموئے وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ تمہیں کس نے کہا۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے بوڑھی سمجھنے لگے ہو۔" نزہت کی بات پر حماد کا بے ساختہ قہقہہ ابھرا تھا۔

"جی نہیں میڈم مجھے پتہ ہے کہ ابھی تو تم جوان ہو' بلکہ بہار کیا ہر موسم کا نشان ہو۔"

"بالکل ٹھیک اور میں اس وقت تک جوان اور بہار کا نشان رہوں گی جب تک ہم دو سے تین نہیں ہو جاتے۔" حماد کے مسکراتے چہرے پر ایک دم سنجیدگی اترتی خود نزہت نے محسوس کی تھی۔

"یعنی اس کے بعد میرے حصے میں ایک بوڑھی اور ست الوجود' کھانستی ہوئی نزہت آئے گی؟"

اس کی بات پر نزہت کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آیا وہ یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہے یا ازراہ مذاق۔

"کیا تمہارا دل نہیں چاہتا حماد کہ رات کو جب ہم واک کرنے آئیں تو ساتھ بے بی پرام بھی لائیں۔۔۔"

"وہ دیکھو نوید بھائی اور عظمی ہمارے ساتھ ہی واک پر آنا شروع ہوئے تھے تا اب دو کی بجائے چاروں مل کر واک کرتے ہیں۔" نزہت نے سامنے دیکھتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا تھا۔ جہاں عظمی بے بی پرام سنبھالے ہوئے تھی جبکہ نوید نے اپنے بیٹے کی انگلی پکڑ رکھی تھی اور بڑے شاد و مسرور باتیں کیے جا رہے تھے۔

"مگر اماں ہمارے پیار میں آ کر کچھ کہتی نہیں ہیں تو کیا۔۔۔ سوچتی اور چاہتی تو ہوں گی نا۔"

"دیکھو نزہت ہر کام کے لیے اللہ نے ایک وقت مقرر رکھا ہے کوئی بھی کام نہ تو اس وقت سے پہلے ہو سکتا ہے نہ بعد میں۔۔۔ تو پھر تم اس چیز کی ٹینشن کیوں لے رہی ہو۔"

"اور کچھ نہیں تو ہمیں لیڈی ڈاکٹر کے پاس تو جانا چاہیے کہ نہیں۔" حماد کی بات تو جیسے اس نے سنی ہی نہیں تھی۔

"کیا خیال ہے پھر ابھی چلیں ڈاکٹر کے پاس؟" حماد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں ابھی تو بہت رات ہو گئی ہے' کل ان شاء اللہ آفس سے آنے کے بعد۔"

وہ اس کی بات کو شاید سچ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ ابھی اور اسی وقت اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتا ہے جبھی معصومیت سے جواب دیا تو وہ مسکرا کر بس اسے دیکھتا ہی گیا۔

☆ ☆ ☆

صبح نزہت' حماد کی ضرورت کی تمام چیزیں نکال کر سامنے رکھنے کے بعد اب کچن میں مصروف تھی جب موقع غنیمت جانتے ہوئے اماں حماد کے پاس بیڈ روم میں جا پہنچیں اور بغیر کسی تمہید کے پوتے پوتیوں کی فرمائش کی تو نما کر بالوں میں تولیہ رگڑتا حماد حیران رہ گیا۔

"اماں پوتے پوتیاں لانے کی فرمائش تو آپ ایسے کررہی ہیں جیسے بازار سے کوئی سودا لاتا ہو۔"

"تم چاہے جو بھی سمجھو لیکن میرا کیا پتا آج ہوں کل نہ رہوں تو۔ کیا چاہتے ہو بوڑھی ماں یہی ارمان دل میں لیے اس دنیا سے چلی جائے۔" نرگس خاتون جذباتی ہوئیں تو بات کرتے کرتے گلا رندھ گیا۔

حماد کے لیے البتہ یہ امر نہایت حیران کن تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے ساس اور بہو دونوں کو ایک ہی ساتھ بچوں کی طلب کیسے ہونے لگی۔

"یاد ہے بیٹا شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد ڈاکٹر سے کچھ ٹیسٹ کروائے تھے کیا کہتی تھی وہ؟"

"ارے اماں ٹیسٹ ہی تو ہیں پھر سے کروالیں گے۔۔۔" شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے حماد نے مصالحانہ رویہ اختیار کیا تھا۔

"جیتے رہو میری جان' اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

"ویسے اماں کل کوئی آیا تھا کیا گھر میں؟"

"کل؟" اماں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے ٹھوڑی پر انگلی رکھی اور پھر مایوسی سے نفی میں گردن ہلادی۔

"نہیں بیٹا کل تو یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ سوائے سلیمہ کے۔"

"سلیمہ خالہ آئی تھیں کل؟"

"ہاں آئی تو تھی لیکن وہ بھی تم دونوں کے آنگن میں کھلنے والے پھول کے لیے بہت پریشان تھی اور کہہ رہی تھی کہ آخر کب تک ہم انتظار کریں گے اس خوشی کا۔"

حماد بات کی تہ تک پہنچ چکا تھا یعنی بے چینی پھیلانے کی تمام تر ذمہ داری سلیمہ خالہ کے سر جاتی تھی۔

اچانک ہی ذہن میں سلونی کا عکس بھی آن ابھرا تھا۔

"سلیمہ خالہ جتنا وقت دوسروں کی بہو بیٹیوں کا دھیان رکھنے میں لگاتی ہیں اتنا دھیان اپنی ہی بیٹیوں پر دیتیں تو آج وہ یوں اوچھی حرکتیں نہ کررہی ہوتیں۔" حماد نے تلخی سے سوچا۔

"حماد' سبحان بھائی آئے ہیں۔" نزہت نے کمرے میں آکر اطلاع دی تو وہ جلدی جلدی بالوں میں برش کرتا سیڑھیاں اترتا نیچے چلا آیا۔ جہاں سبحان ڈیڑھ دو سالہ پیاری سی بچی کو لیے اس کا منتظر تھا۔

"تم۔۔۔؟ صبح صبح یوں اچانک؟"

"سوری یار تمہیں ڈسٹرب کیا۔ دراصل شیبا نے ڈاکٹر کے جانا تھا اسے وہاں چھوڑا تو سوچا اب تم اتنا کرایہ بھر کے میری طرف آؤ گے تو بہتر ہے میں خود ہی موٹر سائیکل لے کر تم تک پہنچ جاؤں اور واپسی اکٹھی ہوجائے گی۔"

"تھینک یو سویٹ یار۔۔۔ آؤ بیٹھو۔ پہلے ناشتا کرتے ہیں لیکن پہلے اس ننھی پری سے کچھ باتیں ہوجائیں۔" حماد نے اس گڑیاں سی بچی کو پاس بلانا چاہا مگر وہ سبحان کی گود میں چھپ گئی تو سبحان اور حماد ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرادیے۔

☼ ☼ ☼

"آپی کہیں جارہی ہیں کیا؟"

سلونی جانے کس وقت نرگس خاتون سے باتیں کرنے کے بعد اٹھی اور بنا دستک کے نزہت کے بیڈ روم میں جا پہنچی جس پر نزہت کا چونکنا ایک فطری عمل تھا۔ اسے برا بھی محسوس تو ہوا لیکن احساس دلائے بغیر مسکرادی۔

"ہاں ذرا ڈاکٹر کے پاس جارہی ہوں۔"

"خیر تو ہے آپی طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔" کھڑکی کی طرف پشت کیے وہ نزہت کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

"ہاں ہاں میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تو کیا حماد۔۔۔" کہتے کہتے اس نے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ سلیقے سے بڑھائے گئے لمبے ناخنوں پر کپڑوں سے میل کھاتی پیازی رنگ کی نیل پالش لگائی گئی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ چھوٹے بڑے نگینوں والی انگوٹھیاں بھی ہاتھوں کا ایک اہم حصہ تھیں۔ پل بھر کے لیے نزہت کو اس دوپہر کا منظر یاد آیا تھا جب حماد کے ہاتھ کو انگوٹھیوں سے مزین یہی دونوں ہاتھ چھپائے ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود کمال ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اس وقت سلونی کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں کھڑی باتیں کررہی تھی۔

"سلونی چلو اماں کے پاس چل کے بیٹھتے ہیں۔"

نزہت نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا تھا۔

"تو کیا آپ اسی طرح جائیں گی باہر؟ میک اپ تو کرلیں تھوڑا سا بلکہ میں خود کرتی ہوں آپ کا میک اپ۔"

"میں اسی طرح ٹھیک ہوں۔ تم آؤ۔"

پتا نہیں کیوں لیکن نزہت کو اس کے سراپے سے خوف آرہا تھا وہ مزید اسے بیڈ روم میں برداشت نہیں کرپارہی تھی۔ تبھی فوراً" اسے نیچے چلنے کا اشارہ دے دیا۔

"آپی آپ کو پتا ہے میں بیوٹیشن کا کورس کررہی ہوں آپ کے چہرے کو ایسا خوبصورت ٹچ دوں گی کہ حماد بھی دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے سلونی' تمہارے حماد بھائی کی نظر ویسے ہی مجھ پر سے نہیں ہٹتی۔"

جان بوجھ کر نزہت نے اسے بتانا چاہا تھا کہ حماد اس کے لیے صرف حماد نہیں' حماد بھائی ہے اور اس بات کو سلونی بھی اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ دونوں میں کچھ مزید بات چیت ہوتی باہر سے آتی موٹر سائیکل اور اس کے ہارن کی آواز پر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مگر نزہت کو چند قدم آگے بڑھنے کا موقع دیے بغیر سلونی انہیں قدموں پر گھوم کر کھڑکی میں سے حماد کو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔ نزہت اس کی اس قدر دیدہ دلیری پر حیران تو بہت ہوئی مگر اپنی طرف اس کی پشت ہونے کی وجہ سے اس کی مسکراہٹ البتہ نہیں دیکھ پائی تھی اور حماد جو نزہت کے کھڑکی میں آنے کے خیال سے بڑے خوشگوار موڈ میں چہرے پر مسکراہٹ سجائے اوپر دیکھ رہا تھا۔ غیر متوقع طور پر سلونی کو دیکھ کر گڑبڑا سا گیا یہ الگ بات تھی کہ آج حماد کا خوشگوار موڈ سلونی کے من آنگن کو سیراب کرگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"حماد۔۔۔ یہ کیا۔۔۔؟ ہم تو آج ڈاکٹر کے پاس جانے والے تھے نا۔"

موٹر سائیکل ایک ریسٹورنٹ کے باہر رکی تو نزہت کا حیران ہونا لازمی تھی۔

"ہاں ہاں مجھے یاد ہے' پہلے بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کرتے ہیں تب تک ڈاکٹر کا بھی ٹائم ہوجائے گا۔" موٹر سائیکل لاک کرنے کے بعد حماد نے چابی جیب میں ڈالی سیف گارڈ کے ساتھ لٹکتا کاغذات کا شاپر ہاتھ میں لیا اور بے فکری سے ریسٹورنٹ کے اندر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ نزہت نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

باہر گوکہ ابھی اندھیرے نے اپنے پر نہیں پھیلائے تھے مگر ریسٹورنٹ کے اندر کی نیم تاریکی ذہن کو بہت بھلی معلوم ہورہی تھی۔ فریشنر کی مسحور کن بھینی بھینی خوشبو نے گویا دل و جاں کو یوں معطر کیا کہ نزہت جھوم سی گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ پہلے وہ کبھی اس ریسٹورنٹ میں نہیں آئی تھی مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ دونوں کسی بھی خاص دن کے لیے اسی ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا کرتے۔ سالگرہ ان کی اپنی ہوتی یا شادی کی۔ کیک اسی ریسٹورنٹ کے دائیں قطار میں ہال کے سب سے آخری والی ٹیبل پر کٹتا۔

آج جب انہوں نے اپنی زندگی میں ایک نئے فرد کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا تب بھی حماد اسے اسی ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا۔

فرق تھا تو اتنا کہ آج حماد کے رویے سے شوخی و

شرارت کا عنصر کچھ مدھم پڑتا معلوم ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے حماد۔ ابھی تو تم باپ بنے بھی نہیں اور چہرے پر فکریں ایسی ہیں جیسے بیٹی بیاہنے جا رہے ہو۔"

بیٹھنے کے کافی دیر بعد بھی جب حماد کچھ نہیں بولا تو نزہت نے ازراہ مذاق کچھ بولنے پر اکسایا۔

"چھ سال کے بعد۔ یوں اچانک بچوں کا شوق۔ پوچھ سکتا ہوں کیوں؟"

کی چین کو میز کی شفاف سطح پر ایک سے دو ہوتے دیکھ کر حماد نے اس کی بات قطعی طور پر نظر انداز کر دی تھی۔

نزہت کے لیے اس کا اتنا سنجیدہ برتاؤ یقیناً "ناقابل فہم تھا۔ جبھی اس غیر متوقع سوال کے جواب میں بس چپ چاپ اسے دیکھے ہی گئی۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ حماد زیادہ دیر دیکھ نہیں سکا تھا چند لمحوں بعد ہی اسے نزہت سے نظریں چرانا پڑی تھیں اور ایسا آج پہلی مرتبہ ہوا تھا۔

"میرا مطلب ہے کیا صرف سلیمہ خالہ کے کہنے پر۔"

"تمہارا دل نہیں چاہتا حماد۔" حماد کی اس بات پر وہ تڑپ ہی تو گئی تھی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن۔ ابھی ان سب باتوں کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔"

"ساری عمر۔؟" نزہت نے بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ "کتنے سالوں کی مزید گارنٹی ہے تمہارے پاس۔"

"امید پر ہی دنیا قائم ہے نا' مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہو تم۔"

"یہ چھ برس 'امید کے سہارے ہی تو کٹے ہیں نا۔"

"اوہو لیکن اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں؟"

"تم دیر کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"پتا ہے میں کیوں دیر کرنا چاہتا ہوں؟" ویٹر کو کچھ دیر انتظار کرنے کا کہہ کر وہ لفظوں کو ترتیب دینے لگا۔ نزہت نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔ کچھ پل ماحول میں رچی خنکی کی نذر ہوئے۔

"کیونکہ میں تمہیں۔ کھونا نہیں چاہتا۔ کسی بھی قیمت پر۔" حماد نے نہایت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کیا تھا مگر پھر بھی نزہت الجھ کر رہ گئی۔

"میں سمجھی نہیں حماد۔ پلیز کھل کے بات کرو۔" جواب میں حماد نے خاموشی سے شاپر میں سے کاغذات کا پلندہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ تو۔ کیا یہ وہی رپورٹس نہیں۔ جو تم نے کہا تھا کہیں کھو گئی ہیں۔" دل دھڑکنے کی رفتار میں واضح اضافہ ہوا تو ہاتھ منجمد۔ ہوتے محسوس ہوئے۔

"ہاں۔ اور یہ وہ واحد جھوٹ تھا جو میں نے آج تک تم سے بولا۔" رپورٹس کے مطابق نزہت کے ماں بننے کا عمل ممکنہ طور پر نہایت پیچیدگیوں کا حامل ہو سکتا تھا اور اگر بالفرض اس کے ساتھ ایک اور وجود سانس لینا شروع کرتا تو دونوں میں سے کسی ایک کا بھی بچنا معجزہ قرار دیا جاتا۔ پہلے تو نزہت نے کئی بار پلکیں جھپکا کر ڈاکٹر کی رپورٹ پڑھی اور پھر جب یقین آیا کہ جو کچھ اس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہی سچ ہے تو جیسے وہ پلکیں جھپکانا ہی بھول گئی۔ آنکھیں پتھرا سی گئیں۔

"میں نے صرف ایک رپورٹ پر اکتفا نہیں کیا تھا' تمہارے ٹیسٹ ہر بڑی لیبارٹری میں بھیجے' ہر ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ مگر سبھی نے اس خواہش کو دل ہی میں دبا دینے کا مشورہ دیا۔"

"ویسے بھی مجھے تمہارے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ بھی نہیں۔"

حماد نے اس کے کانپتے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے سہلایا۔

جانتا تھا کہ یہ دکھ نزہت کے لیے بہت بڑا ہے تبھی ہمیشہ اس کی اس طرح کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتا مگر آخر کب تک۔!!

جبھی آج اس نے نزہت کو سب کچھ سچ بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کتنی ہی دیر آنسو اس کے چہرے کو بنا آواز کے بھگوتے رہے۔ حماد نے بھی اس کے دل میں موجود غبار کو کھل کے باہر نکلنے کا مکمل موقع فراہم کیا تھا۔

"مگر میری اس کمی کی سزا تمہیں کیوں؟ اماں کو کیوں ملے؟"

رونے کے دوران بھی خیال آیا تو حماد اور اماں کا۔

"سزا نہیں انعام ہو تم ہمارے لیے' سمجھیں! اور بس آج کے بعد میں تمہاری آنکھوں میں ایک آنسو نہ دیکھوں۔"

"اماں کو کیا جواب دو گے' جو ہماری واپسی کی منتظر ہوں گی۔"

"اس کے بارے میں تم مت سوچو' میں ان سے خود بات کر لوں گا اور وہ بھی اس طرح کہ وہ تم سے کبھی بھی اس بارے میں نہیں پوچھیں گی۔"

"اور اگر ہم صرف آج۔ میرا مطلب ہے آخری دفعہ اگر ہم ڈاکٹر سے چیک اپ کروالیں۔ ہو سکتا ہے ان سالوں میں کچھ تبدیلی آئی ہو۔"

نزہت نے کبھی یوں جھجک کر اس سے کوئی کام نہ کہا تھا۔ آج کہا تو حماد کا دل کٹ کر رہ گیا مگر مسکراتے ہوئے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور بولا۔

"جو تمہارا حکم۔ لیکن ڈاکٹر کی اپائنٹمنٹ میں پورا آدھا گھنٹہ رہتا ہے کیوں نہ پہلے کچھ کھا پی لیں؟"

"ٹھیک ہے۔ جیسے تم کہو۔"

آنکھوں میں بن چاہے امڈتے آنسوؤں کو بمشکل پیچھے دھکیلتے ہوئے وہ جبراً" مسکرائی۔

☼ ☼ ☼

لائٹ جا چکی تھی۔ سب اپنی اپنی چارپائیوں پر ہاتھ میں پنکھا لیے لیٹے تھے اور کسی کا بھی ایک دوسرے سے بات کرنے کو جی نہ تھا۔ ہر کوئی سوچ کے سمندر میں ماضی کی ناؤ پر بیٹھا مستقبل کے ساحل کو دیکھ رہا تھا۔ عین اوپر خوبصورت جھلملاتا چودھویں کا چاند تھا اور جگمگ کرتے تارے۔

"شمیم۔ کیا ہمارے نام کے بھی ستارے اسی آسمان پر چمکتے ہیں؟"

"پتہ نہیں آپا۔ میرا تو خیال ہے ہمارے ستارے سدا بدلیوں کی اوٹ میں ہی چھپے رہتے ہیں' سامنے ہوتے تو چمکتے بھی۔"

اماں کے خراٹے اور ابا کے وقتاً "فوقتاً" کھانسنے کی آواز ماحول میں عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔

"آپا میں نے سنا ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں؟" تسکین نے رخسانہ اور شمیم کو باتیں کرتے سنا تو ان کی طرف کروٹ لے کر کہنی کے بل لیٹتے ہوئے ہاتھ کو تکیہ بنالیا۔

"ہاں کہتے تو ہیں۔"

"تو جن لوگوں کی ساری عمر شادی نہیں ہو پاتی اور بے چارے اکیلے ہی دنیا سے چلے بھی جاتے ہیں' پھر ان کا جوڑا کہاں رہ جاتا ہے؟"

رخسانہ آپا' تسکین کی بات پر لاجواب ہو گئیں۔ خود شمیم اور سنبلہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھیں کہ سلونی چارپائی پر اٹھ بیٹھی۔

"جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور ہم تک کسی نہ کسی صورت پہنچتے بھی ہیں اب یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے لیے منتخب کردہ جوڑے کو پہچان نہیں پاتے کہ ہماری آنکھوں پر اسی طرح ڈیمانڈز اور نفس کی پٹی بندھی ہوتی ہے جیسے ہمارے اماں ابا کے ذہن اور آنکھوں پر آج تک بندھی رہی۔"

"ہاں اور اب دیکھو بیٹیاں خود اپنی آئندہ زندگی کے لیے پریشان راتوں کو جاگ رہی ہیں اور اماں ابا کو مجال ہے کوئی فکر ہو کہ پانچ بیٹیاں بیاہنے والی ہیں۔" سنبلہ نے جل کر اماں ابا کو دیکھا اور پھر غصے میں ان کی طرف پشت کر کے لیٹ گئی۔

"اپنے اپنے لیے خود ہاتھ پاؤں مارو۔ ان جیسے والدین سے کوئی بھی امید لگانا فضول ہے۔" شمیم نے مایوسی سے کہا یوں بھی گزرتے چند سالوں نے اسے دبلی پتلی لڑکی سے اچھی خاصی خاتون بنا ڈالا تھا۔ جسے دیکھ کر کوئی بھی غیر شادی شدہ تصور نہ کرتا۔

یہی حال رخسانہ آپا کا تھا۔ گھر بیٹھ کر کپڑے سیتی تھیں۔ صبح و شام بیٹھے رہنے کی وجہ سے جسم کی ساخت عجیب بے ڈھنگی سی ہو چکی تھی۔ سر میں پھیلتے جابجا سفید بال جہاں بڑھتی عمر کی چغلی کھاتے وہیں

ڈھلکی ہوئی جلد بھی اس راز کو راز نہ رکھتی۔

"تم سب بہت معصوم ہو کہ اپنے لیے بنا جوڑا پہچان نہیں پائیں لیکن میں اسے پہچان بھی چکی ہوں اور حاصل بھی کر کے رہوں گی۔"

سلونی نے تاسف سے اپنی تمام بہنوں کو دیکھتے ہوئے اپنے ارادے کی تجدید کی اور چاندنی رات کو آنکھوں میں سمونے لگی۔

☼ ☼ ☼

پرنور سفید براق چاندنی، سکوت اور رات کی رانی کی جاں فزا مہک..... کمرے کی کھڑکی کے صاف شفاف شیشے سے آنگن میں چاندنی کا نظارہ کرتی نزہت نے اپنی پیشانی کھڑکی پر ٹکا دی تھی۔

اتنے عرصے سے بنے خوابوں کی کرچیاں کچھ اس شدت سے آنکھوں میں چبھی تھیں کہ ان کی چبھن سے سامنے نظر آنے والا یہ منظر دھندلا گیا تھا۔ اپنا آپ انتہائی ارزاں اور فالتو معلوم ہو رہا تھا اب جبکہ ڈاکٹر نے پھر وہی باتیں دہرائی تھیں تو وہ ڈھے سی گئی۔ ریسٹورنٹ سے کلینک تک کا رستہ اس نے جس طرح منتیں مانگتے گزارا تھا وہ جانتی تھی مگر.....

ہوا وہی کہ جو اس کے نصیب میں لکھا جا چکا تھا۔

اور اب اسے صرف مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دینا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہر طرح سے ایک مکمل انسان ہونے کے باوجود حماد اولاد جیسی نعمت سے محروم رہے۔

محبت ایک قوت ضرور ہے مگر اعتراف محبت کے بغیر یہ قوت میان میں رکھی تلوار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اور اب جبکہ حماد اپنے رویے، عمل اور زبان سے اس کے لیے اپنی محبت کا اعتراف کر چکا تھا تو نزہت نے بھی ضروری خیال کیا کہ حماد کو اس کی محبت کا بدل ضرور ملنا چاہیے۔ رات کا تقریباً" ایک بج چکا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑکی سے سر ٹکیے بے خبر کھڑی تھی۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ کس طرح اس کی آنکھیں نمکین پانی سے لبالب بھر گئیں اور آنسو کسی آبشار کی طرح بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔

چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں رگڑیں اور کھڑکی سے سر ہٹا لیا۔ شیشے کے اس پار آنگن میں چمکتی، دلفریب اور مسحور کن چاندنی کا نور سیلاب بن کر اُمڈا ہوا تھا۔ عین اوپر کھلے آسمان پر پورا چاند بھرپور آب و تاب کے ساتھ جگمگا کر آسمان کی شان بڑھا رہا تھا۔ ایک نظر رخ پلٹ کر اس نے حماد کو دیکھا جو سوتے سوتے بھی کتنا سچا اور کھرا معلوم ہو رہا تھا۔

وہ سکون چاہتی تھی۔ اپنے اندر چلتے ان بے چینی کے جھکڑوں سے نجات چاہتی تھی تبھی دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی اور صحن کے عین وسط میں بنی سیمنٹ کی روش پر پیر پسار کر بیٹھ گئی۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا اپنے اندر شبنم کو سموئے معلوم ہو رہی تھی۔ رات کے پچھلے پہر کی چاندنی پورے عروج پر ہونے کے ساتھ ساتھ سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر بھی نور برسانے لگی۔ اور اس پھوار کا یہ نتیجہ نکلا کہ جب وہ دوبارہ کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھی تو حتمی فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

سلیمہ خالہ نے جب سے بیٹیوں کو اپنی مرضی کی شادیاں کرنے کا اختیار دیا تھا ان کے گھر لوگوں کی آمدورفت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ بعض اوقات تو آنے والے افراد اس قماش کے ہوتے کہ آس پڑوس کے لوگ اپنے گھر کی بہو بیٹیوں کا خیال کرتے ہوئے فوراً" پردے گرا دیا کرتے۔

لیکن بات پھر بھی کہیں بنتی نظر نہ آتی۔

دراصل سبھی بہنوں نے اپنے ملنے جلنے والوں سے رشتوں کا کہہ رکھا تھا۔ سو آج کل لوگ انہیں دیکھنے آ رہے تھے بلکہ بعض اوقات تو کچھ منچلے محض دوستی کی آفر لیے بھی آن پہنچتے۔ لیکن باوجود کوشش کے ان میں سے کوئی بھی اپنے لیے بنایا گیا جوڑا ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہوئی۔

☼ ☼ ☼

صبح اس سے پہلے کہ نزہت اماں اور حماد کے لیے ناشتا تیار کرتی۔ گیٹ پر ہوتی بیل نے تینوں کو چونکا دیا۔

"اس وقت بھلا کون ہو سکتا ہے۔" زیرلب تینوں نے خود سے یہی سوال کیا اور حماد نے اٹھ کر گیٹ کھولا تو اس وقت سجان کو اپنی بیوی اور بیٹی سمیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"یار سجان تم اس وقت؟ آؤ آؤ۔"

وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ اماں بھی وہیں چلی آئیں۔ کچھ ہی دیر میں نزہت ناشتا لے آئی اور سب کو انتہائی اصرار کے ساتھ کھلایا۔ چھوٹی سی گڑیا کے لیے البتہ وہ ناشتا الگ لے آئی تھی اور اب دائیں بائیں ڈیکوریشن پیسز رکھ کر اسے خود کھلا بھی رہی تھی اور اس کے معصوم سے اشارے سمجھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

"یار مجھے پتا ہے اس وقت تم آفس جانے کے لیے جلدی میں ہوتے ہو لیکن دراصل مسئلہ کچھ ایسا ہوا کہ بے وقت تمہیں ڈسٹرب کرنا پڑا۔"

"کمال ہے یار تکلفات میں کیوں پڑ رہے ہو کوئی کام ہے تو حق جتا کر مان سے کہو، وعدہ کرتا ہوں اپنی طرف سے پورا زور لگا دوں گا۔"

"دراصل کام بہت چھوٹا سا بھی ہے اور بیک وقت بہت بڑا بھی۔" بات کرتے ہوئے سجان یقینی طور پر ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

"بولو سجان بیٹا، مجھے کہو۔ جیسے حماد کی ماں ہوں اسی طرح تمہاری بھی تو میں ماں ہی ہوں نا۔"

"اس میں تو واقعی کوئی شک نہیں ہے کہ آپ سے ہمیشہ ماں جیسا پیار ملا ہے مجھے اور اسی لیے آج میں اپنی سب سے قیمتی چیز آپ سب کے حوالے کرنا آیا ہوں۔"

اماں، حماد اور نزہت نے ناسمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"حماد تمہیں پتا ہے نا کہ ہم دونوں نے گھر والوں کی مرضی کے بغیر کورٹ میرج کر کے واپسی کی تمام کشتیاں جلا دی تھیں۔ اب ہمارے والدین نے ہماری کھوج لگالی ہے اور بقول ان کے کہ ہمارے والدین بہت بیمار ہیں اور ہم سے ملنا چاہتے ہیں اس کے لیے وہ ہمیں لینے بھی آئے مگر ہم دونوں کو ان کی نیتوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ روحینہ ہمارے ساتھ جائے۔"

"مگر ہم شام تک واپس آ گئے تو اسے لے جائیں گے۔ نہ آ سکے تو سمجھ جائیے گا کہ ہماری زندگی اتنی ہی تھی۔"

شیبا نے سجان کی بات آگے بڑھاتے ہوئے نم آنکھوں سے کہا اور آخر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اماں اور نزہت لپک کر اس کی طرف بڑھیں تو وہ سہارا پا کر اماں کے گلے لگ گئی۔ نزہت نے بھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنائیت کا احساس دلایا تھا۔

"یار تمہیں پتا ہے نا تمہارے علاوہ میں کسی اور پر اعتماد نہیں کرتا اور پھر خاص طور پر بات جب روحینہ کی ہو تو پھر بالکل نہیں۔" سجان کے لفظ لفظ میں بے چارگی جھلک رہی تھی۔ خود حماد کا دل کٹنے لگا۔

"فکر نہ کرو یار، روحینہ صرف تمہاری نہیں ہماری بھی بیٹی ہے اور پھر تم شام تک تو ان شاء اللہ آ ہی جاؤ گے نا۔"

حماد کے تسلی دینے پر سجان نے کچھ بھی کہنے کے بجائے محض کندھے اچکائے تھے۔ رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتے ہوئے اس نے شیبا کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور بچی کو گود میں لے لیا۔

"روحینہ کو تمہارے حوالے کرتے ہوئے میرا دل مطمئن ہے نزہت۔ اور ہم دونوں کو یقین ہے کہ اس گھر کے علاوہ روحینہ کی اور کوئی جائے پناہ نہیں۔" شیبا نے نزہت کو مخاطب کیا تو اماں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر بوسہ دیا۔

"اللہ نے چاہا تو ہم تمہارے یقین پر پورا اتریں گے بیٹا۔ تم بس بے فکر ہو کر جاؤ۔" اماں نے دونوں کو تسلی دی۔ تو وہ روحینہ کا کھلونوں اور کپڑوں سے بھرا بیگ نزہت اور حماد کے حوالے کر کے بوجھل قدموں اور بھاری دل کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے۔

☼ ☼ ☼

کتنے ہی لوگ سلیمہ خالہ کے گھر آئے اور گئے مگر کہیں بھی بات نہیں بن پائی۔ لوگ بڑے دھڑلے سے ان کے تیار کردہ خوان نوش کرتے اور بعد میں انہی کے منہ پر ان کی بیٹیوں کے عیب گنوا کر چلتے بنتے۔ رخسانہ آپا سے سنبلہ تک سبھی پر مایوسی کے لاتعداد تودے کتنے ہی بار گرتے، بڑی ہمت سے وہ ایک بار پھر اٹھتیں تو ضرور مگر اگلا گرنے والا تودہ اس سے کہیں زیادہ وزنی اور تکلیف دہ معلوم ہوتا۔

مطمئن تھی تو بس سلونی... جو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ مرد کو اپنی طرف مائل کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے خصوصاً" اس لڑکی کے لیے جو نہ صرف اپنی خوبصورتی سے واقف ہو بلکہ اسے استعمال کرنے کے فن سے بھی آگاہ ہو۔

آج جب اماں ابا سمیت سارے گھر میں غم و غصے کی لہر اٹھی ہوئی تھی تو وہ بڑے آرام و سکون سے شو کیس میں سجائی پلاسٹک کی بڑی پلیٹ میں دہی بھلے ڈالنے لگی۔

پلاسٹک کا یہ ڈنر سیٹ دیکھنے میں مکمل طور پر شیشے کا معلوم ہوتا تاوقتیکہ انہیں چھوا جاتا۔ ابھی چند ہفتے پہلے ہی سلیمہ خالہ نے یہ ڈنر سیٹ متوقع مہمانوں کی آمدورفت کے لیے خریدا تھا اور اسے مہمانوں کے علاوہ گھر میں استعمال کرنے کی سختی سے پابندی تھی۔

شمیم کچن میں آئی تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"سلونی... یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر مطمئن ہو کر فریج سے تازہ دھنیا نکال کر دھونے لگی تاکہ دہی بھلوں پر کاٹ کر ڈالنے سے ان کا مزہ مزید بہتر ہو جائے۔ شمیم کی بات کا جواب دینا شاید اس نے وقت کا زیاں خیال کیا تھا۔

"تمہیں پتا بھی ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر میں کیا طوفان اٹھا تھا۔" اس کا اس قدر مطمئن رویہ شمیم کو حیران کیے دے رہا تھا۔

"معلوم ہے سب... لیکن اس میں نیا کیا تھا۔" لفظوں سے کہیں زیادہ لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے سلونی کہ تم بہت خود غرض ہو رہی ہو۔"

"اوہو... اگر آج چند اوباش قسم کے لوگ اماں کو اپنی پانچ بیٹیوں سمیت دھندا کرنے کی آفر کر گئے ہیں تو اس میں برا کیا ہے۔ آخر گندم کاشت کر کے کیوں چاول کی امید لگائے بیٹھے ہو تم سب؟ ہونہہ آدھی سے زیادہ عمریں پابندیوں اور روک ٹوک میں گزار کر اب خیر سے بیٹیاں بیاہنے کا سوچا جا رہا ہے...

کیا پہلے اماں، ابا کو معلوم نہیں تھا کہ انہیں بیٹیاں بیاہنی ہیں، جب لوگ بڑی چاہ اور طلب کے ساتھ ہاتھ تھامنے کے امیدوار تھے تو سامنے تک آنے کی اجازت نہیں تھی اور اب... جب لوگ صرف اپنی نظروں کی تسکین کے لیے شادی کے امیدوار کا چولا پہن کر دوستیاں آفر کرتے آتے ہیں تو اماں، ابا الگ سے بٹھا کر بات چیت کا موقع بھی دے رہے ہوتے ہیں۔ تو ایسے میں لوگ دھندے کی ہی آفرز کریں گے گھر بسانے کی نہیں۔"

سلونی تھی تو گھر میں سب سے چھوٹی، لیکن زمانے کی ہیرا پھیری سے آشنا اور انتہائی تیز طرار... کچھ تو بڑی بہنوں کی زندگیاں اور ان کے تجربات اس کے لیے استاد ثابت ہوئے تھے۔ سو تلخی اور ہوشیاری دونوں اس کے اندر بھرپور طریقے سے موجود تھیں۔

"دہی بھلے اتنے اہتمام کے ساتھ کس کے لیے جا رہے ہیں؟"

سنبلہ اندر آئی تو دہی بھلوں کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس طرح تو کچھ دیر پہلے آنے والے مہمان نما شکاریوں کو بھی سرو نہیں کیا گیا تھا۔

"حماد کے لیے۔" سلونی نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

"حماد بھائی کی بات کر رہی ہو نا؟" سنبلہ نے پہلے شمیم کو دیکھا اور پھر سلونی سے تصدیق چاہی۔

"لیکن کیوں سلونی؟" شمیم بھی اس کے انداز پر حیران تھی۔

"اس کیوں کا جواب تم لوگ جانتی ہو، پھر کیا میرے منہ سے سننا ضروری ہے؟"

"شرم کرو سلونی، وہ نزہت آپی کو بہت چاہتے ہیں اور... اور پھر کسی کا ہنستا بستا گھر اجاڑ کر کیا ملے گا تمہیں۔"

جواب میں کچھ بھی کہنے کے بجائے سلونی کے ہونٹوں پر بڑی تمسخرانہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

"سوائے بدنامی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا، سلونی اور دوسری بات یہ کہ حماد بھائی جیسے انسان کا ہمارے گھرانے کی کسی لڑکی کی طرف متوجہ ہونا... ہاہاہا دیوانے کا خواب ہی لگتا ہے مجھے تو۔"

سنبلہ نے اس کا تمسخر اڑایا تھا۔

"مرد پہاڑ کی چوٹی پر بھی کھڑا ہو تو نیچے موجود عورت محض ابرو کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا سکتی ہے... سنبلہ شہزادی... تم بس دیکھتی جاؤ اور اپنے گھر آنے والی اس اکلوتی بارات کی تیاری کر رکھو۔"

سنبلہ نے ترحم آمیز نظروں سے سلونی کو دیکھا جو آنے والے لمحات کو شاید اپنے لیے ان چاروں سے مختلف دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"حماد آج آپ اتنی جلدی گھر آ گئے۔"

باوجود اس کے کہ وہ حماد کی موٹر سائیکل دیکھ کر ہی دہی بھلوں کی پلیٹ سجا کر لائی تھی۔ سلونی نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔

گیٹ کھول کر سامنے کھڑے حماد کو شاید کسی اور کا انتظار تھا، جبھی اسے دیکھتے ہی چہرے پر کوفت کے آثار ابھرے تھے۔

ہمیشہ کی طرح بغیر جواب دیے حماد نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور اس کے لیے گیٹ کھلا چھوڑ کر اندر جانے لگا۔

"لگتا ہے آپ میرا ہی انتظار کر رہے تھے، جبھی بغیر سلیپرز کے ہی بھاگے چلے آئے۔" سلونی کے یوں مسکرانے پر حماد کی پیشانی پر نمایاں طور پر بل نظر آئے تھے۔

"میں ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔"

"کیا میں آپ کی دوست نہیں ہو سکتی؟" اس دفعہ وہ سوالی بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ حماد کا چونکنا لازمی تھا۔ سو خاموشی سے چند لمحے اس کے چہرے کے اثرات کا جائزہ لیتا رہا۔

"یہ... یہ میں آپ کے لیے لائی تھی خاص طور پر۔" سلونی کتنی ہی ہوشیار سہی، لیکن حماد کی براہ راست نظروں کی تاب نہ لا پائی تھی، جبھی گڑبڑاتے ہوئے فوراً" پلیٹ آگے کر دی۔

"لڑکی... تمہارا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا، پتا بھی ہے تمہیں کہ کیا کہہ رہی ہو؟" حماد کو اس کے دیکھنے کے انداز سے گڑبڑ کا احساس تو ہو چکا تھا، جبھی وہ ہر ممکن حد تک اس سے خشک اور روکھے پھیکے انداز میں بات کرتا۔ مگر وہ اس قدر بولڈ ہو گی کہ نظروں کے بجائے فوراً" لفظوں کا سہارا لینے لگے، یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

"حماد... کون ہے؟"

ڈیڑھ دو سال کی خوب صورت اور گول مٹول سی بچی کو اٹھائے نزہت اندر سے نکلی تو سلونی فوراً" بولی۔

"آپی آج دہی بھلے بنائے تھے، سوچا آپ کے لیے بھی لے آؤں۔" حماد کے آگے بڑھائی گئی پلیٹ کی سمت اس نے فوراً" سے پیشتر بغیر کسی بوکھلاہٹ کے نزہت کی طرف موڑی تھی۔

"اوہ تھینکس۔" نزہت نے رسماً" مروت نبھائی تھی۔ باوجود اس کے کہ سلونی کو دیکھتے ہی اس کے اندر گویا مندر کی گھنٹیوں کا نہ ختم ہونے والا ساز شروع ہو چکا تھا۔ اس نے سلونی کے ہاتھ سے پلیٹ لی، جسے فوراً" ہی گرنے کے خدشے کے تحت حماد نے پکڑ لیا کہ حوریہ کو کندھے سے لگائے وہ ایک ہاتھ میں پلیٹ کا توازن نہیں رکھ پا رہی تھی۔

"ارے لائیے میں خود کچن میں رکھ آتی ہوں۔ ساتھ ہی اماں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" حماد سے پلیٹ لیتے ہوئے ان دونوں کو وہیں چھوڑے اس نے

اندر کا رخ کیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ گھر کے اندرونی حصے میں قدم رکھتی کچھ سوچتی ہوئی پھر واپس مڑی۔
"یہ بچی کون ہے؟ پہلے کبھی دیکھا نہیں اسے۔"
"اسے تم ہماری اپنی ہی بچی سمجھو۔" نزہت کے تفصیلی سچ سے بچنے کی خاطر حماد نے فوراً" جواب دیا۔
"کاش کہ جیسا ہم سمجھ رہے ہوں ویسا ہو تا بھی۔" سلونی نے ذو معنی لہجے میں کہا اور اماں کی پکار پر اندر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے

ابھی تو دل میں اک ہلکی خلش محسوس ہوتی ہے

بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

اسی گمنام نمبر سے آج پھر سلونی کو میسج ملا تھا اور یہ آج پہلی مرتبہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ جب سے اس نے پارلر جانا چھوڑا تھا اسی دن سے اسے یہ پیغامات موصول ہوا کرتے، جن میں اکثر اس کے ساتھ کیے گئے سفر کا حوالہ دیا جاتا۔
اکثر وہ اپنے دل میں ان میسجز کو حماد کے نام سے منسوب کرکے بڑھتی تو دل کو ملنے والی سرور کی لذت ہی کچھ اور ہوتی، لیکن آخر وہ تھا کون جو صبح بخیر سے شب بخیر تک کے پیغامات بڑی باقاعدگی سے بھیجا کرتا۔ ہر گھنٹے بعد جو اپنی محبت کا اعادہ کرنا خود پر واجب خیال کرتا اور جس کے خیال میں سلونی کے بغیر یہ زندگی اسے بے کار معلوم ہوتی۔ اسی مجنوں کا پتا چلانے کے لیے سلونی نے دو، تین دن اسے میسجز کے جوابات دیے اور عین چوتھے دن اس کی حقیقی معنوں میں اوقات جاننے کے لیے اپنے گھر بھی مدعو کرلیا۔
اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔
فروٹ، مٹھائیوں سے لدا پھندا قربان جب ان کے گھر سامنے اپنی ٹیکسی سے اترا تو سفید کلف دار کرتے شلوار کے ساتھ زری کھسا پہنے اس کی سج دھج کسی دولہا سے کم معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ ساری رات کا جاگا قربان جو آٹھ گھنٹے صرف یہی بتانے کی مشق کرتا آیا تھا کہ کس طرح ٹریفک جام میں اس کے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی سلونی نے اس کے دل کی دھڑکن بھی جام کر دی تھی۔ مگر افسوس کہ اس دن کے بعد سے آج تک وہ اسے دوبارہ دیکھ نہیں پایا تھا۔
بندش کے روز پیٹرول کے حصول کی طرح اس کا موبائل نمبر حاصل کرنے کی کہانی الگ تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ تب سے اب تک روز خوابوں میں وہ سلونی کو اپنی ٹیکسی میں بٹھائے جانے کہاں کہاں کی سیریں کروا تا، اب اس کے پیار کے موٹروے پر اتنی دور پہنچ چکا ہے کہ جہاں بریک لگانے کا تصور صرف ہارٹ بریک کرنے کے مترادف ہے۔
اگر وہ اس کے پیار کو گرین سگنل دے تو وہ ہینڈ بریک پر ہی ساری عمر اس کے لیے انتظار میں رہے گا۔ ورنہ بیک ویو مرر ہی اس کی آئندہ زندگی کا سہارا ہو گا کہ چہرے کی ونڈ اسکرین پر گرتے اس کی یاد کے آنسوؤں کو اور کسی وائپر کی ضرورت نہیں ہے۔
یہ اور اسی طرح کے اظہار محبت کرنے کے باقی طریقے قربان نے اڈے پر ٹیکسی ڈرائیوروں کو استاد گل بادشاہ سے بڑی محنت کے بعد یاد کیے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی لفظ کہنے کی نوبت تو تب آتی جب سلونی اسے کچھ کہنے کی مہلت دیتی۔
کمرے میں داخل ہو کر قربان کو دیکھتے ہی اس کے منہ سے گویا جھاگ بہنے لگا تھا۔ قربان جو اس کی کمرے میں آمد پر اسے عزت دینے کی خاطر گل بادشاہ کے ہمراہ کھڑا تھا۔ چند لمحوں پہلے چمکتے چہرے پر جیسے کسی نے ہلدی کا لیپ کر دیا تھا۔
"تم... تمہیں جرات کیسے ہوئی مجھے میسجز کرنے اور یوں منہ اٹھا کر ہمارے گھر آنے کی۔"
"جی... وہ میں..."
"کبھی آئینے میں شکل بھی دیکھی ہے اپنی۔ میں کہتی ہوں تم نے مجھے اتنا گرا پڑا سمجھ لیا کہ تم جیسے انسان کے ساتھ ساری زندگی کا ساتھ نبھاؤں۔" سلیمہ خالہ نے بے چارگی سے گھر آئے مہمانوں کو دیکھا، رخسانہ آپا سمیت سبھی اس غیر متوقع شور پر کمرے کی طرف دوڑی تھیں جہاں قربان شرمندگی کے مارے نظریں زمین پر گاڑے کھڑا تھا۔
"میرا نام سلونی ہے سلونی... ارے تم جیسوں کو تو میں جوتے کی نوک پر بھی رکھ کر جوتا گندا نہ کروں۔ تم کہاں سے میرے سر کا تاج بننے کے خواب دیکھنے لگے۔"
"اے لڑکی خبردار جو اپنی زبان کے ایکسیلیٹر پر زیادہ اسپیڈ بڑھائی تو میرا نام بھی گل بادشاہ ہے، ایکسیڈنٹ، ٹوٹ پھوٹ، مرمت کسی چیز کی ذمہ داری نہیں ہے، سمجھیں۔"
"تم چپ رہو گل بادشاہ۔" سلیمہ خالہ کبھی سلونی کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتیں تو کبھی گل بادشاہ سے التجا۔
"میں نہیں... اپنے منہ کا بونٹ تم بند کرو، ابھی تک جو تمہاری ٹریفک پولیس کے کانسٹیبل جتنی عزت کر رہا تھا نا تو وہ صرف اس قربان کی وجہ سے، ورنہ میرے نزدیک تمہاری حیثیت ٹوٹے ہوئے فٹ پاتھ جتنی بھی نہیں ہے۔"
"ہاں تو پھر کیوں کھڑے ہو اب تک یہاں، مفت میں ٹائم بھی خراب کر رہے ہو اور دماغ بھی۔"
"ہاں اب آئی نا گاڑی جی ٹی روڈ پہ..." گل بادشاہ نے دونوں ہاتھوں کی تالی بجا کر جوش سے قربان کی طرف دیکھا۔ جو دھواں دھواں چہرہ لیے اب تک اسی حالت میں کھڑا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے چند شرارتی بچوں نے فریز، ریلیز کھیلتے ہوئے اسے فریز کر دیا ہو اور ریلیز کرنا بھول کر خود کسی نئے کھیل میں مگن ہوں۔
"دیکھا قربان، سن لیا نا اس کا ہارن... یہ وہ پارٹی نہیں ہے، جو مفت میں گاڑی کی لائٹیں بھی آن کر کے دکھائے۔ یہ کنڈیکٹروں کی طرح صرف پیسے گنتے ہی خوش ہو سکتی ہے۔ جب تیری جیبوں میں نوٹ بس کے مسافروں کی طرح گنجائش سے زیادہ ہوں تو چاہے اکیلا ہی چلا آئیں... اس روٹ پر گاڑیاں چلانے والے ڈرائیور، کنڈیکٹر کے بغیر ہی آتے ہیں۔" گل بادشاہ نے بات ختم کرتے ہوئے بڑی عجیب نظروں سے سامنے قطار میں کھڑی رخسانہ آپا، شمیم، تسکین اور سنبلہ کو دیکھا اور پھر رکے بغیر قربان کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً" دھکیلتا ہوا باہر لے گیا۔ جاتے جاتے قربان نے ایک نظر بپھری ہوئی سلونی کو دیکھا اور آنکھوں کی دہلیز کو پار کرتے آنسوؤں کو سفید آستین سے رگڑ ڈالا۔
"ہونہہ بھلا اپنا اور میرا اسٹینڈرڈ تو دیکھا بات کرنے سے پہلے۔" غصے سے نتھنے پھلاتے ہوئے سلونی نے حقارت سے میز پر رکھے فروٹ اور مٹھائیوں کے شاپر دیکھے اور تنتناتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔
جو غلطی بڑی بہنوں کے معاملے میں اماں، ابا کر چکے تھے آج وہ خود کر رہی تھی۔
جوڑا بلاشبہ آسمان پر بن چکا تھا، لیکن قدرت کی طرف سے گھر تک پہنچا دینے کے باوجود سلونی اسے پہچاننے میں اگر ناکام رہی تھی تو غلطی یقیناً" اسی کی تھی۔

☆ ☆ ☆

سبحان اور شیبا کے قتل کی خبر ان تینوں پر بجلی بن کے گری تھی۔
کیا واقعی والدین اس حد تک سنگ دلی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں کہ ہنستی بستی زندگی ختم کرکے اولاد کو منوں مٹی تلے دبا دیں۔ اماں سمیت حماد اور نزہت کا دل بھی یہ ماننے کو قطعی تیار نہ تھا کہ ایک روز پہلے ان سے مل کر جانے والے سبحان اور شیبا اپنے ہی ماں، باپ کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ یعنی جو لوگ دنیا میں آنے کا وسیلہ بنے، دنیا سے رخصتی کا سامان بھی انہی کے ہاتھوں ہوا۔
ننھی روحینہ اپنا سب کچھ چھن جانے سے بے خبر کھلونوں سے کھیلتی کارپٹ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جا رہی تھی۔ زندگی نے اسے غیروں کے در پر لا بٹھایا تھا۔ اس بات سے تو ابھی وہ

قطعی طور پر انجان تھی، جبھی تھوڑی دیر بعد نزہت کے سامنے کھڑی ہو کر اسے تالیاں بجانے کو کہتی تو وہ حوریہ کی خوشی کے لیے، بہت آنسوؤں کے ساتھ تالیاں بجانے لگتی۔

حماد بھی وہیں کارپٹ پر بیٹھا نم آنکھوں کے ساتھ سبحان کے ساتھ گزرا تمام وقت اور خصوصاً "آخری ملاقات یاد کر رہا تھا" جس میں اس نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی چیز حماد کو سونپی تھی۔

"حماد' اب تمہاری بیٹی ہے۔ رب العزت کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں، مگر اس کے باوجود اس نے تم دونوں کو اگرچہ چھ سال تک اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا تو شاید اس لیے کہ اپنے بچوں کی موجودگی میں شاید تم کو وہ پیار نہ دے پاتے جو اسے اپنے حقیقی والدین سے ملتا... سو اگر سبحان نے ہم پر بھروسہ کر کے یہ چاند سی امانت ہمیں سونپی ہے تو اسے یوں سینت سینت کے رکھنا کہ روز حشر اس سے منہ چھپانے کے بجائے فخر سے اسے بتاؤ کہ تم نے روحینہ کو اپنی بیٹی سے بڑھ کر پیار دیا ہے... جو اگر ہوتی!" نزہت کے کیے گئے فیصلے پر قدرت کا فیصلہ غالب آگیا تھا۔ اماں نے دوپٹے کے پلو سے اپنی سرخ ہوتی آنکھیں رگڑتے ہوئے دونوں کو زندگی گزارنے کا نیا رخ دکھایا، اسی لمحے روحینہ کسی کھلونے سے ٹھوکر لگنے پر اس سے پہلے کہ لڑکھڑا کر گرتی حماد اور نزہت ایک ساتھ اسے پکڑنے کو لپکے تو یوں کہ وہ حماد کے بائیں اور نزہت کے دائیں بازو کو گویا باڑھ جان کر اس پر جھول سی گئی اور گرنے سے بال بال بچ گئی۔ ورنہ امکان غالب تھا کہ نیچے پڑے کھلونوں میں سے کوئی لگ جاتا۔

"میں مطمئن ہوں... اور مجھے یقین ہے کہ تم دونوں سبحان اور شیبا کا اعتماد ہمیشہ قائم رکھو گے۔" اماں نے روحینہ کے لیے دونوں کے چہرے پر محبت اور فکر ایک ساتھ دیکھی تھی، جبھی مطمئن تھیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ لڑکی کب تک یہاں رہے گی نزہت آپی؟"

نزہت ابھی کچھ دیر پہلے ہی روحینہ کی شاپنگ کر کے لوٹی تھی اور اب اس کا فیڈر تیار کر رہی تھی جب سلونی نے آ کر پہلے تو سٹنگ روم میں بکھری شاپنگ پر ایک اچٹتی نظر ڈالی پھر تفصیل معلوم کرنے اماں کے کمرے میں گئی تو انہیں نماز میں مصروف دیکھ کر آخر کار نزہت سے ہی پوچھنا پڑا۔

"کون لڑکی؟" نزہت نے اس کے سامنے اپنا اور روحینہ کا رشتہ جتانے کی خاطر معصومیت اپنائی تھی۔

"روحینہ اور کون... ظاہر ہے مجھے تو آپ گھر میں رکھنے سے رہیں۔" دل کی خواہش بالواسطہ زبان تک آئی تھی۔

"یہ ہماری بیٹی ہے سلونی' یہ گھر جتنا میرا اور حماد کا ہے اتنا ہی اس کا بھی ہے' تو بھلا وہ کیوں جائے گی کہیں اور..."

"کیا مطلب ہے نزہت آپی؟ کہیں آپ نے اسے گود تو نہیں لے لیا؟ ویسے یہ ہے کون اصلی ماں' باپ کون ہیں؟" سلونی کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

راستے کے کانٹے کم ہونے کے بجائے بڑھ رہے تھے۔

"روحینہ ہماری بیٹی ہے اور بس' اس سے آگے پیچھے کوئی سوال نہ جواب۔" فیڈر تیار کر کے اسے پلاتے ہوئے نزہت نے ایک ہی جملے میں نہ صرف اس کا منہ بند کر دیا تھا بلکہ ہر ٹوہ لینے والے کے لیے یہی جواب تھا۔

"کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کے اپنے بچوں ہوں... اپنے... جو آپ کی کوکھ سے جنم لیں' جن کی آبیاری آپ کے خون سے ہو' سوچتی ہوں گی نا آپ بھی۔"

سلونی نے نزہت کی دکھتی رگ پر ہاتھ تو رکھا' مگر یوں کہ نزہت نے اپنے ہونٹوں سے نکلنے والی سی کو خود اپنی سماعتوں تک رسائی کی اجازت بھی نہ دی۔

"میں تو یہ سب باتیں تب سوچتی نا جب خالی ہاتھ ہوتی' مجھے تو اللہ نے حوریہ جیسی پیاری بیٹی سے نوازا ہے' اس لیے نہیں کہ میں ناشکری کروں' بلکہ اس لیے

کہ اسے دیکھ دیکھ کر اس کا شکر بجالاؤں۔" نزہت نے سلونی کو ٹکا سا جواب دیا تھا۔ مگر اس وقت اس کی تلملاہٹ عروج پر تھی۔

جس بات کو دلیل بنا کر اسے حماد کے سامنے نزہت کو کمزور ثابت کرنا تھا وہ تو از خود دم توڑ گئی تھی۔ اتنے عرصے سے تیار کی گئی حکمت عملی اس کی آنکھوں کے سامنے پانی میں نمک کی طرح اپنا وجود کھونے کو تھی اور یہ بات اسے کسی صورت قبول نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

آج حماد نے آفس میں اوور ٹائم کیا تھا۔ اسی لیے معمول سے ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے سیڑھیاں اترتا بلڈنگ کے نیچے پارکنگ ایریا میں کھڑی اپنی موٹر سائیکل کے پاس پہنچ کر اس سے پہلے کہ چابی لگاتا جانے کہاں سے سلونی ہاتھ میں ادویات کا شاپر پکڑے تیز تیز قدموں سے اس کے پاس آپہنچی۔

"حماد۔۔۔ کیا آپ مجھے گھر تک چھوڑ سکتے ہیں؟"

اس اچانک اور غیر متوقع آواز پر حماد نے چونک کر پیچھے دیکھا جہاں سلونی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔

"حماد پلیز ایک ہی جگہ تو جانا ہے کیا آپ مجھے بھی لے چلیں گے؟"

"جی نہیں سوری۔" وہی لیے دیے رہنے والا انداز جو سلونی کے ساتھ اب اچھا خاصا روکھا ہو جاتا تھا۔

"کیا یہ بہتر نہیں کہ کرایہ بچ جائے گا۔"

"عزت نہیں بچے گی سلونی بیگم ہوش کے ناخن لو نقاب کرو اور بس میں بیٹھ کر گھر پہنچ جاؤ۔" نقاب کا مشورہ اس نے سلونی کے ہوشربا میک اپ کی وجہ سے لوکل بسوں کے مسافروں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مخلصانہ طور پر دیا تھا۔

"جس کے لیے اتنا سنور کر آئی ہوں وہی لفٹ نہیں کروا رہا تو نقاب کرنا نہ کرنا برابر ہے میرے لیے۔" سلونی کو اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے حماد نے چابی لگائی اور اس سے پہلے کہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتا سلونی نے چابی نکالی اور تیز قدموں سے چند فٹ کے فاصلے پر بنے کیفے ٹیریا میں کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔

حماد نے اس کی اس اوچھی حرکت پر پہلے تو چاروں طرف گردن گھما کر کسی کے نہ دیکھنے کی یقین دہانی کی اور پھر سرخ چہرے اور تیز قدموں سے اس تک جا پہنچا۔

"کیا حرکت ہے یہ۔" مجبوراً اسے بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھنا پڑا تھا۔

"سوری حماد لیکن سچ پوچھیں تو دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اور بس۔"

"کیا تکلیف ہے تمہارے دل کو۔" حماد تقریباً چیخنے کو تھا۔ مگر پھر کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹیبل پر موجود جگ سے ٹھنڈا پانی پیا اور پھر بولا۔

"دیکھو سلونی میں عورت ذات کی بہت عزت کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں چاہتا کہ تمہیں کچھ الٹا سیدھا کہہ جاؤں کیوں کرتی ہو یہ تھرڈ کلاس حرکتیں آخر تم چاہتی کیا ہو۔"

یہ جگہ اس کے روز آنے جانے کی تھی۔ اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی قسم کی تلخی یوں ہو کہ کل تک بلڈنگ میں موجود تمام دفاتر میں اس کیفے ٹیریا سے جانے والی چائے کے ساتھ سلونی اور حماد کی بھاپ اڑاتی خبر بھی ہو۔

"اپنے نام کے ساتھ صرف آپ کا نام چاہتی ہوں اور بس۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اور نزہت ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔" کچھ دیر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بیٹھنے کے بعد اب وہ تحمل سے بولا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ اس طرح نہیں ٹلے گی۔

"ہونہہ۔۔۔ کیا فائدہ ایسی چاہت کا جو چھ سالوں میں آپ کے آنگن میں ایک پھول بھی نہیں اگا پائی۔"

"سلونی پہلی بات تو یہ کہ تمہیں ہماری ذاتی زندگی میں دخل دینے یا اس پر رائے دینے کا کوئی حق نہیں اور پھر کیا تم نے دلہن کی صورت میں ہمارے آنگن کا کھلتا پھول نہیں دیکھا۔"

"دودھ کی پیاس پانی پینے سے بجھ سکتی ہے؟"

"میرے پاس تمہارے کسی بھی فضول سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔" "اپنا خون پھر اپنا ہی ہوتا ہے حماد لاکھ لاڈ کرو نازوں سے پالو سونے کے نوالے چاندی کے برتنوں میں بھی کھلاؤ گے تب بھی وہ لے پالک ہی کہلائے گی۔ حقیقت سے منہ موڑو یا جھٹلاؤ حقیقت حقیقت ہی رہے گی۔"

"سلونی۔۔۔" دانت بھینچتے ہوئے اس کا چہرہ معمول سے کہیں زیادہ سرخ ہو گیا تھا۔

"مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ لوگ تو بن پھولوں کی بیل کو ہفتہ بھر انتظار کرنے کے بعد نوچ ڈالتے ہیں۔ دوسری نئی اور تر و تازہ بیل لگاتے ہیں ایسی کہ جس سے پھول بھی کھلیں اور پھل بھی ملے پھر تم کیسے اس بنجر زمین کو گلے کا ہار بنائے بیٹھے ہو وہ بھی اس صورت میں جب میں اپنا سب کچھ تم پر وارنے کو تیار ہوں۔"

"جسٹ شٹ اپ سلونی میری برداشت کا امتحان مت لو۔" حماد نے پوری طاقت سے مکا ٹیبل پر مارا تھا۔

ارد گرد کے لوگوں نے پوری توجہ اور دھیان ان کی طرف مرکوز کی تاکہ باقی لوگوں کو بھی اس واقعے سے فیض یاب کیا جا سکے۔

"میں نزہت کو بھی اپنے ساتھ اسی گھر میں رکھ لوں گی حماد لیکن صرف مجھے اپنا ہم سفر ہمراز اپنا محرم دل بنا لو۔" سلونی کے لہجے میں التجا بھی تھی اور فریاد بھی۔

"محرم؟ جانتی بھی ہو اس لفظ کا مفہوم کیا ہے؟" حماد کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اب مکمل طور پر طنز کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں سے مشابہ تھے۔

"ہونہہ۔۔۔ لیکن تمہیں کیا پتا۔۔۔ جو عورت محرم اور نامحرم میں فرق نہیں جانتی وہ محرم دل بھلا کیسے بن سکتی ہے۔ ہوش کے ناخن لو سلونی بی بی ہوش کے۔ محلے والے تم لوگوں کو محلے سے نکلوانے کا سوچ رہے ہیں اور تم دل میں محرم بن کر داخل ہونا چاہتی ہو۔ تم پاک ہو تمہاری نیت بھی صاف ہو گی مگر یہ بات تمہارے اور خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ لوگ تو باہر کھڑے وہ ٹائم نوٹ کرتے ہیں جس میں سلیمہ خالہ تم لوگوں کو رشتہ لے کر آنے والوں کے ساتھ کمرے میں اکیلا چھوڑ کر انڈر اسٹینڈنگ کا موقع دیتی ہیں۔ اس ٹائم کے متعلق لوگ کیا باتیں کرتے ہیں تم میرا منہ نہ ہی کھلواؤ تو بہتر ہو گا کہ بہرحال تمہاری تمام تر اوچھی حرکتوں کے باوجود ایک عورت ہونے کی وجہ سے تمہاری عزت کرتا ہوں۔"

حماد بولنے پر آیا تو بنا سوچے سمجھے جذبات میں بس بولتا ہی چلا گیا۔

"میں نے تمہیں بہت چاہا ہے حماد اور میں سمجھتی تھی کہ کسی بھی قیمت پر تمہیں حاصل کر کے رہوں گی۔ لیکن میرا قصور صرف اور صرف سلیمہ جیسی ماں اور دوست محمد جیسے باپ کے گھر پیدا ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

اور۔۔۔ اور میں صرف اپنی نہیں اپنی بہنوں کی بھی قسم دے سکتی ہوں کہ ان کا جسم بھی پاک ہے ذہن بھی اور نیت بھی وہ صرف اپنی زندگی کا ساتھی ڈھونڈنا چاہتی ہیں اور بس۔"

"مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے سلونی بولنے والے کی زبان نہیں۔۔۔ کس کس کے منہ پر ہاتھ رکھو گی کس کس کی اٹھتی ہوئی انگلی کو پکڑو گی۔۔۔ زندگی کے ساتھی یوں بند کمروں میں اکٹھے بیٹھ کر ملا کرتے تو دفتروں آفسز میں کام کرنے والا ہر بندہ شادی شدہ ہوتا۔ جاؤ اور ٹھنڈے دماغ اور پرسکون دل کے ساتھ اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سوچو۔"

"میرے دل کا محرم تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا حماد آج نہ کل۔"

"جاؤ بی بی جاؤ۔۔۔ پہلے کسی عالم سے محرم نامحرم کا فرق پوچھو اس لفظ کی رٹ بعد میں لگانا۔" حماد نے ایک نظر اس کے ہاتھوں میں موجود کی چین کو دیکھا جس پر یقیناً اس وقت سلونی کی گرفت ڈھیلی تھی۔ جبھی ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے چابی لی اور بنا رکے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

ہمیشہ اماں کے پیچھے پیچھے پھرنے والی نزہت کے بارے میں کسی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ دنیا سے جاتے ہوئے بھی وہ اماں ہی کی تقلید کرے گی اور وہ بھی یوں کہ عین ان کی برسی کے روز ان کے ایصال ثواب کے لیے مختلف پکوان تیار کرنے کے دوران محض بلڈ پریشر ہائی ہوجانے سے ان کے پاس جا پہنچی۔

اس کے جانے کے بعد حماد تو ٹوٹ کر بکھرا ہی مگر روحینہ بلاشبہ ہل کر رہ گئی۔ اتنی چاہنے اور ٹوٹ کر روحینہ کو پیار کرنے والی مما جانی کے دنیا سے چلے جانے کے بعد کتنا ہی عرصہ تو وہ دوبارہ اپنے اسکول کو جوائن ہی نہیں کرپائی کہ مما جانی اپنے ہاتھوں سے ناشتا کروائیں، تب جاؤں گی۔ ایسے میں حماد نے اپنا دکھ پس پشت ڈال کر روحینہ کی خاطر خود کو بھی سنبھالا اور اسے بھی باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار یوں دیا کہ اسے اپنے پاپا جانی کے علاوہ اور کچھ نظر ہی نہ آتا۔

اور آتا بھی کیسے حماد بیک وقت اس کے سامنے ماں، باپ، دوست، ٹیچر سب کچھ ہی تو تھا، یہاں تک کہ خود اسے قرآن شریف بھی پڑھایا۔ یوں بھی اتنا سوشل تو وہ پہلے بھی نہیں تھا اور اب حوریہ کے ساتھ منسلک اس کی تمام تر مصروفیات نے تو جیسے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کردیا تھا۔ فکر تھی تو بس حوریہ کا بہترین مستقبل اور اچھی تربیت... بس اس کے علاوہ اب اس کی زندگی کا محور کچھ نہیں تھا، کچھ بھی تو نہیں...

☼ ☼ ☼

وقت کے تھال میں گرتے دن رات کے سکوں نے بہت کچھ بدل ڈالا تھا۔ اماں اور نزہت کے بعد دیگرے حماد اور حوریہ کو چھوڑ کر ابدی سفر پر روانہ ہوئے تو ایک بار پھر لوگوں نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا۔

مگر ہائے یہ دل...

جو نزہت کی جگہ کسی بھی اور کو دینے کو تیار نہ تھا۔ پھر اب وہ اکیلا نہ تھا۔ آنے والی نہ جانے روحینہ کو وہ محبت اور پیار دے پاتی کہ نہیں جس کی ابتدا نزہت نے کی تھی اور اپنی ذات پر آنے والی ہر سردی گرمی کو وقت کی عنایت سمجھ کر برداشت کرنے کا حوصلہ اس میں تھا۔ مگر جب بات آتی روحینہ کی تو پھر وہ کسی بھی چیز پر سمجھوتہ نہیں کرسکتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ پھر نزہت کے بغیر حماد نے اکیلے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔

روحینہ کو نا صرف باپ، بلکہ ماں کا بھی پیار یوں دیا کہ اسے زندگی میں کسی چیز کی، کسی رشتے کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ نزہت کے جانے کے بعد اس میں کچھ بھی اس کا اپنا نہ رہا تھا۔ صبح، شام اٹھتے بیٹھتے یاد تھا تو بس روحینہ... روحینہ... اور روحینہ۔

اپنی ذات کو حماد نے گویا روحینہ کے لیے وقف کر چھوڑا تھا۔

جتنا وقت دفتر میں گزرتا، سو گزرتا، اس کے بعد نہ کہیں آنا، نہ جانا... محلے میں کیا ہورہا ہے، کون آرہا ہے، کون جارہا ہے، وہ ان تمام باتوں سے بے خبر تھا۔ گھر ہوتا وہ اور روحینہ۔ وقت نے اس کے تمام پیارے رشتے ایک ایک کرکے واپس لے لیے تھے، مگر اب وہ روحینہ کو کہیں جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

اسی لیے ہر ممکن روحینہ کے ساتھ گزارتا۔ وہ بھی اب اٹھارہ سال کی ہونے کو آئی تھی۔ مگر محلے والوں سے "تقریباً" ناواقف... کہ چھوٹی ہوتی تھی تو حماد کے ساتھ گھر میں چھپن چھپائی، گڑیا گھر اور اس جیسے دوسرے گیمز کھیلتی، بڑی ہوئی تو بیڈ منٹن، شطرنج کھیلتے، ملکی سیاست پر لاحاصل تبصرے اور "کمبائن اسٹڈی" میں کس طرح وقت گزر جاتا وہ دونوں حیران رہتے۔

حماد بھی چونکہ روحینہ کی خاطر ایک بار پھر بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی تک اس کا ہاتھ تھامے اسی کے ساتھ بڑا ہوا تھا۔ اس لیے دونوں کے درمیان جھجک نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بھرپور دوستانہ ماحول میں وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دنیا جہان کے ہر موضوع پر بات چیت کرتے، تب ہی ایک دفعہ جب روحینہ نے اپنے کلاس فیلو کی طرف سے رشتہ بھیجنے کی بات حماد کو بتائی تو اس نے جانا کہ وہ تو واقعی اب ایک ننھی کلی سے خوب صورت و خوشنما پھول کا روپ

دھار چکی ہے۔ سوائے اپنی طرف سے رضامندی کا عندیہ دے کر اس کے والدین کو گھر مدعو کرنے کا کہا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ روحینہ کا کوئی دوست اپنے والدین سمیت ان کے گھر آرہا تھا اور جس مقصد کے لیے آرہا تھا یہ خیال آنے پر حماد کا جوش قابل دید تھا۔ جانتا تھا کہ روحینہ کا بھری دنیا میں اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور اسے کچھ ہوجانے کی صورت میں روحینہ کے سر پر ہاتھ رکھنے والا یا اسے تحفظ دینے والا اور کوئی بھی نہیں۔

یہ سوچ اکثر اسے راتوں کو نیند سے جگا کر بٹھا دیتی تھی۔ مگر آج وہ خوش تھا کہ روحینہ کی نئی زندگی کا پہلا باب رقم ہونے جارہا تھا۔

مہمانوں کے آنے سے پہلے انواع و اقسام کے لوازمات سے ٹیبل سجادی گئی تھی۔ ان کے آنے پر روحینہ کو صرف چائے بنا کر انہیں ڈائننگ ٹیبل کی طرف مدعو کرنا تھا۔ ابھی وہ روحینہ کو فائنل ہدایات دے رہا تھا کہ باہر سے آتی آوازوں کے نزدیک تر ہونے پر چونک گیا۔

"کیا ان ہی کا ایڈریس کنفرم کررہی تھیں نا آپ؟ حماد الحسن مرزا۔"

سلونی نے ہاتھ میں پکڑے وزیٹنگ کارڈ سے حماد کا نام معنی خیز انداز میں باآواز بلند پڑھا۔

"جی بالکل... بہت شکریہ۔" ارمضان کی والدہ نے اخلاقاً "شکریہ" کہتے ہوئے وزیٹنگ کارڈ واپس لے کر پرس کی بیرونی جیب میں ڈالا اور روحینہ کو بوسہ دے کر بڑی محبت سے اس سے ملیں۔ ادھر حماد اور بدیع صاحب نے بھی آپس میں مصافحہ کی رسم نبھائی۔

روحینہ اور ارمغان البتہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے۔

"غالباً" آپ لوگ آج رشتے کی بات کرنے آئے ہیں۔"

سلونی نے اپنی عینک کے اوپری حصے سے دیکھتے ہوئے ڈائریکٹ بدیع صاحب سے سوال کیا تو حماد پہلو بدل کر رہ گیا۔

"آپ غالباً" ان کی..." ارمغان کی والدہ نے سلونی کو روحینہ کا رشتہ دار خیال کرتے ہوئے تعارف چاہا تھا۔

"نہیں، نہیں ان سے تو صرف محلے داری..." حماد نے وضاحت کرنا چاہی تھی۔ مگر سلونی بیچ میں بول پڑی۔

"ارے جی مجھے چھوڑیے، اس بات پر دھیان دیجیے کہ یہ جو باپ بیٹی کے روپ میں آپ کے سامنے بیٹھے ہیں دراصل یہ کون ہیں۔"

حماد سمیت سبھی کو اس بات پر اچنبھا ہوا تھا۔

"سلونی تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" حماد سخت غصے میں تھا۔ بیٹی کا رشتہ اس کے من چاہے پیار کے ساتھ جڑنے جارہا تھا، مگر یہ سلونی...

"حماد صاحب پلیز کہنے دیجیے انہیں، آخر ہم دو گھرانے زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ خوشی اور غم میں ساتھ دینے کا وعدہ کرنے والے ہیں تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ان کی طرف سے پیدا کیے جانے والے شکوک و شبہات دور کرلیے جائیں۔ تاکہ بعد میں ہونے والی بدمزگی سے بچا جاسکے۔"

بدیع صاحب اپنی بات میں حق بجانب تھے۔ سو حماد کو خاموش ہونا پڑا۔ زیادہ چیختا چلاتا یا زبردستی اسے باہر جانے کو کہتا تو شاید وہ لوگ دال میں کچھ کالا ہونا خیال کرتے، سو ماحول کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اسے چپ ہونا ہی پڑا۔

"جی تو بہن آپ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔" ارمغان کی والدہ نے سلونی کو دوبارہ اپنی بات جاری رکھنے کی درخواست کی۔

"میں نے کیا کہنا تھا بہن بس اتنا کہ جس گھر سے بیٹے کے لیے اس کی ہم سفر، ہمراز اور محرم دل کا انتخاب کرنے آئی ہو، سوچ لینا کیا وہ لوگ محرم اور نامحرم کے فرق سے بھی واقف ہیں کہ نہیں؟"

بات ختم کرتے ہوئے سلونی نے ایک ہاتھ اپنے تراشیدہ ڈائی کیے ہوئے بالوں میں پھیرتے ہوئے بڑی گہری نظروں سے حماد کو دیکھا جو اس کی بات پر بلاشبہ

چونکا تھا۔

"بہن پہیلیاں مت بجھوائیے۔ پلیز کھل کر اور وضاحت سے بات کیجیے۔" بدیع صاحب سلونی کی باتوں سے مکمل طور پر الجھ چکے تھے۔

"دراصل روحینہ ان کی لے پالک اولاد ہے' گھر میں نہ ان کی ماں' نہ بیوی' بچپن سے انہوں نے روحینہ کو خود ہی پالا پوسا' جوان کیا' لیکن ہے تو وہ ان کے لیے نامحرم ہی نا... محلے کے کسی گھر کا ان کے گھر آنا جانا نہیں' سارا سارا دن ساری ساری رات یہ دونوں ان بند دروازوں کے پیچھے کن ایکٹیوٹیز میں مصروف ہوتے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے... لیکن آپ خود سمجھ دار ہیں' مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے' بولنے والے کی زبان نہیں۔"

سلونی اپنی دھن میں ماضی کے قرض چکا رہی تھی۔ ارمغان اور اس کے والدین کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔ وہیں روحینہ اور حماد برف کے گلیشیر بنے وہیں کے وہیں جم گئے تھے۔ بے گناہ' بے قصور اور پاک دامن ہونے کے باوجود یہ الزام ہی بہت بڑا اور گھناؤنا تھا۔

"لوگ ان دونوں کے متعلق کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں' اللہ توبہ میری تو اپنی چاروں بہنوں نے ساری زندگی بغیر شادی کے ماں' باپ کی دہلیز پر گزاری' لیکن کبھی نامحرم کی آڑ میں محرم کا کھیل نہیں رچایا۔"

دکھ اور صدمے سے جیسے ارمغان سمیت اس کے والدین بھی مت بت بنے بیٹھے تھے۔

"یہ دیواروں پر ٹنگی تصویریں ہی دیکھیے کیا باپ' بیٹی کو اس طرح کی تصویریں بنواتے دیکھا ہے کبھی۔"

ڈرائنگ روم میں جا بجا تصویریں لگی تھیں جن میں زیادہ روحینہ کی اکیلی' مگر کچھ میں حماد بھی موجود تھا اور ان میں سے کچھ تصویریں ارمغان کے کہنے پر روحینہ نے اسے میل بھی کی تھیں۔ مگر چونکہ ان سب کی نظروں کے سامنے روحینہ کے الزامات کی دھندلی عینک موجود تھی' اس لیے حماد اور روحینہ کے ہر پوز پر اعتراض دل میں سر اٹھانے لگا۔

"ارمغان میاں تم جس لڑکی کو اپنا محرم دل بنانے جا رہے ہو کیا اسے یا اس کے نام نہاد باپ کو محرم' نامحرم کا فرق بھی پتا ہے۔"

روحینہ نے اس وقت شدت سے یہ خواہش کی تھی کہ ارمغان کسی طرح روحینہ پر اپنا اعتماد ظاہر کر کے سلونی کا منہ بند کروا دے۔ مگر...

خواہش' خواہش ہی رہی۔

سلونی کی بات پر ارمغان نے سر جھکا لیا تھا۔

"مانا کہ یہ پاک ہیں' ان کی نیت صاف ہے' مگر یہ بات ان کے اور خدا کے علاوہ تو کوئی نہیں جانتا نا... ارے میں کہتی ہوں مارنے والے کا ہاتھ تو پکڑ لو گے' بولنے والوں کی زبان کیسے پکڑ پاؤ گے تم لوگ..." وہ سب جو ایک وقت میں ان کو محلے سے نکلوانے کا سوچ رہے تھے۔

روحینہ کی بھیگتی آنکھوں میں کوئی منظر واضح نہ رہا تھا۔ حماد کا جھکا ہوا سر اسے مارے دے رہا تھا۔ پھر ارمغان کی خاموشی اور اس کے والدین کی چبھتی نظریں...

"جائیے اور پھر محرم' نامحرم کا فرق معلوم کر لیجیے۔ میری باتیں آپ کو ذرا" سمجھ آجائیں گی۔" حماد کا ادھار جو وہ ایک مدت سے اپنے سینے پر لیے پھرتی تھی آج اس نے چکا دیا تھا۔ فاتحانہ انداز میں اس نے زمین میں گڑے حماد کو دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ چار دیواری بھی بڑی نعمت ہے خدا کی۔"

ان سب کو سناتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہتی سلونی نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ تو ارمغان سمیت اس کے والدین بھی سلونی کے ہمراہ تھے۔

"اگر وہ آج تک تنہا تھی تو آج کے بعد سے حوریہ کے ہوتے ہوئے بھی حماد ساری عمر تنہا رہے گا۔"

یہ اطمینان اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ بن کے ناچ رہا تھا۔

دوسری طرف اپنے ٹوٹتے شانوں پر کوہ گراں محسوس کرتے حماد کے ارد گرد نامحرم کی بازگشت کے سوا کچھ نہ تھا۔

دھرتی کی آغوش میں اترتی سانولی ٹھنڈی شام کے سائے بڑھنے لگے تھے۔ کاسنی پلین کاٹن کا لباس زیب تن کیے وہ چھت پر جاتی سیڑھیوں پر قدرے اوپر کی جانب ہو کر بیٹھی تھی یوں کہ اگر کوئی صحن میں کھڑا ہو کر دیکھے تو وہ دکھائی نہ دے۔ شریر ہوا اس کے رخ پر جھولتی آوارہ لٹوں سے چھیڑ چھاڑ میں مگن تھی۔ وہ پیر موڑے بیٹھی تھی اور اس کے گھٹنوں پر غالباً" کوئی چیز دھری تھی جو اس نے دائیں ہاتھ سے تھام رکھی تھی۔

اس کے حسین چہرے پر نرم سی مسکان تھی۔ آنکھیں ہنوز یک ٹک سی گھٹنوں پہ دھری چیز پر ٹھہر گئی تھیں گویا پلکیں جھپکنا بھی گوارا نہ ہو۔ وہ ہوش و خرد کی وادیوں سے پرے تخیلاتی جہاں کی سیر میں محو تھی۔ یک دم اس کی نرم سی مسکان بھرپور مسکراہٹ میں ڈھل گئی اور یوں گماں ہوا گویا کسی نے اس کے رخساروں کی ندی میں کنکر دے مارا ہو وہ کھل کے مسکرائی تھی اور مسکراتے ہوئے اس کے گالوں پر دو بھنور رقص کرنے لگے تھے۔

"صنم!" معاً" صحن میں کھڑے ہو کر کسی نے آواز دی۔

"یا وحشت۔" اس کی مسکراہٹ یک لخت سمٹی ذہن نے آواز کی شناخت کا مرحلہ طے کیا اور اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے وہ ہڑبڑا اٹھی۔

سب سے پہلا مسئلہ ہاتھ میں تھامی چیز کو ٹھکانے لگانے کا تھا وہ لبوں میں جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگی۔

"اب اس سے پہلے کہ امی جی اوپر آئیں۔ میں ہی نیچے چلی جاؤں تو بہتر ہے۔" وہ خود کلامی کرتے ہوئے ہاتھ میں تھامی چیز کو قدرے کنارے کر کے سیڑھیوں پہ رکھے گملے کے درمیان چھپا کر تیزی سے زینہ طے کرتی نیچے چلی آئی۔

"کیا کر رہی تھیں؟" آصفہ بیگم خاصی برہم سی صحن میں کھڑی تھیں۔ کڑے تیوروں میں سوال آیا۔ وہ ابھی خود ساختہ جواز تراشنے ہی والی تھی کہ۔۔۔

"امی۔۔۔ امی۔" ٹی وی لاؤنج سے تزئین کی پکار سنائی دینے لگی۔

"کیا ہوا۔" آصفہ بیگم نے وہیں سے کھڑے کھڑے تزئین سے مدعا دریافت کیا۔ گویا ابھی صنم کی زبردست کلاس لینے کا ارادہ تھا۔

"ڈرامہ شروع ہو گیا ہے۔ جلدی آجائیں۔" تزئین کے جواب کے ساتھ ہی آصفہ بیگم مزید کچھ کہے سنے بغیر اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

"اوہ۔۔۔" صنم کی سینے میں اٹکی سانس آزاد ہوئی۔

"صنم۔" ابھی اس نے کھل کر سانس بھی نہیں لی تھی کہ لاؤنج سے پھر آصفہ بیگم کی آواز ابھری۔

"جی۔۔۔" وہ تیزی سے بنا کچھ سوچے اندر کی جانب لپکی۔

تزئین صوفے پر پاؤں پسارے بیٹھی تھی صنم کو دیکھ کر مسکائی۔ آصفہ بیگم نیچے کارپٹ پر نئے لان کے کپڑے پھیلائے ٹی وی پر نشر ہونے والے انڈین ڈرامے کی طرف متوجہ تھیں۔ صنم جی بھر کے بدمزا ہوئی۔ سارا زمانہ ایک طرف اور اس کی انڈین ڈراموں سے بے زاری ایک طرف۔

"ان میں سے اپنے لیے دو تین سوٹ پسند کر لو۔" آصفہ بیگم نے بنا اس کی جانب دیکھے کہا۔ وہ بادل ناخواستہ کارپٹ پر بیٹھ گئی اور بے چارگی سے تزئین کو دیکھا جو معنی خیزی سے مسکرا رہی تھی۔ جانتی جو تھی کہ اس وقت صنم کی آمد کہاں سے ہوئی ہے۔

"امی آپ کو معلوم تو ہے مجھے پرنٹڈ کپڑے پسند نہیں میرے لیے آپ پلین کاٹن لے لیتیں نا۔" وہ چار مرتبہ کپڑے الٹ پلٹ کرنے کے بعد اس نے بے زاری سے آمنہ بیگم کو مخاطب کیا۔ جو پوری طرح بھارتی ڈرامے میں دکھائی جانے والی گھریلو سیاست میں گم تھیں۔ صنم کی بات پر چونکتے ہوئے بے چارگی سے پیشانی پر ہاتھ مارا گویا اپنی یادداشت کو شاباش دے رہی ہوں۔

"دیکھو ذرا!۔۔۔ میں بھی نا۔۔۔ وہ سیل لگی ہے لان کے کپڑوں کی تو میں اور تسمیہ (خالہ جان) نکل گئے اس طرف، لیتے ہوئے تمہارا خیال ہی نہیں رہا۔ چلو کوئی بات نہیں تم رہنے دو۔۔۔ تمہارے لیے لے آؤں گی دوسرے۔"

ان کا مزاج من پسند ڈرامے کی وجہ خاصا خوشگوار ہو چلا تھا۔ تبھی تفصیلاً" جواب دیتے وہ ہولے سے مسکرائی تھیں۔

صنم کلمہ شکر پڑھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اس کا رخ باہر کی جانب تھا (دل اور دماغ تو سیڑھیوں پہ رکھے گملوں کے درمیان چھوڑ آئی تھی نا)

"اب کہاں جا رہی ہو؟" وہ ٹھٹک کر پلٹی آصفہ بیگم اسی کی جانب متوجہ تھیں۔ ٹیلی وژن پر وقفہ آچکا تھا۔

"وہ۔۔۔ میں۔" صنم سے کچھ بن نہیں پڑی۔ تزئین لاتعلقی سے چینل سرچنگ کر رہی تھی۔ صنم نے دل ہی دل میں اسے دو چار صلواتیں سنا ڈالیں۔

"یہ سب میرے کمرے میں رکھ دو اور کچن میں گوشت دھو کر رکھا ہے میں نے وہ پکا لو۔" انہوں نے سارے کپڑے شاپنگ بیگ میں ڈال کر اسے تھمائے۔

صنم نے التجائیہ نظروں سے تزئین کو دیکھا۔ وہ جان کر غیر متوجہ تھی ناچار صنم کو امی کے جاری کردہ احکامات کی تکمیل کے لیے مستعد ہونا پڑا۔

"کیا ہوا ڈارلنگ۔" صنم کاؤنٹر پہ کھڑی پیاز کاٹ رہی تھی جب تزئین نے اسے پیچھے سے تھاما۔

"پیچھے ہٹو!۔۔۔ کتنی مرتبہ کہا ہے تم سے کہ ان چھچھورے جملوں اور حرکتوں سے گریز کیا کرو میرے سامنے۔" وہ اچھی خاصی تپی ہوئی تھی۔

"لو کان پکڑے معاف کر دو بہنا۔" تزئین اس کی وجہ برہمی سے واقف تھی۔ تبھی اک شرارتی سی چمک اس کے چہرے سے لپٹی ہوئی تھی۔ صنم نے خفا سی نگاہ تزئین پر ڈالی اور دوبارہ سے اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" تزئین جان کر انجان بنی۔

"کچھ نہیں۔" بے دلی سے جواب آیا۔

"تو یہ منہ دس کلو کا تربوز جیسا کیوں ہو رہا ہے؟" وہ ہنسی تھی اپنی ہی تشبیہ پر۔

"یہ ایسا ہی تھا۔" صنم بے زار ہوئی۔

"اچھا! نئی اطلاع ہے میرے لیے۔" تزئین کاؤنٹر پہ چڑھ کر بیٹھ گئی۔

"مل گئی نئی اطلاع۔۔۔ اب جاؤ یہاں سے۔" اس نے برنر آن کر کے پتیلی چڑھاتے ہوئے تزئین کو گھورا۔

"چلی جاتی ہوں۔ یہ تو بتاؤ اپنے ان کو کہاں رکھا ہے۔ ذرا ہم بھی تو دیدار کریں۔" اس نے کٹے ہوئے ٹماٹر کے ٹکڑے منہ میں ڈالے نتیجتاً" بازو پر پڑنے والی کفگیر کی ضرب شدید سے کراہ کر رہ گئی۔

"اف! سنگدل صنم۔ میرا بازو توڑ ڈالا۔" تزئین کب باز آنے والی تھی ہنوز غیر سنجیدگی سے تڑپ اٹھی۔

"جاؤ یہاں سے جا کر دیکھو اپنا پسندیدہ ڈرامہ۔" صنم نے تپ کر کہا۔

"یار تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میں یہ ڈرامے صرف تفریح کے لیے دیکھتی ہوں۔" وہ صفائی دینے لگی۔

"اب تم ہی بتاؤ فیشن میگزین الگ خریدوں اور لطیفوں کی کتاب الگ پھر الگ الگ دونوں کی ورق گردانی میں وقت برباد کروں اس سے بہتر نہیں کہ میں ایک دو اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھ لوں۔ ایک ڈرامہ دو مزے۔" وہ ہنسی تھی۔ صنم کو نا چاہتے ہوئے بھی اس کے انداز پہ ہنسی آگئی۔

"یہ ہوئی نا بات۔۔۔ اب بتاؤ کہاں ہے وہ؟"

"میں سیڑھیوں پہ لے کر بیٹھی تھی امی صحن سے آوازیں دینے لگیں گھبراہٹ میں وہیں گملوں کے درمیان رکھ آئی۔ امی نے دوبارہ صحن میں نکلنے بھی نہیں دیا اور کچن میں بھیج دیا۔ ابھی رات ہو جائے گی تو چھت پر جانا یوں بھی ممنوع ہو جائے گا اور میرا دل اٹکا ہے اس میں۔" صنم روہانسی ہو گئی۔

"اچھا نا۔۔۔ میں لے آتی ہوں لیکن۔۔۔" تزئین باور کرانے والے انداز میں گویا تھی۔ صنم اس کی بات

کامطلب سمجھتے ہوئے تیزی سے اثبات میں سرہلانے لگی۔

"کل تمہارا گلابی اسکارف..... سوچ لو۔"

"لے لو بھئی لے لو..... ہمیشہ کے لیے لے لو۔" صنم نے اس کی بات قطع کرکے تیزی سے کہا اور وہ مسکرا اٹھی۔

"آواز دے کہاں ہے۔" تزئین گنگناتے ہوئے کچن سے نکلی اور صنم مطمئن سی دیگچی کی جانب متوجہ ہوئی۔ جانتی تھی کہ تزئین مطلوبہ چیز اس کے سرہانے پہنچا ہی دے گی۔

☼ ☼ ☼

حامد شیرازی اور آصفہ شیرازی کے خوب صورت گلشن کی دو ہی بلبلیں تھیں۔ صنم شیرازی اور تزئین شیرازی بالترتیب سیکنڈ ایئر اور فرسٹ ایئر میں ایک ہی کالج میں زیر تعلیم تھیں۔ ہاں! نصاب دونوں کے مختلف تھے۔ تزئین سائنس گروپ جبکہ صنم نے آرٹس گروپ جوائن کررکھا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ صنم کوئی کند ذہن لڑکی تھی جو مارے باندھے نام نہاد پڑھائی کرنے کے لیے آرٹس کے مضامین منتخب کر بیٹھی تھی (جیسا کہ عام طور سے لوگ سوچتے ہیں) بلکہ شعور کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے صنم کی دلچسپی ادبی کتب کے مطالعہ تک جا پہنچی تھی۔

منظوم مجموعہ کلام' افسانے' ناولز' کالمز کے مجموعے..... ادبی رسالے و جرائد..... انٹر تک پہنچتے پہنچتے اس نے حامد صاحب کی لائبریری کی اچھی خاصی کتب پڑھ لی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کتابوں کا آدھے سے زیادہ مواد اس کے سر سے گزر گیا تھا۔ حامد شیرازی خود بھی خاصی باذوق طبیعت کے مالک تھے اسی وجہ سے ان کی لائبریری میں بہترین ادبی کتب موجود تھیں جو اتنی عام فہم ہرگز نہ تھیں کہ سولہ سترہ برس کی صنم کو سمجھ آتیں۔ بہرحال انہی کتابوں کے نامکمل مطالعے کا اعجاز تھا کہ صنم نے اردو ادب میں ماسٹرز کا ارادہ کرلیا اور اسی ارادے کی تکمیل کے لیے اس نے انٹرمیڈیٹ میں آرٹس گروپ کا انتخاب کیا۔

نرم اور خوب صورت لب و لہجے کی مالک صنم شیرازی جلد ہی اپنے اساتذہ کی منظور نظر اور کالج کی ہر دلعزیز طالبات میں شمار ہونے لگی تھی۔ اس کی رس بھری آواز میں لفظوں کا بہترین انتخاب اور لہجے کا اتار چڑھاؤ سننے والے کی سماعتوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ سونے پہ سہاگہ اس کی ذہانت اور صلح جو فطرت و بذلہ سنجی پہلی ہی بار ملنے والے کو اپنا گرویدہ بنالیتی۔ کالج کے سالانہ میگزین میں شائع ہونے والے اس کے منظوم کلام اور نثرنگاری کو خاصا سراہا گیا تھا۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سیکنڈ ایئر میں ہونے والے ہفتہ طالبات کے مشاعرہ سیشن کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھی۔ جس کے لیے صنم جہاں گھبرائی ہوئی تھی وہیں پرعزم بھی تھی۔ اس کی نظر میں "جو کام مزاج سے مطابقت رکھتا ہو وہ آسان ہو یا نہ ہو پرلطف ضرور ہوتا ہے۔" اور وہ اپنے اساتذہ کی امیدوں پر پورا اترنے کے لیے جی جان سے تیاریوں میں مگن تھی۔

☼ ☼ ☼
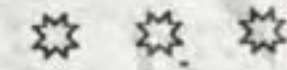
"لو بھئی! منہ میٹھا کرو۔" لاؤنج سے آتی تسمیہ خالہ کی آواز پر صنم اور تزئین کمرے سے نکل آئیں۔ سامنے کا منظر حسب توقع تھا۔ تسمیہ خالہ اب آصفہ بیگم کے منہ میں گلاب جامن ڈال رہی تھیں جو انہوں نے شوگر کی وجہ سے تکلفاً "تھوڑا سا چکھ کر" باقی ہاتھ میں تھام لیا۔

"بہت مبارک ہو تسمیہ! لیکن خوش خبری بھی تو سناؤ۔" آصفہ بیگم خوشدلی سے مسکرائیں۔

"ہلار نے اپنا پبلشنگ ہاؤس شروع کیا ہے اور وہاں سے شائع ہونے والی پہلی کتاب ہلار کا ہی مجموعہ کلام ہے۔"

"ماشاء اللہ!..... اللہ مبارک کرے اور خوشیوں' کامیابیوں سے نوازے۔" آصفہ بیگم دعائیں دینے لگیں۔

"آمین! آمین۔" صنم اور تزئین بھی نزدیک آ گئیں۔ تزئین نے بے تکلفی سے ایک گلاب جامن اٹھالیا۔

"بہت بہت مبارک ہو خالہ جان! لیکن اس خوشخبری پر تو اک دعوت بنتی ہے نا۔" تزئین حسب معمول چہکی۔

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں؟..... ہلار مجھے کہہ رہا تھا جلد ہی کتاب کی تقریب رونمائی منعقد کرنی ہے۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ پہلا دعوت نامہ ہمارے گھر خالہ جان ورنہ ہلار بھائی سے کہہ دیجیے گا میں لڑ پڑوں گی۔" تزئین کے ٹھنکنے پر تسمیہ خالہ ہنس پڑیں۔

"بالکل کہہ دوں گی بھئی تم فکر ہی مت کرو۔" انہوں نے مٹھائی کا ڈبا سینٹرل ٹیبل پر دھرا تھا۔

"ذوبیہ آپی کیسی ہیں اور باسط؟ کافی دنوں سے ہماری طرف آئے نہیں ہیں وہ لوگ۔" صنم نے خالہ زاد بہن اور ان کے بیٹے کی بابت دریافت کیا۔

"اللہ پاک کا کرم ہے گڑیا وہ بھی بالکل ٹھیک ہے اور باسط بھی۔ بس ذرا میکے ہی کم آنا ہوتا ہے اس کا تو ادھر ادھر کا چکر بھی کم ہی لگتا ہے۔"

"اچھا ہے! اللہ اس کو اپنے گھر میں شاد آباد رکھے۔ لڑکیاں شادی کے بعد سسرال میں ہی سجتی ہیں..... بس اب میں بھی صنم کے لیے رشتے کی تلاش میں ہوں اس سال بارہویں پاس کرلے گی۔ ابھی سے دیکھنا شروع کروں گی تو من پسند بر ملنے بھی وقت لگے گا نا..... اگلے ڈیڑھ دو برس میں اس کی بھی شادی کردوں گی لڑکیاں جتنی جلدی اپنے گھر بار والی ہوجائیں اتنا اچھا ہے۔" آصفہ بیگم نے لب کشائی کی اور تسمیہ بیگم صنم کو نگاہوں کی گرفت میں لیے سوچ میں پڑ گئیں۔

اتنی نادان تو نہیں تھیں کہ آصفہ بیگم کا در حقیقت یاددہانی کرواتا انداز سمجھ نہ پاتیں۔ انہوں نے کافی پہلے آصفہ بیگم سے صنم اور ہلار کی بابت گفتگو کی تھی تب آصفہ بیگم نے انہیں مناسب وقت کے انتظار کا کہا تھا اور آج آصفہ بیگم کے منہ سے صنم کی شادی کا تذکرہ سن کر انہیں اپنی سابقہ خواہش یاد آگئی۔ ان کا بس چلتا تو وہ ابھی ہی صنم کو ہلار کے لیے مانگ لیتیں۔ لیکن انہوں نے اپنی خواہش کو ہلار کی خوشی سے مشروط کرتے ہوئے کچھ دن ٹھہرنے کا قصد کیا تاکہ ہلار سے اس کا عندیہ لے سکیں۔

"چائے لیجیے خالہ....." وہ صنم کی آواز پر چونکیں جو ان کی طرف چائے کا کپ بڑھا رہی تھی۔ اس کے ملائم چہرے پر نازک سی مسکان تھی۔

"اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے آمین۔" انہوں نے کپ تھامتے ہوئے دعا دی اور وہ مسکراتے ہوئے انہیں بسکٹ سرو کرنے لگی۔

تسمیہ بیگم کا ارادہ تھا کہ ہلار ایک مرتبہ صنم کو دیکھ لے تو پھر اس کی توجہ اس طرف دلائی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ہلار اور صنم کو مدمقابل کس طرح لایا جائے ایک تو وہ مصروف بھی کچھ زیادہ ہوا کرتا تھا۔ دراصل ہلار اقبالیات میں پی ایچ ڈی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک پرائیوٹ کالج میں لیکچرار بھی تعینات تھا۔ پھر ایک نجی ریڈیو چینل پر بطور براڈکاسٹ وابستگی' ادبی مصروفیات الگ اور اب یہ پبلشنگ ہاؤس کا آغاز..... اول تو اس کے پاس رسمی میل جول کا وقت نہیں ہوتا دوسرا وہ تھا بھی تھوڑا ریزرو نیچر کا مالک خاندانی تقریبات میں بھی شاذ و نادر ہی شریک ہو پاتا کہنے والے کہتے تھے کہ ہلار ابراہیم وفا ایک مغرور و خود پسند شخصیت ہے۔ اب نہ جانے اس بات میں کتنی صداقت تھی۔

بہر کیف مندرجہ بالا صورت حال میں صنم کو ہلار نے کبھی غور سے دیکھا ہو یہ توقع عبث ہے۔ سو تسمیہ بیگم نے ہلار کے مجموعہ کلام کی رونمائی کی تقریب تک اس معاملے کو اٹھا رکھا۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ صنم ناسازی طبع کی وجہ سے تقریب میں شرکت نہیں کرسکی ناچار تسمیہ بیگم دل مسوس کررہ گئیں۔ اب بطور خاص ہلار کو صنم سے ملوانے کا اہتمام مشکل ترین تھا کہ اول تو ہلار کو فرصت ہی نہیں ملتی دوسرا اگر فراغت میسر آبھی جاتی تو ہلار اس موضوع سے کنی کترا کر نکل جاتا تسمیہ بیگم اچھی طرح جانتی تھیں۔ لیکن انہوں نے بھی مصمم ارادہ کرلیا تھا

کہ ہالار سے اس موضوع پر گفتگو ضرور کریں گی

☼ ☼ ☼

لیمن پلین کاٹن کے لباس میں ملبوس وہ اپنے اور تزئین کے مشترکہ کمرے میں تھی۔ تزئین انسٹیٹیوٹ گئی تھی اور آصفہ بیگم اپنے کمرے میں آرام کررہی تھیں۔ یہ وقت بہترین تھا صنم کے دل پسند مشغلے کے لیے دوپٹہ اس کے کاندھے سے ڈھلک کر بیڈ پر گرچکا تھا۔ وہ کہنیوں کے بل اوندھے منہ بیڈ پر دراز' ہاتھ میں کچھ تھامے یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ حیرانی رقم تھی اور چھوٹا سا گلابی دہانہ حیرت کی زیادتی سے تھوڑا وا ہو چکا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تعجب ہلکورے لے رہا تھا وہ اردگرد سے بے گانہ ہوئی ہاتھ میں تھامی چیز میں گم تھی۔ پتا نہیں کتنا وقت بیت گیا جب آہٹ پر صنم چونکی..... کوئی اس طرف آرہا تھا اس نے فوراً" سے پیشتر ہاتھ میں تھامی چیز تکیے کے نیچے چھپائی اور پلکیں موند کر سوتی بن گئی آنے والی حسب توقع آصفہ شیرازی تھیں جو صنم کو سوتا دیکھ کر بنا کوئی آہٹ پیدا کیے لوٹ گئیں۔

صنم نے ان کے چلے جانے کا اطمینان کر کے آنکھیں تھوڑی سی وا کر کے دیکھا کمرہ خالی تھا وہ مطمئن سی سراٹھاتی تکیے کے نیچے سے مطلوبہ چیز برآمد کرچکی تھی۔ اس چیز میں محو ہونے سے پہلے اس کی نظر تزئین کے بیڈ پر رکھے دھلے ہوئے تہہ شدہ کپڑوں پر پڑی جو ابھی کچھ دیر قبل وہاں نہیں تھے جس کا مطلب تھا آصفہ شیرازی ابھی یہاں رکھ کر گئی تھیں اور اسی سلسلے میں یہاں ان کی آمد دوبارہ اور سہ بارہ بھی ہو سکتی تھی۔

"دیکھا جائے گا۔" صنم نے تسلی آمیز انداز میں خود کو تھپکی دی اور پھر سے ہاتھ میں تھامی چیز میں گم ہو گئی..... پندرہ منٹ بعد پھر آہٹ ابھری صنم نے گزشتہ کارستانی دہرائی۔ اب کی بار بھی آصفہ بیگم کچھ اور کپڑے اور دھلے ہوئے غلاف اور بیڈ شیٹس وغیرہ رکھ گئی تھیں۔ صنم ان کے چلے جانے کا اطمینان کر کے ابھی سابقہ مشغلے میں مشغول ہونے کا ارادہ باندھ ہی رہی تھی کہ ایک بار پھر محسوس ہونے والی آہٹ پر بھنا کر رہ گئی۔ اس نے تپ کر ہاتھ میں تھامی چیز بیڈ فوم کے نیچے چھپائی اور تکیے پر سر پٹختے ہوئے سختی سے پلکیں بھینچ لیں۔ کچھ پل بیتے اور رائٹنگ ٹیبل پر کچھ رکھنے کی آواز آئی۔ صنم نے اداکاری جاری رکھی۔ وہ محسوس کررہی تھی کہ کوئی چلتے ہوئے اس کے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ اب صنم کو اپنے چہرے کے قریب سانسوں کی تپش محسوس ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور دھک سے رہ گئی۔ آنکھوں کے بالکل قریب غیر متوقع چہرہ۔

"اف۔" وہ حواس باختہ ہوئی۔

"ہاہاہا..... ہاہاہا۔" تزئین بے ساختہ اور بے تحاشا ہنستی ہوئی پیچھے ہٹی صنم نے تیزی سے سیدھے ہوتے ہوئے' دھڑ دھڑ' کرتے دل پر ہاتھ رکھ کر سنبھالا دیا۔

"بدتمیز۔" حواس قابو میں آئے تو تزئین کو کشن کھینچ مارا' جو ابھی بھی ہنسی قابو کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

"اپنی شکل دیکھو ذرا..... مجھے پتا تھا تم ڈر جاؤ گی مگر ..... ہاہاہا..... ڈرتے ہوئے اتنی ہونق لگو گی یہ نہیں معلوم تھا۔" اس کی ہنسی شرارتی سی مسکراہٹ میں مقید ہوئی۔

"بس..... ہنس لیا یا باقی ہے ابھی؟" صنم تپی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا یار.....؟" تزئین اب سر پہ لگے اسکارف کی پنیں کھول رہی تھی۔

"کچھ نہیں یار..... پتا تو ہے تمہیں کیا ہوا ہو گا۔" صنم نے چہرے پر بل کھاتی لٹ کان کے پیچھے اڑسی اور ڈوپٹہ شانے پر پھیلایا۔

"اوئیس!..... امی آرہی ہوں گی بار بار اور میرے آنے پر بھی تم سمجھی ہو گی کہ....." تزئین گزشتہ سچویشن انجوائے کرنے والے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں! اور تم تو اتنی بڑی چیز ہو کہ..... لے کر ڈرا دیا مجھے۔" صنم بھی مسکرائی۔

"ہاں تو اور کیا؟..... ساری دنیا کو بتا سکتی ہو تم لیکن مجھے نہیں۔" وہ کہتے ہوئے واش روم کی سمت بڑھ گئی، صنم بھی مسکراتی ہوئی اٹھی اور اس کے بیڈ سے دھلے ہوئے کپڑے اٹھا کر الماری میں رکھنے لگی۔

"صنم۔" وہ الماری کے نچلے خانے میں بیڈ شیٹس رکھ کر سیدھی ہوئی تھی جب تزئین نے اسے پکارا۔

"ہوں۔" وہ الماری کے پٹ بند کرتے ہوئے تزئین کی جانب پلٹی جو بھیگا چہرہ ٹاول سے خشک کررہی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں کہ مشاعرہ سیشن کے مہمان خصوصی میں ہالار بھائی بھی شامل ہیں۔" تزئین نے آئینے میں ابھرتے صنم کے عکس پر نظریں جمائیں۔

"اس میں بتانے والی کیا بات ہے وہاں نوٹس بورڈ پر اتنا بڑا بڑا لکھا ہوا ہے۔" صنم نے بے نیازی دکھائی۔

"بتانے والی بات تو ہے۔ آفٹر آل وہ ہمارے کزن ہیں۔ تھوڑی ہماری بھی ٹور بن جائے گی فرینڈز سرکل میں۔"

"خوامخواہ..... وہ ہمیں پہچانیں گے بھی نہیں دیکھ لینا۔" صنم نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"اب ایسی بھی بات نہیں۔ اتنے بدتہذیب تو نہیں ہوتے ادبی لوگ بلکہ میرے خیال میں عام لوگوں سے زیادہ ہی خوش اخلاق ہوتے ہیں۔" تزئین جرح کر رہی تھی۔

"تم اور تمہارے خیالات..... ہونہہ۔" صنم نے تمسخر اڑایا۔

"تم ریڈیو پر ان کے شوز نہیں سنتی نا۔ اس لیے ایسا کہہ رہی ہو۔ میری ان سے کئی مرتبہ لائیو بات ہوئی ہے اور ملاقات بھی ان کے مجموعہ کلام کی تقریب میں ہو چکی ہے۔ مجھے تو وہ پہچان لیں گے۔ ہاں! تمہارا نہیں معلوم۔" تزئین اسے چھیڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"نہیں پہچانتے تو نہ پہچانیں..... مجھے کیا۔" صنم بھی سر جھٹکتی لاپروائی سے تزئین کے پیچھے لپکی۔

☼ ☼ ☼

سخن شعار ہی سمجھیں سخن وری کیا ہے
وگرنہ شعر تو ہر کوئی کہا کرتا ہے

"ریختہ سخن طرازی کی ایسی شکل ہے۔ جس میں کم اور خوب صورت لفظوں میں اظہار و بیان کی دلکشی کا انحصار۔ بحر و اوزان کے اصولوں پر ہے۔ بڑی سے بڑی بات اچھوتے انداز اور دلفریب الفاظ میں تول کر محض دو سطروں میں بیان کر دینا بلاشبہ ایک اچھے اور باصلاحیت شاعر کا طرہ امتیاز ہے اور کسی بھی شاعر کا وہ کلام جو پڑھنے یا سننے والے کو اپنے دل کی ترجمانی کرتا محسوس ہو وہ شاعر اور اس کے کلام کی کامیابی کی دلیل ہے۔ بقول شاعر۔

شعر حالات دل کا آئینہ
حرف در حرف ادا ہوتے ہیں

گلابی پلین کاٹن کی قمیص' چوڑی دار پاجامہ اور بڑا سا دوپٹہ جس پر ہمرنگ گوٹے سے خوب صورت کام بنا ہوا تھا زیب تن کیے وہ اس کے بالکل سامنے اسٹیج پر دوزانو ہو کر بیٹھی تھی اس کے سامنے رکھے مکتب پر مائیک اور تازہ گلابوں کا بڑا سا گلدستہ رکھا تھا اور ان بہت سارے تازہ سرخ گلابوں کے درمیان اس کا نکھرا ستھرا چہرہ بھی کسی گلاب سے کم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی نازک کلائیوں میں بیلے کے کنگن مہک رہے تھے سر پہ رکھے دوپٹہ کی شرارت سے سمٹے ہوئے بالوں کی دو ایک لٹیں اس کے رخسار پر جھول گئی تھیں۔

بہت ساری نگاہوں کا مرکز بنی صنم شیرازی ذرا بھی نروس نہیں تھی۔ ہولے ہولے خوب صورت لب و لہجے میں لفظوں کے موتی پروتی وہ بزم مشاعرہ کو مشکبار کیے دے رہی تھی۔ موقع کی مناسبت سے اشعار کا انتخاب اور سخن شعاری کا منفرد انداز ہالار سمیت سب کو ہی اس کے اعلا ذوق اور ادبی شناسائی و وابستگی کا معترف کیے دے رہا تھا۔ محفل اپنے حسن دلربائی سے اختتام کی جانب رواں دواں تھی اور صنم اپنی کامیابی پر مسرور و سرشار.....

محفل کے اختتام پر صنم آڈیٹوریم سے نکل کر اساتذہ کے لیے مختص کمرے کی سمت بڑھ رہی تھی جب "ہالار ابراہیم وفا" سے مڈبھیڑ ہو گئی وہ بہت ساری

آٹوگراف بک لیے کھڑی لڑکیوں کے درمیان گھرا تھا۔ صنم نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس ہجوم پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ چونکہ اسٹیج پر بطور مہمان خصوصی اسے مدعو کرتے ہوئے وہ سلام کلام کے اخلاقیات نبھا چکی تھی سو ابھی یہاں علیحدگی سے رشتہ داری جتانے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن غالباً" ہالار ابراہیم وفا کا ارادہ کچھ اور بن گیا تھا۔

"صنم۔" وہ ٹھٹک کر رکی ہالار کی آواز پر پلٹ کر دیکھا۔ وہ اب اپنے پرستاروں سے معذرت کرتا اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔

"جی۔" وہ مودب ہوئی۔ آف وائٹ شلوار قمیص پر شانوں پہ براؤن شال رکھے وہ اونچا لمبا بھرپور مرد بلاشبہ مردانہ وجاہت کا حامل تھا۔

"بہت خوب صورت بولتی ہو تم۔" مسکراتے لبوں اور کچھ کہتی آنکھوں سے صنم ایک پل کے لیے نروس ہوئی تھی۔

"آداب۔" اگلے ہی پل وہ پراعتمادسی مسکرائی۔

"تسلیم!" گھنی مونچھوں تلے ہالار ابراہیم کے لب معنی خیزی سے مسکرائے۔ صنم نے نگاہیں چراتے ہوئے اردگرد نگاہ ڈالی۔

"تم نے کبھی بتایا نہیں کہ تم ادب میں اتنی دلچسپی رکھتی ہو۔" ہالار کی نظریں اس کے نوخیز چہرہ کا طواف کررہی تھیں۔ وہ پھر ہولے سے مسکرائی۔

"کسی کو کچھ بتانے کے لیے اس سے ملنا ضروری ہوتا ہے ہالار بھائی! اور مجھے نہیں یاد کہ آج سے پہلے کبھی ہماری بطور خاص کہیں ملاقات بھی ہوئی ہے۔" وہ جیسے اس کی نادانی پر محظوظ ہوئی۔ ہالار دل ہی دل میں اس کی حاضر جوابی کو سراہ کر رہ گیا۔

"تمہیں نہیں لگتا بطور خاص ملاقات محض خاص لوگوں سے ہی ہوتی ہے جیسے حسن اتفاق سے میری تم سے ملاقات ہو گئی۔" مقابل کو اس کی ہی کسی بات سے لاجواب کرنے کا فن ہالار خوب جانتا تھا اور یہاں تو مقابل بھی صنف نازک تھی جملے سے جھانکتی ذرا سی ذومعنویت سے چھوئی موئی کی مانند سمٹ جانے والی۔

"آپ کا مجموعہ کلام بے حد دلفریب ہے۔" صنم نے بات بدلی ہالار اس کے دامن بچانے پر مسکرایا۔

"شکریہ!..... ویسے اب تمہیں شکایت تو نہیں ہو گی نا؟" اس کی آنکھیں شرارت سے لبریز ہوئیں۔

"کس بات کی شکایت؟" صنم ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"دیکھ لو..... میں نے تمہیں پہچان بھی لیا اور تم سے علیحدہ سے باتیں بھی کرلیں اب تمہاری بدگمانی دور ہو گئی ہوگی یقیناً"..... ہالار کے لبوں کے گوشوں میں پھڑکتی شرارتی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ تزئین اس سے مل چکی ہے اور یہ کارکردگی اس کی ہی ہے۔ صنم کے دل میں شدید خواہش ابھری بھلا کیسی خواہش..... تزئین کی گردن مروڑنے کی۔ ہالار بغور اس کے چہرے کو جانچ رہا تھا۔

"تزئین ملی آپ سے۔" اچھی طرح جاننے کے باوجود وہ اس کی نظروں سے خائف تزئین کی بابت پوچھ بیٹھی۔

"مل چکی ہے تبھی تو تم سے آشنائی ہوئی ہے۔" وہ مسلسل اسے نروس کررہا تھا۔ صنم نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔

"معاف کیجیے گا۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔" وہ معذرت خواہانہ کہتی جانے کے لیے پر تولنے لگی۔

"ضرور۔" ہالار نے اسے جانے کا عندیہ دیا۔

"شکریہ؟" وہ پلٹ گئی۔

"صنم۔" وہ اس کی بولتی نگاہوں سے خائف ہوتی کلمہ شکر پڑھتی دو قدم ہی بڑھی ہوگی جب دوبارہ ہالار ابراہیم کی آواز پر اس کے بڑھتے قدم تھم گئے۔ اس نے ذرا کی ذرا رخ موڑ کر دیکھا وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا صنم کے پلٹنے پر دھیرے سے اس کے نزدیک آیا۔

"بہت جلد ایک بطور خاص ملاقات کا اہتمام کر رکھنا۔" اس کے ..... لہجے پر صنم پزل ہوئی۔ جملے کی معنی خیزی اس کے عارض پر سرخی بن کر دوڑ گئی۔

"اللہ حافظ۔" وہ اپنا دل سنبھالتی نظریں جھکائے پلٹی اور ہالار سے دور ہوتی چلی گئی۔

"آہ!..... دل بے خود۔" وہ وہیں کھڑا دل کی بے اختیاری پر مصنوعی آہ بھرتے ہوئے ہولے سے ہنس پڑا نئے نویلے جذبات کی دلفریبی حواسوں پہ چھانے لگی تھی۔

اور آگے کے مراحل کچھ اتنے مشکل تو نہیں تھے۔ جس بات کے لیے تسمیہ بیگم کو ہالار کی فراغت مطلوب تھی وہ بات ہالار نہایت اطمینان سے ان کی آغوش میں سر رکھ کر پلکیں موندے عرض کررہا تھا اور تسمیہ بیگم کے ہاتھ تو گویا ہفت اقلیم کی دولت آگئی تھی۔

چونکہ ہالار ذوبیہ سے چار سال بڑا تھا لیکن ذوبیہ کی شادی کے چار سال بعد بھی ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے وہ اب تک پہلو بچائے جارہا تھا لیکن اب جا کے اچانک اس نے اس معاملے میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے لاعلمی میں ہی تسمیہ بیگم کی خواہش کو اپنی پسندیدگی کی سند دے دی تھی تسمیہ بیگم کے خوش ہونے کا ٹھوس جواز تو بنتا تھا نا!..... ابراہیم صاحب کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ آناً" فاناً" سارے معاملات طے پا گئے تھے دوسری جانب شیرازی صاحب نے رسماً" بھی سوچنے کا وقت نہیں لیا اور محض رشتہ لے کر گئے تسمیہ بیگم اور ابراہیم صاحب بات ہی پکی کر آئے اور ٹھیک پندرہ دن بعد منگنی کی تقریب کا انعقاد عمل میں آنا طے پا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ صوفے پر دراز یک ٹک ہاتھ میں تھامی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ پرشکن ابرو اس کے درد کے ترجمان بنے ہوئے تھے۔ اس نے بے دردی سے دائیں آنکھ کے کنارے ٹپکنے والے آنسو کے قطرے کو ہاتھ کی پشت سے رگڑ ڈالا۔ حالانکہ آج اس کی منگنی تھی۔ لیکن اسے جیسے کسی بات سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ وہ اپنے دل پسند مشغلے میں مستغرق تھی۔ تقریب لان میں تھی اسی وجہ سے گھر میں چہل پہل قدرے کم تھی۔ وہ اس وقت گھر میں صرف کام والی خالہ کے ہمراہ تھی تبھی بے خوفی سے صوفے پر دراز محو و مشغول تھی۔ تزئین اور آصفہ بیگم کچھ ضروری سامان کے لیے بازار تک گئی تھیں۔

"آج تو چھوڑ دو اسے۔" وہ تزئین کی آواز پر چونک کر سیدھی ہوئی جو ابھی ابھی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور ہاتھ میں تھامی چیز کو کہیں چھپانے کا ارادہ کرنے لگی۔

"امی سامنے مسز عثمان کے گھر گئی ہیں کسی کام سے۔" تزئین نے صنم کا ارادہ بھانپتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا تو وہ پرسکون ہوتی اطمینان سے پھر اسے لے بیٹھی۔

"اف..... میں نے کہا آج تو چھوڑ دو اسے۔" تزئین اسے پھر سے گم ہوتے دیکھ کر چڑ گئی۔

"تم بھی تزئین..... تم بھی ایسا کہو گی۔" صنم کو جیسے صدمہ پہنچا تھا۔

"ای کیا کم تھیں جو تم نے بھی اس سے بیر باندھ لیا۔" وہ جذباتیت کے سارے ریکارڈ توڑنے پر مصر تھی۔

"بس کرو! تم پر یہ مسخراپن سوٹ نہیں کررہا۔" تزئین ہنسی تھی۔

"مت ہنسو تزئین! آج میرا دل رو رہا ہے۔" وہ اب بھی مصنوعی سنجیدگی سے گویا تھی۔

"خیر ہے؟" تزئین شاپنگ بیگز کھنگال رہی تھی۔ بالآخر اس نے جیولری برآمد کرلی۔

"خیر ہی تو نہیں ہے..... وہ چلا گیا تزئین۔" صنم بے چارگی سے گویا تھی۔

"اسے تو جانا ہی تھا وہ جائے گا تبھی تو کوئی اور آئے گا نا؟..... زندگی میں آنا جانا تو لگا رہتا ہے۔" وہ لاپروائی سے کہتی جیولری پہن کر چیک کررہی تھی۔ صنم نے دلدوز نظروں سے اسے گھورا۔

"کم آن چیر اپ صنم! آج منگنی ہے تمہاری اور تم بیٹھی سوگ منا رہی ہو۔" وہ دیوار گیر آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ اسی دم آصفہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔ صنم نے تیزی سے ہاتھ میں تھامی چیز صوفے پر

رکھے ڈھیروں کشنز کے درمیان چھپائی۔ تزئین معنی خیزی سے کھانسنے لگی لیکن صنم کی گھوری اس کے گلے کی مصنوعی خراشوں کا علاج کر گئی۔

منگنی کی تقریب چونکہ مشترکہ تھی اس لیے اہتمام خاصے بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا۔ اسی روز شام ڈھلے سلور کام سے مزین پیچ کلر کے شرارے میں ملبوس بجی سنوری صنم ہالار ابراہیم سے منسوب کر دی گئی۔

وہ اس دن کے بعد چوتھی شب تھی۔ جب صنم نے روانی سے چلتے قلم کو لگام دیتے ہوئے گھڑی پہ نگاہ ڈالی۔ رات کے سوا بارہ بج چکے تھے اس نے گردن موڑ کے دیکھا تزئین دنیا جہاں سے بے خبر نیند کی آغوش میں مدہوش ہو چکی تھی۔ صنم اس کے بے ترتیبی سے دراز ہونے پر مسکرائی اور سیدھے ہوتے ہوئے سائیڈ پر دھری کتاب کے درمیان سے ڈاک کا لفافہ برآمد کیا۔ ابھی وہ اس پر مطلوبہ ایڈریس لکھنا ہی چاہتی تھی کہ موبائل فون کی مدھم رنگ ٹون پر چونک گئی۔ رات کے اس پہر کون یاد کر سکتا ہے وہ تھوڑی حیران ہوتی کال ریسیو کر گئی نمبر اجنبی تھا۔

"السلام علیکم۔" مردانہ آواز ایئر پیس سے ابھری۔

"ہالار بات کر رہا ہوں۔" اس کے مزید حیران ہونے سے قبل مقابل نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ یہ منگنی کے بعد ان کی براہ راست پہلی گفتگو تھی۔ وہ نروس ہوتی کچھ بول ہی نہیں پائی۔

"سلام کا جواب تو دو۔ ایسی بھی کیا بے یقینی۔" وہ غالباً" اس کی پزل ہوتی کیفیت انجوئے کر رہا تھا۔

"وعلیکم السلام!" صنم کو مدھم سروں میں کہنا پڑا۔

"جاگ رہی تھیں تم بھی؟" وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔

"جی۔۔۔ کچھ مصروف تھی اس وجہ سے۔"

"کیسی مصروفیت؟" بات برائے بات ہی سہی لیکن آگے بڑھ چکی تھی۔

"من پسند مصروفیت۔" وہ سامنے ٹیبل پر پڑی چیز کو دیکھ کر مسکرائی۔ البتہ بولنے سے احتراز برتا۔

"اوہ۔۔۔ کہیں تم بھی تو دریچے میں نہیں کھڑیں؟" وہ پر تجسس ہوا۔

"بھی کا کیا مطلب؟۔۔۔ آپ اتنی رات گئے دریچے میں کھڑے ہیں؟" اس نے حیرانی سے ایک نظر گھڑی پہ ڈالی۔

"ہاں!۔۔۔ اور ابھی مزید یہیں کھڑا رہوں گا۔" وہ اس کی حیرانی سے لطف اندوز ہوا۔

"کیوں۔۔۔ کچھ خاص ہے دریچے میں؟"

"خاص دریچے میں نہیں۔ آج کی رات میں ہے۔"

"اچھا! کیا خاص ہے رات میں؟"

"اپنے کمرے کی کھڑکی کھولو اور دیکھ لو۔" مسکراتی آواز پر صنم کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ بکھری۔ وہ آہستگی سے اٹھی اور ہولے ہولے چلتی کھڑکی کے نزدیک آٹھہری۔ پردے سمیٹ کر گلاس ونڈو سرکانے تک محض خاموشی گنگناتی رہی تھی۔

"بے انتہا دل پذیر منظر ہے۔" آسمان کی وسعتوں میں جھانکتے ہی اس کے لبوں سے بے ساختہ یہ جملہ ادا ہوا اور دوسری سمت ہالار کی مسکراہٹ گہری ہو چلی۔

چودھویں رات کا مکمل چاند رات کے سیاہ آنچل سے لپٹا سارے آسمان پر چاندنی کی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ تیرگی کی گھور تاریکی میں ماہ کامل کا ہالا بے حد پرنور اور مقدس تاثر پیش کر رہا تھا۔ ٹھنڈی زرد کرنیں صنم کے چہرے کو چومنے لگیں وہ مسحور سی ہوئی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں نے اتنی رات کو کیوں کال کی؟" وہ ہالار کی بات پر چونک سی گئی۔

"کیوں کال کی؟" سنبھل کر پوچھا گیا۔ ہالار نے ماہ کامل پر نگاہوں کی گرفت کی۔

"چاندنی رات کی مبارکباد دینے کے لیے۔" صنم نے پورے چاند کو نظر بھر کر دیکھا۔ در پردہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے محو گفتگو تھے ماہ کامل دم سادھے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

"میں سمجھی نہیں؟" وہ الجھی تھی۔

"میں سمجھا دیتا ہوں۔"

"کہتے ہیں کہ چاندنی راتوں میں تخلیق کاروں کی

تخلیقی صلاحیتیں عروج پر پہنچ جاتی ہیں اور بڑے بڑے شاہکار حسن اتفاق سے انھیں چاندنی راتوں میں تخلیق کیے گئے ہیں۔"

دونوں کی نگاہیں ماہ کامل سی لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ مزید کہہ رہا تھا۔

"سو چاندنی راتیں تخلیق کاروں یعنی فنون لطیفہ سے متعلقہ لوگوں اور حساس دل والوں کے لیے بے انتہا اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی وجہ سے اصل باذوق دل ایک دوسرے کو چاندنی رات کی مبارکباد دیتے ہیں۔ جیسے میں نے تمہیں دی۔۔۔ اب تمہاری باری۔" صنم ہالار کی آخری بات اور انداز پر مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"اوکے جی! آپ کے لیے چاندنی راتیں مبارک اور بخیر ہوں۔" صنم نے حساب برابر کیا۔

"شکریہ۔" ہالار کھل کر مسکرایا۔ صنم بلاشبہ اس کی ہم مزاج تھی۔

"رات بہت ہو گئی ہے۔ میں نے صبح کالج بھی جانا ہے۔" صنم نے پلٹ کر گھڑی دیکھی پونے ایک ہو چکے تھے۔

"ٹھیک ہے! اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔" ہالار نے الوداعی کلمات کہے وہ ہنوز یک ٹک چاند کو تک رہا تھا۔

"آپ بھی۔۔۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ نگہبان۔" صنم نے سیل فون بند کرتے ہوئے ایک الوداعی نگاہ چاند پر ڈالی۔

"اب یہ کرو گی تم۔" تزئین کی آواز پر وہ پردے برابر کرتی ایک لمحے کے لیے تھم گئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے نزدیک کھڑی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے امی کا۔ لیکن پھر بھی تم۔۔۔" تزئین نے ڈاک کا لفافہ واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ صنم اس کے نزدیک چلی آئی۔

"پلیز تزئین! تم بتاؤ اس میں غلط کیا ہے؟" صنم نے ٹیبل پر بکھری کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"غلط، صحیح کو درمیان سے نکال دو مجھے بتاؤ تم یہ سب کتنے دن تک چھپا سکو گی۔" تزئین سینے پر بازو لپیٹے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں بس اس کے جواب ۔۔۔ آنے کا انتظار کروں گی پھر امی سے خود بات کروں گی۔ انہیں سمجھاؤں گی کہ جو وہ سمجھ رہی ہیں ویسا کچھ نہیں ہے۔" صنم نے ڈاک کا لفافہ اور وہ چیز ٹیبل کی نچلی دراز میں ڈالی اور بیڈ کی سمت بڑھ آئی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔۔۔ کب پوسٹ کرو گی۔" تزئین بھی ٹھنڈی سانس بھرتی بیڈ پر دراز ہوئی۔

"کل۔۔۔ ان شاء اللہ۔" صنم کی غزالی آنکھوں میں جگنو سے خواب چمک رہے تھے۔ تزئین نے اس کے خوابوں کے تکمیل کی دعا مانگی اور پلکیں موند گئی۔ صنم نے ایک نظر کھڑکی کے بند کواڑوں کو دیکھا اس کے دل میں ایک مرتبہ پھر ماہ کامل کو دیکھنے کی خواہش جاگی۔ وہ معصومیت سے مسکرائی اور خود کو سرزش کرتی پلکیں موند گئی۔ اس کے نوخیز چہرے پر نرم سی مسکان رقصاں تھی۔

اور۔۔۔ دو مہینے بعد صنم کا انتظار تمام ہوا تب اس کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ پوسٹ مین (ڈاکیے) سے موصول ہوئی ڈاک ہاتھ میں تھامے بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی۔ بے تحاشا ہنستی ہوئی چمکتے چہرے کے ساتھ فرط مسرت سے وہ کچھ بولنے سے قاصر تھی۔ بیڈ پہ دراز تزئین حیران ہوتی اٹھ بیٹھی۔

"تزئین! یہ۔۔۔ یہ۔" وہ ہنس رہی تھی بنا کچھ بتائے صرف ہنس رہی تھی۔ تشویش تزئین کے چہرے سے جھلکنے لگی۔

"کیا ہوا ہے صنم! پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔" وہ جھنجلائی جب صنم نے ہاتھ میں تھامی چیز اس کے سامنے کر دی۔ تزئین ایک لمحے کو تو سمجھی ہی نہیں جب سمجھی تو حیرانی سے صنم کو دیکھا گویا تصدیق چاہ رہی تھی کہ جو وہ سمجھ رہی ہے وہ سچ ہے یا نہیں۔

صنم اثبات میں سر ہلاتے ایک مرتبہ پھر ہنس پڑی اور اس بار اس کی ہنسی میں تزئین کی کھلکھلاہٹ بھی شامل تھی۔ وہ خوش تھی۔ بے حد خوش اور یہی چیز جب اس نے رات شیرازی صاحب کو دکھائی تو وہ بھی پہلے تو حیران ہوئے پھر بے انتہا مسرت محسوس کرتے

ہوئے صنم کو اس کی پہلی کامیابی پر ہزار روپے بطور انعام تھمائے۔ صنم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ اور تزئین شیرازی صاحب کے دائیں بائیں صوفے پر بیٹھی تھیں ۔ آصفہ شیرازی لاؤنج میں براجمان اپنے پسندیدہ بھارتی ڈراموں سے استفادہ ـــــ کر رہی تھیں۔ اسی وجہ سے صنم مطمئن سی اپنے ابو جی کو اپنے کارنامے کی تفصیلات بتا رہی تھی۔

"تم دونوں یہاں بیٹھی ہو..... ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔" آمنہ شیرازی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے گویا ہوئیں۔ شیرازی صاحب یوں کھنکارے گویا کوئی تقریر کرنی ہے۔ تزئین شرارتاً" مسکرا رہی تھی جبکہ صنم کسی قدر گھبرائی ہوئی تھی۔

"خاص بات تو ہے آصفہ! آؤ تم بھی دیکھو۔" شیرازی صاحب نے ہاتھ میں تھامی چیز آصفہ بیگم کی سمت بڑھائی۔

انہوں نے پہلے تو بغور شیرازی صاحب کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں تھمی چیز کو دیکھا۔ پھر خشمگیں نظریں اٹھائیں۔

"ڈائجسٹ۔" ان کی پیشانی پہ شکنیں ابھری۔

"ہزار مرتبہ سمجھایا ہے ان لوگوں کو کہ یہ بے حیائی کے نمونے ڈائجسٹ مت پڑھا کرو مگر ان لوگوں کو سمجھ نہیں آتی۔ اب تو ماشاءاللہ والد صاحب بھی اس کے دلدادہ معلوم ہو رہے ہیں۔" وہ طنزیہ کہتی چلی گئیں اور صنم کا چہرہ بجھ گیا۔ شیرازی صاحب نے حوصلہ افزا نظروں سے صنم کو دیکھا۔

"میں تمہیں کیا دکھا رہا ہوں دیکھ تو لو۔" شیرازی صاحب کے اشارہ کرنے پر صنم "آصفہ شیرازی کے نزدیک جا بیٹھی۔

"صنم بیٹا! آپ سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ یہ سب فضول چیزیں ہیں تم کیوں ان میں وقت برباد کرتی ہو۔ کیا میں نہیں جانتی کہ ان ڈائجسٹوں میں کیسی کیسی کہانیاں ہوتی ہیں اور اس سے لڑکیوں کے ذہنوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔" آصفہ نے صنم کا ہاتھ تھام کر ملائمت سے سمجھانا شروع کیا۔

"امی...." صنم نے ہولے سے ان کی بات کاٹ دی۔

"آپ مجھے خود بتائیے اس میں کیا برائی ہے۔ میں اس سے سیکھتی ہوں امی ان کیسی کیسی کہانیوں سے سبق لیتی ہوں۔ میں اس کی غلط باتیں نہیں اچھے اطوار یاد رکھتی ہوں۔ اچھی بری باتیں تو ہر جگہ ہوتی ہیں نا؟ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں نا؟ یہ تو ہمارے اوپر منحصر ہے کہ ہم کیا سیکھتے ہیں اچھا یا برا؟" وہ نہایت آرام سے اپنا نقطہ نظر واضح کر رہی تھی۔ آصفہ بیگم مہر بہ لب اسے دیکھ رہی تھیں۔

"دیکھ لو آصفہ! صنم اب کتنی سمجھ دار ہو گئی ہے تمہیں سمجھا رہی ہے۔" شیرازی صاحب شرارتاً" گویا ہوئے۔

"لیکن کہہ بالکل ٹھیک رہی ہے۔ اب تم خود ہی بتاؤ ٹی وی اور کیبل سے زیادہ بے حیائی ہے کہیں؟ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ حیا باختہ ڈرامے اور فلمیں تو سارا گھرانہ اکٹھے بیٹھ کر دیکھ لے۔ لیکن ڈائجسٹ نہ پڑھے کیونکہ اس میں کیسی کیسی کہانیاں ہوتی ہیں۔" شیرازی صاحب نے آخر میں آصفہ بیگم کا انداز سمیٹا تو صنم اور تزئین کے چہروں پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

"امی پلیز! آپ تھوڑا کھلے ذہن سے سوچیں۔ اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے آپ بے شک خود پڑھ کر دیکھ لیں اور اب تو...." وہ روانی سے کہتی یک بیک تھم سی گئی۔

"اب تو کیا؟" آصفہ بیگم نے اتنی دیر بعد لب کشائی کی تھی۔

"اب تو صنم کا پہلا افسانہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب تو تم پڑھ ہی لو۔" شیرازی صاحب ہلکے پھلکے انداز میں بولے تو آصفہ بیگم نے حیران ہو کر صنم کو دیکھا جو سر جھکائے مسکرا رہی تھی۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے ڈائجسٹ شیرازی صاحب کے ہاتھ سے لیا اور کھول کر دیکھنے لگیں۔

صنم اور تزئین مسکراتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ گئیں اب یقیناً" آصفہ بیگم صنم کا افسانہ پڑھنے والی تھیں اور اس کے لیے انہیں تنہا چھوڑ دینا ہی بہتر تھا۔ اور اگلی صبح ناشتے کی میز پر آصفہ شیرازی نے بہت سرسری سے انداز میں کہا تھا۔

"صنم تمہارا افسانہ بہت اچھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنا بہتر تحریر کر سکتی ہو۔"

وہ سر جھکائے خوش کن احساسات و تصورات میں گھری ناشتا کر رہی تھی جب تزئین اس کے کان میں گھسی۔

"ہالار بھائی کو بتایا؟"

"نہیں!" صنم نے جوس کا گلاس منہ سے لگایا۔

"تو بتا دو۔" تزئین معنی خیزی سے مسکرائی۔

"آخر انہیں بھی تو معلوم ہو کہ ان کی متوقع شریک حیات نے باضابطہ طور پہ قلمی سفر کا آغاز کر دیا ہے۔"

"فضول باتیں کروالو تم سے بس۔" صنم نے اسے مصنوعی گھوری دی۔

"کم آن صنم آئی ایم سیریس۔" وہ اب کے سنجیدہ ہوئی۔

"بتا دوں گی بھئی۔ ابھی تو چلو لیٹ ہو رہے ہیں۔" صنم نے گفتگو سمیٹی اور کالج بیگ اٹھا کر سر پہ اسکارف درست کرتی فاطمہ بیگم کو الوداع کہتے کچن میں چلی گئی۔

پھر یوں ہوا کہ جب اپنے افسانے کا ذکر صنم نے ہالار سے کیا تو ہالار ابراہیم نے ایک عجیب سی بات کہی جو صنم کو مخمصے میں ڈال گئی۔ اس نے کہا۔

"ڈائجسٹ ادب کے قاتل ہیں صنم! اور میں تمہیں اس راستے پہ چلنے کا مشورہ نہیں دوں گا باقی تمہاری مرضی۔" اور صنم کا دل بے انتہا برا ہوا۔

اس کا خیال تھا کہ صرف وہ ہی لوگ ڈائجسٹ کے خلاف ہیں جو ادب آشنا نہیں ہیں لیکن اب جا کے اس پر منکشف ہوا کہ ادب شناس طبقہ تو ڈائجسٹ کے بارے میں اور بھی زیادہ منفی رائے رکھتا ہے۔ وہ اداس ہوئی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ نگاہ خلا میں اڑتے پرندوں

کے ساتھ محوِ پرواز تھی۔ اسی دم تزئین اس کے برابر آ بیٹھی۔ اس نے دھیرے سے نظریں موڑ کر اسے دیکھا۔ تزئین نے آدھی کھائی چاکلیٹ اسے آفر کی صنم نے نفی میں سرہلاتے اس کا ہاتھ پیچھے کیا۔

"کیا بات ہے سسٹر! یوں ملکہ جذبات کی طرح کیوں بوز کر رہی ہو۔" وہ بے فکری سے چاکلیٹ کے بائٹ لینے لگی۔

"موڈ اچھا نہیں ہے۔" صنم بے زار سی تھی۔

"موڈ کو کیا ہوا؟" تزئین چونکی۔

"کچھ نہیں یار!..... موڈ کو کیا ہونا ہے۔"

"ہالار بھائی سے بات ہوئی۔" تزئین نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں! ہو گئی تمہارے ہالار بھائی سے بات۔" صنم نے جملہ دانتوں میں چبایا۔

"خیریت ہے نا۔ سرکار کے مزاج خاصے برہم معلوم ہوتے ہیں۔" تزئین نے شوخی سے کہتے ہوئے چاکلیٹ کا خالی ریپر ڈسٹ بن میں اچھال دیا۔

"یار تزئین ایک بات بتاؤ مجھے یہ ڈھائی تین سو صفحات کے بے ضرر سے رسالوں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ جو سارے جہاں کی برائی سب اسی کے جگر میں گردانتے ہیں ——" صنم اچھی خاصی بھری بیٹھی تھی۔

"ہالار بھائی نے کچھ کہا ہے کیا؟" تزئین نے اندازہ لگایا۔ صنم اثبات میں سرہلا گئی۔

"انہوں نے کہا۔ ڈائجسٹ ادب کے قاتل ہیں۔" وہ بجھے بجھے انداز میں بتانے لگی۔

"تو؟" تزئین نے بھنویں اچکائیں۔

"تو یہ کہ وہ مجھے اس راستے پہ چلنے کا مشورہ نہیں دیں گے باقی میری مرضی۔"

"اب تم کیا چاہ رہی ہو؟" تزئین سنجیدگی سے اس کی طرف گھومی۔

"میں کیا کروں میری تو سمجھ نہیں آرہا۔ ابھی میری مدیرہ صاحبہ سے بات ہوئی انہوں نے بہت حوصلہ افزائی کی اور جلد ہی میری اگلی تحریر کے لیے بھی اصرار کر رہی تھیں۔" وہ کنفیوز سی کہتی جارہی تھی۔

"دیکھو صنم! ہر شخص اپنی سوچ میں آزاد ہے۔ کوئی کیا سوچتا ہے تمہارے لیے وہ اہم نہیں ہے۔ تمہاری اپنی رائے تمہارے لیے زیادہ مقدم ہونی چاہیے۔ اللہ پاک نے ہر انسان کو الگ الگ سوچنے سمجھنے اور سیکھنے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ تم اپنی عقل استعمال کرو اور خود صحیح غلط کا فیصلہ کرو تاکہ تم کسی دوسرے کی رہنمائی اور مشورے پر آنکھ بند کر کے چل پڑو۔" تزئین رسان سے کہہ رہی تھی۔ صنم اس کی بات سنتی سوچ میں گم تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دھیرے سے مسکرائی جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئی ہو۔

"میں نے کہیں ایک بات پڑھی تھی تزئین۔" وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

"کہ! روشنی سے استفادہ کرو یہ مت دیکھو کہ مشعل کس کے ہاتھ میں ہے۔ ابھی اتنی دیر سے رہ رہ کر یہ جملہ میرے ذہن میں منعکس ہو رہا تھا۔ میں تو ابھی طفل مکتب ہوں مجھے قطعی نہیں معلوم کہ ادب کیا ہے اور بے ادبی کیا ہے لیکن اتنا شعور بہرحال رکھتی ہوں کہ اچھے' برے اور صحیح غلط میں تمیز کر سکوں اور ڈائجسٹ کے بارے میں میری رائے یہی ہے کہ بالفرض اگر مان بھی لیں کہ یہ ادب نہیں ہے پھر بھی یہ بات تو طے ہے کہ آج کل کے الیکٹرانک میڈیا کے دور میں اردو زبان کی ترویج و ترقی میں کہیں نہ کہیں ڈائجسٹ بھی اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

ایک معیاری ڈائجسٹ کا ادب کے قتل میں ہاتھ ہو یا نہ ہو لیکن معاشرتی اصلاح میں اس کا ہاتھ ضرور ہے۔"

صنم کے لہجے سے عزم جھانک رہا تھا۔ وہ واقعی نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے بڑے پیار سے قلم تھاما تھا اور اب اس نے اپنے قلم کو روانی سے چلنے کے اطوار سکھانے تھے اپنے قلم کے سہارے اپنے خوابوں کو تعبیر دینی تھی۔ اس نے گزرتے دنوں میں قلم چلانے کا ڈھنگ سیکھ لینا تھا۔ تزئین نے دل ہی دل میں اس کے عزم عالیشان کی سلامتی کی دعا مانگی۔

☼ ☼ ☼

فیروزی رنگ کی پلین شیفون جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس اس کا نازک سراپا اور نفاست سے کیا گیا میک اپ اس کی شخصیت کو خاصا باوقار بنا رہے تھے۔ اس کے لمبے بال پشت پہ بہہ رہے تھے جنہیں اس نے ایک فینسی کیچو سے مقید کر رکھا تھا۔ رخساروں کو چھوتی بالوں کی لٹ ہواؤں کی چھیڑ چھاڑ سے بل کھائے جارہی تھی۔ اس کے گلابی لبوں پر مدھر سی مسکان اور آنکھوں میں جگر جگر کرتے جگنو اس کے شاداب دل کا حال بیان کر رہے تھے۔ کلائیوں میں بیلے کے کنگن اس نے آج بھی پہن رکھے تھے جو ہالار نے یہاں آتے ہوئے بطور خاص اسے پہنائے تھے۔ اس نے نظریں موڑ کر برابر میں براجمان ہالار کو دیکھا۔ پتا نہیں کتنا وقت بیت گیا۔ اس نے انگلیوں کی پوروں پہ گننا شروع کیا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں ختم ہو گئیں اور اس کی گنتی بھی پانچ..... پورے پانچ سال بیت گئے۔ وہ گہری سانس بھرتی سر جھکائے مسکرائی۔

گزرے دنوں میں اس کے زور قلم اور اصلاحی و شستہ انداز تحریر نے قارئین میں بے پناہ مقبولیت پائی۔ وہ باقاعدہ مستند مصنفہ کا درجہ حاصل کر چکی تھی اس کے کئی ناولز معیاری ڈائجسٹوں میں سلسلے وار شائع ہونے کے بعد کتابی شکل بھی اختیار کر چکے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کتنی کامیاب ہوئی یہ بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

تین سال قبل ہالار اس کی زندگی میں باضابطہ طور پر پورے طمطراق و استحقاق کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک آئیڈیل اور محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اس نے کبھی صنم کی قلمی مصروفیات پر پابندی عائد نہیں کی تھی۔ اس طرف سے اس کا رویہ ایک عجیب سی لاتعلقی کی لپیٹ میں تھا۔ اس نے کبھی صنم کی تحاریر زیر مطالعہ لانے کی کوشش نہیں کی تھی نہ ہی کبھی صنم کی کسی طرح کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ صنم نے بھی پہلی مرتبہ کے بعد کبھی ہالار سے اپنی کسی تصنیف کا تذکرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔

دو سال قبل صنم ایک خوب صورت ننھی پری کی ماں کے عہدے پر فائز ہو چکی تھی۔ لیکن مصروفیات اور ذمہ داریوں کی زیادتی کے باوجود اس کے قلم کی روانی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ گزشتہ سال اس کا ایک ناول خواص و عوام میں مقبولیت پانے کے بعد ڈرامائی شکل میں ٹیلیویژن پر نشر کیا گیا تھا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ آج وہ اس بقعہ نور بنے لان کی جگمگاتی روشنیوں میں جگ مگ کرتی آنکھوں کے ساتھ اسٹیج کو نظروں کی گرفت میں لیے بیٹھی تھی۔ جہاں تھوڑی دیر بعد اسے بہترین مصنفہ ہونے کے اعزاز و ایوارڈ سے نوازنے کے لیے خوش آمدید کہا جارہا تھا۔

تالیوں کی گونج میں اس نے ہالار کی سمت دیکھا وہ مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس دن پہلی مرتبہ قلمی حوالے سے صنم نے ہالار کی آنکھوں میں اپنے لیے تفاخر کی جھلک دیکھی اور شادمان ہو گئی۔

☼ ☼

صبا سحر

مکمل ناول

"شش۔۔۔ ندو!۔۔۔ او ندو کی بچی۔"

سعد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دبی دبی آواز سے نادیہ کو پکارا' جو دو تین گز کے فاصلے پر اس کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔ فاصلہ اتنا نہ تھا کہ سعد کی آواز اس تک نہ پہنچ پاتی مگر وہ جان بوجھ کر انجان بنی بیٹھی رہی۔

"سن نا۔۔۔ بہری چڑیل۔" اب کے سعد نے کھسیا کر اسے آواز دی۔

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

آم کی خالی پیٹی کو لمبائی پر کھڑا کر کے 'اس پر ایڑھی اونچی کیے 'ایک پاؤں سے مزید کھڑے رہنا سعد کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

"سن لے نا' ندو پیاری!" وہ بہت زچ ہو کر بولا۔

سعد کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ لکڑی کے چند پتلے پتلے پھٹوں پر مشتمل یہ پیٹی اس کا بوجھ مزید سہار نہیں سکتی۔ ذہن میں گزشتہ روز کا منظر بھی گھوم گیا تھا۔

شاید اب نادیہ کے کان پر جوں رینگ جاتی مگر ٹھیک اسی لمحہ اس نازک سی لکڑی کی پیٹی نے سعد کے چھیاسٹھ کلو کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا اور زمین بوس ہو گئی۔ ساتھ ہی سعد کو بھی فرش چومنے پر مجبور کر گئی۔

ہلکے سے شور کے ساتھ سعد کی چیخ نادیہ کے کانوں تک پہنچی تو وہ کتاب پھینک کر فوراً" دیوار کی طرف لپکی مگر اسی وقت سیڑھیوں سے رضیہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

"نادیہ! فارغ ہو گئی ہو تو نیچے آ جاؤ۔ تمہارے ابو آ گئے ہیں چائے بنا دو۔"

اور نادیہ 'سعد کی مزاج پرسی کی حسرت لیے ان کے پیچھے چل پڑی کیونکہ اگر انہوں نے نادیہ کو سیدھے ہاتھ کی دیوار کے ایک فٹ کے قریب بھی دیکھ لیا ہوتا تو کل کی طرح پھر ایک دنگل شروع ہو جاتا۔

ادھر سعد چاروں شانے چت ابھی تک دیوار کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ شاید اب اس حادثے پر ہی وہ سنگ دل محبوبہ جھانک لے مگر۔۔۔

"پتا نہیں کس بات کا رزلٹ لے رہی ہے۔ دو دفعہ زخمی ہو چکا ہوں اس کے چکر میں اور اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ ہونہہ سنگ دل۔۔۔! بے حس کہیں کی۔ بیچ کر کے بھی خیریت نہیں پوچھ سکتی۔ پتا نہیں کس بات کے نخرے ہیں۔ ڈرپوک 'ظالم 'بدتمیز۔۔۔"

سعد نے غصے میں نادیہ کو کئی القاب سے نواز دیا۔ پھر خود ہی کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ سیڑھیاں اترتے اترتے پھر ایک دفعہ نظر دیوار پر ڈالی کہ شاید اب رحم آ گیا ہو۔ مگر خالی دیوار اس کے منہ چڑا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سعد لڑکھڑاتا ہوا نیچے آیا تو صائمہ کی نظر پڑ گئی۔ بکھرے ہوئے بال 'کالی ٹی شرٹ پر مٹی لگی ہوئی' چھلی ہوئی کہنیاں۔۔۔ اسے ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ تیزی سے سعد کے پاس آئی۔ وہ سمجھا 'شاید بہن ہمدردی کرے گی مگر وہ آتے ہی بولی۔

"جلدی سے اپنا حلیہ درست کر کے اماں کے پاس آجاؤ۔ میں چائے رکھ چکی ہوں۔ انہوں نے تمہیں اس طرح دیکھ لیا تو چوتھی جنگ عظیم شروع ہو جائے گی۔"

"تیسری۔" سعد نے کراہتے ہوئے تصحیح کی۔

"تیسری کل ہو چکی ہے' آج چوتھی ہو گی۔ اگر تم نے اپنا حلیہ درست نہ کیا تو۔" اس نے کہا اور ساتھ ہی اسے غسل خانے کی طرف دھکیل بھی دیا۔

کپڑے جھاڑ کر' منہ دھو کر' بال بنا کر وہ نفیسہ بیگم کے پاس تخت پر آ بیٹھا۔ اس کو دیکھ کر انہوں نے صائمہ کو آواز دی۔

"سعد کو ڈبل روٹی بھی لا دے چائے کے ساتھ۔ ساگو دانہ سے کیا پیٹ بھرا ہو گا دوپہر کو۔" نفیسہ بیگم کو اپنے بیٹے کی کل حادثے میں زخمی ہو جانے والی زبان کا خیال آیا۔

صائمہ نے ڈبل روٹی لا کر رکھی تو سعد بولا۔ "مکھن بھی لگا دو اس پر۔"

"بھائی! میرا تو خیال ہے' مکھن کی جگہ آئی اوڈیکس لگا لو' زیادہ فائدہ رہے گا۔" صائمہ نے اس کے مسلسل دو دن سے زخمی ہونے پر فقرہ کسا۔ سعد گھور کر رہ گیا۔ البتہ رئیسہ بیگم ناسمجھی سے بولیں۔

"باؤلی ہوئی ہے کیا۔ آئی اوڈیکس کھانے کی چیز نہیں ہے۔ جا جا کر مکھن بھی لا دے۔" صائمہ ہنستی ہوئی اٹھ گئی۔

رئیسہ بیگم چائے پی چکیں تو صائمہ کہنے لگی۔

"اماں! آپ نے حسینہ خالہ کے ہاں جانا تھا نا!" اسے سعد سے آج کے واقعے کی تفصیل سننا تھی اس لیے اس نے رئیسہ بیگم کو بہانے سے بھیجنا چاہا۔

"ہاں ہاں' یاد آیا۔ اس کے دیور کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا' تعزیت کرنا ہے۔"

"اماں عیادت۔" صائمہ نے درست کیا۔

"ارے ہاں وہی۔" رئیسہ بیگم نے چادر سنبھالی اور دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے جاتے ہی صائمہ' سعد کے قریب آگئی۔

"ہاں بھیا! اب سناؤ آج کی لو اسٹوری۔"

سعد بھرا بیٹھا تھا فوراً" شروع ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

نصیر الدین (سعد کے ابا) کے گوٹھ سے آم کی چھ پیٹیاں آئی تھیں۔ رئیسہ بیگم نے سارے محلے میں آم بانٹے مگر بالکل پڑوس میں ایک دیوار کی دوری پر رہنے والی اپنی سگی بہن انیسہ بیگم کو خوشبو بھی نہ سونگھائی۔ انیسہ بیگم کو بھی پروا کب تھی۔ انہیں تو مرزا غالب بھی اسی لیے ناپسند تھے کہ انہیں آم پسند تھے۔ سو انہوں نے اپنی بڑی بہن کی بے اعتنائی کی ذرا پروا نہ کی مگر۔۔۔ نادیہ کو کھلائے بغیر سعد سے آم نہیں کھائے جا رہے تھے۔ اسی لیے وہ کل رئیسہ بیگم سے نظر بچا کر بڑے بڑے چار لنگڑے آم لے کر چھت پر چلا گیا۔

رئیسہ بیگم' سعد کی اپنی خالہ کے گھر جھانکا تانکی سے واقف تھیں' اس لیے انہوں نے چھت پر سے ہر وہ چیز ہٹا دی تھی' جس پر چڑھ کر سعد دیوار کی دوسری طرف جھانک سکے۔ پہلے دونوں گھروں کی چھتوں کی درمیانی دیوار چھوٹی سی تھی۔ با آسانی پھلانگ کر ایک دوسرے کے گھر آیا جا سکتا تھا مگر جب سے رئیسہ بیگم اور انیسہ بیگم کے درمیان پانی پت کی جنگ ہوئی تھی ایک دوسرے کے گھر آمد جامد بالکل ختم ہو گئی۔ حتیٰ کہ بات چیت بھی ختم ہو گئی مگر جب رئیسہ بیگم نے دیکھا کہ سعد نے بغاوت کی ہوئی ہے اور وہ باقاعدگی سے خالہ کے گھر براستہ چھت جاتا رہتا ہے تو انہوں نے دونوں گھروں کے بیچ دیوار بلند کر دی اور چھت پر سے ہر قسم کا سامان ہٹا دیا۔

جس سے انہیں خدشہ تھا کہ سعد اسے بطور سیڑھی استعمال کر سکتا ہے۔ مزید یہ بھی کہ سعد پر کڑی نظر رکھی جانے لگی کہ وہ نیچے سے امدادی سامان نہ لے جائے۔

سعد کو سیڑھیوں کے آس پاس منڈلاتے دیکھ کر

رئیسہ بیگم چوکنا ہو جاتیں تو سعد اماں کی کڑی نظروں کی وجہ سے ادھر ادھر ہو جاتا۔

کل جب سعد نے دیکھا کہ رئیسہ بیگم کپڑے سینے میں مصروف ہیں تو وہ چھت پر جانے کے لیے پر تولنے لگا۔ وہ نیچے بیٹھا حساب لگا رہا تھا۔ سات فٹ اونچی دیوار ہے' چھ فٹ اس کا قد۔۔۔ تو ایسی کوئی چیز ملے جو کم از کم ایک فٹ اونچی ہو' باقی تھوڑا ایڑی اونچی کر کے کام چلا لیا جائے گا' سو وہ کمرے میں نظروں ہی نظروں میں ایک فٹ لمبی کوئی چیز تلاش کر رہا تھا۔ اس کی نظر سلائی مشین کے ٹین کے کور پر ٹھہر گئی وہ سوچنے لگا' یہی ایک چیز ہے جس کی غیر موجودگی اماں کو محسوس نہیں ہو گی کیونکہ فی الحال وہ کپڑے سینے میں مصروف ہیں اور شام تک ان کے فارغ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ سلائی سے فارغ ہو کر ہی اس طرف دھیان دیں گی اور تب تک سعد اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر چکا ہو گا۔ ورنہ رئیسہ بیگم اس کی حرکتوں کی وجہ سے ہر اس چیز پر نظر رکھنے لگی تھیں' جو اس کو جھانکا تانکی میں مدد دیتی۔

سعد غیر محسوس طریقے سے رئیسہ بیگم کے پیچھے گیا۔ غور سے اماں کو دیکھا۔ اطمینان ہوا کہ ان کا مکمل دھیان اپنی سلائی کی طرف ہے تو آہستگی سے کور اٹھایا اور فوراً" ہاتھ آگے لا کر اپنے سینے کے سامنے رکھ لیا تاکہ پیچھے سے دیکھنے پر کور نظر نہ آسکے اور سعد کے چوڑے شانوں کی وجہ سے کور واقعی پیچھے سے نظر نہ آ سکا۔ کمرے سے آہستگی سے نکلا مگر اس کے بعد تیزی سے چھت پر چڑھ گیا۔

انیسہ بیگم کی دیوار سے ملا کر اس نے لمبائی پر کور رکھا اور احتیاط سے اس پر پاؤں رکھ کر اوپر کو اٹھا۔ ٹین کے کور نے سعد کے وزن پر تھوڑا سا احتجاج کیا اور ہلنے لگا۔ سعد نے پروا نہ کی۔ اب وہ انیسہ خالہ کی چھت پر جھانک رہا تھا۔ اس نے دیوار پر ہاتھ جما کر منڈیر پر ٹھوڑی رکھ دی تھی۔ وہ بس اتنا ہی اونچا ہو سکتا تھا اس نے اسی کو غنیمت جانا اور نادیہ کو آواز دی۔

"ندو! دیکھ، تیرے لیے آم لایا ہوں۔ ایمان سے اتنے دن ہوگئے ہیں۔ میں نے کھائے نہیں ابھی تک۔" سعد کو بولتے ہوئے پریشانی ہو رہی تھی۔

نادیہ دن بھر کے اپنے تمام کاموں سے فارغ ہو کر چھت پر اس وقت اپنی کتابیں لیے بیٹھی تھی۔ وہ پرائیویٹ بی اے کر رہی تھی۔ سعد کو اس کی یہ ٹائمنگ معلوم تھی۔ وہ ہمیشہ اسی وقت چھت پر آتا تھا۔ مگر پہلے اس کے چھت پر جانے اور اپنی کزن سے بات کرنے پر بین نہیں لگا تھا۔

"سعد! تمہیں کتنی بار منع کیا ہے۔ مت آیا کرو اس طرح خالہ بی ناراض ہوتی ہیں تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔" نادیہ نے اسے سمجھایا۔

"آم لایا ہوں تمہارے لیے۔ اس میں غلط کیا ہے۔" وہ تھوڑا سا خفا ہو کر بولا۔

"جس طرح تم آم لائے ہو، وہ غلط ہے۔" نادیہ نے پھر سمجھانا چاہا۔

"ہاں تو پھر اور کیسے لاتا۔ اماں نے بھجوائے نہیں تو ـــــ" نادیہ نے اس کی بات کاٹی۔

"یہی تو کہہ رہی ہوں کہ جب خالہ بی ہی نہیں چاہتیں تو تم ـــــ" اب کے سعد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اماں کا معاملہ اماں جانیں۔ میرا دل نہیں مانتا تو میں کیا کروں؟ مجھے نہیں پتا بس ـــــ جب تک تو نہیں کھائے گی، میں بھی نہیں کھاؤں گا۔"

"دیکھو سعد ـــــ"

"اللہ!!!" سعد کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس کی کمر پر رئیسہ بیگم کی جوتی پڑی تھی۔

"سعد!" نادیہ نے پریشان ہو کر پکارا۔ وہ تڑپ اٹھی، جب اس نے دیکھا، سعد کی ٹھوڑی زور سے منڈیر پر لگی ہے۔ یقیناً "اس کے دانت اور زبان پر چوٹ لگی ہو گی اور واقعی ایسا ہوا تھا۔ ربڑ کی جوتی اس کی کمر پر کسی بید کی طرح پڑی۔ وہ ہلا تو غیر متوازن ہو گیا اور گرتے گرتے اس کی ٹھوڑی زور سے منڈیر سے ٹکرا گئی۔ وہ نیچے گر گیا۔ نادیہ نے جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ جانتی تھی کہ دوسری طرف خالہ بی کڑے تیوروں کے ساتھ کھڑی ہوں گی۔ تعلقات ویسے ہی اچھے نہیں ہیں مزید خراب ہو جائیں گے۔ سو، دل مسوس کر وہیں دیوار کے ساتھ لگ گئی۔

"ناہنجار! باز نہیں آئے گا تو اپنی حرکتوں سے خالہ سے محبتیں دکھا کر کیا ثابت کرنا چاہتا ہے کہ تو بڑا ہمدرد اور چاہنے والا ہے ان کا اور ہم ظالم، دشمن ـــــ اور وہ ـــــ میرے بیٹے پر شفقتیں نچھاور کر کے مجھ سے میری اولاد کو بدظن کرنا چاہتی ہے ـــــ اور تو اس کی چالاکیوں کو محبت سمجھتا ہے ـــــ"

رئیسہ بیگم پتا نہیں کیسے، اپنی سلائی چھوڑ کر اوپر پہنچ گئیں اور سعد کو اتنی پابندیوں کے باوجود اپنی خالہ کے گھر جھانکتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ سرتاپا سلگ گئیں۔

ادھر سعد اپنے منہ پر ہاتھ رکھے گھٹنوں کے بل بیٹھا رہا۔ رئیسہ بیگم بول بول کر ہلکان ہو گئیں مگر سعد بغیر کوئی جواب دیے یونہی بیٹھا رہا تو متفکر ہو کر اس کی طرف بڑھیں۔ سعد نے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا تو خون نکل رہا تھا۔ ٹھوڑی پر لگنے سے اس کی زبان دانتوں تلے آ کر کچل گئی تھی۔ زبان تھوڑی سی پھٹ گئی تھی اب اس میں سے خون نکل رہا تھا۔ رئیسہ بیگم اسے نیچے لے آئیں۔ کلی وغیرہ کروائی اور ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ سعد کے چوٹ لگنے سے ان کی مزید خفگی ختم ہو گئی تھی ورنہ ہفتہ بھر اسے گاہے بگاہے ڈانٹ پڑتی رہتی ـــــ مگر سعد پھر بھی باز نہ آیا۔

گھر میں سب کا خیال تھا کہ اب سعد ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ رئیسہ بیگم بھی مطمئن تھیں اور سعد نے ان کے اسی اطمینان کا فائدہ اٹھایا اور زخمی زبان کے ساتھ دوسرے دن پھر چھت پر پہنچ گیا۔

اب کی بار اس نے آم کی خالی ہو جانے والی پیٹی استعمال کی جس کی طرف ان کا کبھی دھیان جا ہی نہیں سکتا تھا اور انہوں نے خود ہی چھت پر رکھوائی ہوئی تھی۔

رئیسہ بیگم کا گھر گلی کے دوسرے گھروں کی نسبت تھوڑا اونچا بنا ہوا تھا۔ اس حساب سے دونوں گھروں کی چھتوں کی درمیانی دیوار کی لمبائی سعد کے لیے زیادہ اور نادیہ کے لیے کم تھی اور پھر اسے یہ بھی سہولت حاصل تھی کہ چھت پر سیڑھی کے علاوہ بے شمار ایسی مضبوط چیزیں بھی موجود تھیں، جن پر چڑھ کر وہ باآسانی سعد کی چھت پر جھانک سکتی تھی اور پھر اس پر اس کے امی ابو کی طرف سے کوئی پابندی بھی نہیں تھی مگر وہ خالہ کی ناراضی کی وجہ سے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کرتی تھی، ہرچند کہ سعد بہت اصرار کرتا تھا۔ اس بات کا اطمینان رئیسہ بیگم کو بھی تھا کہ ان کی بھانجی اچھی خاصی سمجھ دار اور سنجیدہ لڑکی ہے۔ ان کے سعد کی طرح چلبلی نہیں ہے۔ نادیہ، سعد کو منع کرتی تھی کہ اس طرح کی حرکتیں نہ کیا کرے، مگر وہ باز نہ آتا۔

آج بھی وہ خالہ بی کی ناراضی کے ڈر کی وجہ سے منہ موڑے بیٹھی رہی کہ کہیں خالہ آج پھر نہ آجائیں۔ اب تک تو انہیں نادیہ سے کوئی شکایت نہ تھی مگر اس کا خیال تھا کہ اگر سعد کی یہی حرکتیں رہیں تو اب وہ ضرور شاکی ہو جائیں گی مگر آج خالہ بی تو نہیں آئیں پر سعد خود ہی۔

"نادیہ کی قسمت میں ہی نہیں ہیں آم۔" سعد نے دوسری مرتبہ ناکامی پر سوچا پھر خود ہی چیخا "نہیں ـــــ" اور پھر ـــــ

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم خالہ جان!" سعد نے نہایت ادب سے انیسہ بیگم کو سلام کیا۔

بھانجے کو کافی عرصہ بعد دیکھ کر انیسہ بیگم خوش ہو گئیں مگر نادیہ شدید حیرانی سے اسے اپنے ہی گھر کی چھت کی سیڑھیاں اتر کر صحن میں آتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر ایک لحظہ کو مین گیٹ پر پڑی جو اندر سے بند تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسا ہے میرا بیٹا۔" خالہ پیار سے بولیں۔ چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف انیسہ بیگم کی پشت تھی اس لیے وہ دیکھ نہ سکیں کہ سعد کہاں سے نازل ہوا ہے مگر نادیہ جو ابھی ابھی کچن سے چائے لے کر نکلی تھی، اسے دیکھ چکی تھی۔ سعد کی ضدی طبیعت اور اپنے لیے اس کے جذبات سے تو وہ خود بھی اچھی طرح واقف تھی۔

"بیٹا! آپا بی ناراض ہوں گی، اگر انہوں نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو۔"

"ارے نہیں خالہ جان! آپ بے فکر رہیے۔" اس نے لاڈ سے اپنی خالہ کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"اماں کو پتا نہیں چلے گا کہ میں یہاں آیا تھا کیونکہ میں جس طرح آیا ہوں، اسی طرح واپس جاؤں گا۔"

"تو تم کس طرح آئے ہو؟" انیسہ بیگم نے تعجب سے پوچھا۔

"ارے خالہ جان! چھوڑیے آپ آم کھائیے، پیڑ مت ـــــ ارے! آم سے یاد آیا۔ آم لایا ہوں نا! سچ مچ آم کھائیے۔" اسے آموں کا تھیلا یاد آیا، جو اس نے آخری سیڑھی کے پاس رکھ دیا تھا۔ اٹھا کر لایا اور تخت کے پاس میز پر رکھ دیا۔ انیسہ بیگم کو اگرچہ آم سخت ناپسند تھے مگر بھانجے کے خلوص پر بے حد خوش ہوئیں۔

"نادیہ! یہ لو' دھو کرلے آؤ۔" انہوں نے نادیہ کو آواز دی' جو اب تک وہیں کھڑی خاموشی سے سب ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اس نے آم پکڑ لیے۔ کچن سے دھو کر پلیٹ اور چھری کے ساتھ لے کر آئی تو انیسہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"عصر پڑھ لوں ذرا۔"

"خالہ! آم تو کھاتی جائیے۔ غالب کو بھی بہت پسند تھے آم' آپ کی طرح۔" اسے پتا تھا کہ انیسہ بیگم کو آم بالکل پسند نہیں ہیں۔

"اے ہٹو' غالب.... ہونہہ! انہیں تو بس دو ہی کام آتے تھے۔ آم کھالیں یا شعر کہہ لیں۔" انیسہ بیگم جاتے جاتے بڑبڑائیں۔

"نہیں خالہ! انہیں مراسلہ بھی خوب لکھنا آتا تھا۔" سعد نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

نادیہ کو معلوم تھا کہ سعد کو مرزا غالب بہت پسند ہیں اور اسی لیے وہ بہت شوق سے آم کھاتا تھا کہ غالب بھی بہت شوق سے آم کھاتے تھے۔ مگر صرف اس کی وجہ سے سعد نے اب تک آم نہیں کھائے تھے۔

خالہ عصر پڑھنے چلی گئیں۔ خالو ابھی دکان سے واپس نہیں آئے تھے اور معیز تو ابھی ابھی چائے پی کر ٹیوشن گیا تھا سو سعد کے پاس بہت اچھا ٹائم تھا کہ وہ نادیہ سے پچھلے دو دنوں کے بدلے لے سکے۔

"بیٹھو اور کھاؤ۔" اس نے آم کی طرف اشارہ کیا۔

"پہلے بتاؤ' تم آئے کس طرح ہو؟" نادیہ نے فوراً سوال کیا۔ اسے رہ رہ کر خالہ بی کے غصے کا خیال آ رہا تھا۔

"بتاتا ہوں؟ بیٹھو تو سہی۔" سعد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے تخت پر بٹھایا۔ وہ بیٹھ گئی تو پلیٹ قریب کر کے کہنے لگا۔

"اب کاٹو۔" اسے آم کھانے کی بھی جلدی تھی اور نادیہ سے خوب ساری باتیں کرنے کی بھی جبکہ نادیہ کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگے گا اور خالہ بی' سعد کی یہاں موجودگی پر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں گی مگر سعد کی طبیعت سے بھی آگاہ تھی کہ اتنی آسانی سے بتائے گا نہیں' سو پلیٹ کھسکائی اور آم کاٹنے لگی۔

"ظفر ہے نا! وہ جو پچھلی گلی میں رہتا ہے۔" اس نے دوست کا نام لیا۔

"ہاں۔" نادیہ سننے لگی۔

"اس کے برابر والوں کا گھر بن رہا ہے ڈبل اسٹوری.... میں ظفر کے ساتھ ان کی چھت پر گیا۔ ان کی چھت سے تمہارے برابر والوں کی چھت پر.... پھر اپنی پیاری خالہ کی چھت پر.... تھرو پراپر چینل۔" سعد نے نہایت آرام سے اپنی کارروائی بتائی۔

"اور جو خالہ بی کو پتا چل گیا تو....؟" اس کا ڈر ختم نہیں ہو رہا تھا۔

"کیسے پتا چلے گا؟ میری واپسی بھی اسی شان و شوکت سے ہوگی جیسی آمد ہوئی تھی۔" وہ اپنے کارنامے پر خوش ہو رہا تھا۔ نادیہ نے پلیٹ اس کی طرف کھسکائی۔ سعد نے ایک پھانک اٹھائی اور نادیہ کی طرف بڑھائی۔ اس نے ہاتھ میں لینا چاہا تو سعد نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"اوں ہوں.... میرے ہاتھ سے۔"

نادیہ نے ایک نظر انیسہ بیگم کے کمرے کی طرف ڈالی' مبادا وہ آ نہ رہی ہوں' پھر اس کے ہاتھ سے کھا لیا۔ سعد کے چہرے پر نادیہ سے زیادہ رنگ بکھر گئے۔ باقی کا ٹکڑا اس نے اپنے منہ میں ڈال لیا۔

"امم م.... ندو کی بچی! ظالم! تیری وجہ سے پورے چھ دن بعد آم کھا رہا ہوں۔" سعد نے مزے سے کھاتے ہوئے کہا۔ اسے آم کھانے کی بے حد خوشی ہو رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ نادیہ کو اپنے ہاتھوں سے کھلانے کی۔ نادیہ کے لیے بھی یہ احساس بہت خوشگوار تھا کہ سعد اس کے لیے اتنا سنجیدہ اور مخلص ہے۔

"چائے لاؤں؟" اسے جھوم جھوم کر آم کھاتے دیکھ کر نادیہ نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟" سعد بہت شوق سے چائے پیتا تھا' اب جو انکار ہوا تو اسے بڑی حیرانی ہوئی۔

سعد نے گٹھلی چوستے ہوئے جواب دیا۔

"تیری مہربانیوں سے مسلسل دو دن سے شدید زخمی ہو رہا ہوں۔ زبان زخمی ہے۔ تیز اور گرم بالکل کھایا نہیں جا رہا۔ ساگودانہ' میٹھا دلیہ اور دودھ ڈبل روٹیوں پر گزارہ کر رہا ہوں۔ آم بھی نہیں کھا رہا تھا' ورنہ اسی سے تھوڑی توانائی مل جاتی۔ بہت کمزوری ہو رہی ہے بچ۔"

اس نے چہرے پر مصنوعی نقاہت کے اثرات سجاتے ہوئے کہا' پھر گٹھلی پھینک کر بولا۔

"پر تیرے تو نخرے ہی نہیں ختم ہو رہے تھے۔ آج اگر بروقت مجھے ظفر کا خیال نہ آجاتا تو زخمی ہونے کی ہیٹ ٹرک ہو جاتی۔" سعد نے دوسرا آم شروع کیا۔

"سعد! سچ تمہیں دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ تم یونیورسٹی میں پڑھتے ہو۔" نادیہ نے اس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر اپنی بات کر دی۔

"کیوں' کیا ہوا ہے تجھے؟"

"تو تڑاق کیوں کرتے ہو؟ ندو کیوں بولتے ہو؟ پتا ہے نا' امی ابو کو نام بگاڑنا کس قدر ناپسند ہے اور مجھے بھی۔"

سعد کو خیال آیا' وہ اس کے ندو پکارنے پر خوب چڑتی تھی۔ مگر اسے اچھا لگتا تھا اور جب وہ اس کی کسی بات پر چڑ جاتی تو اس وقت اسے جلانے کے لیے خاص طور پر کہتا تھا۔

"پیار سے کہتا ہوں۔" وہ پیار سے بولا۔

"پتا ہے مجھے۔ مگر نام بگاڑنا بہت غلط بات ہے۔ اس سے شخصیت پر اچھے اثرات نہیں پڑتے۔" نادیہ نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اچھا۔" دوسری گٹھلی اٹھاتے ہوئے لاپروائی سے بولا۔

"اور تو کیوں کہتے ہو؟ تم کہا کرو نا۔"

"اب میں تیرے ساتھ بھی غیروں کی طرح بات کروں؟ تو میں تو اپنائیت ہوتی ہے۔ محبت ہوتی ہے۔"

"تو میں بدتمیزی ہوتی ہے۔ اپنائیت اور محبت اسی چیز میں نظر آتی ہے تمہیں؟"

"تجھے تو میری کسی بات میں محبت نظر نہیں آتی۔" سعد تڑپ کر بولا۔

"یونیورسٹی میں تیرے کہنے سے داخلہ لیا' تجھے نظر آئی محبت؟ اماں اور خالہ کی شدید لڑائی کے باوجود تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں' تجھے نظر آئی محبت؟ تیرے پیچھے دو دن سے لفنگوں کی طرح حرکتیں کر رہا ہوں۔ آج بھی کس طرح آیا ہوں' پتا ہے تجھے.... تجھے تو میرے کسی کام میں' کسی بات میں محبت نظر نہیں آتی۔ ہاں! اعتراض خوب ہوتے ہیں۔"

شہد جیسا آم کھانے کے باوجود سعد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ اس نے گٹھلی پھینک دی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" سعد کے آم چھوڑ دینے پر نادیہ شرمندگی سے بولی۔

"بس رہنے دے اپنا مطلب۔" وہ ناراض ہو گیا۔

"مسٹر سعد! اگر مجھے آپ کے کسی فعل سے محبت محسوس نہ ہوتی تو آپ کی محبت کا جواب میں کبھی محبت سے نہ دیتی۔" نادیہ نے اس کے خوامخواہ ناراض ہو جانے پر خود بھی خفا ہو کر کہا۔

"اوہ! کب دیا ہے آپ نے محبت کا جواب محبت سے؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ اس کے طنزیہ انداز میں آپ کہنے پر نادیہ ہنس پڑی دل میں سوچنے لگی کہ اس کے منہ سے آپ جچتا ہی نہیں۔ تو ہی ٹھیک ہے۔ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"پہلے یہ تو بتائیے' آپ کے کس فعل کو محبت سمجھوں؟ اس بات کو کہ اتنے جتن کر کے میرے لیے آم لائے ہیں....؟"

"تو یہ کافی نہیں ہے کیا؟" سعد کو اپنی تمام جدوجہد یاد آئی۔

"جی اور تب ہی اتنا سا کھلا کر اتنے بڑے بڑے دو آم خود کھا لیے' مجھے باتوں میں لگا کر۔" نادیہ نے پلیٹ کی طرف اشارہ کیا' جس میں اب چھلکے اور گٹھلیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سعد کے چہرے پر شرمندہ سی مسکراہٹ آگئی۔ ابھی وہ کچھ اور کہتا کہ انیسہ بیگم آ گئیں۔ ان کی آمد پر سعد کو اندازہ ہوا کہ کافی دیر ہو گئی

ہے۔

"چلتا ہوں خالہ جان۔" سعد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا جاؤ، ورنہ آبائی مسجد میں تمہاری گمشدگی کا اعلان کروا دیں گی اور اگر تم ہمارے گھر سے برآمد ہوگئے تو بغیر کیس چلائے، گولی مار دیں گی ہمیں۔" انیسہ بیگم نے ملکی حالات سے مشابہ اپنے گھریلو حالات پر اخباری زبان میں تبصرہ کیا، نادیہ اور سعد مسکرانے لگے۔

سعد کو سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھ کر انیسہ بیگم نے چونک کر استفسار کیا۔

"یہاں کہاں جارہے ہو؟"

"خالہ جان! وہ..... میں۔" سعد سر کھجانے لگا۔ نادیہ ہنس پڑی۔

"امی! دروازے سے آسکتا تھا بھلا؟" انیسہ بیگم سرہلانے لگیں۔

"اوپر تک تو ساتھ چل۔" سعد نے اوپر جانے کو قدم بڑھائے مگر نادیہ کو وہیں جمے دیکھا۔ تو کہا۔

"نہ بابا! سامنے والی زبیدہ خالہ نے دیکھ لیا تو فوراً خالہ بیگم کو بتادیں گی اور پھر وہ ہوجائے گا، جواب تک نہیں ہوا۔" نادیہ نے اگلے متوقع لمحوں کا نقشہ کھینچا۔

"صرف زبیدہ خالہ کے خیال سے کہہ رہی ہو نا؟" سعد نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ہاں تو ان کے علاوہ محلے میں اور کون ہے فسادی۔" نادیہ نے ان کی لگائی بجھائی والی عادت سے خائف ہو کر سعد کو جواب دیا۔

"تو محترمہ! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ زبیدہ خالہ اپنے بھتیجے کی شادی میں حیدر آباد گئی ہوئی ہیں اور اس وقت گھر میں صرف حمید خالو ہیں۔"

"پوری تیاری سے آئے ہو۔" نادیہ نے اس کی معلومات پر کہا۔ سعد مسکرا دیا، پھر انیسہ بیگم کی طرف دیکھا ان کی توجہ بٹی ہوئی پائی تو ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

رئیسہ بیگم اور انیسہ بیگم سگی بہنیں تھیں۔ کوئی بھائی نہ تھا۔ بھائی کی کمی نہ کبھی ان دونوں کو محسوس ہوئی اور نہ ہی ان کے والدین کو بیٹے کی محرومی کا کبھی احساس ہوا۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھیں۔ عادت مزاج میں بھی، جسامت میں بھی۔ رئیسہ بیگم ددھیال پر گئی تھیں، بھاری بھرکم سی تھیں جبکہ انیسہ بیگم اپنی والدہ کی طرح دھان پان سی تھیں۔ والدین نے دونوں بیٹیوں سے خوب لاڈ پیار کیا۔ مگر رئیسہ بیگم اس پیار سے تھوڑی خود سر ہو گئیں جبکہ انیسہ بیگم کے مزاج میں اعتماد اور ٹھہراؤ پیدا ہوا۔

تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ان کے ابا نے دونوں کو دی مگر اس سے فائدہ صرف انیسہ بیگم نے اٹھایا اور اچھے نمبروں سے ہر سال پاس ہوتے ہوئے میٹرک کر لیا۔ اس زمانے میں میٹرک اعلا تعلیم ہوا کرتی تھی۔ رئیسہ بیگم تیسری جماعت میں دوبار فیل ہونے کے بعد پڑھائی کو خیرباد کہہ بیٹھی تھیں اور اکثر انیسہ بیگم کو اعلا تعلیم حاصل کرکے مغرور ہو جانے اور اکثر و بیشتر اوقات بھول جانے کے طعنے دیا کرتی تھیں۔ انیسہ بیگم نے اگر کسی کام میں مہارت حاصل کی تو وہ سلائی کڑھائی تھی۔ جیسے جیسے مہارت بڑھتی گئی، فخر زعم کی صورت اختیار کرتا گیا۔ (انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی صائمہ کو بھی یہ ہنر سکھایا اور اب اس کے ساتھ مل کر بوتیک کھولنے کی تیاری مکمل ہے)

گھریلو اور روزمرہ کے معاملات میں ان کے ابا اپنی دونوں بیٹیوں سے صلاح مشورہ کرتے..... رئیسہ بیگم کے مشورے کافی جارحانہ ہوا کرتے تھے جبکہ انیسہ بیگم چونکہ پڑھی لکھی تھیں، اس لیے اکثر ان کے مشورے قبول کرلیے جاتے، پھر رئیسہ بیگم کباب ہو جاتیں۔ جل کر کہتیں۔

"تعلیم کا رعب ڈالتی ہے۔ کتابوں سے اٹھا کر بات سامنے رکھ دیتی ہے۔ اپنی عقل سے تھوڑا ہی بولتی ہے۔" انیسہ بیگم زیادہ تر خاموش رہتیں مگر جب پانی سر سے گزرنے لگتا تو صرف ایک جملہ بولتیں۔

"آپا! تم تو یہ بھی نہیں کرسکتیں۔" اور چھوٹی بہن کی اس بات پر رئیسہ بیگم اپنے نام کے معنی مزید خراب کرلیتیں۔

انیسہ بیگم کا رشتہ آیا۔ اچھا تھا مگر ابا قبول کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے کہ بڑی موجود ہے، چھوٹی کا رشتہ کرتے اچھا نہیں لگتا، لوگ باتیں بنائیں گے۔ اماں نے سمجھایا کہ اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے، پکا کردو۔ شادی بڑی کے بعد ہی کریں گے۔ ابا کو یہ بات بھلی لگی۔ انہوں نے ہاں کردی۔ رئیسہ بیگم مزید جلنے لگیں۔ عبدالقدوس وزن میں بہت بھاری تھے۔ رئیسہ بیگم ان کا ہر وقت مذاق اڑاتیں۔

"ہائے انیسہ! سچ میں، الن ننھا کی جوڑی ہے۔" ان کی ہنسی کو بریک اس وقت لگا جب ان کے لیے نصیر الدین کا رشتہ آیا۔ اب انیسہ بیگم کے ہنسنے کی باری تھی۔ ہنستے ہوئے بولیں۔

"لو آپا! تمہاری بھی الن ننھا والی جوڑی بن گئی۔ اب تو خوش ہو نا!"

نصیر الدین بہت نحیف و نزار قسم کے تھے۔

ابا نے بڑی کی شادی کے دو سال بعد چھوٹی کی شادی کردی۔

رئیسہ بیگم بہت خوش ہوئیں، جب ان کے ہاں سعد پیدا ہوا۔ یہ خوشی غرور میں اس وقت بدلی، جب انیسہ بیگم کے ہاں پہلی بیٹی (نادیہ) ہوئی مگر اس وقت حیرانی سے صدمہ ہوگیا، جب ابا نے سعد اور نادیہ کا رشتہ طے کردیا۔ رئیسہ بیگم کو اعتراض تو بہت ہوا مگر ابا کے ڈر اور محبت کے باعث کچھ کہہ نہ سکیں۔ ان کے دونوں دامادوں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ نصیر الدین خوش تھے کہ سمدھن پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی ملی ہیں۔ بہو بھی ایسی ہی ہوگی۔ عبدالقدوس کا خیال تھا کہ بڑوں کے فیصلے صحیح ہوتے ہیں۔ جس طرح ان کی بیگم نے بڑی بہن کے رویے برداشت کرلیے، ان کی بیٹی بھی کرلے گی۔ بڑے ہو کر سعد اور نادیہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ رئیسہ بیگم نے رشتہ تو نہیں توڑا مگر مسلسل ٹالے جارہی تھیں۔ انہیں بہن سے تو ہمیشہ پرخاش رہی مگر بھانجی سے بہت التفات تھا۔

سعد کے بعد ان کے ہاں صائمہ ہوئی اور انیسہ بیگم کے ہاں معیز یوں دونوں بہنوں کی فیملی مکمل ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

سعد، رئیسہ بیگم کے ساتھ صحن میں بیٹھا شام کی چائے پی رہا تھا، جب اچانک ایک چھوٹا سا مگر بہت زور سے ایک پتھر اس کے قریب آکر گرا۔ رئیسہ بیگم گلی میں کھیلتے بچوں کی شرارتوں پر بڑبڑانے لگیں، جبکہ سعد سے چائے ختم کرنا مشکل ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ نادیہ چھت پر بلا رہی ہے۔

"اماں! طاہر بھائی کے ابو کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔" اسے فوری طور پر یہی جھوٹ سوجھا۔

"یا اللہ خیر! کب، کیسے؟" ان کا پریشان ہونا فطری تھا۔ آخر محلے داری کا معاملہ تھا۔

"پتا نہیں۔ کل ہوا ہے شاید آپ کو جانا چاہیے اماں۔"

"لو، مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔" انہوں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ چادر اوڑھی اور طاہر بھائی کے ابو کی عیادت کو چل دیں، جو دو گلیاں چھوڑ کر رہتے تھے۔ سعد نے صائمہ کو اشارہ کیا اور جست لگا کر چھت پر جا پہنچا۔ دیوار خالی تھی۔ اس نے سیٹی بجا کر اوکے کا اشارہ دیا۔ نادیہ دیوار پر نمودار ہوئی تو سعد کے چہرے پر دلفریب سی مسکراہٹ آگئی۔ کچھ نہیں کیا بس دیکھے گیا۔

"کیسی ہے ندو کی بچی۔" کافی دیر تک خاموشی سے تکنے کے بعد اپنے انداز میں بولا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

"پتا تو ہے تجھے، تو ہمیشہ مجھے اچھی لگتی ہے اور آج تو دل چاہ رہا ہے کہ....."

اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ نادیہ کے بال کھلے ہوئے تھے۔ دیوار کی منڈیر پر رکھے بازوؤں سے لگ رہا تھا کہ اس نے سرخ رنگ کا سوٹ پہنا ہوا ہے، جس پر چھوٹی چھوٹی سیاہ بوٹیاں بنی ہوئی

ہیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کاجل لگا کر اس نے سر شام رات کا سماں باندھ دیا تھا۔

"کیوں بلایا ہے؟" سعد کا بس چلتا تو وہ ساری عمر اسے یونہی دیکھتا رہتا مگر اماں کے نازل ہو جانے کے خوف سے پوچھ لیا۔ نظریں البتہ یونہی جمی رہیں۔

"یونیورسٹی جانا ہے۔"

"کب؟" سعد کی باچھیں کھل گئیں۔

"بدھ کو۔ نو بجے۔"

"ٹھیک ہے۔" نظریں ہنوز جمی تھیں۔

"سعد وہ..." کچھ کہتے ہوئے وہ جھجکی۔

"خالہ بی کو پتا چل گیا تو؟"

"نہیں پتا چلے گا۔ بے فکر رہ۔ بھروسا نہیں ہے مجھ پر؟"

"بات بھروسے کی نہیں ہے۔ تمہیں پتا تو ہے خالہ بی کتنا برا مانتی ہیں۔ ان کو ذرا سی بھی سن گن مل گئی نا تو ....."

"تو کیا کروں پھر۔ چھت پر بھی آنا چھوڑ دیا ہے تو نے۔ باہر بھی نہیں ملتی۔ اچھا بھلا کالج جا رہی تھی، خوامخواہ پرائیویٹ پڑھنا شروع کر دیا۔ دیکھ تو لیا کرتا تھا میں کم از کم۔ اب تو ترس جاتا ہوں۔ اب کبھی کبھی یونیورسٹی لے جاتا ہوں تو اس پر بھی اعتراض شروع ہو گیا تجھے۔ نہیں جانا تو نہ جا۔" وہ اچھا خاصا بگڑ گیا۔

"اعتراض کرتی تو بتاتی نہیں تمہیں۔ بس خالہ بی سے ڈر لگتا ہے۔"

"تو پھر اب کیوں بتایا؟" وہ منہ بنا کر بولا۔

"تمہاری ضد کی وجہ سے۔ تمہیں نہ بتاتی اور خود چلی جاتی تو خالہ بی سے زیادہ اودھم تم مچا دیتے۔"

"جانتی ہے نا مجھے، پھر بھی ڈرامے کرتی ہے۔ بس ٹھیک ہے اب پرسوں چلیں گے۔" اس نے مطمئن ہو کر کہا مگر نادیہ کے چہرے پر ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔

"اتنے ہی برے برے منہ بنانے ہیں تو ٹھیک ہے۔ خود چلی جا، نہیں جاتا میں۔" وہ غصے سے کہہ کر اترنے لگا تو اس نے فوراً آواز دی۔

"اچھا سنو تو۔" وہ رک گیا۔ "اسپورٹس گراؤنڈ والے اسٹاپ پر آجانا۔" سعد کا غصہ فوراً ختم ہو گیا۔ "روز آیا کرنا چھت پر۔"

"جی ضرور جیسے آپ کا حکم۔" اس نے مذاق اڑایا۔ سعد گھورنے لگا۔

"اچھا، یونیورسٹی سے فارغ ہو کر چڑیا گھر چلیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے، خالہ بی کو بھی ساتھ لے لیں گے۔" اس نے پھر مذاق اڑایا مگر سعد اماں کا نام سن کر سوچنے لگا کہ ابھی اماں، طاہر بھائی کے گھر سے آئیں گی تو وہ انہیں کیا جواب دے گا.....

☼ ☼ ☼

انیسہ بیگم کی خواہش تھی کہ ایف اے کرتے ہی نادیہ کی شادی ہو جائے مگر نادیہ نے روک دیا۔

"ابھی نہیں امی! پہلے میں گریجویشن کر لوں اور سعد اپنا ماسٹرز مکمل کر لے پھر۔"

"آپا جی کے انداز پھر بھی یہی رہیں گے..... وہ بیٹے کی ماں ہیں۔" انہوں نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

"تم دیکھ لینا، وہ خود کبھی نہیں آئیں گی، چاہے سعد پی ایچ ڈی کر لے۔ وہ مجھے نیچا دکھانا چاہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہو گی کہ میں خود جا کر جھولی پھیلاؤں..... بلکہ شاید وہ یہ بھی نہیں چاہتیں۔" انیسہ بیگم رو نکھی سی ہو گئیں۔ عجیب سا خوف پیدا ہو گیا۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا امی! خالہ بی آئیں گی اور خود ہی آئیں گی۔ بس آپ تھوڑا صبر کریں۔" نادیہ نے ماں کو تسلی دی۔ وہ خاموش تو ہو گئیں۔ مگر مطمئن نہ ہو سکیں۔ وہ اپنی بہن کو اچھی طرح جانتی تھیں، وہ اتنی آسانی سے کبھی نہیں مانیں گی.....

☼ ☼ ☼

"اس دفعہ پھل بہت کم آیا ہے۔" نصیرالدین کمرے میں داخل ہوئے تو انیسہ بیگم نے کہا۔

"جتنا اترا لے آیا۔" انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"کیا مطلب، فصل خراب ہوئی ہے کیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں مگر اتنا ہی اترا تھا اس دفعہ۔" انہوں نے پلنگ پر لیٹتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی بازار سے آئے تھے۔

"اتنا کم..... یہ تو ایک درخت کا پھل بھی نہیں لگ رہا۔" رئیسہ بیگم نے جرح کی۔

"آپ بھول رہی ہیں شاید، میں اس دفعہ جلدی گوٹھ چلا گیا تھا۔ وہ اترائی (پھل اتارنے کا) کا وقت نہیں تھا مگر ستار نے کہا کہ خالی ہاتھ جاتے ہوئے اچھا نہیں لگتا اس لیے ایک درخت کا پھل اتار دیا اس نے میرے لیے، باقی سب کو بھی اسی میں نبٹا دیا۔ کچھ دنوں میں ستار ہمارا باقی پھل بھی لا دے گا۔" انہوں نے تفصیل بتائی تو رئیسہ بیگم کو کچھ اطمینان ہوا مگر ستار کے آنے کا سن کر ان کا منہ کڑوا ہو گیا۔

ستار چاچا نصیر الدین کے دور پار کے رشتے دار تھے۔ گوٹھ میں نصیر الدین کی زمینیں انہوں نے ہی سنبھالی ہوئی تھیں۔ آم کے چھ درخت بھی تھے۔ نصیر الدین ہفتہ دس دن میں دو تین، چکر لگا آتے تھے۔ اس دفعہ وہ پھل اتارنے کے موسم سے پہلے چلے گئے تھے، اس وقت جتنا پھل اتارا گیا، وہ زیادہ تر دینے دلانے میں پورا کر دیا تھا۔ تھوڑا سا وہ لے آئے۔ اترائی کے وقت پھل ستار کے علاوہ گوٹھ کے تقریباً" ہر گھر میں دیا جاتا تھا۔ باقی پھل منڈی میں بھیج دیا جاتا تھا، جس سے نصیر الدین کا کاروبار چلتا تھا۔ نصیر الدین کے گھر دس پیٹیاں آتی تھیں، جن میں سے رئیسہ بیگم اپنے سب محلے والوں کو بھی دیا کرتی تھیں، سوائے انیسہ بیگم کے۔

رئیسہ بیگم سوچ رہی تھیں کہ باقی پھل کے لیے اس دفعہ نصیر الدین خود ہی دوبارہ چکر لگا لیں گے مگر انہوں نے ستار کا نام لے کر انہیں پریشان کر دیا۔

اَن پڑھ اور پینڈو سے، درجن بھر بچوں کے باپ ستار چاچا جب بھی آتے، دو دن ضرور رکتے اور ان دو دنوں میں وہ رئیسہ بیگم کا پندرہ دن کا بجٹ متاثر کر جاتے۔

"واہ واہ بھابھی جی نے کیا خوب کھانا پکایا ہے۔ ذائقہ ہے بھابھی جی کے ہاتھ میں۔ ایسا لذیذ کھانا تو میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں کھایا۔"

وہ کھاتے جاتے اور کہتے جاتے۔ رئیسہ بیگم پر اس تعریف کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی نظر چنگیر میں ختم ہوتی روٹیوں پر ہوتی۔ تین افراد کا کھانا ستار چاچا اکیلے کھا جاتے تھے۔ رئیسہ بیگم واضح الفاظ میں ان سے بے زاری کا اظہار کرتیں مگر وہ اسے "بھابھی جی کی محبت" گردانتے اور ان کی تیوریوں کا ذرا اثر نہیں لیتے ایک دفعہ تو رئیسہ بیگم نے بے زاری کی انتہا کر دی اور انہوں نے سادگی کی۔ انہوں نے پائے پکائے اور ستار چاچا کے سامنے رکھے۔

"آہا! آج تو مزا آجائے گا، بھابھی جی نے پائے پکائے ہیں۔" انہوں نے کھانے سے پہلے ہی چٹخارا بھر کے کہا۔ رئیسہ بیگم کا منہ بن گیا۔ جل کر کہنے لگیں۔

"پڑوس سے آیا تھا بڑی عید پر۔ کوئی کھا ہی نہیں رہا تھا۔ سعد بتا رہا تھا کہ وہ لوگ بیمار گائے لائے تھے۔ برڈ فلو ہو گیا تھا اس کو میں نے سوچا، تم تو کھا ہی لو گے، تم پر برڈ فلو کیا اثر کرے گا۔"

انہوں نے بے مروتی کی حد کر دی تھی۔ سعد اور صائمہ نے ان کی بات سن کر دانتوں میں انگلی دبالی۔

"برڈ فلو اور وہ بھی گائے کو....."

مگر مجال ہے جو ستار چاچا نے ذرا بھی برا مانا ہو۔ مزے سے بولے۔

"بھابھی جی نے صحیح کہا، مجھ پر برڈ فلو کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ بھابھی جی کے ہاتھوں سے زہر بھی کھا لوں گا تب بھی کچھ نہیں ہو گا مجھے۔" رئیسہ بیگم سلگ کر رہ گئیں۔

اب جو نصیر الدین نے بتایا کہ ستار چاچا آئیں گے تو وہ ابھی سے پریشان ہو گئیں۔

"سنو، سعد کے ابا۔" انہوں نے نیم دراز نصیر الدین کو پکارا۔

"تم ہی چلے جانا گوٹھ۔"

"نہیں، میں نے کھاد اور بیجوں کے لیے فیصل آباد جانا ہے۔"

"فیصل آباد، سعد کو بھیج دو تم گوٹھ چلے جاؤ۔" انہوں نے فوراً" کہا۔

"کیوں؟" انہوں نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں۔

"کیوں کا کیا مطلب۔ سعد کو اپنے ساتھ لگاؤ۔ اسے بھی ان معاملات کا پتا چلے۔ اس نے بھی آخر یہی کام سنبھالنا ہے۔ اسے پتا ہونا چاہیے ان تمام کاموں کا۔" اپنے تئیں انہوں نے بڑے پتے کی بات کی۔

"اچھا، چلو ٹھیک ہے۔ سعد کو بتا دینا۔" انہوں نے نیم غنودگی میں بھی فرماں برداری دکھائی۔

"سوتے جاگتے اماں کا کہنا ماننا صرف ہمارے ابا کو ہی آتا ہے بس۔"

سعد اسی وقت یونیورسٹی سے لوٹا تھا۔ کھانا کھانے کے بجائے فریج سے دو بڑے بڑے آم پلیٹ میں رکھ کر اندر آ رہا تھا۔ آم ہوتے تو وہ کھانا کم ہی کھاتا تھا۔ سعد کی بات نصیر الدین نے سنی نہیں اور رئیسہ بیگم نے اہم نہیں جانی، سعد وہیں بیٹھ کر آم کھانے لگا۔

"سعد! تمہارے ابا کہہ رہے ہیں۔ تمہیں کھاد اور بیج لینے کے لیے فیصل آباد جانا ہے۔"

"کب؟"

"بدھ کو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا پھر یکدم چیخا۔

"نہیں اماں! بدھ کو میرا ایسی فائنل ہے۔"

"تمہارے یہ کھیل تماشے بند نہیں ہوں گے سعد! بس کرو یہ کھیل کود۔ بڑے ہو گئے ہو اب تم۔ اپنے ابا کا ہاتھ بٹاؤ۔" انہیں یقیناً" ستار چاچا کے آجانے کا خوف تھا۔

"پیاری اماں! اگلی دفعہ چلا جاؤں گا۔ اس مرتبہ بہت اہم میچ ہے میرا۔"

"تمہارا میچ تو جمعرات کو تھا۔" رئیسہ بیگم کو یاد آیا۔ سعد کو اچھو لگ گیا۔

"اماں! بدھ کو پہلی اننگز ہو گی، جمعرات کو دوسری۔" تیزی سے کہا۔

"ہائیں! ایسا بھی ہوتا ہے؟" ون ڈے میچ کے بارے میں اتنا تو جانتی تھیں وہ۔

"اماں! اس دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بس انسان کو ثابت قدم رہنا چاہیے۔ ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ پریشان رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا یوں بھی انسان تو غلطی کا پتلا ہے اور یہ دنیا بھی ایک دار العمل ہے۔ آپ فکر نہ کریں اماں.....! ان شاء اللہ ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

سعد نے آم کھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ رئیسہ بیگم اس کا منہ دیکھے گئیں۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا، مگر سعد جانتا تھا کہ اس نے کیا کہا ہے۔ وہ اکثر نہایت سنجیدہ انداز میں بے موقع اور فضول بات کر کے رئیسہ بیگم کا اصل بات سے دھیان ہٹا دیتا تھا..... اور ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ کامیاب ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

اسے وہاں کھڑے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا، جب سامنے سے نادیہ آتی دکھائی دی۔ وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سیدھے ہاتھ میں ایک فائل دبی ہوئی تھی۔ تیز تیز چلنے سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔ گلابی اور کاسنی رنگ کے لان کے پرنٹڈ سوٹ پر بڑا سا دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر سر پر گہرا سرخ اسکارف لپیٹے، میک اپ سے عاری چہرے مگر کاجل سے بھری آنکھوں کے ساتھ ہمیشہ کی طرح وہ سعد کے دل میں اتر گئی۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی۔ آدھے گھنٹے سے کھڑا ہوں۔" اسے گھورتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"دیر تو نہیں ہوئی۔" اس نے کلائی میں بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔

"نو بج رہے ہیں اور نو بجے کا ہی کہا تھا میں نے۔" سعد جواباً" چپ رہا تو نادیہ خود ہی ہنس کر کہنے لگی۔

"تم جذباتی ہو کر جلدی آگئے ہو۔" سعد جھینپ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ وہ بیٹھی تو تیزی سے بھگا لی۔

کولڈ ڈرنک اور برگر لے کر جب وہ دونوں بنچ پر بیٹھے تو نادیہ نے سادہ سے لفظوں میں اسے انیسہ بیگم کا خدشہ بتا دیا۔ سعد ایک لمحے کو چپ سا ہو گیا۔

"سعد! اگر خالہ جی واقعی ایسا سوچتی رہی ہیں تو کیا ہم کبھی...." آگے کہنے کی نادیہ میں ہمت نہیں تھی۔

"نہیں نہیں، ایسا مت سوچ۔ اللہ نہ کرے۔ تو فکر نہ کر بس تھوڑا..... میں....." وہ تڑپ کر بولا مگر اپنی ماں کی سختی یاد کر کے تسلی کے الفاظ ہی بھول گیا۔

"سعد! میں خالہ بی کی بہت عزت کرتی ہوں اور ان سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے مجھے مگر..... اس معاملے میں امی کو اگر خالہ بی سے خود بات کرنی پڑ گئی تو خالہ بی اس بات کے بھی طعنے دیتی رہیں گی۔ مجھے سب برداشت ہے سعد! مگر اپنی امی کی ہتک نہیں اور ابھی تو اس بات میں بھی شک ہے کہ وہ ہماری شادی چاہتی بھی ہیں یا نہیں۔"

اس نے نرم لفظوں میں سعد سے شکوہ کیا۔ وہ اسے بھی پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس مسئلے کا حل ضرور چاہتی تھی۔ رئیسہ بیگم کیا چاہتی ہیں، یہ جاننے سے سب قاصر تھے۔ ان کا موقف کبھی کھل کر آیا ہی نہیں۔ انہوں نے سعد اور نادیہ کے رشتے پر واویلا تو بہت کیا تھا مگر ابھی تک توڑا بھی نہیں تھا۔

"یار! میں کرتا ہوں کچھ۔ تو پریشان مت ہو۔ بس ذرا امتحان سے فارغ ہو جاؤں۔ اتنا تو انتظار کر سکتی ہے نا!" اس نے بہت محبت سے پوچھا۔

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"اوہ خوش رہ جوان کی بچی۔" وہ زیادہ دیر تک سنجیدہ نہیں رہ سکا تھا اور اس وقت تو وہ نادیہ کی بات پر اس قدر خوش ہوا کہ بس چلتا تو ابھی رئیسہ بیگم کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا اور دوسری طرف کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتی نادیہ کے "جوان کی بچی" کہنے پر اچھو لگ گیا۔ وہ اسے ایسے ہی الٹے سیدھے لفظوں سے پکارتا رہتا تھا۔

"سعد! تمہیں دیکھ کر ہرگز نہیں لگتا مجھے کہ تم کچھ کر سکو گے۔" وہ اس کے اتنی جلدی غیر سنجیدہ ہو جانے پر خفا ہو گئی تھی۔

"کیوں نہیں لگتا؟" وہ اس کی رائے پر تنگ گیا۔

"میری ہنسنے بولنے اور ہر دم خوش رہنے والی عادت سے یہ نہیں سمجھنا کہ میں کچھ کر نہیں سکتا۔ میں مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہوں، وقت آئے گا تو سب دیکھ لیں گے کہ سعد کیا کچھ کر سکتا ہے۔"

وہ طیش میں آ گیا۔ نادیہ نے مزید بھڑکایا۔

"پتا تو چلے کیا کر لو گے؟"

"وقت آئے گا تو دیکھ لینا۔ کچھ نہ کر سکا تو تجھے بھگا کر لے جاؤں گا۔" اس نے جوش سے کہا۔ اب کے نادیہ تنگ گئی۔

"بس یہیں زور چلے گا تمہارا۔ خالہ بی کے سامنے نہیں بول سکو گے کچھ۔"

"دیکھ ندو! طیش نہ دلا کہ میں ابھی اماں کے سامنے بات کر کے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دوں۔ جب وقت آئے گا تو تو خود دیکھ لے گی کہ میں کیا کرتا ہوں۔ مجھے ابا اور خالو نہ سمجھنا اچھا؟"

اس نے اپنے اور نادیہ کے ابا کی گھریلو حالات پر چشم پوشی پر چوٹ کی۔

عبدالقدوس، انیسہ بیگم کی سمجھ داری سے مرعوب ہو کر خاموش رہتے تھے اور نصیرالدین، رئیسہ بیگم کی طراری سے دب کر خاموش رہتے تھے، سو ان دونوں حضرات کی خاموشی کے بعد ایک سعد ہی مرد مجاہد تھا جو کچھ کر سکتا تھا۔ معیز تو ابھی کافی چھوٹا تھا۔

"تم ابو اور خالو بن بھی نہیں سکتے۔" نادیہ ہنس کر کہنے لگی۔

"مطلب؟" سعد نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ میرے ابو کی طرح بننے کے لیے تمہیں اپنے وزن میں اڑتالیس پونڈ کا اضافہ کرنا پڑے گا اور خالو جان بننے کے لیے اپنا پچیس کلو گرام وزن گھٹانا پڑے گا۔"

اس نے ہنستے ہوئے سعد کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اسے بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی

☼ ☼ ☼

"اماں! کہاں جا رہی ہیں؟" صائمہ نے کچن سے نکل کر پوچھا۔

"پہلے ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی۔ اپنا بی پی چیک کرواؤں گی، پھر مارکیٹ جاؤں گی۔"

"اماں! اگر آج نہ جائیں تو۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"کیوں؟ ڈاکٹر سے دوا بدلوانی ہے۔ اس سے تو اب فرق نہیں پڑتا اور تم نے بھی تو کہا تھا کہ تمہیں مارکیٹ سے کچھ چیزیں چاہئیں۔"

"ہاں اماں کہا تھا مگر چھوڑیے نا، چیزیں اتنی ضروری نہیں ہیں۔ آپ کی طبیعت بھی خراب ہے کل چلی جائیے گا۔"

"ہاں تو ڈاکٹر کے پاس جا تو رہی ہوں۔"

"اماں! ڈاکٹر کے پاس بھی کل ہی چلی جائیے گا۔ آج طبیعت زیادہ خراب ہے آپ کی۔" صائمہ کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بہانہ کر کے اماں کو روکے۔

"میرا خیال ہے تم بھی ڈاکٹر کے پاس چلو۔ مجھے تو تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔" انہوں نے صائمہ کو تیز نظروں سے گھورا۔ وہ گڑبڑا گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہہ پاتی انہوں نے چادر سنبھالی اور یہ جا وہ جا۔

کلینک سے نکلیں تو مارکیٹ جانے کا ارادہ بدل کر گراؤنڈ کی طرف مڑ گئیں۔ سوچا، بیٹا اتنا اچھا کھیلتا ہے، کبھی دیکھا نہیں۔ آج دیکھتی ہوں اور جب وہ مجھے دیکھے گا تو اور زیادہ جوش سے کھیلے گا۔ ممتا بھری مسکراہٹ لیے گراؤنڈ کی طرف بڑھیں مگر..... خالی میدان دیکھ کر سخت متعجب ہوئیں۔ کچھ حیران، کچھ پریشان سی پلٹنے لگی تھیں کہ سامنے والے کونے پر بیس پچیس قدم کے فاصلے سے سعد ان کے آگے سے گزرا۔ اس کے ساتھ کوئی بیٹھا ہوا تھا..... بیٹھا ہوا نہیں، بیٹھی ہوئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھیں سعد نے میدان کے اگلے کونے پر بائیک روکی اور محبت پاش نظروں سے اسے اللہ حافظ کہنے کے لیے ہلکا سا رخ موڑا تو نادیہ کے کندھوں سے ہوتی ہوئی اس کی نظر رئیسہ بیگم پر پڑی تو مسکراہٹ ایکا ایکی غائب ہو گئی۔

"مارے گئے۔ اب خیر نہیں بچو!" نادیہ بھی وہیں کھڑی تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ رضیہ بیگم وہیں سے واپس پلٹ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"بس بھابھی جی! میں نے سارا مال اسٹور میں رکھوا دیا ہے۔ اس دفعہ فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ سارا اضافی مال کل منڈی پہنچ جائے گا۔ بھائی جی کو بتا دیجیے گا۔ شہزاد! آجا چائے پی لے، ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

ستار چاچا نے رئیسہ بیگم کو تفصیل بتائی اور ساتھ ہی اس لڑکے کو بھی آواز دے ڈالی جو اسٹور میں آم کی پیٹیاں ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ ستار چاچا جب بھی پھل لاتے، سعد ہوتا تھا مگر آج جب ستار چاچا آئے تو سعد یونیورسٹی گیا ہوا تھا اور نصیرالدین فیصل آباد۔ سو انہوں نے ساری تفصیل رئیسہ بیگم کو بتائی مگر ان کا دھیان ستار کی باتوں میں نہیں تھا۔ شہزاد اسٹور سے ہاتھ جھاڑتا ہوا نکلا۔

"آجا بیٹا! لے چائے پی لے۔" انہوں نے شہزاد کی طرف چائے کی پیالی بڑھائی۔

"نہیں میں پہلے ہاتھ دھوؤں گا۔ باتھ روم کہاں ہے۔" اس نے پوچھا۔

ستار چاچا چائے پینے میں مصروف تھے اور رئیسہ بیگم شہزاد کا جائزہ لینے میں مجبوراً" صائمہ کو اس کی رہنمائی کرنی پڑی، وہ ہاتھ دھو کر آیا تو اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ایک کپ اور چائے ملے گی؟"

"آپ دو کپ پئیں گے؟" صائمہ کو حیرانی ہوئی۔

"نہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔ "باہر ڈرائیور کو دوں گا۔"

"انہیں دے دی ہے۔ یہ آپ کی ہے۔" صائمہ کو اس کا ڈرائیور کی پروا کرنا اچھا لگا۔ "آپ کی چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے تو دوسری لا دوں؟"

"نہیں ٹھیک ہے شکریہ۔" وہ خاموشی سے چائے پینے لگا۔

صاف ستھرے حلیے میں سلیقے سے بال بنائے ہوئے وہ بہت تمیز سے چائے پی رہا تھا۔ اس نے بات بھی بڑی شائستگی سے کی تھی۔ رئیسہ بیگم کافی متاثر ہو رہی تھیں۔

"ستار! یہ لڑکا کون ہے؟" انہوں نے پوچھا ستار سے تھا مگر نظریں شہزاد پر جمی ہوئی تھیں، جو اپنا ذکر سن کر اب سر اٹھا کر رئیسہ بیگم کو دیکھ رہا تھا۔

"بھابھی جی! بیٹا ہے میرا۔" ستار چاچا نے کافی جوش سے جواب دیا۔

"تمہارا بیٹا..... لگتا تو نہیں ہے۔ یہ تو کافی معقول لگ رہا ہے۔" رئیسہ بیگم کو اپنی زبان پر قابو نہیں تھا۔ ستار چاچا ہنسنے لگے۔ شہزاد نے دوبارہ سر جھکا لیا۔

"سب سے بڑا ہے کیا؟" ان کی نگاہیں ابھی بھی اسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"نہیں جی، دوسرے نمبر والا ہے۔" ستار چاچا نے ستائشی نظروں سے شہزاد کی طرف دیکھا، جو خالی کپ میز پر رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ستار چاچا بھی اس کی تقلید میں کھڑے ہوئے۔

"اچھا بھابھی جی چلتے ہیں۔"

"اچھا؟" رئیسہ بیگم کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک تو ستار چاچا نے کھانے کی فرمائش نہیں کی اور جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ دوسرے ان کے بیٹے کو دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی تھیں۔ اس بانکے سجیلے نوجوان کو وہ کسی طور ستار کا بیٹا ماننے کو تیار نہیں تھیں۔

"بیٹھو ستار! کھانا کھا کے جانا۔" صائمہ نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا۔ ان کی تو جان جاتی تھی ستار چاچا کے کھانا کھانے سے اور اب.....

"جلدی جاؤ صائمہ! اور اچھا سا کھانا پکاؤ اپنے چاچا کے لیے۔"

صائمہ ان کے شاہی فرمان پر ہنستے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ ڈرائیور کو بھی بیٹھک میں بلوا لیا۔ شہزاد نے بیٹھک میں اس کے ساتھ کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ ستار چاچا اندر کمرے میں کھانا کھانے لگے۔ صائمہ بھی موجود تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ مسلسل "اور کھاؤ ناں ستار۔" پر اصرار کیے جا رہی تھیں۔

"ستار! کیسا پکا ہے کھانا۔" انہوں نے ایسے پوچھا جیسے ستار چاچا سے مشہور زمانہ "دیور بھابھی" والا لاڈ ہو۔

"بھابھی جی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہمیشہ کی طرح مزے دار۔" انہوں نے پرانے انداز میں ہی جواب دیا۔

"نہیں، آج تو صائمہ نے بنایا ہے نا اس لیے پوچھ رہی تھی۔" انہوں نے پیار بھری نظروں سے صائمہ کو دیکھا۔ ستار نے بھی ایک تشفق سی نظر صائمہ پر ڈالی۔

"بھابھی جی! میری بھتیجی کے ہاتھ میں بھی ذائقہ ہے بہت۔" وہ مسکرائے۔

"کتنے بیٹے ہیں تمہارے؟" رئیسہ بیگم نے اچانک بات بدل دی۔

"جی چار ہیں۔"

"تو پھر بیٹیاں آٹھ ہیں تمہاری؟" ایک دم حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں بھابھی جی! میری تو ایک ہی بیٹی ہے۔" اب کے وہ بھی حیران ہو گئے۔

"میں نے تو تمہارے گھر میں بہت سارے بچے دیکھے تھے۔" انہوں نے درجن بھر کہتے ہوئے بمشکل خود کو روکا۔ ستار چاچا ہنسنے لگے۔

"وہ تو جی میری بیوہ بہن کے بچے تھے۔ جب آپ گوٹھ آئی تھیں اس وقت میری بہن بھی میرے ساتھ رہتی تھی تو بچے بھی سب ساتھ ہی کھیلتے پڑھتے تھے۔ آپ کو بھی تو گوٹھ آئے ہوئے زمانہ ہو گیا ہے۔ اب میں نے اس کا حصہ دے دیا ہے۔ بچے بھی ماشاء اللہ بڑے ہو گئے ہیں۔ یہیں شہر میں ہی لیا ہے اس نے گھر۔ سب بچے پڑھ رہے ہیں۔ بڑا بیٹا تو اس کا بھی خیر سے اب کام پر لگ گیا ہے، میرے شہزاد اور تنویر کی طرح۔" ستار چاچا نے جواب میں پوری تفصیل بتائی۔

"جاؤ صائمہ! چائے بنا لو۔ تمہارے چاچا کھانے کے بعد چائے ضرور پیتے ہیں۔" رئیسہ بیگم بڑے موڈ میں تھیں۔ ستار چاچا کا تو نہیں معلوم صائمہ خوب حیران ہو رہی تھی۔

"نہیں بھابھی جی! اب چلوں گا۔ ویسے ہی دیر ہو گئی ہے۔ منڈی بھی جانا ہے اور بیٹی کی کچھ کتابیں بھی خریدنی ہیں۔"

"بیٹی بھی پڑھتی ہے؟" ان کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

"جی پرائیویٹ پڑھتی ہے۔ امتحانات کے دن اپنی پھوپھی کے پاس آ جاتی ہے۔"

"ارے تو لے کر آنا تھا نا اسے۔" رئیسہ بیگم خفا ہوئیں۔ "بیٹے کو بھی آج پہلی بار لائے ہو۔"

"جی ضرور اگلی دفعہ آؤں گا تو لے آؤں گا۔ مصروف رہتے ہیں جی سب کام میں، پڑھائی میں....."

وہ مزید وضاحتیں دیتے مگر بیٹھک سے شہزاد کی آواز آئی جو انہیں اب چلنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ رئیسہ بیگم بھی ساتھ ساتھ باہر نکلیں۔ شہزاد صحن میں کھڑا تھا۔ ڈرائیور پچھلے دروازے سے باہر چلا گیا تھا۔

"دوبارہ آنا بیٹا۔" رئیسہ بیگم نے شفقت سے کہتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"جی ضرور۔" اس نے بھی ادب سے سر جھکا کر جواب دیا اور نظریں جھکائے باہر نکل گیا۔ ستار چاچا نے رئیسہ بیگم کو سلام کیا اور صائمہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی رئیسہ بیگم ان ہی کے بارے میں باتیں کیے جا رہی تھیں۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے وہ ستار چاچا کے جانے کے بعد بڑبڑاتی تھیں۔ اب قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ صائمہ ان کی سوچ سے بے خبر اس کایا پلٹ پر حیران تھی۔

آج سعد کو سنانے کے لیے اس کے پاس ایک مزے دار کہانی تھی۔

☆ ☆ ☆
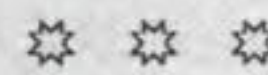
انیسہ بیگم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ کچی نیند میں ایسا لگا جیسے اماں انہیں آوازیں دے رہی ہیں۔ وہ ظہر پڑھ کر لیٹی تھیں۔ لیکن نیند زیادہ گہری نہیں تھی اور اب وہ جاگ بھی چکی تھیں مگر ہلکی ہلکی آوازیں کانوں میں اب بھی آ رہی تھیں۔ انہیں صورت حال سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کمرے میں نظر دوڑائی تو نادیہ نظر نہیں آئی۔ گھبرا کر باہر نکلیں۔ نادیہ صحن میں بھی نہیں تھی۔ شور کی آوازیں چھت کی طرف سے آ رہی تھیں۔ وہ تیزی سے اوپر لپکیں۔ نادیہ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سہمے ہوئے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ مکمل طور پر ہوش میں آ چکی تھیں اور سمجھ چکی تھیں کہ اماں مرحومہ یاد نہیں کر رہی تھیں، آپا جی گرم ہو رہی ہیں۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا انیسہ! کہ تم ان اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آؤ گی۔ کان کھول کر سن لو تم جو چاہ رہی ہو نا، وہ میں ہونے نہیں دوں گی۔ تم میری نرمی اور شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو..... کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہو تم کہ میرے بچے کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہو..... یا یہ کہ میرے بیٹے کو کوئی لڑکی نہیں ملے گی..... ابا جو فیصلہ کر گئے ہیں نا! ان کی زندگی تک نبھا لیا میں نے۔ اب باز آئی میں..... صرف ایک وعدے کو نبھانے کے لیے میں اپنی پوری زندگی جہنم نہیں بنا سکتی۔"

رئیسہ بیگم اپنی چھت پر گردن اونچی کیے، سانس لیے بغیر بولے چلی جا رہی تھیں اور انیسہ بیگم اپنی چھت پر گردن جھکائے سانس روکے سنے جا رہی تھیں۔ وہ نہ تو دیوار سے جھانکنے کی ہمت کر پا رہی تھیں اور نہ ہی یہ سمجھ پا رہی تھیں کہ یہ باقاعدہ جنگ ہے یا طبل جنگ.....

رئیسہ بیگم صرف چلا رہی تھیں اور آئندہ کے عزائم بیان کر رہی تھیں، اپنے عتاب کی وجہ نہیں بتا رہی تھیں۔ جب سناتے سناتے تھک گئیں تو اتر گئیں۔

"نادیہ! کیا ہوا ہے؟" انہوں نے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"امی..... وہ یونیورسٹی..... سعد کے ساتھ..... خالہ

بی نے۔" نادیہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"میرے اللہ!" انہوں نے سر پکڑ لیا۔ "تمہیں پتا ہے نا آپائی کا...... پھر بھی تم نے......"

"آئی ایم سوری امی! آئندہ نہیں کروں گی۔ آئندہ کبھی آپ کو شرمندہ نہیں کرواؤں گی پلیز معاف کر دیں۔" وہ ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔ انیسہ بیگم نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا' اس نے نادم ہو کر نظریں جھکا لیں۔ وہ آزردہ ہو کر خاموش ہو گئیں۔ کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں۔ انہیں یہ تو اندازہ تھا کہ نادیہ نے معافی مانگ لی ہے یقیناً" اب وہ کبھی ایسا کام نہیں کرے گی مگر اپنی بڑی بہن کا کیا کریں جو انہیں بے نقط سنا گئی ہیں۔ پورے محلے کا تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں مگر اتنا یقین تھا کہ زبیدہ خالہ نے ضرور سنا ہو گا۔ انہیں رہ رہ کر شرمندگی ہو رہی تھی۔ اب انہیں سعد پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔ معاملات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے لیے ایک خبر ہے بھائی!" سعد یونیورسٹی سے آیا تو صائمہ نے اسے کھانا دیتے ہوئے کہا۔

"اچھی یا بری؟" سعد نے پلیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے پوچھا۔

"نہ اچھی' نہ بری...... مگر حیران کن۔"

"اچھا! تو پھر اسٹارٹ ہو جاؤ۔"

"ستار چاچا آئے تھے۔" صائمہ نے کہا۔

"ہیں؟" اس نے ہیں کو کھینچا۔ "یہ تو واقعی بڑی حیرت انگیز بات ہے۔" سعد نے مذاق اڑایا پھر یکدم تاسف سے کہنے لگا۔

"انہیں ساری بیٹیاں خود ہی رکھنی پڑی ہوں گی یار......!"

"نہیں' شہزاد بھی آیا تھا ساتھ۔"

"اوہ! تو یہ بھی حیران کن بات!" اس نے پھر مذاق اڑایا۔ "ویسے برا ہوا' ملاقات نہ ہو سکی۔ پہلی بار آیا تھا۔ فون کر دیتا تو میں جلدی آ جاتا یا جاتا ہی نہیں۔"

"افوہ! تم میری پوری بات سنو گے یا نہیں؟" وہ اس کے مسخرے پن سے غصہ میں آ گئی۔

"بس میری بہن! آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے' ورنہ میں حیرت سے مر جاؤں گا۔" اس نے پھر چھیڑا۔ اب کے وہ مزید سلگ گئی۔ "دفع ہو" کہہ کر رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔ منہ بھی پھلا لیا۔ سعد ہنس پڑا۔

"اچھا نا! ناراض کیوں ہو رہی ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے۔" اس نے صائمہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف دوبارہ موڑا۔

"بتانے والی بات یہ ہے کہ اماں نے ستار چاچا کو خود...... بصد اصرار...... کھانے پر روکا۔"

سعد کو اچھو لگ گیا۔ "واقعی؟" اس کا ہاتھ رک گیا۔

"ہاں اور کھاتے ہوئے مسلسل اصرار بھی کر رہی تھیں اور کھاؤ نا ستار!" صائمہ نے ماں کی نقل اتاری۔

"یار! یقین نہیں آ رہا۔" سعد نے پلیٹ کھسکا دی۔

"اب ایسی بھی بات نہیں کہ تم کھانا ہی چھوڑ دو۔"

"کھانا نہیں چھوڑ رہا۔ اب آم کھاؤں گا۔" صائمہ آم لے آئی۔

"تو کیا شہزاد کو بھی یہی کھانا کھلایا تھا۔ دال چاول۔ وہ پہلی بار ہمارے گھر آیا تھا۔" اسے اچانک خیال آیا۔

"جی نہیں ان کے لیے کڑاہی بنائی تھی چاول روٹی

بھی تھی۔ شامی کباب بھی اور رائتہ سلاد بھی۔ بہت طریقے اور احترام کے ساتھ تواضع کی تھی۔" صائمہ نے اس کی پریشانی بھانپ کر تسلی دی۔

"ویسے ــ مزے دار بات بتائی ہے۔" اس نے سر دھنتے ہوئے کہا۔ پتا نہیں اسے آم کھاتے ہوئے مزا آ رہا تھا یا بات سن کر۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ اماں نے ایسا کیوں کیا؟" صائمہ نے سادگی سے پوچھا۔

"میرے خیال میں......"

"اور بھئی بچو! کیا ہو رہا ہے۔" نصیر الدین کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں بچوں کو خوش گپیوں میں دیکھ کر مسرور ہوئے۔ انہوں نے بہت پیار سے اپنے بچوں کو دیکھا۔ ان کے دونوں بچوں نے ماں کے برعکس مزاج پایا تھا' ہمدردانہ اور دوستانہ۔ سعد قدرے لاپروا تھا مگر انہیں یقین تھا کہ اس کی زندگی خوب اچھی گزرے گی کیونکہ نادیہ بہت ٹھنڈے مزاج کی صلح جو طبیعت رکھتی تھی۔

"السلام علیکم ابا! آئیے آم کھائیے۔" سعد نے پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔ ان کا ارادہ نہیں تھا مگر بچوں کے ساتھ کھانے میں مزا آئے گا۔ یہ سوچ کر ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔

"ابا! ستار چاچا کہہ رہے تھے' اس دفعہ فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ سارا اضافی مال کل منڈی پہنچا دیں گے۔"

صائمہ نے ستار چاچا کا پیغام دیا۔ وہ سر ہلانے لگے۔ اسی وقت رئیسہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو سعد تھوڑا محتاط ہو گیا۔ کچھ دنوں سے ماحول میں کافی تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ رئیسہ بیگم سے خفا خفا تھا۔ انہوں نے اس واقعہ پر صرف اسی کے لتے نہیں لیے تھے بلکہ چھت پہ جا کر نادیہ اور خالہ کو بھی بے بھاؤ کی سنائی تھیں۔ نادیہ نے خوب رو رو کر اس سے شکوہ کیا تھا۔ اس نے صرف سعد کی وجہ سے ہی وہ پروگرام بنایا تھا۔ رئیسہ بیگم ان ہی لوگوں کے پاس ــ بیٹھ گئیں۔

"سنا ہے ثمینہ نے شہر میں گھر لے لیا ہے۔" انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"کون ثمینہ؟" نصیر الدین نے چونک کر پوچھا۔

"ستار کی بہن اور کون؟"

"اچھا وہ...... ہاں ہاں' کافی دن ہو گئے ہیں اب تو۔" انہیں یاد آ گیا۔

"آپ نے بتایا نہیں۔"

"بیگم! آپ تو ستار کے کسی رشتے دار کا نام تک سننا پسند نہیں کرتیں۔ وہ تو ستار کی سگی بہن ہے۔" ان کی بات پر وہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔

"پرسوں شام کو کیا کر رہے ہیں آپ۔ کہیں جانا تو نہیں ہے؟"

"نہیں آپ کام بتائیے۔" انہوں نے آم کھاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"مجھے ثمینہ کے گھر لے چلیں۔"

سعد' صائمہ' نصیر الدین...... تینوں نے استعجاب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی حیرانی کو رئیسہ بیگم نے بھی دیکھ لیا۔ منہ بنا کر بولیں۔

"ایسی بھی کیا انوکھی بات کہہ دی میں نے۔ ستار میرا سسرالی رشتے دار ہے۔ سسرالی ویسے ہی دل سے قریب نہیں ہوتے' اس لیے بس ذرا اس کے ساتھ......"

"آپ کی تو سگی بہن بھی آپ کے دل کے قریب نہیں ہیں۔ ستار چاچا کیا ہوں گے۔" سعد نے دل میں سوچا۔

"وہ تو میں اس کے اتنا سارا کھانا کھانے سے خائف رہتی تھی' ورنہ اور تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ کے تمام ملنے جلنے والوں کا احترام کرتی ہوں۔"

"جی جی ٹھیک کہا آپ نے۔ سعد کے ساتھ چلی جائیے گا۔ میں شاید مصروف ہوں گا۔"

"نہیں آپ ہی لے جائیے گا۔ سعد کی تو شاید تیسری انگز ہوں گی۔"

انہوں نے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ کہا۔ سعد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ آم کھاتا رہا۔ اسے مسلسل نادیہ کی روتی ہوئی آواز سنائی دے

رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

دو دن بعد صائمہ کے پاس سعد کو سنانے کے لیے پھر ایک مزے دار اسٹوری تھی۔

"اماں آم کی پیٹی اور دو کلو مٹھائی لے کر گئی تھیں۔ واپسی میں بھی بڑی خوش تھیں۔ موڈ بہت اچھا تھا۔ چار گھنٹے بیٹھی تھیں ان کے گھر کہہ رہی تھیں' میرا تو اب بھی آنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"کیوں ایسا کیا تھا ان کے گھر میں' پوچھا نہیں؟" سعد نے کہا۔

"اماں کی مصروفیت ختم ہو تو پوچھوں۔ آنے کے بعد بھی کمرے میں گھنٹہ بھر سے ابا کے ساتھ پتا نہیں کون سی میٹنگ کر رہی ہیں۔"

"حیرت کی بات نہیں ہے؟ کہاں تو اماں ستار چاچا کے نام بھی سننا پسند نہیں کرتی تھیں اور اب حال یہ ہے کہ مٹھائیاں لے کر جا رہی ہیں۔ مجھے تو دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

سعد نے غور سے ایک نظر صائمہ کو دیکھ کر کہا۔ صائمہ نے لاعلمی سے کندھے اچکا دیے۔ رات رئیسہ بیگم کا خوشی سے چمکتا چہرہ ان دونوں کو تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

"شہزاد تمہارے ساتھ پڑھتا ہے' تم نے کبھی بتایا نہیں۔" انہوں نے سعد سے کہا۔

"آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اس دن کے بعد سے اب وہ کافی خاموش رہنے لگا تھا۔

"تو مجھے کیا خبر تھی جو میں پوچھتی۔" انہوں نے اچنبھے سے کہا۔

"مجھے بھی پتا نہیں تھا اماں! کہ یہ خبر آپ کے لیے بہت اہم ہو گی' ورنہ ضرور بتاتا۔" اس نے ہنوز اسی انداز سے جواب دیا۔ بتانے کو تو اس کے پاس بہت کچھ تھا' جسے رئیسہ بیگم سنتیں تو حیرت کے مارے بے ہوش ہو جاتیں۔ انہیں سعد کی سنجیدگی کھل رہی تھی

۔ جل کر کہنے لگیں۔

"ہاں' جیسے اپنی خالہ کے بارے میں ہر بات بتاتے ہو۔"

سعد نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس کھانا چھوڑ کر چلا گیا۔ نصیر الدین خاموشی سے دیکھ کر رہ گئے۔ صائمہ ملول ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

رئیسہ بیگم ہر ہفتے ثمینہ آنٹی کے گھر پہنچ جاتی تھیں۔ آج بھی وہ سعد کے ابا کو زبردستی لے کر چلی گئیں۔ وہ منع بھی کرتے رہے کہ اتنا جانا مناسب نہیں لگتا لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی۔ صائمہ کچن میں تھی۔ سعد صحن میں تخت پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا پتھر اس کے قریب آ کر گرا۔ اس نے فوراً" سر ہٹا لیا' ورنہ عین اس کے سر پر گرتا۔ عام دنوں میں وہ ایسے غیر متوقع حملوں پر خوشی سے اچھل پڑتا تھا اور چھلانگ لگا کر چھت پر دوڑ لگاتا تھا۔ پتھر اگر سر پر بھی لگ جاتا تو خوشی کا باعث ہوا کرتا تھا مگر ابھی اسے یوں لگا جیسے وہ پتھر اسے جان بوجھ کر مارا گیا۔ ہو۔ اپنا بدلہ لینے کے لیے.....

"صائمہ! چھت پہ جا رہا ہوں خیال رکھنا۔" اس نے صائمہ کو آواز لگائی۔

"وش یو بیسٹ آف لک بھیا۔" اس نے کچن سے ہی ہانک لگائی۔

سعد کے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اوپر جانے کے لیے تیزی سے قدم بڑھائے مگر آج اس کے انداز میں جوش نہیں تھا۔ وہ نادیہ سے شرمندہ تھا۔ اس کے لیے اس کا سامنا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ دیوار کی منڈیر پر نادیہ جھانک رہی تھی۔ اداس چہرے اور شکوہ کرتی نظروں کے ساتھ تقریباً" ایک ہفتے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"کیسی ہو؟" سعد نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے سامنے ہوں۔" سعد نے ایک نظر ڈالی اور چپ رہا۔ کافی دیر کی خاموشی کے بعد نادیہ ہی بولی۔

"مبارک ہو' بہت بہت۔"

"کس بات کی؟" سعد چونکا۔

"تمہاری شادی ہونے والی ہے نا بینا سے۔" اس نے گویا دھماکا کیا۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا..... کس کی شادی..... کون بینا؟" وہ یکدم بھڑک گیا۔

"غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب مجھے پتا چل گیا ہے تو تم کیسے بے خبر ہو سکتے ہو؟" نادیہ نے جواباً" اس سے زیادہ بھڑک کر کہا۔ سعد ایک بار پھر چونک گیا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو نادیہ! سچ! میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا۔" وہ قدرے دھیما پڑ گیا۔

"خالہ بی میں نے ثمینہ آنٹی سے بینا کا رشتہ مانگا ہے تمہارے لیے۔" آہستگی سے کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم!" سعد ششدر رہ گیا۔

"نہیں تو تم سے..... تم سے کس نے کہا؟"

"بینا نے بتایا ہے اور ابھی بھی خالہ بی وہیں گئی ہوئی ہیں۔ مجھے سب پتا ہے۔ پتا تو تمہیں بھی ہے' بس میرے سامنے انجان بن رہے ہو۔" نادیہ نے بے اعتباری سے کہا۔

"نہیں نادیہ! یقین کرو میں....." سعد حقیقی معنوں میں پریشان ہو گیا۔ اس دن خالہ اور نادیہ سے جھگڑا کرنے پر وہ رئیسہ بیگم سے ناراض ہو گیا تھا۔ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا۔ گھر میں ہوتا تو خاموش خاموش رہتا۔ بس ضروری بات چیت کر لیتا۔ وہ کچھ پوچھتیں تو تمیز سے جواب دے دیتا' خود سے کوئی بات نہیں کرتا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اماں آج کل ثمینہ آنٹی کے گھر بہت جا رہی ہیں مگر اس کا خیال تھا کہ اماں کو شہزاد پسند آ گیا ہے اور وہ صائمہ کے لیے سوچ کر راہ و رسم بڑھا رہی ہیں مگر اندر ہی اندر وہ یہ سب کر رہی ہوں گی' اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔

نادیہ کو یوں پتا تھا کہ بینا اور نادیہ نے ایک ہی کالج سے پڑھا تھا اور اب گریجویشن بھی دونوں ساتھ ہی کر رہی تھیں۔ اس کا بھائی شہزاد' سعد کے ساتھ پڑھتا تھا اور یہ بات رئیسہ بیگم کے علاوہ سب کو معلوم تھی۔ سعد کو یقین آ گیا کہ نادیہ غلط نہیں کہہ رہی مگر شہزاد نے اسے کیوں نہیں بتایا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"میں شہزاد سے بات کرتا ہوں۔" سعد نے کہا اور اترنے لگا۔

"سعد!" نادیہ کے پکارنے پر وہ رک کر پلٹا۔

جب وہ چھت پر آیا تو نادیہ کا چہرہ اترا ہوا تھا' پھر بات کرتے کرتے آنکھیں بھیگنے لگی تھیں' پھر آواز رندھ گئی اور اب باقاعدہ آنسو بہہ رہے تھے۔ سعد تڑپ کر رہ گیا۔ کافی دیر تک وہ کچھ بول ہی نہیں پایا' بس دیکھے گیا۔ وہ کھلنڈرا سا سعد' جس کے بارے میں نادیہ کی رائے تھی کہ یہ کبھی بھی سنجیدہ نہیں ہو سکتا' اب شدت ضبط سے سرخ چہرہ لیے کھڑا تھا' سنجیدگی و پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ دو قدم اس کے قریب آیا اور سر اونچا کر کے کہنے لگا۔

"پریشان نہ ہو' کچھ نہیں ہو گا۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور شادی بھی تجھ ہی سے کروں گا اماں کو راضی ہونا پڑے گا اور اگر اماں نہ مانیں تو..... تو پھر میں ہی نہیں رہوں گا پھر اماں بے شک کسی سے بھی رشتہ مانگتی رہیں..... اتنا تو اعتبار کر سکتی ہے نا مجھ پر؟" گمبھیر آواز میں بولتا ہوا وہ کہیں سے بھی پہلے والا شوخ اور لاابالی سعد نہیں لگ رہا تھا۔ نادیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے سر ہلایا۔

سعد نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ آم کی خالی تین پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ رئیسہ بیگم کا دھیان اب سعد کی طرف سے ہٹ گیا تھا۔ وہ اپنی ہی سرگرمیوں میں مصروف رہنے لگی تھیں۔ اس نے تینوں پیٹیوں کو ایک دوسرے پر رکھا اور چڑھ گیا۔ دونوں کو بہت کچھ یاد آ گیا۔ چڑھ کر اس نے منڈیر پر رکھے ہوئے نادیہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"مسکراتی رہا کر۔" اور نیچے اتر گیا۔ نادیہ کی آنکھوں میں پھر آنسو بھرنے لگے۔ سعد ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے نیچے اتر

گیا۔

"کیا ہوا' خیریت ہے نا!" نیچے صائمہ نے پوچھا تو سعد نے ساری بات بتادی۔

"بھائی! یہ تو بہت غلط ہو جائے گا۔ اماں بہت برا کر رہی ہیں۔ کچھ کرو۔"

سعد سر جھکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ صائمہ ملال سے اسے دیکھے گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو شہزاد! ابا تمہاری طرف ہی ہیں نا؟" سعد نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"ہاں مگر ابھی کچھ ہی دیر ہوئی ہے' وہ نکل چکے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"یار...! تم نے بتایا نہیں کہ اماں نے...." سعد ہچکچایا۔

"کیا بتاتا یار! میں تو خود حیران رہ گیا کہ تمہاری بات تو تمہاری خالہ زاد سے طے ہے اور تم اسے شاید پسند بھی کرتے ہو۔"

"شاید نہیں شہزاد یقیناً" صرف پسند نہیں کرتا' محبت کرتا ہوں بہت اور شادی بھی اسی سے کروں گا۔ بینا.... بینا کو تو میں بالکل صائمہ کی طرح سمجھتا ہوں۔ تم تو سب جانتے ہو شہزاد!" سعد نے تیزی سے کہا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اماں اس حد تک چلی جائیں گی۔ چھوٹے موٹے اختلافات تو اماں اور خالہ میں اکثر ہوتے ہی رہتے تھے مگر...." سعد صحیح معنوں میں پریشان ہو گیا تھا۔

"تم کیوں پریشان ہو رہے ہو سعد! میں۔" شہزاد نے شاید اسے تسلی دینا چاہی تھی۔ سعد نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"پریشان؟ یار! میری جان پر بن گئی ہے اور تم کہہ رہے ہو میں پریشان نہ ہوں؟ میری اماں — بے کار کی انا کے چکر میں میری زندگی سے کھیلنے لگی ہیں اور مجھے پتا ہی نہیں.... تم خود سوچو' جب بینا نے نادیہ کو بتایا ہو گا تو اس نے کس طرح برداشت کیا ہو گا۔ یار.... ! میں اس کی ذرا سی بھی تکلیف نہیں برداشت کر سکتا۔" سعد رو دینے کو تھا۔

"ستار چاچا نے کیا سوچا ہو گا' جب اماں نے یہ بات کی ہو گی اور ثمینہ آنٹی بھی تو...." اسے رہ رہ کر شرمندگی ہو رہی تھی۔

"کیا بات کرتے ہو سعد! ہم دونوں کے باپ بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ہمارے بچپن سے نہیں' ان کے اپنے بچپن سے.... تو کیا ابو یہ بات نہیں جانتے ہوں گے کہ تم اپنی کزن سے منسوب ہو؟ وہ تو یار! آنٹی' ہم لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتیں ورنہ کیا ہم ایک دوسرے کے خاندان کے بارے میں جانتے نہیں ہیں؟ تم خود ہی بتاؤ۔"

شہزاد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

اور دوسرے یہ کہ ابو نے کچھ بھی نہیں سوچا بلکہ کسی نے کچھ نہیں سوچا.... بلکہ ہمیں کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"کیوں؟" وہ حیران ہوا۔

"وہ اس لیے کہ بینا بچپن سے ہی ثمینہ آنٹی کے فرحان سے منسوب ہے۔"

"یعنی وٹہ سٹہ؟" سعد خوشی و حیرانی سے بولا' دوسری طرف شہزاد زور سے ہنس پڑا۔ سعد کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اس کے خیال میں رئیسہ بیگم نے بینا کی بات کر کے اسے شہزاد اور ستار چاچا کی نظر میں ہلکا کر دیا تھا اور پھر جو وہ انکار کرتا (جو کہ یقیناً" کرتا) تو پھر شاید کبھی ان کی نظروں میں وہ مقام نہ بنا پاتا۔ رئیسہ بیگم کے تو گمان میں بھی یہ بات نہیں ہو سکتی تھی کہ سعد کی ستار کے گھر والوں سے کتنی دوستی ہے۔ صائمہ اور نصیر الدین بھی یہ بات خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ نادیہ اور بینا بھی بہت اچھی سہیلیاں ہیں۔

☼ ☼ ☼

ایک مہینے بعد ستار چاچا کے بارے میں رئیسہ بیگم کے پرانے خیالات لوٹ آئے۔ ستار چاچا نے بینا کا

رشتہ منع کر دیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے بتایا تھا کہ بینا ٹھیکرے کی مانگ ہے۔ پھر بھی انہیں شدید غصہ آیا۔ گھر آ کر بھی خوب برہم ہوتی رہیں۔

"کیا تھا اگر ثمینہ کو منع کر دیتا۔ میرا سعد اس کے فرحان سے زیادہ بہتر ہے۔ خوب صورت ہے اور پڑھا لکھا بھی۔ اپنا کاروبار ہے۔ بچپن کی منگنی کی ایسی کون سی اہمیت ہوتی ہے۔ توڑ دیتا۔"

"جی بالکل جس طرح آپ نے اپنے بیٹے کی بچپن کی منگنی توڑ دی.... آرام سے۔" نصیر الدین نے طنزیہ کہا۔ انہیں خود بھی سبکی کا احساس ہوا تھا۔

"آپ کو اگر اپنی بہن سے محبت نہیں تو اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ کسی کو بھی اپنی بہن سے محبت نہیں ہو گی۔ ستار کو اپنی بہن بھی پیاری ہے اور اپنا بھانجا بھی۔"

"ہونہہ! ایسے بھی کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے ہوئے اس کی بہن اور بھانجے میں۔" رئیسہ بیگم نے بڑی عجیب بات کی۔

"وہ تو ہمارے سعد میں بھی نہیں لگے ہوئے۔"

"بس رہنے دو۔ بینا کوئی آخری لڑکی نہیں تھی اس دنیا میں۔ میں اپنے بیٹے کے لیے ہیرا ڈھونڈ نکالوں گی۔ تم سب حیران رہ جاؤ گے۔ دیکھنا۔"

"ہیرے کی پہچان ہے آپ کو؟" نصیر الدین آج پتا نہیں کس موڈ میں تھے۔ رئیسہ بیگم تلملا کر اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

انیسہ بیگم اور عبدالقدوس خاموش بیٹھے تھے۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ نادیہ کچن میں تھی۔ انہیں کل ہی پتا چلا تھا کہ رئیسہ بیگم نے سعد کے لیے اب طاہر کی بہن کا رشتہ مانگا ہے۔

"میں اپنی بیٹی کی مزید تذلیل برداشت نہیں کر سکتی۔ آپا بی جس سے چاہیں' سعد کی شادی کرتی رہیں' میری بلا سے۔ میں ان سے پہلے نادیہ کی شادی کر کے دکھاؤں گی اور وہ بھی سعد سے لاکھ درجے اچھے لڑکے سے۔"

وہ غصہ میں بولیں۔ ادھر کچن میں پیاز کاٹتی نادیہ کی آنکھیں تیزی سے گیلی ہونے لگیں۔

"اور یہ بات بھی بتا دوں کہ میری بیٹی سے اچھی کوئی لڑکی انہیں ملے گی نہیں' پچھتائیں گی وہ ایک دن۔" انیسہ بیگم آج بہت بھری بیٹھی تھیں۔

"وہ پچھتائیں گی یا نہیں' وہ ان کا مسئلہ ہے اور بہت بعد کا مسئلہ ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اپنی ضد و غصے میں اپنی ہی بچی کا تو نقصان نہیں کر رہے۔" عبدالقدوس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپا بی کو سمجھانا بہت مشکل کام ہے۔ ان کا مقابلہ مصلحت سے کیا جا سکتا ہے۔ ان ہی جیسا انداز اپنا لینے سے ہم یقیناً" اپنا نقصان کریں گے۔ جبکہ ہمیں اپنی بچی کی خوشیاں لوٹانی ہیں۔"

انیسہ بیگم نے فوراً" ان کی بات سمجھ لی مگر تھکے ہارے انداز میں کہنے لگیں۔

"ہمیں کب انکار ہے اس کی خواہش سے۔ اس کی خوشی میں ہماری بھی خوشی ہے مگر حالات جیسے ہو گئے ہیں' اس کے علم میں بھی ہے۔ اسی کو سمجھ جانا چاہیے اب۔"

انیسہ بیگم نے در پردہ اسے بھول جانے کی تلقین کی تھی۔ نادیہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ کیا کرے اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک خالہ بی دو گھروں کی خوشیاں چھیننے بیٹھی ہیں۔ خالہ بی اسی طرح اڑی رہیں تو کیا.... وہ بے بسی سے رو پڑی۔ ایک دم اسے اپنے ابو کی بات کی بازگشت سنائی دی۔ "آپا بی کا مقابلہ مصلحت سے کیا جا سکتا ہے۔ ان جیسا انداز اپنا لینے سے ہم اپنا ہی نقصان کریں گے۔"

"نہیں۔ خالہ بی کا مقابلہ ان ہی جیسا انداز اپنا کر کیا جا سکتا ہے۔" اس نے سختی سے آنسو پونچھے۔

☼ ☼ ☼

"آؤ آؤ رئیسہ! اچھا ہوا تم خود ہی آ گئیں۔ میں آنے والی تھی تمہاری طرف۔" زبیدہ خالہ نے پاندان

کھسکاتے ہوئے تخت پر ان کے لیے جگہ بنائی۔
"کیا کہا ان لوگوں نے؟" انہوں نے بے صبری سے پوچھا۔
"پان کھاؤ گی؟" انہوں نے جیسے رئیسہ بیگم کی بات سنی ہی نہیں۔
"نہیں۔ تم ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔" رئیسہ بیگم کو جلدی تھی۔
"ارے شہلا!" انہوں نے اپنی بہو کو آواز دی۔
"اپنی خالہ کے لیے چائے تو بنا لاؤ ذرا۔"
"ارے پرے کرو چائے کو۔ تم یہ بتاؤ۔ ان لوگوں نے کیا جواب دیا۔" وہ جھنجلا گئیں۔
"منع کر دیا ان لوگوں نے۔" زبیدہ خالہ نے ایک جھٹکے سے جواب دیا۔
رئیسہ بیگم ایک لمحے کو سکتے میں آ گئیں۔ کافی دیر تک بے یقینی سے زبیدہ خالہ کو دیکھتی رہیں۔
"کیوں؟" بہت دیر بعد ان کے منہ سے سرسراہٹ ہوئی۔ زبیدہ خالہ کے چہرے پر ہلکی سی استہزائیہ ہنسی نظر آئی۔
"کیوں کا کیا سوال ہے بھئی! سیدھی سی بات ہے، انہیں صائمہ پسند نہیں آئی۔"
"کیوں..... کیا کمی ہے میری بیٹی میں؟" ان کی نظر میں صائمہ کا سراپا گھوم گیا۔ گندمی رنگ، مناسب خدوخال، متناسب جسم، پڑھی لکھی، باحیا، سلیقہ مند..... انہوں نے دل گرفتگی سے سوچا۔
"کمی تو کسی کی بیٹی میں نہیں ہوتی رئیسہ! بس بیٹے کی ماں کی آنکھ میں سمونے کی گنجائش کم ہوتی ہے۔"
چار دن پہلے زبیدہ خالہ کے توسط سے صائمہ کا ایک رشتہ آیا تھا۔ اچھے مناسب لوگ تھے۔ ان کے کسی انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ انہیں صائمہ پسند نہیں آئی۔ پہلے تو وہ رئیسہ خالہ کا انتظار کرتی رہیں پھر جب صبر نہ ہو سکا تو خود ہی چل پڑیں اور اب ان کا خلاف توقع جواب سن کر چپ بیٹھی تھیں۔
"دیکھو رئیسہ! ہر شخص بہترین اور اعلا چیز کی خواہش رکھتا ہے۔ یہ سب کا حق ہے۔ اس حق کو تم نے بھی تو استعمال کیا ہے۔ پہلے اپنا دل بڑا کرو، تمہاری جگہ بھی خود بہ خود بن جائے گی۔"
انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ عجیب سی کیفیت میں گھری تھیں۔
"تم فکر مت کرو۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ وہ بہتر اسباب پیدا کرنے والا ہے۔ ہماری صائمہ بہت اچھی ہے۔ دیکھنا! اللہ اس کے لیے بہت اچھا بندوبست کرے گا۔ یہ لو چائے پیو۔" شہلا نے چائے لا کر رکھی تو انہوں نے کپ ان کی طرف بڑھایا۔ رئیسہ بیگم نے بے دلی سے چائے پی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☼ ☼ ☼

اپنے خیالات میں گم، بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی جانب بڑھتے ہوئے پتا ہی نہیں چلا کہ انیسہ بیگم کے دروازے کے سامنے ہیں۔ دروازے پر نادیہ کھڑی اخبار والے سے بات کر رہی تھی۔ اس کی نظر بھی اسی وقت ان پر پڑی۔ پہلے تو اس نے گھبرا کر اندر جانا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔
"السلام علیکم خالہ بی۔" اس نے دروازے سے ذرا آگے ہو کر کہا۔ وہ رک کر بے توجہی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔
"کیسی ہیں خالہ بی!" سلام کا جواب نہ پا کر اس نے سوال کیا۔
"تم کیسی ہو؟"
"جی میں ٹھیک ہوں۔ اندر آجائیے نا!" اس نے جھجکتے ہوئے کہا اور پیچھے ہٹتے ہوئے انہیں اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ رئیسہ بیگم نے غیر ارادی طور پر قدم بڑھا دیا۔ آج انہوں نے تقریباً" پانچ سال بعد اس دہلیز کو پار کیا تھا۔ دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ نادیہ دروازہ بند کر کے اندر لپکی۔
"امی..... امی!"
"کیا ہوا، کیوں اتنی زور زور سے..... آپا بی آپ....." حیرت کی زیادتی سے آگے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ نادیہ نے ٹھوکا۔ "آئیے نا آپا بی.....!" وہ آگے بڑھیں۔

"نہیں، چلتی ہوں۔" وہ پلٹنے لگیں۔
"اب یہاں تک آ گئی ہیں تو اندر بھی آجائیے نا! سچ میں کوئی سوال نہیں کروں گی۔" انہوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھاما اور خاموش نظروں سے کمرے کی طرف چلنے پر اصرار کیا۔ رئیسہ بیگم میکانکی انداز میں اندر چل پڑیں۔
"نادیہ! چائے لاؤ۔" ان کی آواز میں خوشی کی وجہ سے کپکپاہٹ آ گئی۔ نادیہ وہیں سے کچن میں چلی گئی۔
"خیریت ہے آپا بی! آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔"
"ہوں..... نہیں کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔" انہوں نے گول مول سا جواب دیا۔
نادیہ نے چائے کے ساتھ بسکٹ اور سوجی کا حلوہ بنا کر ان کے سامنے رکھا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ رئیسہ بیگم نے غور سے اسے دیکھا۔ آج بڑے عرصے بعد انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ اچھی خاصی پیاری تھی۔ ان کی اکلوتی بھانجی، ان کے بیٹے کی پسند، ان کے والد کا فیصلہ..... آج صائمہ کو کسی نے رد کیا تو انہیں اتنا دکھ ہوا اور وہ خود جو اتنے عرصے سے اعلانیہ اس لڑکی کو ٹھکراتی چلی آ رہی تھیں.....؟ انہوں نے محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ ان کی طرح ان کی بہن بھی اپنی بیٹی کی جلد اور اچھی جگہ شادی کی نا صرف خواہش رکھتی ہے بلکہ حق بھی رکھتی ہے۔ اس کے باوجود وہ آج تک اپنی بیٹی کو اپنے والد کے فیصلے کے حوالے کیے ہوئے ہے جبکہ وہ خود بے بنیاد انا کے چکر میں کئی زندگیاں برباد کر رہی ہیں۔
اکلوتا بیٹا، اکلوتی بھانجی، اکلوتی بہن..... ان کی جنگ، ان کا انکار دراصل ہے کس بات پر..... ان کا مطالبہ کیا ہے..... وہ انیسہ سے کیا منوانا چاہتی ہیں..... کچھ نہیں۔ تو پھر..... یہ جھگڑا..... یہ انکار..... یہ بے رخی کس بات کی..... وہ کون سی ضد تھی، جس نے دیوار پار رہنے والی بہن کے گھر جانے سے پانچ سال روکے رکھا..... وہ نہ جانے کیا کچھ سوچے چلی جاتیں، اگر زبیدہ خالہ اپنی کرخت آواز میں انیسہ بیگم کے گھر میں ان کی موجودگی پر حیرانی کا اظہار نہیں کرتیں۔
"ارے رئیسہ! تم یہاں..... حیرت ہے! کوئی خاص بات ہے کیا؟" وہ ان ہی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔ رئیسہ بیگم کھسیانی سی ہو گئیں، پھر قدرے سنبھل کر کہنے لگیں۔
"میری تو بہن کا گھر ہے یہ۔ تم بتاؤ، تم کیسے آئیں یہاں۔"
"اوہو! بڑی جلدی خیال آگیا کہ یہ تمہاری بہن کا گھر ہے۔" زبیدہ خالہ نے طنزیہ کہا تو وہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔
"آپ چائے پئیں زبیدہ باجی۔" انیسہ بیگم نے بات سنبھالی۔
"صرف چائے نہیں، مٹھائی بھی منگواؤ۔" انہوں نے کہا۔
"مٹھائی؟" وہ حیران ہوئیں۔
"ارے بھئی! ان لوگوں نے ہماری نادیہ کے لیے ہاں کہہ دی۔" رئیسہ بیگم نے چونک کر انیسہ بیگم کو دیکھا، ان کے چہرے پر ان سے زیادہ تعجب تھا۔
"تم نے نادیہ کا رشتہ طے کر دیا؟" انہوں نے پہلی مرتبہ انیسہ بیگم کو مخاطب کیا۔
"جی وہ..... آپا بی۔" وہ ہکلا گئیں۔ آپا بی کی تیز نظریں ان کے چہرے پر جمی تھیں۔
"کس سے؟" وہ گھور رہی تھیں۔
"کس سے؟" انہوں نے گھبراہٹ میں سوال دہرا دیا، پھر زبیدہ خالہ کی طرف دیکھنے لگیں۔
"تم چھوڑو، میں بتاتی ہوں۔" وہ ان کی مدد کو تیار ہوئیں۔
"تمہاری طرح انیسہ نے بھی مجھ سے نادیہ کے لیے رشتہ دیکھنے کو کہا تھا۔ میرے پاس دو رشتے تھے۔ ایک تمہارے گھر لے آئی، ایک انیسہ کے۔ صائمہ والوں نے انکار کہلوا دیا جبکہ اظہر کی ماں نے نادیہ کو پسند کر لیا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ تم یہاں ہو، ورنہ میں ابھی نہیں آتی..... اچھا نہیں لگتا نا، حالانکہ اس میں قصور تو انیسہ کا کوئی نہیں کہ تم بھی تو اپنے سعد کے لیے

لڑکیاں دیکھتی پھر رہی ہو مگر پھر بھی...."

زبیدہ خالہ کی پوری بات سن کر رئیسہ بیگم کی رگیں تن گئیں۔ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ نادیہ پر ڈالی تو اسے شرماتے ہوئے پایا۔ سلگ کر انیسہ بیگم کو دیکھا تو ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"یہ سب کیا ہے انیسہ!" تم بھول گئیں کیا کہ نادیہ کا رشتہ میر سعد سے طے ہے' جو کہ ہمارے ابا نے ان کے بچپن میں ہی طے کر دیا تھا' پھر تم...."

"ارے کون سے رشتے بی بی! وہ جسے آج تک تم نے قبول ہی نہیں کیا؟" انیسہ بیگم کے بجائے زبیدہ خالہ نے جواب دیا۔

"اگر ایسا تھا تو پھر تم کیوں اپنے بیٹے کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہو۔ اگر انیسہ...."

"تم ہمارے بیچ میں مت بولو زبیدہ! یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔" رئیسہ بیگم نے تنک کر زبیدہ خالہ کی بات کاٹی۔

"مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے تمہارے معاملے میں بولنے کی ہونہہ۔" زبیدہ خالہ نے بھی ان ہی کی طرح جواب دیا۔

"انیسہ! میں نے کل اظہر لوگوں کی طرف جانا ہے۔ مجھے رات تک جواب کہلوا دینا اور سنو! ہاں کر دینا۔ بہت اچھا رشتہ ہے۔ پھر کسی کی باتوں میں آ کر بے وقوفی مت کر جانا۔ لڑکا ڈاکٹر ہے' اکلوتا اور خوب صورت۔ بڑا سارا گھر ہے۔ پھر نہیں ملے گا ایسا لڑکا۔"

انہوں نے تیزی سے بولتے ہوئے ایک جتاتی نظر رئیسہ بیگم پر ڈالی اور چادر سنبھالتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی رئیسہ بیگم نے پھر کڑی نظروں سے انیسہ بیگم کو دیکھنا شروع کر دیا۔

"خبردار جو ہاں کی انیسہ! بے شک وزیر اعظم ہو وہ لڑکا' منع کر دو۔ نادیہ کی شادی میرے سعد سے ہوگی بس کہہ دیا میں نے۔ یہ ہمارے ابا کا فیصلہ تھا۔ تم اختلاف نہیں کر سکتیں اس سے۔ ابا کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ میں اگلے ہفتے آؤں گی باقاعدہ منگنی کرنے۔ تیاری کر لو.... اور زبیدہ کو منع کروا دو۔"

رئیسہ بیگم نے غصہ میں دیرینہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔ جھوٹی انا رکھنے والے لوگ دراصل بے وقوف اور بزدل ہوتے ہیں۔ نادیہ گلنار ہو رہی تھی اور انیسہ بیگم پر اچانک اتنا بڑا مسئلہ حل ہو جانے پر شادی مرگ کی کیفیت تھی۔

"آپا بی....!" ان کے منہ سے خوشی کے مارے آواز بھی گھٹی گھٹی سی نکلی۔

"کیا آپا بی؟ میں اب بالکل تاخیر نہیں چاہتی۔ قدوس کو بھی بتا دینا۔ بہت ہی ست آدمی ہے۔ جب بھی کوئی بڑا کام ہوتا ہے گھر میں' بیمار پڑ جاتا ہے۔ اب بچوں کی شادی آ گئی ہے سر پر تو کہیں پھر نہ بیماری لے کر بیٹھ جائے۔" انہوں نے خوامخواہ بہنوئی کو لتاڑ دیا۔ چادر سنبھالتے ہوئے اٹھیں۔ نادیہ پر ایک نظر ڈالی۔ کھینچ کر گلے لگایا اور لاڈ بھری جھڑکی دی۔

"بس' بہت پڑھ لیا۔ اب تیاری کر۔" سر پر بوسہ دیا اور نکل گئیں۔ انیسہ بیگم حیران پریشان کھڑی تھیں۔ نادیہ ان کے قریب آئی اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھایا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے نادیہ کی طرف دیکھا۔

"نادیہ.... کیا ہے یہ سب؟"

"امی.... وہ.... میں نے بلوایا تھا زبیدہ خالہ کو۔"

انیسہ بیگم نے سر پکڑ لیا۔

"یہ کیا حرکت کی نادیہ! آپا بی کو پتا چلے گا تو قیامت کھڑی کر دیں گی۔"

"امی! کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہ دیکھیے کہ کتنا بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔"

"لیکن نادیہ....!" انیسہ بیگم سچ مچ بوکھلا گئی تھیں۔ "تم جانتی نہیں ہو کیا اپنی خالہ بی کو؟"

"جانتی ہوں امی! اچھی طرح جانتی ہوں' جب ہی یہ حرکت کی۔ آپ خالہ جی سے جتنے چاہیں مذاکرات کر لیتیں۔ وہ اپنے بے بنیاد موقف پہ ڈٹی رہتیں۔ امی! معاف کیجیے گا۔ وہ آپ کی بڑی بہن ہیں مگر ہیں بے وقوف انہوں نے ہمیشہ ہر چھوٹی بڑی بات پر آپ سے اختلاف کیا' مگر آپ خود سوچیں' کیا وہ درست ہوتی تھیں؟ وہ آپ سے جیلس نہیں ہیں امی! آپ سے

خائف ہیں۔ جب ہی انہوں نے کبھی کسی سے آپ کی برائی نہیں کی' بس آپ سے ہی اختلاف کرتی تھیں آپ کو مرعوب کرنے کے لیے۔ اندر سے خوف زدہ لوگوں کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اونچا اونچا بول کر خود کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خالہ بی دراصل بے وقوف اور سیدھی سادی خاتون ہیں۔ اپنے آپ کو منوانے کے لیے انہیں یہی طریقہ سمجھ میں آیا اور تب ہی ہماری احتراماً" خاموشی کو وہ اب تک اپنی جیت سمجھتی آئی ہیں اور اب جبکہ ان کے احساس برتری پر چوٹ لگی تو وہ تلملا کر وہی فیصلہ سنا گئیں جس سے اب تک انحراف کرتی آئی تھیں اور ایک لمحہ کو بھی یہ نہیں سوچا کہ ان کے علاوہ باقی سب لوگ یہی تو چاہ رہے تھے۔"

نادیہ نے انیسہ بیگم کو رسانیت سے سمجھایا اور وہ کوئی رئیسہ بیگم تھوڑی ہی تھیں' جو نہ سمجھتیں.... مسکرا کر دونوں ہاتھوں کے پیالے میں نادیہ کا چہرہ لے کر بے ساختہ اسے چوم لیا۔ نادیہ بھی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

سبز اور بسکٹی رنگ کے امتزاج کا شیفون کا فراک پاجامہ' جس پر گورے کا خوب صورت اور مہین کام بنا ہوا تھا۔ سر پر بڑا سا دوپٹا جس کے بارڈر پر بھی فراک جیسا کام تھا۔ اونچی ہیل' دونوں ہاتھوں میں بھری بھری چوڑیاں اور پھولوں کے کنگن' بالوں میں موتیا کا گھنا سا گجرا.... گلابی لپ اسٹک اور گہرا کاجل....

آج نادیہ کی رسم منگنی ہے۔ مشترکہ تقریب ہے' سو دولہا میاں بھی آئے ہوئے ہیں۔ سفید کاٹن کا کڑکڑاتا ہوا شلوار قمیص' جس کے گریبان پر ہلکے پیلے رنگ کی نفیس سی کڑھائی ہوئی تھی۔ سلیم شاہی کھسے اور سلیقے سے بنے ہوئے بال۔ آج تو سعد کی خوشی دیدنی تھی۔ مسکراہٹ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

دونوں گھروں کی پہلی خوشی تھی' اس لیے بڑی دھوم دھام کی ہوئی تھی۔ ستار چاچا بڑے بڑے ٹوکرے رکھوا رہے تھے' مٹھائی کے' پھلوں کے.... آم کے دو ٹوکرے الگ سے تھے۔ اگرچہ موسم تقریباً" ڈھلنے لگا تھا۔ مگر گھر کا پھل تھا' موسم ختم ہو جانے کے بعد بھی موجود رہتا تھا اور آج تو رئیسہ بیگم خاص طور پر آم لائی تھیں کہ ---- اپنی بہن کو دینے کا آج تو موقع تھا۔

رئیسہ بیگم اور انیسہ بیگم ایک ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں کے چہروں سے خوشی جھلک رہی تھی مگر جب ستار چاچا پر نظر پڑتی تو منہ بن جاتا۔ عبدالقدوس اور نصیرالدین بھی خوش تھے۔ معیز بھی ادھر سے ادھر اٹھلاتا پھر رہا تھا اور صائمہ.... وہ بھی میرون رنگ کی خوب گھیر والی فراک میں دل میں اترے جا رہی تھی اور دولہا دلہن تو تھے ہی خوش ستار چاچا بھی اپنی پوری فیملی کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔

رئیسہ بیگم نے نادیہ کو انگوٹھی پہنائی اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی مانگ لی۔ انیسہ بیگم کو معلوم تھا کہ وہ اسی طرح ہتھیلی پر سرسوں جمائیں گی' سو انہوں نے تاریخ پہلے ہی سوچ رکھی تھی۔ انہوں نے اگلے مہینے میں چڑھتے چاند کی تاریخ دے دی۔ سارا کام خوش اسلوبی سے ہو گیا تھا کہ اچانک رئیسہ بیگم نے ایسی بات کہہ دی کہ انیسہ بیگم کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ انہیں رنگ میں بھنگ پڑتا دکھائی دینے لگا۔

"آپا بی....!" ان کی آواز حلق میں پھر کہیں اٹک گئی۔

اسی وقت وہاں صرف سب بڑے موجود تھے۔ دولہا دلہن اور نوجوان پارٹی دوسرے کمرے میں ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ انیسہ بیگم کی طرح عبدالقدوس بھی اس وقت ایسی بات کی امید نہیں کر رہے تھے۔ نصیرالدین اپنی جگہ شرمندہ ہو رہے تھے انیسہ بیگم کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بس اب وہ سب کے سامنے ذلیل ہونے والی ہیں۔

"میں نے بھلا ایسا کیا کہہ دیا کہ تمہاری سانس ہی رک گئی۔ تم اپنی بیٹی کے فرض سے سمجھو سبکدوش ہو گئیں۔ میں بھی ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ میرا بھی ارادہ

تھا کہ صائمہ اور سعد کی ایک ساتھ شادی کروں گی۔ مگر تمہیں نہ جانے کیوں وخت پڑ گیا۔ یہی تو کہا ہے نا کہ جس لڑکے کو تم نے نادیہ کے لیے ہاں کی تھی' ان لوگوں سے میری صائمہ کے لیے بات کرو۔"

"آپابی۔۔۔۔!" وہ ایک بار پھر گڑبڑا گئیں۔ اب وہ انہیں کیسے بتاتیں کہ وہ محض ایک ڈراما تھا جس سے ان کی بیٹی صائمہ بھی واقف تھی۔ اب یہ بات اگر انہیں پتا چل جائے تو۔۔۔۔ انہوں نے دل ہی دل میں نادیہ کو کوسا' تب ہی عبدالقدوس کی آواز آئی۔

"بات یہ ہے آپا جی!" انہوں نے ادب سے انہیں مخاطب کیا۔

"وہ لوگ صحیح نہیں تھے۔ اگر وہ لوگ اچھے ہوتے تو ہم کیوں منع کرتے' ہمارے لیے صائمہ اور نادیہ برابر ہیں۔"

"اچھا! لیکن اس دن تو بڑی تعریف ہو رہی تھی اس کی۔" انہوں نے فوراً" چمک کر کہا۔

"ظاہری طور پر تو سب اچھا لگ رہا تھا آپابی! مگر میں نے انکوائری کروائی تو کچھ نامناسب باتیں سامنے آ گئیں ان کے بارے میں۔" انہوں نے رسانیت سے ایک بار پھر جھوٹ بولا۔ انہیں اپنی بیٹی کے اس جھوٹ کی لاج رکھنی ہی تھی' جس سے وہ دو گھروں کی خوشیاں مشروط تھیں۔ رئیسہ بیگم نے یوں دیکھا' جیسے انہیں یقین نہ آیا ہو۔ انیسہ بیگم کی تو جان نکلی ہوئی تھی۔ ماحول ایک دم بدل گیا۔ ہر طرف خاموشی سی چھا گئی تھی۔ اس بوجھل سی خاموشی کو ستار چاچا کی آواز نے توڑا۔

"بھابھی جی! اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔۔۔ صائمہ بٹی کے لیے میں اپنے تنویر کا رشتہ دیتا ہوں۔" رئیسہ بیگم کا منہ کھل گیا۔

"یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے۔ زمینوں کا سارا کام اسی نے سنبھالا ہوا ہے۔ اسی کی محنت اور لگن کی وجہ سے میری زمینیں پہلے سے زیادہ منافع دے رہی ہیں۔ بہت محنتی بچہ ہے میرا۔ لائق اور فرماں بردار بھی۔ چھوٹے والے شہزاد کے لیے تو جی میں اپنی بھانجی لاؤں گا۔"

انہوں نے ثمینہ کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"اب اگر آپ چاہیں تو تنویر کے لیے میں اپنی بھتیجی لے لوں؟" انہوں نے بہت محبت سے نصیرالدین کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔

رئیسہ بیگم بالکل چپ تھیں۔ وجہ اچانک غیر متوقع طور پر ملنے والی خوشی ہی نہیں بلکہ کوئی اور احساس تھا۔ جو ایک دم ان کے دل میں جاگزیں ہوا۔ وہ سوچنے لگیں کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کہاں کہاں ہلکان ہو رہی تھیں مگر ان کے نصیب آس پاس ہی موجود تھے۔ انہوں نے صائمہ کے لیے کیا سوچا اور سعد کے لیے کیا کیا سوچا مگر ہوا اس کے بالکل برعکس اور اس سے کہیں زیادہ اچھا۔ ان کے اکلوتے بیٹے کا رشتہ ان کی بے جا ضد کی وجہ سے مسلسل التوا کا شکار تھا۔ اب بھی بات بنی ہے تو اس میں ان کے کوئی کمال نہیں تھا بلکہ ایک طرح کی جیلسی تھی کہ ان کی بہن کو ان سے زیادہ اچھا داماد کیوں ملے۔ اتنا اچھا بر ان کی بیٹی کو کیوں نہ مل جائے یہی وجہ تھی جو وہ فوراً" نادیہ کے لیے رضامند ہو گئیں تاکہ وہ لڑکا اپنی صائمہ کے لیے مانگ سکیں۔ مگر وہ بھول گئیں کہ یہ سب معاملات طے کرنے والی ذات کوئی اور ہے۔ اس نے اپنے بندے کے لیے جو سوچ رکھا ہے' وہ اسے ضرور ملے گا چاہے کوئی کتنی ہی رکاوٹ کیوں نہ ڈالے اور جو نہیں لکھا' وہ ہزار تدبیروں پر بھی نہیں مل پاتا۔۔۔۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اللہ نیت کا صلہ ضرور دیتا ہے لیکن یہاں ان کی نیت کا بھی کمال نہیں تھا۔

اس وقت گھر میں جتنے بھی لوگ موجود تھے' سب کے سب ایک دوسرے سے مخلص تھے' سوائے ان کے۔۔۔۔ انہوں نے سب کو ہمیشہ اپنی نظر سے دیکھا' جو خود کو بھایا' وہی کیا۔ انہوں نے دوسروں کی خوشی کا خیال کبھی نہیں رکھا حتی کہ اپنی اس اولاد کی خوشی کو بھی اپنی انا کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش میں تھیں' جس نے ان تمام حالات میں بھی ان سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ کبھی مقابل نہیں کھڑا ہوا۔ کبھی سوال نہیں کیا ہمیشہ عزت دی۔۔۔۔ یہاں بھی دوسروں کا خلوص کام آیا۔ اللہ نے دوسروں کی نیت کا صلہ دیا' جس میں ان کی بھی عزت رہ گئی۔

یہی وقت تھا کہ وہ اپنا دل صاف کر کے اپنا رویہ درست کر لیں اور اپنے خیالات پر نادم ہو جائیں اور اللہ سے بھی اپنے تکبر کی معافی مانگ لیں اور اس کے بندوں سے بھی۔

"ستار! مجھے معاف کر دو۔" ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ سب حیران رہ گئے۔ نصیرالدین نے تعجب سے اپنی شریک حیات کو دیکھا۔ اتنے برسوں میں انہوں نے پہلی مرتبہ ان کے منہ سے معذرت کا لفظ سنا تھا۔ ان سے زیادہ انیسہ بیگم ششدر تھیں۔ انہوں نے تو ان کے ساتھ بچپن بھی گزارا تھا۔ ستار چاچا دوبارہ آگے بڑھے۔

"نہیں بھابھی جی! معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ سب آپ کا پیار تھا۔ بس آپ میری بات کا جواب دیجیے۔ آپ کو منظور ہو تو میں بلواؤں تنویر کو؟"

رئیسہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے نصیرالدین کی طرف دیکھا۔ وہ پھر حیران ہو گئے۔ یہ بھی زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ ان کی بیگم کو ان کی تائید یا اجازت کی ضرورت پیش آئی تھی۔

انیسہ بیگم نے کچھ ہوش سنبھالا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم بھی معاف کر دو انیسہ!" ان کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔

"ایسی بات نہ کریں آپابی! آپ بڑی ہیں۔" انہوں نے بڑی بہن کے ہاتھ چوم لیے ستار چاچا نے آواز لگائی۔ "شہزاد۔۔۔۔!"

"پہلے بچے سے تو پوچھ لو ستار۔" انہوں نے کسی خدشے کے تحت کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے بھابھی جی! آپ کے بچوں کی طرح میرے بچے بھی بڑے فرماں بردار ہیں جی۔ میں پہلے ہی اس کی مرضی معلوم کر چکا ہوں۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ویسے ایک راز کی بات بتاؤں؟" وہ تھوڑا قریب آ کر بلند سرگوشیوں میں بولے۔

"میرا تو شروع سے ہی ارادہ تھا کہ بھائی جی کی بیٹی کو اپنی بہو بناؤں گا اور بھائی جی سے بہت پہلے ہی میں اس خواہش کا اظہار کر چکا ہوں۔"

رئیسہ بیگم نے فوراً" نصیر الدین کی طرف دیکھا۔ وہ چور سے ہو کر مسکرا دیے مگر پھر کھل کر ہنس پڑے، جب ان کی نصف بہتر مسکرا دی تھیں۔

"جی ابو۔" شہزاد حاضر ہوا۔

"بیٹا! جاؤ بھائی کو بلا لاؤ۔ بلکہ ایسا کرو سب بچوں کو یہاں بلا لاؤ۔ آج ہم اپنی خوشیوں کو دوبالا کر دیتے ہیں۔"

"لگتا ہے سب سیٹ ہو گیا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔

"جی اچھا ابو۔" اس نے شرافت سے کہا اور اندر بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼
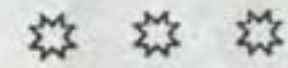
دوسرے کمرے میں ہنسی اور قہقہوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ اتنے عرصے بعد سب ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی۔ ایسے قہقہے اڑ رہے تھے گویا ہنسنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہوں۔ معیز، تنویر، شہزاد، سعد فرحان..... دوسری طرف صائمہ، بینا، افشاں اور نادیہ..... سب ایک دوسرے پر جملے بازی کر رہے تھے۔ نادیہ خوب لطف لے رہی تھی مگر جوں ہی سعد اس سے کوئی بات کرتا، وہ فوراً" منہ پھیر لیتی۔ سعد نے کئی دفعہ نظر بچا کر اشارے سے اس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ متوجہ ہی نہیں ہو رہی تھی اور آج تو ہمیشہ ساتھ دینے والی صائمہ بھی "نو لفٹ" کا بورڈ لیے بیٹھی تھی۔ وہ بار بار مدد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا مگر وہ نظر بدل کر دوسری طرف خوش گپیوں میں مشغول ہو جاتی۔

اتنی خوشی کے دن نادیہ کا ایسا رویہ اسے بے چین کر رہا تھا۔ کافی دیر برداشت کرنے کے بعد وہ اچانک اٹھا اور صائمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے جھٹکے سے نادیہ کے برابر سے کھڑا کر کے خود بیٹھ گیا۔

"اوہو۔" کی اجتماعی آواز کے ساتھ کئی شوخ جملے بھی اس کے کانوں میں پڑے..... نادیہ فوراً" سرک کر اس سے دور ہو گئی، ساتھ ہی رخ بھی موڑ لیا۔

"ناراض ہے کیا؟" اس نے جھک کر سرگوشی کی مگر جواب ملنے کی حسرت رہ گئی کہ باقی سب لڑکے بھی کھلکھلاتے ہوئے اس کے پاس آ گئے۔

"زور سے بول نا، کان میں کیا کھسر پھسر کر رہا ہے؟" شہزاد نے بالکل اس کے قریب اپنا منہ لے جا کر کہا تو وہ جھینپ کر سیدھا ہو گیا۔

"اوں ہوں شہزاد! بات کرنے دو ویسے ہی منہ کی کھانی پڑ رہی ہے بے چارے کو۔" تنویر نے ہنسی دبا کر چوٹ کی تو سعد نے سلگ کر اسے دیکھا۔

"تم پر بھی یہ وقت آئے گا۔"

"پتا نہیں کب آئے گا۔" تنویر نے ٹھنڈی آہ بھر کر صائمہ کو دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"اوئے ہوئے حسرتیں تو دیکھو۔"

شہزاد نے ایک سال بڑے بھائی کو چھیڑا۔ تنویر نے ہنستے ہوئے اس کی کمر پر دھپ لگائی۔ شہزاد ابھی کچھ اور کہنے لگا تھا کہ ستار چاچا کی آواز پر باہر چلا گیا۔

"ہاں ناں بھئی! تم سب پر تو یہ وقت آ چکا ہے۔ ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔"

"نہیں نہیں تنویر بھائی! آپ اکیلے نہیں ہیں، میں بھی ہوں۔" تنویر کی بات پر معیز فوراً" بولا تو سب ایک بار پھر زور سے ہنس پڑے۔

"کرتے ہیں آپ کا بھی کوئی بندوبست تنویر بھائی! صبر کریں۔ کچھ خود بھی ہمت کریں۔ یہاں تو سب اپنی مدد آپ کے عنوان کے تحت بیٹھے ہیں۔" فرحان نے کہا۔

اسی وقت شہزاد اندر داخل ہوا۔

"لو بھئی! بڑے بھیا کا بھی مسئلہ حل ہو گیا۔"

"کیا مطلب؟" سب ایک ساتھ چلائے۔

"سب پتا چل جائے گا ابھی۔ ابو باہر بلا رہے ہیں سب کو اور آپ کو خاص طور پر یاد کر رہے ہیں۔" اس نے تنویر کی طرف مڑ کر شوخی سے کہا۔

"کیوں، مجھے کیوں؟" تنویر نے معصومیت سے پوچھا۔

"دیگیں صاف کروانی ہیں۔" شہزاد نے ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا اور باہر دھکیلا۔

"دولہا میاں! آپ کو بھی بلایا ہے۔" اب وہ سعد کی طرف متوجہ ہوا۔

"بس دو منٹ میں آتا ہوں تم چلو۔" سعد کو موقع ملنے والا تھا۔ گنواتا کیوں۔

"اور ابھی تمہارا ابھی بلاوا آئے گا۔ تیار رہنا۔" اس نے شرارت سے صائمہ سے کہا اور مسکراتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

"اتنا اترا کیوں رہی ہے ندو کی بچی۔"

جیسے ہی سب باہر نکلے سعد نے فوراً" نادیہ کا بازو پکڑ کر اپنی طرف رخ گھمایا۔ اس نے پہلے تو جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا پھر صائمہ سے کہنے لگی۔

"صائمہ! اپنے بھائی سے کہو، مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کرے۔"

"کیوں..... کیا کیا ہے میں نے۔" وہ بگڑ گیا۔

"یہی تو مسئلہ ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا بلکہ اب مجھے سمجھ لینا چاہیے کہ تم آئندہ بھی کچھ نہیں کر سکو گے۔ بڑی بڑی ہانکیں مارتے تھے تم مجھ خالو اور ابا نہ سمجھنا..... وقت آنے پر بہت کچھ کر کے دکھاؤں گا..... یہی کہتے تھے نا تم؟ بتاؤ کیا تیر مار لیا تم نے؟"

نادیہ تنک کر بولی تو وہ شرمندہ سا ہو کر سر کھجانے لگا۔ بینا اور افشاں کے سامنے دلہن سے ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا، ان کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ اس نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔ "کیا سوچتی ہوں گی یہ لڑکیاں..... یہ اوقات ہے دولہا کی؟" اس نے سوچا۔

"میں نے کہا تھا نا سعد! تم کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف باتیں بگھار سکتے ہو اور الٹی سیدھی حرکتیں کر سکتے ہو بس۔" وہ سچ مچ خفا ہو گئی تھی۔

"ارے وہ..... میں آئندہ....." سعد حقیقی معنوں میں شرمندہ ہو گیا تھا یہ واقعی اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ سب معاملات طے کرتا۔ اس نے دل میں پکا عہد کر لیا کہ اب وہ اپنی ساری ذمہ داریاں نبھائے گا۔ نادیہ کو مکمل اعتماد فراہم کرے گا۔

"بس سعد! رہنے دو۔ اب کوئی دعوامت کرو۔ دیکھ لیا میں نے تمہیں۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہیں صرف باتیں بنانی آتی ہیں۔" نادیہ نے ایک بار پھر غبار نکالا۔

"بھائی! نادیہ صحیح کہہ رہی ہے۔ جو کام تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ نادیہ نے لڑکی ہو کر کر لیا۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

صائمہ نے بھی دلہن بنی نادیہ کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو حسب توفیق لتاڑا۔

"آئی ایم سوری نادیہ! میں پوری کوشش کروں گا کہ آئندہ تمہیں کوئی شکایت نہ ہو۔ وعدہ....." وہ سخت شرمندہ ہو رہا تھا۔

نادیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اسے یاد نہیں پڑتا

کہ سعد نے کبھی اس کے صحیح نام سے پکارا ہو۔ پھر بھی خفگی سے بولی۔

"سعد جاؤ تم۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

نادیہ کے خفگی سے منہ پھیر لینے پر اس نے ایک نظر افشاں اور بینا پر ڈالی کہ شاید وہ بھی اس کار خیر میں حصہ ڈالنا چاہیں مگر نادیہ کے غصے کی وجہ سے وہ دونوں اب سنجیدہ کھڑی تھیں۔ سعد نے ایک نظر نادیہ کے سپاٹ چہرے پر ڈالی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"نادیہ! اب کیا ہو گا۔ بھائی تو سچ مچ ناراض ہو گئے۔" سعد کے جانے کے بعد صائمہ پریشانی سے کہنے لگی

"رہنے دو جانتی ہوں تمہارے بھائی کو۔ اسے خفا ہونا آتا ہے نہ پریشان ہونا۔"

"ویسے تم نے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔" صائمہ ہنسی۔

"تمہارے نکمے بھائی کی کلاس لینا ضروری تھا۔" نادیہ نے جواب دیا۔

"اور ویسے بھی خالہ بی کو راضی کرنے کا کام اسی کا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا۔ اپنی امی کی طرح میں بھی خالہ بی کی نیچر سمجھتی ہوں۔ وہ صرف زبان کی تیز ہیں مگر فطرتاً "سادہ ہیں۔" وہ بے وقوف کہتے کہتے رک گئی۔

"ویسے کمال ہو گیا۔ نادیہ! تم نے ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔" بینا نے ہنس کر کہا تو سب کے ساتھ نادیہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"دیکھا تھا' کتنا شرمندہ ہو رہا تھا۔ بے چارہ سچ مچ پریشان ہو گیا تھا۔ نادیہ بس اب مزید تنگ مت کرنا۔" افشاں نے حمایت لی۔

"ہاں ناں اور کیا' اتنا سا منہ نکل آیا تھا میرے پیارے بھائی کا۔" صائمہ کو بھی خیال آیا بھائی کا۔

"اوں ہوں' ابھی نہیں۔ سارے حساب پورے کروں گی' پھر......!"

نادیہ نے مزے سے کہا تو سب زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں مگر جب سعد پہ نظر پڑی تو فوراً "چپ بھی ہو گئیں۔ کمرے کے دروازے پر سعد کھڑا ان کی ساری باتیں سن چکا تھا' جس میں اسے سبق سکھانے کا اعتراف کیا گیا تھا۔

وہ نصیر الدین کے کہنے پر سب لڑکیوں کو بلانے آیا تھا کہ نادیہ اور سعد کی طرح صائمہ اور تنویر کو بھی ساتھ بٹھا کر رسم کر لی جاتی مگر یہاں آیا تو یہ انکشاف ہوا۔ اس نادیہ کو گھورتا ہوا آگے بڑھا تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر نادیہ نے صائمہ کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی مگر اب سعد سے کیسے بچ سکتی تھی۔

اس نے صائمہ کو ایک طرف دھکیلا۔ بینا اور افشاں خود ہی ایک طرف ہو گئیں اور نادیہ کا ہاتھ جکڑ لیا۔

"کتنی چالاک ہے تو' مجھ پر رعب ڈال رہی تھی۔"

نادیہ نے ہاتھ چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ دبے دبے ہونٹوں سے مسکرا رہی تھی۔

"تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتی...... اب محبت ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں بھی تمہاری طرح الٹی سیدھی حرکتیں کرتی...... ویسے میں اکیلی نہیں تھی' صائمہ بھی میرے ساتھ تھی اس پلان میں۔"

اس نے صائمہ کو بھی گھسیٹ لیا اور سعد اس کے ڈھکے چھپے لفظوں میں محبت کے اعتراف پر خوشی سے مسکرانے لگا۔ صائمہ پر شکریہ اور شاباشی کی ایک نظر ڈال کر وہ پھر نادیہ کو دیکھنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے' میں تجھے صحیح کہتا ہوں۔"

"کیا؟" اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"نندو کی بچی۔"

نادیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کی جلترنگ میں موتیا اور گلاب کی بھینی بھینی خوشبو بھی شامل ہو گئی۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ اس کے منہ سے "نندو کی بچی" ہی اچھا لگتا ہے۔

☆ ☆

نظیر فاطمہ

شام کا وقت تھا۔ نشاط کپڑے کی دکان میں بیٹھی اپنے لیے سوٹ پسند کر رہی تھی کہ اچانک ایک مردانہ آواز پر اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور اس کی نظریں وہیں پر جم گئیں۔ وہ کپڑے خریدے بغیر ہی اٹھی اور فوراً" دکان سے باہر نکل آئی۔ سیلز مین جو اسے کپڑے دکھا رہا تھا کندھے اچکا کر رہ گیا۔ دکان سے باہر آ کر نشاط اپنی گاڑی میں بیٹھی اور غائب دماغی سے گاڑی چلاتے ہوئے اپنے گھر تک پہنچی۔ گھر پہنچ کر وہ اوندھے منہ بستر پر گر گئی۔ رات تک وہ یونہی پڑی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر پانی پیا اور صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی پچھلی زندگی فلم کی طرح اس کے سامنے چلنے لگی۔

☆ ☆ ☆

نشاط ایک ٹیکسٹائل مل میں بطور کوالٹی کنٹرول آفیسر کام کرتی تھی۔ اسے نوکری کرتے ہوئے تین سال ہوئے تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی۔ یہاں پر نشاط کی قسمت نے یاوری کی اور اس کا رشتہ شکیل صاحب کے ساتھ طے پا گیا۔ شکیل صاحب' نشاط کے ابو کے دوست کے بھانجے تھے۔ شکیل صاحب ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ان کی ایک بہن اور ایک بھائی تھا۔ بہن بڑی تھی ان کی شادی کو کئی سال گزر چکے تھے۔ بھائی چھوٹا تھا اور زیر تعلیم تھا۔ گھر میں شکیل صاحب' ان کی ماں جی اور چھوٹا بھائی ہی تھے۔ دیکھے بھالے اور شریف لوگ تھے لہٰذا رسمی کارروائی کے بعد نشاط کی شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

شکیل صاحب سے شادی کے بعد نشاط کو اپنے والدین کے اس فیصلے کی خوب صورتی کا احساس ہوا۔ شکیل صاحب بہت محبت کرنے والے شوہر ثابت ہوئے۔ ماں جی بہت شفیق خاتون تھیں اور اس کا دیور بہت رکھ رکھاؤ اور ادب والا نوجوان تھا۔ وہ ہر لحاظ سے مطمئن تھی اور اپنے اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ نشاط نے اپنی نوکری جاری رکھی۔ آفس کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت موجود تھی اور اس کی شفٹ تین بجے ختم ہو جاتی تھی۔ لہٰذا گھر اور آفس کو ساتھ ساتھ چلانے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔

شکیل صاحب کو بچے بہت اچھے لگتے تھے اور وہ بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی بہن کے بچے ان سے بہت اٹیچ تھے اور ماموں سے

خوب ناز نخرے اٹھواتے تھے۔ فطری طور پر اب شکیل صاحب نشاط کی طرف سے بچے کی خوشخبری کے منتظر تھے۔ لیکن ان کی شادی کو ایک کے بعد دوسرا سال بھی گزر گیا اور ان کا آنگن سونا ہی رہا تو شکیل صاحب کے ساتھ ساتھ نشاط خود بھی پریشان ہونے لگی۔ دونوں کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے ماں جی نے انہیں اپنا مکمل چیک اپ کروانے کا مشورہ دیا۔ دونوں کے چیک اپ کے بعد جو رپورٹس سامنے آئیں ان کے مطابق شکیل صاحب تو بالکل نارمل تھے لیکن نشاط کو کوئی ایسا مسئلہ تھا کہ ان کے ماں بننے کے چانسز صرف دس فیصد تھے۔ یہ سن کر شکیل صاحب چپ سے ہو گئے اور نشاط نے اس چیز کو اپنے اوپر اس قدر سوار کر لیا کہ بیمار پڑ گئی۔ نشاط کے دکھ کو سمجھتے ہوئے ماں جی نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور تسلی دی۔ شکیل صاحب نے بھی مقدور بھر دل جوئی کی لیکن نشاط کے دل کو سکون نہ ملا۔

وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ نشاط اور شکیل صاحب کی شادی کو سات سال کا عرصہ گزر گیا لیکن نشاط کی گود خالی رہی۔ شکیل صاحب جب باوجود کوشش کے اپنے باپ بننے کی فطری خواہش پر قابو نہ پا سکے تو انہوں نے نشاط سے دوسری شادی کی اجازت مانگی۔ اس پر نشاط نے زمین آسمان ایک کر دیے اور انہیں دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ دی۔ کچھ دن بعد شکیل صاحب نے دوبارہ یہ موضوع چھیڑا تو نشاط نے پہلے کی طرح رونا دھونا نہیں مچایا بلکہ شکیل صاحب کی ساری بات سننے کے بعد یہ شرط رکھ دی کہ اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں تو اسے طلاق دے دیں۔ شکیل صاحب یہ سن کر سناٹے میں آ گئے۔ وہ نشاط کو یقین دلانے لگے کہ ان کی دوسری شادی کے بعد نشاط کے مقام اور مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ لیکن نشاط اپنے مطالبے پر قائم رہی۔

ماں جی سے مشورے کے بعد شکیل صاحب نے سمیرا سے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سمیرا اماں جی کی دور پار کی بھتیجی تھی۔ چار سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی لیکن شادی کے دو سال بعد ہی بیوہ ہو گئی اور اپنی ایک سال کی بچی کو لے کر دوبارہ ماں باپ کی دہلیز پر آ گئی۔ ماں جی، شکیل صاحب کے ساتھ خود سمیرا کی ماں کے گھر گئیں اور ان سے سمیرا کا رشتہ مانگا اور شکیل صاحب کی دوسری شادی کی وجہ بھی بیان کر دی۔ ماں جی نے کہا "وہ سمیرا کو اس کی بچی کے ساتھ قبول کریں گے لیکن بدلے میں سمیرا کو شکیل صاحب کی پہلی بیوی نشاط کو عزت دینا ہوگی۔" سمیرا کے گھر والوں نے سوچ بچار کے لیے وقت مانگا اور ایک ماہ بعد اپنی رضامندی دے دی۔

اس سے پہلے کہ ماں جی شکیل صاحب اور سمیرا کے نکاح کی تاریخ طے کرتیں۔ انہوں نے نشاط کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتایا تو نشاط ہتھے سے اکھڑ گئی اور ماں جی کو کڑوی کسیلی باتیں سنانے لگی۔ ماں جی نے کہا۔

"دیکھو نشاط! ہر شادی شدہ مرد اور عورت کو بچوں کی خواہش ہوتی ہے۔ تم شکیل کی اس فطری خواہش کو کیوں کچلنا چاہتی ہو؟" نشاط پھنکار کر بولی۔

"اگر کمی آپ کے بیٹے میں ہوتی تو کیا تب آپ مجھے بھی دوسری شادی کا مشورہ دیتیں اور سپورٹ کرتیں؟" ماں جی نے کچھ لمحے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ہاں۔" نشاط نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"اگر کمی شکیل میں ہوتی اور تم شکیل کی طرح اولاد کی تڑپ رکھتیں تو میں شکیل کو مجبور کرتی کہ وہ تمہیں طلاق دے دے اور پھر میں خود تمہاری دوسری شادی کرواتی۔ ایسی صورت میں دوسری شادی تمہارا حق ہوتا۔ میں اس حق کو بھلا کیوں چھینتی۔" یہ سب سن کر نشاط نے بڑے کڑوے لہجے میں کہا۔

"یہ سب منہ کی باتیں ہیں، اگر مرد میں کمی ہو تو سب عورت سے قربانی مانگتے ہیں کوئی اس کے حق کے لیے کھڑا نہیں ہوتا۔ خیر مجھے طلاق چاہیے اور میں شکیل کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔" ماں جی اس کی باتیں سن کر خاموشی سے اٹھ آئیں۔

ماں جی نے شکیل صاحب اور سمیرا کے نکاح کے لیے اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ مقرر کر دی۔ نکاح سے آٹھ دن پہلے انہوں نے دوبارہ نشاط کو سمجھایا۔

"نشاط میری بات سنو، تم طلاق کا مطالبہ چھوڑ دو کیوں اپنا گھر اجاڑنا چاہتی ہو؟" نشاط نے سر اٹھا کر شکایتی نظروں سے ماں جی کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"میں اجاڑ رہی ہوں یا آپ ماں بیٹا مل کر میرا گھر اجاڑ رہے ہیں؟" ماں جی نے اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر کو سمجھ لیا۔

"بیٹا! میں تو تمہارا گھر بچانا چاہتی ہوں۔ شکیل بے شک میرا بیٹا ہے لیکن ہے تو وہ ایک مرد اور مرد جب کوئی کام کرنے کی ٹھان لے خاص کر دوسری شادی کرنے کی تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ بیٹا اولاد نہ ہونے کی صورت میں اسلام بھی مرد کو دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اسے دوسری شادی کی اجازت دے دو اور اپنا گھر بچا لو۔ سمیرا اچھی بچی ہے وہ چھوٹی بہنوں کی طرح تمہاری عزت کرے گی۔ میں نے اور شکیل نے یہ شرط رکھی ہے کہ سمیرا تمہیں اپنی بڑی بہن سمجھے گی اور تمہاری عزت کرے گی۔ اس کے علاوہ میں نے شکیل کو بھی اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ دوسری شادی کے حوالے سے ساری اسلامی تعلیمات کو مدنظر رکھے گا اور اپنی دونوں بیویوں کو برابر کے حقوق دے گا۔ بیٹا! شکیل تم سے اب بھی بہت محبت کرتا ہے اسی لیے تو تمہاری رضامندی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور تمہیں طلاق نہیں دینا چاہتا۔ اتنا تو تم اسے جانتی ہی ہو کہ میرا شکیل حقوق و فرائض کی ادائیگی کا کتنا دھیان رکھتا ہے۔" یہ سب سن کر نشاط۔۔۔ چلانے لگی۔

"جائیں میری جان چھوڑیں، میں بھر پائی ایسی محبت سے، مجھے بس طلاق چاہیے۔" اسی شام نشاط اپنا سامان سمیٹ کر اپنے والدین کے گھر چلی آئی۔ اس کے امی ابو نے اسے سمجھایا کہ وہ اپنی ضد چھوڑ کر سمجھوتا کر لے لیکن بے سود۔

مقررہ تاریخ پر شکیل صاحب اور سمیرا کا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے ایک ہفتے بعد شکیل صاحب اور سمیرا نشاط کو لینے کے ارادے سے گئے۔ لیکن نشاط نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ بار بار مطالبے پر بھی شکیل صاحب نے نشاط کو طلاق دینے سے انکار کر دیا اور کئی بار اسے منانے گئے۔ لیکن نشاط نے ضد میں آ کر خلع کا نوٹس بھجوا دیا۔ اس پر شکیل صاحب نے آخری کوشش کے طور پر نشاط سے ملنے کی کوشش کی تو نشاط نے ان کے سامنے آ کر صرف یہ کہا۔

"مجھے تم جیسے گھٹیا شخص سے طلاق چاہیے بس۔" پھر فیصلہ ہو گیا اور شکیل صاحب نے بھاری دل کے ساتھ نشاط کو طلاق دے دی حالانکہ وہ دل سے یہ چاہتے تھے کہ نشاط ان کے ساتھ رہے۔

نشاط کی شادی کے تین سال بعد اس کے چھوٹے بھائی کی شادی بھی ہو گئی تھی اور اب گھر پر بھابھی کا راج تھا۔ وہ طلاق کے بعد نشاط کو برداشت کرنے پر تیار نہیں تھی۔ لیکن اپنی ساس اور سسر کی وجہ سے مجبور تھی۔ نشاط کی طلاق کے چار سال بعد اس کے امی ابو آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو بھابھی کو کھلی چھٹی مل گئی اور اس نے نشاط کے لیے گھر میں رہنا دوبھر کر دیا۔ تنگ آ کر نشاط اپنی ایک دوست کی والدہ کے پاس پے انگ گیسٹ کے طور پر رہنے لگی۔ وہ بہت تنہا ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تک کی نوکری اور اس کے بعد تنہائی اور اس کی سوچیں۔ اب اکثر رات کو اسے ماں جی کی باتیں یاد آتیں اور اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہوتا۔

آج کپڑے کی دکان پر نشاط نے شکیل اور سمیرا کو بچوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ چار پانچ سال کی بچی جو سمیرا کے پہلے شوہر سے تھی، شکیل کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی اور دو سال کا ایک بچہ سمیرا کی گود میں تھا۔ شکیل اور سمیرا دونوں کے چہروں پر بہت اطمینان اور سکون تھا اور انہیں دیکھ کر وہ خود پہلے سے زیادہ بے سکون ہو گئی اور یہ سوچنے لگی کہ کاش! اس نے اس وقت ضد کی بجائے سمجھ داری اور ظرف کا مظاہرہ کیا ہوتا تو آج وہ بھی سمیرا، شکیل اور ان کے بچوں کے ساتھ سکون اور اطمینان کی زندگی گزار رہی ہوتی۔

☆ ☆

شفق افتخار

نایاب ہیں ہم

مکمل ناول

زروہ محمود، درانی ہاؤس میں رہنے والے دوسرے نمبر کے محمود درانی کی بیٹی ہے اور چار بہنوں میں اس کا نمبر چوتھا ہے۔ اس کا ایک بھائی جڑواں بھی تھا۔ لیکن قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ چند گھنٹے زندہ رہنے کے بعد اس دنیا سے چلا گیا اور یہی قصور زروہ محمود کے کھاتے میں لکھ دیا گیا۔

"درانی ہاؤس" معظم درانی کی ملکیت ہے۔ انہوں نے بہت ارمانوں سے اسے خود کھڑے ہو کر تعمیر کروایا تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق اس کے چار پورشنز بنوائے۔ ان کے چار بچے ہیں۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ اگر درانی ہاؤس کا بڑا سا براؤن کلر کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوں تو سامنے وائٹ ماربل کی روش کے دونوں اطراف آپ کو دو لان نظر آئیں گے۔ ہرے بھرے خوب صورت سے لان جو رنگین پھولوں اور درختوں سے لدے ہیں۔ لان عبور کرتے ہی وائٹ ماربل کا ڈرائیو وے ہے، جہاں ہمہ وقت کئی گاڑیاں ایک ساتھ کھڑی رہ سکتی ہیں۔ دائیں طرف بہت خوب صورت انداز سے بنی ہوئی وائٹ ماربل کی سیڑھیاں نظر آئیں گی جو سیدھے اوپر کے پورشن کو جاتی ہیں اور اس کے برابر ہی میں نیچے والے پورشن کی بڑی سی کھڑکی جسے اگر کھول دیا جائے تو لاؤنج میں بیٹھ کر بھی با آسانی باہر کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ کھڑکی کے برابر میں ذرا فاصلے پر نیچے پورشن میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ بڑا سا بھاری براؤن کلر کا دروازہ اندر لاؤنج میں کھلتا ہے اور یہ پورشن معظم درانی کا اپنا ہے۔ جہاں وہ اپنی بیگم نفیسہ درانی کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ اس پورشن میں چھ کمرے ہیں، ایک ڈریسنگ روم، سٹنگ روم کے علاوہ چار بیڈ رومز، اسی پورشن کے دو کمرے بند ہیں، کیونکہ وہ معظم درانی کی صاحبزادی فاطمہ صدیقی کے لیے مخصوص ہیں۔ وہ شادی شدہ ہیں اور جب بھی آتی ہیں یہیں ٹھہرتی ہیں۔

اوپر کے پورشن میں معظم درانی کے بڑے صاحبزادے اعظم درانی اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں۔ صدیقہ درانی ان کی بیگم اور ان کے چار بچے، تین بیٹے اور ایک بیٹی، احمر، معیز، عمر اور سب سے چھوٹی ثنا جو زروہ محمود کی ہم عمر ہے۔ بائیں طرف لان میں ایک بڑا سا اسٹائلش جھولا لگا ہے۔ جو زروہ محمود کے والد محمود درانی نے اس کی فرمائش پر لان میں لگوایا ہے اور زروہ اکثر وہیں پائی جاتی ہے۔ بائیں طرف نیچے کے پورشن میں محمود درانی اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ ان کی بیگم سفینہ درانی اور ان کی چار صاحبزادیاں رباب، نایاب، وردہ اور سب سے چھوٹی زروہ درانی۔ اوپری پورشن میں معظم درانی کے سب سے چھوٹے بیٹے احمد درانی اپنی بیگم نائبہ درانی کے ساتھ رہتے ہیں۔ تاحال ان کی کوئی اولاد نہیں ہے اور وہ اس سلسلے میں بہت پریشان رہتے ہیں۔

یہ ایک روایتی گھرانا ہے، روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے، اپنا برسوں پرانا گارمنٹس کا بزنس ہے۔ جو وسیع پیمانے پر پھیلا بہت اچھا چل رہا ہے۔ اس گھر میں صدیقہ درانی کو بڑی بہو ہونے کی حیثیت سے خاص

اہمیت حاصل ہے شاید اس لیے بھی کہ نفیسہ درانی کی سگی بھتیجی ہیں اور شاید اس لیے بھی کہ وہ اوپر تلے تین بیٹوں کی ماں ہیں جس پر انہیں فخر بھی بہت ہے وہ شدت سے یہ خواہش رکھتی تھیں کہ اپنی چھوٹی بہن کو یہاں اپنی دیورانی یعنی محمود درانی کی دلہن بنا کر لائیں اور پھوپھو بھی ان کی ہمنوا تھیں۔ لیکن بھلا ہو محمود درانی کا انہوں نے بڑی بھابھی کے رنگ ڈھنگ دیکھتے ہوئے ایک دن چپکے سے باپ کے کان میں کہہ دیا کہ وہ خاندان میں کہیں بھی شادی نہیں کرنا چاہتے اور خاندان کے باہر کہیں بھی کرنے کو تیار ہیں۔ یوں ان کے لیے معظم درانی نے اپنے جاننے والوں میں سے سفینہ کا انتخاب کیا اور پھر جلد ہی وہ دلہن بن کر درانی ہاؤس میں آگئیں۔ نفیسہ بیگم تو پھر بھی ماں تھیں ذرا سی پس و پیش کے بعد رضامند ہو گئیں لیکن صدیقہ بیگم کے دل میں وہ پہلے دن سے انی کی طرح چبھ گئی تھیں اور انہوں نے ساس کو بھی ہر ممکن طریقے سے ان کے خلاف کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس سازش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہیں۔

ابتدا وہاں سے ہوئی جب سفینہ کی گود میں پہلی اولاد رباب یعنی ایک بیٹی آئی نفیسہ درانی پرانے خیالات کی مالک تھیں اور ایسے میں صدیقہ درانی کا یہ کہنا کہ پہلی اولاد تو بیٹا ہی ہونا چاہیے وہ فوراً ہی اس پر ایمان لے آئیں یوں خود بہ خود ہی صدیقہ درانی کا پلڑا بھاری ہو گیا کیونکہ وہ پہلے سے ایک بیٹے کی ماں تھیں اور ایسے میں جانے کیوں سفینہ شرمندہ شرمندہ سی پھرا کرتیں جیسے یہ ان کا قصور ہو حالانکہ ان کے شوہر نے انہیں کبھی بھی یہ احساس نہیں دلایا تھا۔ وہ تو رباب کو پا کر بہت خوش تھے مگر صدیقہ درانی کی ڈھکی چھپی باتیں سن کر سفینہ کی دل میں شدت سے یہ خواہش جڑ پکڑ چکی تھی کہ اگلی اولاد بیٹا ہی ہونا چاہیے لیکن جب صدیقہ درانی کے ہاں معیز ہوا تو ان کے یہاں نایاب چلی آئی اور وہ ایک بار پھر سے چور سی بن گئیں۔ ایسے میں ساس کا رویہ انہیں شدت سے یہ احساس دلاتا تھا کہ وہ بیٹیوں کی ماں ہیں حالانکہ بیٹیاں تو رحمت ہیں، پر نہ جانے کیوں ہم یہ بات بھول جاتے ہیں اور پھر جب نایاب کے بعد زروہ چلی آئی تو وہ ڈر گئیں انہیں اپنا آپ مجرم لگنے لگا تھا اور مسلسل یہ احساس دلانے والی صدیقہ درانی تھیں اور ان ہی کی باتوں میں لگ کر کسی حد تک نفیسہ درانی بھی جو ہر وقت بس اپنے پوتوں کے ساتھ لگی رہتیں۔ صدیقہ درانی کے تین بیٹے اور ان کی تین بیٹیاں۔ حالانکہ وہ پڑھی لکھی، سمجھ دار تھیں اور یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ اولاد صرف مرد کی قسمت سے ہوتی ہے یا پھر اللہ کی مرضی سے، وہ جو کرتا ہے بہتری کے لیے کرتا ہے لیکن پھر بھی صدیقہ درانی کی طنزیہ مسکراہٹ دیکھ کر وہ ہولتی ہی رہتی تھیں ایسے میں جب پھر سے زروہ کے چھ سال بعد امید جاگی تو وہ ڈر گئیں اور انہوں نے اپنے خدشے کا اظہار محمود درانی سے کیا کہ وہ یہ سلسلہ ختم کرنا چاہتی ہیں تو وہ بے انتہا غصے میں آگئے اور وجہ جان کر وہ آپے سے باہر ہو گئے۔

"تمہارا دماغ خراب ہے خبردار جو ایسا سوچا بھی تم سمجھ دار عقل مند پڑھی لکھی ہو۔ مجھے تم سے ایسی امید قطعی نہیں تھی۔ بھابھی کی تو عادت ہی ایسی ہے اور اماں جان بھی ان کی باتوں میں آجاتی ہیں اور تم ان کی باتوں میں آکر یہ بے وقوفی کرنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں قطعی اس بات کی اجازت نہیں دوں گا۔" اتنی اونچی آواز میں انہوں نے پہلی بار بات کی تھی وہ خوف زدہ ہو گئیں۔ آنکھوں میں آنسو فوراً ہی امڈ آئے تھے۔ محمود درانی ان کے آنسو دیکھ کر فوراً ہی نرم پڑ گئے۔

"دیکھو سفینہ، میری بات سنو۔ اولاد ایک بہت بڑی نعمت ہے پھر چاہے وہ بیٹا ہو یا بیٹی۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ ہم صاحب اولاد ہیں بہت سے ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو ایک بیٹی کے لیے بھی ترس رہے ہیں اور تم یوں ناشکری کر رہی ہو۔ میری بیٹیاں مجھے بہت عزیز ہیں اور اگر میری ایک بیٹی اور بھی ہو جائے تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بھی مجھے اتنی ہی عزیز ہو گی اور اگر

ہمارے نصیب میں بیٹا ہوا تو اللہ تمہاری یہ خواہش بھی ضرور پوری کرے گا۔ تم اس کی رحمت سے مایوس مت ہو۔"

سفینہ کے دل سے بوجھ تو اترا مگر دل میں ڈر بھی تھا اور ایسے میں اماں جان نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس بار انہیں پوتا چاہیے کہ جس سے محمود کی نسل آگے بڑھ سکے ایسے میں احمد درانی کی بیوی نائبہ انہیں اکثر ہی سمجھایا کرتیں ان کی شادی کو دو سال ہونے والے تھے اور وہ ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے محروم تھیں۔ ایسے میں — بار بار یوں ساس اور جٹھانی کا سفینہ کو جتلانا بہت برا لگتا تھا لیکن وہ کچھ کہہ نہیں پاتی تھیں البتہ سفینہ کی ہمت بندھاتی تھیں۔

جب اسپتال میں ڈاکٹر نے انہیں جڑواں بچوں کی نوید سنائی جس میں ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی تو وہ جیسے کھل اٹھی — ایسے میں انہیں ایک اور بیٹی بھی بری نہیں لگی تھی۔ لیکن ان کا بیٹا دو ڈھائی گھنٹے ہی اس دنیا میں زندہ رہ پایا تھا اور پھر چل بسا اور کوئی اسے نہیں بچا سکا کیونکہ اس کی اتنی ہی زندگی تھی اور سفینہ ایک بار پھر مجرموں کی طرح ایک اور بیٹی اٹھائے گھر میں داخل ہوئیں تو صدیقہ درانی کی نظریں ان کے دل میں ترازو ہی ہو گئیں۔ کمرے میں آکر سفینہ نے ایک بوجھ کی طرح دو دن کی معصوم سی بیٹی کو بستر میں لٹا دیا ایسے میں نائبہ چاچی نے روتی بلکتی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور خاموش نگاہوں سے سفینہ کو دیکھا کہ اس وقت کچھ بھی کہنا بے کار تھا اور پھر پیدائش کے چھٹے روز جب دادی نے اسے پہلی اور شاید آخری بار اسے گود میں اٹھایا تھا تو ان کے منہ سے نکلا "کاش" سفینہ کے دل میں — نیزے کی انی کی طرح چبھ گیا اس کا نام بھی اس کے بابا نے ہی رکھا تھا۔ زروہ محمود

ماں تو اپنی مجرمانہ خاموشی میں کچھ سوچ ہی نہیں پا رہی تھی اور پھر دادی کے منہ سے نکلا ہوا وہ کاش زروہ محمود کا جرم بن گیا کہ جیسے اپنے ساتھ آنے والے بھائی کو اس نے زندہ رہنے کی مہلت نہ دی ہو۔ اور شاید یہ بھی کہ وہ اس کے ساتھ ہی اس دنیا میں چلی آئی تھی بنا کسی ضرورت کے اور اگر وہ اکیلا ہی اس دنیا میں آتا تو شاید بچ جاتا اور یہی کاش اس کی ماں کو اس سے دور کرنے کا سبب بنا تھا۔ صرف زروہ سے کیا وہ تو اپنی تینوں بیٹیوں سے بھی دور ہو رہی تھیں۔

رباب اب بڑی ہو رہی تھی۔ اسے ماں کی زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی اپنی فرینڈز کی طرح اپنی ساری باتیں اپنی ماں سے شیئر کرے۔ لیکن ماں کو تو اپنے کاموں اور اپنی سوچوں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ سفینہ جب بھی بچوں کے قریب جانے کی کوشش کرتیں اس کے لاڈ اٹھانا چاہتیں ساس اور جٹھانی کی کوئی نہ کوئی بات انہیں پھر سے اپنے خول میں سمٹنے پہ مجبور کر دیتی تھی اور ان کے اور بچوں کے درمیان پھر سے وہی فاصلہ آجاتا۔ دادی اور تائی کی باتوں نے ان کا دھیان بھی اپنے چند گھنٹوں کے بیٹے سے ہٹا کر جیتی جاگتی بیٹیوں کی طرف لگنے ہی نہیں دیا۔

کتنے ہی دن یوں ہی گزرے تھے اس گھر میں کبھی ماؤں نے اپنے بچوں کے لاڈ نہیں اٹھائے تھے۔

صدیقہ درانی سدا کی کام سے جی چرانے والی ایک وقت میں ایک چیز بنا کر بچوں کے سامنے رکھ دیتیں۔ بے زاری سے سب کام کرتیں بس سارا وقت اپنے ہی زعم میں مبتلا رہتیں اور دوسروں کا جی جلاتی رہتیں۔ سفینہ تو تھیں ہی خاموش طبع بس نائبہ چاچی ہی ان سب بچوں کی فیورٹ تھیں۔ اکثر سارے بچے ان کے ہی پورشن میں جمع رہتے۔ ان سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے اور وہ خوشی خوشی سب کی فرمائشیں پوری کرتیں۔ ایسے میں دادا جان کے انتقال نے ان سب کی زندگیوں میں ہلچل مچادی۔ چار سالہ زروہ حیران سی نائبہ چاچی کی گود میں بیٹھی ٹکر ٹکر سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ بچے اپنے شفیق دادا کو بہت مس کررہے تھے۔ دادا کے انتقال والے دن فاطمہ پھوپھو آٹھ سالہ اذان کا ہاتھ تھامے چلی آئیں۔ ایک سال قبل ان کے شوہر کا اچانک ہی انتقال ہوا تھا اور شاید دادا جان یہی صدمہ سہہ نہیں پائے تھے اور اب فاطمہ پھوپھو ہمیشہ کے لیے یہاں چلی آئی تھیں اور وہیں دادا کے پورشن میں اپنے لیے مخصوص ان ہی دو کمروں میں شفٹ ہو گئیں اور جس وقت دادا کا جنازہ اٹھا وہ تیورا کر گری تھیں۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ محبوب شوہر کے بعد اب محبت کرنے والے باپ کی جدائی شاید وہ برداشت نہیں کرپائی تھیں۔ پورے دو ہفتے وہ اسپتال میں رہیں ایسے میں اذان کو سفینہ اور نائبہ چاچی نے ہی سنبھالا تھا اور اسپتال میں ان کی دیکھ بھال الگ۔ دادی کو اپنا تو کوئی ہوش نہیں تھا۔ شوہر کی جدائی اور اکلوتی بیٹی اس حال میں تھی۔ بہر حال وقت کا کام ہے گزرنا اور وہ تکلیف دہ وقت بھی گزر ہی گیا۔

☼ ☼ ☼

"بھابھی زروہ کدھر ہے؟" اس دن محمود درانی آفس سے کچھ جلدی آگئے تھے تو وہ نائبہ کے پاس آگئے۔ باقی بچیاں اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں۔

"محمود بھائی زروہ سو رہی ہے۔" نائبہ کچن میں مصروف تھیں۔

"اس وقت۔ خیریت؟" وہ کچھ حیرت سے بولے

"وہ دراصل بھائی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ کام چھوڑ کر ان کے پاس چلی آئیں۔

"کیا ہوا اسے؟" وہ یکدم پریشان ہوا تھے۔

"اسے بخار ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔۔۔" مگر وہ ان کی بات سنے بغیر تیزی سے کمرے کی طرف بڑھے جہاں زروہ دوائیوں کے زیر اثر پرسکون نیند سو رہی تھی اور احمد چاچو اس کے سرہانے بیٹھے تھے۔ بابا نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چھوا۔ بخار اب قدرے کم تھا۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ احمد چاچو نے بھی انہیں تسلی دی۔ وہ سوئی ہوئی زروہ کا ماتھا چوم کر اسے اٹھائے بنا اپنے پورشن کی طرف آگئے اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھے جہاں سفینہ حسب معمول جائے نماز بچھائے کسی وظیفے میں مصروف تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے وظائف آج کل کچھ زیادہ ہی طویل ہوتے جارہے تھے وہ خاموشی سے بیٹھ کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

"کچھ احساس ہے تمہیں کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ لیکن تمہیں فرصت ہی کب ہے؟" سفینہ جیسے ہی جائے نماز تہہ کرکے اٹھیں وہ ان پہ برس پڑے۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" جانے لہجے میں اتنی لاتعلقی تھی کہ انہیں محسوس ہوئی۔ وہ کھول اٹھے۔

"زروہ کو بخار ہے اس قدر تیز اور تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

"زروہ کو بخار ہے کب سے؟ صبح تو ٹھیک ٹھاک تھی۔" جانے وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھیں یا حیرانی سے وہ سمجھ نہیں سکے۔

"اب یہ بھی میں تمہیں بتاؤں کہ کب اور کیوں ہوا۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے سفینہ۔ تم ماں ہو اور ایک ماں کی اولاد سے اتنی لاتعلقی اچھی نہیں ہوتی اور وہ بھی بیٹی سے۔ تمہاری بیٹی بخار میں پھنک رہی ہے اور تمہیں خبر ہی نہیں ہے۔ تم اتنی پڑھی لکھی ہو پھر بھی اتنی جاہلیت کا مظاہرہ کرو گی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا، مجھے تو افسوس ہونے لگا ہے تمہاری سوچ پر۔ تم دوسروں کے

کہنے میں آکر صرف اپنا نقصان کررہی ہو۔" انہوں نے بیوی کو اچھا خاصا لتاڑ کر رکھ دیا۔ اور پریشانی سے سر تھام کر بیٹھ گئے۔ سفینہ کے دل کو یکدم ندامت نے گھیر لیا۔

"آئی ایم سوری محمود! مجھے واقعی نہیں پتا تھا۔" وہ آنکھوں میں ندامت کے اشک لیے ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ وہ خاموش رہے۔

"میں ابھی جا کر دیکھتی ہوں۔" ان کی خاموشی سفینہ کو مزید شرمندہ کرگئی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے اٹھتی ہوئی سفینہ کو روک دیا۔

"میں اسے دیکھ آیا ہوں۔ اب کافی بہتر ہے۔ لیکن سفینہ پلیز بچیوں کا خیال رکھا کرو۔ وہ اب بڑی ہو رہی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ کل کو ان کے ذہنوں میں ہماری طرف سے کوئی بدگمانی پیدا ہو۔ مت سوچا کرو فضول باتوں کو، مت دھیان دیا کرو کسی کی بھی باتوں پر۔ صرف یہ سوچو کہ اللہ کا کتنا کرم ہے اس نے ہمیں اولاد سے نوازا ہے شکر ادا کیا کرو۔ شکوہ مت کیا کرو اور یہ میں تمہیں آخری دفعہ سمجھا رہا ہوں۔" انہوں نے ہزار دفعہ کی کہی ہوئی باتیں پھر سے دوہرائی تھیں کہ شاید اس بار کچھ اثر ہو جائے۔

"میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ آپ پلیز ناراض مت ہوں۔" وہ شرمندگی سے بولیں۔ ان کی آنکھوں سے کتنے ہی آنسو پلکوں کی باڑ پھلانگ کر گر پڑے۔ محمود درانی کا دل ان کے آنسو دیکھ کر ہی پسیج گیا تھا۔ ان سب باتوں سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو وہ سفینہ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ بس کبھی کبھی سفینہ کا رویہ انہیں ہرٹ کر دیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان آنے والے دنوں میں اس گھر میں صرف یہ فرق پڑا تھا کہ پھوپھو نے کالج میں بطور لیکچرار جاب کرلی تھی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کل کو اذان کو کسی بھی قسم کا احساس محرومی ہو کہ وہ یوں اس طرح

ننھیال میں رہ رہا ہے اور اس کے باپ کے بعد اس کی ماں نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا اور ویسے بھی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ بھائیوں پہ کسی قسم کا کوئی بوجھ ڈالیں۔ اگر ابا زندہ ہوتے تو اور بات تھی حالانکہ تینوں بھائی انہیں پلکوں پہ بٹھاتے تھے۔ بہت محبت کرتے تھے ان سے بھی اور اذان سے بھی۔ انہوں نے ابھی تک اذان کا اسکول بھی چینج نہیں کیا تھا حالانکہ سب نے بہت کہا کہ اسے بھی اسی اسکول میں داخل کروادو جہاں سب بچے جاتے ہیں۔ لیکن پھوپھو نے منع کردیا کیونکہ اذان کے پاپا کی یہ خواہش تھی کہ اذان اسی اسکول میں پڑھے اور اذان بھی اپنا اسکول چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ سو سب نے چپ سادھ لی۔

آنے والے دنوں میں گھر میں بلال کا اضافہ ہوا تھا۔ بلال، نائبہ چاچی کا بھانجا تھا۔ اس کے پاپا کا ٹرانسفر ایک نواحی علاقے میں ہوا تھا اور وہ وہاں کے تعلیمی معیار سے مطمئن نہیں تھے۔ اسی لیے وہ بلال کو کسی ہوسٹل میں داخل کرانا چاہتے تھے جبکہ بلال ہوسٹل جانے سے گھبرا رہا تھا نائبہ چاچی کو جب اس مسئلے کا علم ہوا تو وہ فوراً" ہی بلال کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھیں اور انہوں نے احمد چاچو سے بھی پوچھ لیا تھا۔ احمد چاچو کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بھلا ایک بارہ، تیرہ سال کے بچے سے انہیں کیا پرابلم ہوسکتی تھی جبکہ اس کے مستقبل کا سوال تھا۔ مسئلہ اماں جان سے اجازت کا تھا مگر خلاف توقع وہ بھی جلد ہی مان گئیں اور یوں بلال خوشی خوشی نائبہ خالہ کے ساتھ ان کے گھر چلا آیا۔ بلال، اذان کے اسکول میں ہی پڑھتا تھا بس سیکشن الگ الگ تھے۔ پھر احمد چاچو نے ان کے سیکشن بھی ایک ہی کرادیے۔ یوں بلال بھی اذان کے ساتھ ہی اسکول آنے جانے لگا۔ اذان کو بھی کمپنی مل گئی اور پھوپھو بھی مطمئن ہوگئیں۔ کیونکہ اذان اپنے پاپا سے بہت کلوز تھا اور ان کی ڈیتھ کے بعد وہ بمشکل یہاں ایڈجسٹ کرپایا تھا۔ وہ آج بھی ہر ویک اینڈ اپنے دادا اور دادی کے ساتھ گزارنا پسند کرتا تھا۔ یہاں کسی سے اس کی اتنی زیادہ دوستی نہیں تھی بس تھوڑی بہت معیز کے ساتھ اور اب بلال کے ساتھ۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔" اذان جیسے ہی اندر داخل ہوا سامنے سفینہ مامی بیٹھی اپنا کوئی کام کررہی تھیں۔

"وعلیکم السلام، آؤ بیٹا۔" وہ نرمی سے مسکرائیں۔

"مامی زروہ کہاں ہے؟" اذان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا اندر کمرے میں ہوگی بہنوں کے ساتھ، خیریت۔" وہ ہنوز اپنے کام میں مصروف تھیں۔

"جی، اسے کچھ دکھانا ہے۔" وہ کہتا ہوا تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں زروہ فرش پہ پیپرز اور کلرز ارد گرد بکھرائے کوئی ڈرائنگ بنانے میں مصروف تھی۔ اسکول سے چھٹیاں تھیں تو سارے بچے ہوم ورک سے فارغ ہو کر اسی ایکٹویٹیز میں مصروف نظر آتے تھے۔ اذان نے اسے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ وہ سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ادھر آؤ، تمہیں کچھ دکھاؤں۔" وہ اسے لان کی ایک سائیڈ پہ لے آیا۔ جہاں کونے میں پودوں میں چھپا کر ایک باسکٹ رکھی گئی تھی۔

"یہ کیا ہے اذان بھائی؟" وہ مارے اشتیاق کے گھٹنوں کے بل وہیں باسکٹ کے پاس بیٹھ گئی۔

اذان نے اس کے پاس بیٹھ کے احتیاط سے وہ باسکٹ اٹھائی۔ اسے ان دونوں کے درمیان رکھا اور اس کا ڈھکن اٹھایا۔ اندر دو چھوٹے سے روئی کے گالے جیسے سفید رنگ کے خرگوش کے بچے تھے جن کی بھینچی ہوئی آنکھیں سرخ تھیں۔

"اف یہ کتنے پیارے ہیں۔ یہ کس کے ہیں اذان بھائی۔" زروہ نے ڈرتے ڈرتے ان پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ میں تمہارے لیے اپنے دوست سے لے کر آیا ہوں۔ تم نے کہا تھا نا کہ تمہیں خرگوش اچھے لگتے ہیں۔"

"تھینک یو، اذان بھائی، مگر ہم انہیں رکھیں گے کہاں۔ اگر دادو نے دیکھ لیا تو۔"

"واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" زروہ نے واقعی پتے کی بات کی تھی۔

"سوچنے دو۔" اذان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جانتا تھا کہ اگر دادو نے اس کے پاس خرگوش دیکھ لیے تو اس کی خیر نہیں۔

"اچھا میرے ساتھ آؤ۔" چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ باسکٹ اٹھائی اور زروہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"یہاں رکھتے ہیں انہیں، کوئی نہیں دیکھے گا اور نانو تو اس طرف آتی ہی نہیں ہیں۔" اذان وہ باسکٹ اٹھا کر گھر کے پچھلی طرف بنے اسٹور کی طرف آگیا۔ یہ کمرہ گھر کی پچھلی طرف بنا تھا اور بطور اسٹور استعمال کیا جاتا تھا۔ دادو کا اس طرف آنا نہیں ہوتا تھا پھوپھو بھی کبھی کبھار کام والی سے صفائی وغیرہ کروا کے سامان کو ترتیب سے رکھوادیتی تھیں۔ اس لیے اذان کو یہ جگہ محفوظ ترین لگی تھی۔ کیونکہ اگر پھوپھو کو پتا چل بھی جاتا تو انہیں سمجھانا آسان تھا بہ نسبت دادو کے۔

اذان نے باسکٹ زروہ کو پکڑا کر دروازہ کھولا۔ پرانا دروازہ معمولی سی آواز سے کھل گیا۔ اندر داخل ہو کر اس نے نیم اندھیرے میں ٹٹول کر لائٹ آن کی تھی۔ لائٹ آن ہوتے ہی کمرے میں چھایا اندھیرا ایک دم سے دور ہوگیا۔ زروہ بھی اس کے پیچھے اندر آگئی تھی۔ باسکٹ ابھی بھی اس نے ہی اٹھا رکھی تھی۔ اذان نے کمرے کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی ــــ تاکہ وہ کوئی محفوظ جگہ ڈھونڈ سکے۔ جہاں وہ یہ باسکٹ رکھ سکے۔ کمرے میں چاروں طرف بڑے بڑے شیلف بنے تھے، جن میں ترتیب سے سامان رکھا تھا۔ شاید حال ہی میں پھوپھو نے اس کی صفائی کروائی تھی۔ پھر اس کی نظر دیوار میں بنے شیلف پہ پڑی۔ جو آدھا سامان سے بھرا تھا اور آدھا خالی تھا۔ زمین سے قدرے اونچائی پہ تھا۔ اس نے وہ باسکٹ وہاں رکھ دی اور اس کا ڈھکن کھول دیا تھا، تاکہ ہوا اندر جاسکے۔

"یہاں ٹھیک ہے، یہاں رکھتے ہیں۔" اس نے اچھی طرح اطمینان کرلینے کے بعد زروہ سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اچک اچک کر انہیں، دیکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ کیونکہ شیلف اس کے قد کے برابر تھا۔ لیکن باسکٹ چونکہ اس کے اوپر دھری تھی۔ سو وہ اونچی ہوگئی تھی۔ کچھ دیر ان کے ساتھ کھیلنے کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ انہوں نے لائٹ اور پنکھا آن ہی رہنے دیا تھا۔ دروازہ بند کرکے وہ دونوں باہر آگئے تھے۔

"کسی کو بتانا مت۔" اذان اسے تاکید کرنا نہیں بھولا تھا اور جواب میں زروہ نے اپنا نہایت سلکی بالوں والا سر معصومیت سے ہلادیا۔

☼ ☼ ☼

"درانی ہاؤس" ہمیشہ کی طرح ویسا ہی تھا۔ وہی تائی صدیقہ کی جلی کٹی طنز سے بھری باتیں۔ سفینہ کا وہی دھوپ چھاؤں سا رویہ۔ دادو کا وہی تائی کے بچوں سے اظہار محبت اور سفینہ کی بچیوں سے ازلی بیر جو نہ جانے وقت کے ساتھ کم ہو رہا تھا یا بڑھ رہا تھا۔ مگر ان سب باتوں سے ہٹ کر بچے اپنی زندگی میں مگن نائبہ چاچی اور پھوپھو کے شفقت بھرے سائے میں خوش تھے۔

اذان اور زروہ بڑی رازداری سے اسٹور والی شرارت کو نبھا رہے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ کسی کو کانوں کان اس قصے کی خبر نہیں تھی۔ وہ روئی کے گالوں سے خرگوش اب اتنے بڑے ہوگئے تھے کہ دودھ پینا چھوڑ کر آسانی سے خود کھاپی لیتے تھے اور اچھل کر باسکٹ سے باہر بھی نکل آتے تھے۔ ہاں شیلف اور زمین کا فاصلہ انہیں زیادہ لگتا تھا۔ اس لیے وہ شیلف پر ہی گھوم پھر کر باسکٹ میں جا کر سوجاتے تھے۔ اب تک تو اس راز کو کوئی نہ جان سکا، مگر پھوپھو اس راز کو جان گئیں مگر خاموش رہیں، جانتی تھیں کہ یہ شرارت کس کی ہے۔

☼ ☼ ☼

آج پھوپھو اپنے پورشن کے لان کی صفائی کروا رہی تھیں۔ تائی جان کو تو ان سب باتوں سے کوئی دلچسپی تھی نہیں۔ حالانکہ لان دونوں کا مشترکہ تھا۔ لیکن زیادہ تر خیال پھوپھو ہی رکھتی تھیں۔ دادو اندر بیٹھ کر

اکیلے بور ہونے کی بجائے باہر پھوپھو کے پاس گئی تھیں اور وہیں ایک طرف رکھی لان چیئر پہ بیٹھ گئیں۔ سردیوں کی آمد آمد تھی، ہلکی ہلکی دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ بچے سب اسکول، کالجز گئے ہوئے تھے اور مرد حضرات اپنے اپنے کام پہ۔ اس لیے تقریباً" تمام خواتین ہی فارغ تھیں۔ تائی جان وہاں آکر بیٹھیں تو پھوپھو نے نائبہ چاچی اور سفینہ کو بھی وہیں بلالیا۔ سفینہ آج بھی اماں اور تائی کی موجودگی میں ذرا کم ہی بیٹھا کرتی تھیں اور پھر سنا بھی خوب کرتی تھیں کہ ہمارے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں وغیرہ وغیرہ۔ سو اس سے بہتر تھا کہ وہ یہاں سب کے ساتھ بیٹھ جاتیں۔ دفعتاً" کوئی سفید چیز گیند کی طرح اچھلتی ہوئی کیاری میں لگے درخت کے پیچھے چلی گئی اور پھر اور کسی کی نظر پڑے نہ پڑے یہ کیسے ممکن تھا کہ دادی کی نظر نہ پڑتی۔

"فضل ذرا دیکھنا تو اس درخت کے پیچھے کیا ہے۔" دادو نے مالی بابا سے کہا۔ جو سر جھکائے کیاری میں گوڈی کرنے میں مصروف تھا اور اس درخت کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ جہاں وہ سفید چیز غائب ہوئی تھی۔

"کچھ بھی نہیں ہے اماں۔ فضل بابا، آپ یہ پودا وہاں لگادیں۔" پھوپھو دیکھ چکی تھیں۔ اس لیے ٹال دیا ورنہ لازماً" دادو کا پارہ چڑھ جاتا۔

"تو دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ میں خود ہی دیکھ لیتی ہوں، جانے کیا بلا ہے۔" وہ دادی ہی کیا جو کسی سے ٹل جائے۔ کرنی تو انہیں اپنے من کی ہی ہوتی تھی۔ پھر وہ اچھی ہو یا بری۔ اس درخت کے پاس پہنچ کر کتنے ہی لمحے وہ وہاں کھڑی غور سے دیکھتی رہیں۔ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ کیا چیز ہے، کیونکہ وہ ننھا خرگوش پوری طرح مٹی کھودنے میں مصروف تھا۔ اس لیے سفید سے قدرے بھورا مائل دکھ رہا تھا اور آدھا اندر مٹی میں تھا اور آدھا باہر اور دادو ناک پہ انگلی رکھے بس اسے دیکھے جارہی تھیں۔

"ارے فاطمہ، ذرا دیکھو تو یہ تو خرگوش ہے۔ ارے یہ نحوست گھر میں کہاں سے گھس آئی۔ ارے جلدی کرو، اسے گھر سے باہر نکالو۔" دادو کے اس طرح واویلا کرنے پر سب ہی ان کے پاس اٹھ آئے تھے۔

"کیا ہوگیا ہے اماں، ایک خرگوش ہی تو ہے۔ اس میں اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ ادھر ادھر سے آگیا ہوگا۔" پھوپھو نے پھر سے بات کو ٹالنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

"ارے ادھر ادھر سے کیسے آجائے گا۔ یہ ضرور ان بچوں کی شرارت ہے۔ پتا بھی ہے گھر میں خرگوش رکھنا منحوس ہوتا ہے۔ ابھی اور اسی وقت اس کو گھر سے باہر نکالو۔" تائی جان بھلا کیسے پیچھے رہ سکتی تھیں۔ اپنا حصہ تو ڈالنا تھا۔

"خدا کے لیے بھابھی، ایک معصوم سا جانور ہے، اس میں نحوست کی کیا بات ہے۔ اگر بچوں میں سے کوئی لے بھی آیا ہے تو اس میں اتنی بری بات تو نہیں ہے۔" نائبہ چاچی سے اب ان کی یہ جاہلانہ باتیں مزید سنی نہیں گئیں۔

"کیوں جب انسان منحوس ہوسکتے ہیں تو جانور بھی ہوسکتے ہیں۔ کیوں نہیں ہوسکتے اور اگر اماں کہہ رہی ہیں تو کچھ سوچ کر ہی کہہ رہی ہوں گی۔" کوئی بھی موقع ہو، کوئی بھی بات ہو، تائی جان اپنی ذہنیت کا مظاہرہ ضرور کرتی تھیں اور مخاطب کون ہوتا تھا۔ یہ سب ہی اچھی طرح جانتے تھے، لیکن بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ کون ڈالتا، اس لیے سب خاموش ہی رہتے تھے۔ سفینہ سے یہ سب کچھ مزید سنا نہیں گیا۔ وہ وہاں سے چلی آئیں۔

ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ بہت مشکل سے خود کو کمپوز کرتی تھیں اور پھر کوئی ایسی بات ہوجاتی کہ وہ بکھر کر رہ جاتیں اور پھر یہ اسی رات کی بات تھی جب پھوپھو نے اذان سے کہا تھا کہ وہ خرگوش واپس فیصل کو دے آئے اور اذان پہلے سے ہی جانتا تھا کہ اگر تانو کو پتا لگے گا تو یہی ہوگا۔ اس لیے چھپا کر رکھے تھے۔ مگر نہ جانے کیسے اسٹور کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ اگلی ہی صبح جاکر وہ فیصل کو خرگوش واپس کر آیا تھا اور جب زروہ کو پتا چلا تو اس نے شور مچادیا۔

"میں کہہ رہی ہوں زروہ چپ کر جاؤ، ورنہ بہت مار کھاؤ گی۔ کیا تمہیں پتا نہیں ہے کہ تمہاری دادو کو تم پسند ہو، نہ تمہاری کوئی لائی ہوئی چیز، پھر کیوں ضد کرتی ہو۔" سفینہ نے سارا غصہ زروہ پر نکال دیا۔ جو کب سے روئے جارہی تھی۔ بس مارنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"دادو گندی ہیں۔" وہ روتے ہوئے ایک ہی گردان کررہی تھی کہ اسے وہ خرگوش واپس چاہئیں۔ سفینہ پاس ہی سر تھامے بیٹھی تھیں۔ سب ہی باری باری اسے چپ کروانے کی کوشش کر چکے تھے۔ لیکن وہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"زری۔" اسی پل اذان وہاں آیا۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔

"اذان بھائی، دادو گندی ہیں، ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہیں۔ مجھے ڈانٹتی ہیں۔ میں بابا سے ان کی شکایت کروں گی۔" اس کے بال بکھر گئے تھے اور گالوں پہ آنسوؤں کے نشان تھے۔

"ایسے نہیں کہتے زری، وہ بڑی ہیں نا اور آپ تو بہت اچھی بچی ہو۔" اذان نے اس کے آنسو صاف کیے۔ وہ جانتا تھا زری کا ری ایکشن یہی ہوگا۔ اس لیے وہ اسے بتائے بغیر ہی وہ خرگوش فیصل کو واپس دے آیا تھا۔

"آپ مجھے واپس لادیں گے نا، میرے خرگوش۔" وہ کتنے یقین سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھو زری۔ وہ بہت چھوٹے تھے نا۔ اس لیے وہ اپنے ماما، پاپا کے بغیر بہت اداس ہوگئے تھے۔ اس لیے میں انہیں چھوڑ آیا۔ وہ اب بھی تمہارے ہی ہیں۔ لیکن وہ رہیں گے فیصل کے پاس۔ کیونکہ وہاں ان کے ماما، پاپا ہیں، بہن، بھائی ہیں۔ ہم بھی تو اپنے ماما، پاپا کے ساتھ رہتے ہیں نا اور ان کے بغیر اداس ہوجاتے ہیں تو وہ بھی وہاں زیادہ خوش رہیں گے۔ لیکن میں نے فیصل سے کہہ دیا ہے کہ وہ ابھی بھی زروہ کے ہیں اور اس نے ایگری بھی کرلیا ہے۔ اس لیے جب ہمارا دل کرے گا ہم وہاں جائیں گے اور ان سے مل لیں گے، ٹھیک ہے اب خوش۔" وہ مسکراتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں سے سرہلا رہی تھی۔ اذان نے لاڈ سے ہمیشہ کی طرح اس کی ننھی سی ناک دبادی۔ جو بات سب گھنٹوں سے سمجھا رہے تھے۔ وہ اذان نے منٹوں میں سمجھادی تھی۔

☼ ☼ ☼

گزرتے وقت کو بھلا کبھی کوئی روک سکا ہے۔ جتنی تیزی سے وقت کا پرندہ اڑتا ہے شاید ہی کوئی اور پرندہ اتنی تیزی سے اڑ سکتا ہو۔ کیونکہ اس کا کوئی ایک ٹھکانہ، ایک گھونسلہ نہیں ہوتا۔ جہاں وہ چند لمحوں کو ٹھہر کر سستا لے۔ اسے بس اڑتے ہی رہنا ہے۔

گزرتے وقت نے "درانی ہاؤس" میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں۔ بچے جوان ہوگئے تھے۔ دادو کچھ اور بوڑھی ہوگئی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا رعب آج بھی باقی تھا۔ رہتی آج بھی پھوپھو کے ساتھ تھیں۔ لیکن نظر تینوں پورشنز پہ رکھتیں اور وہ بھی کڑی، تائی جان آج بھی ویسی ہی تھیں اپنے ہی زعم میں مبتلا اور ہمیشہ کی طرح کسی کو کم ہی خاطر میں لاتی تھیں۔ احمر ملک سے باہر پڑھنے چلا گیا تھا۔ اس کی شادی تائی کی سگی بھتیجی سے ہوگئی تھی۔ عمر اس کے پاس جانے کو پر تول رہا تھا۔ معیز ماسٹرز کے بعد تایا جان کے ساتھ بزنس سنبھالنے لگا تھا۔ ثنا نے ابھی زروہ کے ساتھ سیکنڈ ایئر مکمل کیا تھا۔ دونوں کو رزلٹ کا انتظار تھا۔ رباب کی گریجویشن کے بعد شادی کردی گئی تھی اور وائے قسمت کے رشتہ بھی تائی جان کے توسط سے ہی ہوا تھا۔

سفینہ نے لاکھ انکار کرنا چاہا۔ لیکن ان کی آج بھی کسی نے نہیں سنی اور محمود درانی بھی بڑی بھابھی اور ماں کے سامنے سر جھکا گئے تھے۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ کیا رباب ہماری بیٹی نہیں ہے، اور کیا ہم اس کا برا چاہیں گے۔ یہ اور بات تھی کہ لڑکا اس سے عمر میں خاصا بڑا تھا اور وہ کوئی خاص خوش نہیں تھی، اپنے گھر میں، بس ماں باپ کی عزت کی خاطر گزارہ کررہی تھی۔

نایاب ڈاکٹر بن رہی تھی اور زروہ گریجویشن کے بعد فری تھی اور ماسٹرز کرنے کا ارادہ کررہی تھی اور فی الحال

کوکنگ شوز دیکھ کر اپنا ٹائم پاس کر رہی تھی۔ ہاں یہ اور بات تھی کہ اسے کوکنگ کا صرف دیکھنے کی حد تک شوق تھا۔ بنایا اس نے کبھی کچھ نہیں تھا۔ ہاں زروہ کو کوکنگ کا خاصا شوق تھا۔ وہ وقتاً "فوقتاً" کبھی نائبہ چاچی سے اور ماما سے کچھ نہ کچھ سیکھتی رہتی تھی۔ نائبہ چاچی کے بلال نے بھی ماسٹرز مکمل کرلیا تھا اور آج کل جاب تلاش کر رہا تھا۔ اس کے والدین چاہتے تھے کہ وہ اب واپس ان کے پاس آجائے۔ آخر کب تک خالہ کے پاس رہے گا۔ لیکن وہ واپس جانا نہیں چاہتا تھا اور نہ نائبہ چاچی اور یہاں کوئی بھی ایسا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کے والدین بھی زیادہ اصرار نہیں کرتے تھے اور باقی رہا اذان تو پھوپھو چاہتی تھیں کہ وہ اپنے بابا کی طرح انجینئر بنے یا ان کی خواہش کے مطابق سی ایس ایس کرلے۔ لیکن اذان کو دونوں باتوں میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ سی اے کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ بینکنگ فیلڈ میں جانے کا تھا۔ ہاں اس نے پھوپھو کو یہ ضرور یقین دلایا تھا کہ اس بیچ اگر اس کا ارادہ بنا تو وہ سی ایس ایس کی تیاری ضرور کرلے گا، لیکن اس نے وعدہ نہیں کیا تھا۔

وہ آج بھی ویک اینڈ اپنے ددھیال میں گزار تا تھا۔

گزرتے وقت میں اس کے دادا کا انتقال ہو گیا تھا۔ دادی تھیں اور وہ اذان سے بہت محبت کرتی تھیں اور اذان بھی ان سے محبت کرتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں جب بھی اذان وہاں سے آتا، قدرے گم سم ——— ہوتا پھوپھو خوب اچھی طرح سے سمجھتی تھیں کہ اس کے اس رویے کی وجہ کیا ہے۔ بچپن سے اذان کی خواہش تھی کہ وہ وہاں رہے۔ دادی کے پاس اپنے بابا کے گھر میں۔ لیکن پھوپھو کبھی پلٹ کر وہاں نہیں گئیں ——— مگر انہوں نے کبھی اذان کو وہاں جانے سے نہیں روکا۔ کیونکہ اس کے دادا اور دادی اس کے منتظر رہتے تھے اور اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ پھوپھو بھی کبھی کبھار ان دونوں سے بات کرلیتی تھیں۔ لیکن وہاں کبھی گئی نہیں اور اذان کو یہی بات کھٹکتی تھی، لیکن وہ کبھی ماں سے پوچھ نہیں پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج ویک اینڈ تھا اور معیز صاحب کو شوق چڑھا تھا پتنگ اڑا کر بچپن کی یاد تازہ کرنے کا۔ معیز اور بلال پتنگ اڑا رہے تھے۔ بلکہ اڑا کم رہے تھے۔ شور زیادہ مچا رہے تھے۔ اذان وہیں رکھی چیئر پہ بیٹھا انہیں دیکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ تائی جان گھر پہ نہیں تھیں۔ اس لیے وہ سب آج معیز کی طرف جمع تھے، اس کی چھت پر۔ ورنہ ایسے شوق نائبہ چاچی کی چھت پر پورے کیے جاتے تھے۔ معیز نے ثنا کو چائے اوپر ہی لانے کو کہا تھا اور ساتھ وردہ اور زروہ کو بھی بلانے کو کہا۔ سب جانتے تھے کہ معیز کا کوئی کام وردہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور یہ بات چھوٹے بڑے سب ہی جانتے تھے اور کسی کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ ماسوائے تائی جان کے۔ وردہ اور ثناء تو آگئی تھیں، لیکن زروہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔

"زری کہاں ہے ثنا؟" چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اذان نے ثنا سے پوچھا۔

"وہ سو رہی ہے اذان بھائی۔" ثنا اسے سرسری سا بتا کر معیز کی طرف آگئی۔

"سو رہی ہے اس وقت۔" اذان نے حیرانی سے پوچھا۔

"سو نہیں رہی ہے۔ اس کا موڈ خراب ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا ہے؟"

"اسے اپنی فرینڈ کی برتھ ڈے پر جانا تھا۔ دادو سے اجازت نہیں ملی اور پھر بابا بھی شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں تو پھر کون لے جاتا، بس اسی بات کی وجہ سے صبح سے اس کا موڈ بہت خراب ہے۔" وردہ نے اس کے خراب موڈ کی وجہ بتادی۔

"خیر جانے کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ماموں نہیں ہیں تو کیا ہوا، میں ہوں، معیز اور بلال ہے، کوئی بھی لے جاسکتا ہے، اچھا خیر میں دیکھتا ہوں۔" اذان کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں جائیے، ہو سکتا ہے آپ کی بات مان جائے۔ ماما اور میں تو سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں۔" وردہ نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اذان چھت سے اتر کر

سیدھا ان کے پورشن کی طرف آیا تھا۔ مامی کچن میں تھیں۔ نایاب اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھی۔ وہ مامی کو بتا کر اس کے کمرے کی طرف آگیا۔ جہاں وہ سرتاپاؤں کمبل لپیٹے پتا نہیں جاگ رہی تھی یا واقعی سو رہی تھی۔

"میں سو رہی ہوں اذان بھائی۔" اذان کے دوبارہ آواز دینے پر اندر سے یہ جواب آیا۔ مسکراہٹ نے بے ساختہ اذان کے لبوں کو چھوا۔

"آپ سوتے میں بھی بولتی ہیں، آج پتا چلا ہے۔" دوبارہ کوئی جواب نہیں آیا۔

"اچھا کیا ہوا ہے، اٹھ کر بیٹھو اور مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔" اذان اسے کہتے ہوئے اسٹول کھینچ کر وہیں اس کے بیڈ کے پاس بیٹھ گیا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ وہ اس کا کہنا ضرور مان لے گی اور واقعی یہی ہوا تھا۔ اذان کے دوبارہ پکارنے پر وہ بکھرے بال سمیٹتی اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی سرخ تھیں۔ شاید وہ روتی رہی تھی۔ کبھی کبھی انسان کوئی چھوٹی سی خواہش کے نہ پورا ہونے پر بھی بے انتہا دکھ محسوس کرتا ہے اور کبھی بڑی سے بڑی خواہش کے رد کیے جانے پہ بھی اتنا محسوس نہیں کرتا ہے۔ اذان کے پوچھنے پہ اس نے اسے پوری بات بتادی۔

"تو تم نے نانو کے سامنے مامی سے اجازت کیوں لی؟" اذان نے پوری بات سننے کے بعد اس سے کہا۔

"میں آپ کو پاگل لگتی ہوں اذان بھائی، جو ان کے سامنے بات کروں گی۔ انہوں نے آتے ہوئے سن لیا تھا اور پھر ان کی عادت کا آپ کو پتا ہے۔" اس کی آنکھیں پھر سے جھلملانے لگیں۔

"اچھا تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ ابھی زیادہ ٹائم نہیں ہوا ہے۔" اذان فوراً" ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے اب نہیں جانا۔" لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"بری بات ہے زری، میں کہہ رہا ہوں اٹھ جاؤ۔"

"سوری، مگر مجھے نہیں جانا اور پھر میں نے اس کے لیے گفٹ بھی لینا تھا۔" اذان نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں نا اذان بھائی، اب میرا موڈ نہیں ہے جانے کا اور اگر میں چلی جاؤں گی تو مجھے مزا نہیں آئے گا، تو پھر فائدہ ایسے جانے کا۔" اس کی بات بھی اپنی جگہ درست تھی۔ جب کہیں جانے کا موڈ ہو تو پھر انسان تیاری بھی اسی حساب سے کرتا ہے اور ذہن بھی اسی طرف لگالیتا ہے۔

"تو پھر اپنا موڈ تو ٹھیک کرو اور وردہ بتا رہی تھی کہ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ کتنی غلط بات ہے نا۔ چلو اٹھو سب معیز کی طرف ہیں۔ ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔ میں تمہیں بلانے ہی تو آیا تھا۔" اذان چاہتا تھا کسی طرح اس کا موڈ ٹھیک ہو جائے، کیونکہ اسے احساس تھا کہ نانو بھی کبھار بہت زیادتی کر جاتی ہیں۔ کیا ہو جاتا اگر اسے اجازت دے دیتیں۔

"مگر..." زری نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"بڑی مامی گھر پہ نہیں ہیں۔ اٹھ جاؤ اب فوراً"۔"

اور اب کے وہ واقعی اٹھ گئی تھی۔ اذان کی کوئی بات وہ کبھی نہیں ٹالتی تھی۔

"آپ چلیں، میں آتی ہوں۔"

"میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔" اذان کہتے ——— ہی باہر نکل آیا تھا اور جب تک وہ فریش ہو کر آئی۔ اذان نے سفینہ مامی کے ساتھ اچھی خاصی گپ شپ لگالی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا وہ یہ تھا کہ زروہ اور ثنا کا سیکنڈ ایر کا رزلٹ آچکا تھا اور اب آگے ایڈمیشن کا مسئلہ تھا۔ ثنا کا ارادہ بس گریجویشن کرنے کا تھا اور زروہ بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ بی ایس سی کرلے۔ بابا نے بھی کہہ دیا تھا کہ جس چیز میں اس کا انٹرسٹ ہو۔ وہ وہی کرے، لیکن نایاب چاہتی تھی کہ میڈیسن کی فیلڈ میں آئے۔ اس کے مارکس اتنے اچھے ہیں تو وہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کرلے اور وہ مسلسل انکاری تھی کہ میں نہیں کروں گی۔ اس وقت بھی یہی بحث ہو رہی

تھی۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی۔" اذان کو بلال سے کچھ کام تھا۔ وہ اس کے پاس جا رہا تھا کہ نیچے بسورتی ہوئی زری کو دیکھ کر رک گیا۔

"اذان بھائی آپ ہی سمجھائیں نا' نایاب آپی کو' مجھے میڈیکل نہیں کرنا اور نہ ہی انٹری ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔" اس نے فوراً" ہی اذان سے مدد چاہی تھی۔

"اور میں بھی یہی کہوں گی اذان کہ تم ہی اسے سمجھاؤ کہ انٹری ٹیسٹ دینے میں کیا حرج ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" نایاب نے مسکراتے ہوئے اس کی بات لوٹائی۔

"اور اگر میں سلیکٹ ہو گئی تو۔۔۔" وہ ٹھنکی۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" نایاب کے مسکرا کر کہنے پہ وہ چڑ گئی۔

"ویسے نایاب آپی' زری ٹھیک کہہ رہی ہے' جب اسے میڈیکل کرنا ہی نہیں ہے تو یہ انٹری ٹیسٹ بھی کیوں دے۔ اتنی محنت کرے' بنا انٹرسٹ کے اور اگر کلیئر کر جاتی ہے تو پھر ہم سب ہی کہیں گے کہ اب آگے پڑھو اور پھر اسے بنا انٹرسٹ کے پورے پانچ سال پڑھنا پڑے گا اور فضول میں کسی کی سیٹ ضائع ہو جائے گی۔" اذان نے حسبِ معمول اپنی دوست کی ہی سائیڈ لی تھی۔

"دیکھا۔ یہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ سمجھ ہی نہیں رہی۔" وہ اپنی بات سمجھے جانے پہ خوش تھی۔

"تمہیں واقعی کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔" نایاب نے مایوسی سے پوچھا۔

"سچ بالکل بھی نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں' تم بی ایس سی کر لو۔" نایاب نے بالآخر اس کا موقف سمجھ لیا تھا۔

"او تھینک یو نایاب آپی۔" وہ بے ساختہ اٹھ کر نایاب سے لپٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

نایاب کا ہاؤس جاب مکمل ہو گیا تھا۔ اذان کو جاب مل گئی تھی۔ اس کو سی اے مکمل کیے ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ اسی خوشی میں سب اس کے پیچھے پڑے تھے کہ انہیں ٹریٹ دی جائے اور وہ مان بھی گیا۔ مسئلہ دادو سے اجازت کا تھا۔ مگر اتفاق سے دادو کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ موسمی بخار تھا۔ وہ دوا لے کر سو رہی تھیں۔ پھوپھو نے کہا کہ "تم لوگ جاؤ۔ اگر پوچھیں گی تو میں سنبھال لوں گی۔" تائی جان نے ثنا کو روک لیا تھا۔ وہ روتی بسورتی رک تو گئی' لیکن دھیان سارا وہیں لگا تھا۔ جہاں سب جا رہے تھے۔ تب ہی معیز نے نیچے آکر ثنا کو آواز دی اور جیسے ہی وہ نیچے آئی بازو سے پکڑ کر گاڑی میں بٹھا دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی تو تائی جان کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

رباب بھی آئی ہوئی تھیں۔ لیکن انہوں نے ساتھ جانے سے منع کر دیا تھا۔

دو گاڑیوں میں ٹھنس ٹھنسا کر وہ لوگ چلے آئے تھے۔ بڑی مشکل سے جگہ منتخب کر کے وہاں ڈنر کیا گیا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ سب آئس کریم کھا رہے تھے۔ جب ہمیشہ کی طرح بلال اور معیز نے ثنا اور زروہ کے کپ اچک لیے تھے اور وہ دونوں اسپون ہاتھ میں لیے بس چند لمحوں کو دیکھتی رہ گئیں۔

"یہ غلط بات ہے معیز بھائی' آپ دونوں ہمیشہ اسی طرح کرتے ہیں۔" ثنا چلائی تھی۔

"بس کیا کریں' جو ٹیسٹ تم دونوں کی آئس کریم میں ہوتا ہے' وہ ہماری آئس کریم میں پتا نہیں کیوں نہیں ہوتا اذان تم بھی ٹیسٹ کرو نا۔" جواب معیز کی بجائے بلال نے دیا اور زری سے چھینا گیا کپ اذان کی طرف بڑھا دیا اور مزے کی بات اذان نے چمچہ بھر بھی لیا تھا۔

"واقعی بلال بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اذان نے بھی اس کی تائید کی۔

"اذان بھائی آپ بھی' آپ ہمیں اسی لیے لے کر آئے ہیں۔" زری نے بری طرح تینوں کو گھورا۔ جو مزے سے ہنس رہے تھے۔ وہ اس بات سے بہت چڑتی

تھی۔ جب معیز یا بلال اس کے سامنے سے چیزیں اچک لیتے تھے۔ وہ دونوں ناراض ہو گئیں۔ پھر سب نے بڑی مشکل سے انہیں منایا۔

"میرا خیال ہے اب گھر چلنا چاہیے' کافی ٹائم ہو گیا ہے۔" نایاب کے کہتے ہی ان سب کو ہی وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ سب ہی جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"ہیلو اذان۔" اس پکار پہ جہاں گاڑی کا دروازہ کھولتا اذان رکا تھا۔ وہیں ان سب نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

"او تجل تم یہاں؟" وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تو یہ تھی تمہاری مصروفیت' جس کے لیے تم نے ہمیں جوائن کرنے سے منع کر دیا تھا۔"

"ہاں بس اچانک ہی ہم لوگوں کا پروگرام بنا۔ تمہاری کال بعد میں آئی تھی۔ اینی وے گائز یہ تجل ہیں' میری تایا زاد۔" اذان نے سب کو ساتھ ہی مخاطب کیا۔ نام سے تو وہ سب ہی جانتے تھے۔ ہاں تجل کو دیکھا پہلی بار تھا۔ شاید بچپن میں کبھی دیکھا ہو۔

"آؤ تجل میں تمہیں سب سے ملواتا ہوں۔" وہ تجل سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ چاہے تھوڑی دیر کو سہی ان لوگوں کو جوائن ضرور کرے۔

"سوری اذان! میرے فرینڈز میرا انتظار کر رہے ہیں مجھے جانا ہے۔ بعد میں ملاقات ہوتی ہے تم سے۔" وہ تنفر سے کہتی جانے کو پلٹ گئی جہاں اس کے دوست اس کا انتظار کر رہے تھے جن میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ اس نے اذان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اذان کو شرمندگی ہوئی تھی اسے تجل کا ایٹی ٹیوڈ برا لگا تھا۔

"اونہہ بناوٹی۔" یہ ریمارک معیز نے دیے تھے کہا صرف معیز نے تھا لیکن ذہنوں میں سب کے یہی تھا۔

☼ ☼ ☼

تائی جان معیز کی شادی کرنا چاہ رہی تھیں۔ احمر کے لیے بھتیجی لائی تھیں اب معیز کے لیے بھی اپنے خاندان سے لانا چاہتی تھیں لیکن معیز' زروہ سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں یہ بات تائی جان سمیت سب ہی جانتے تھے اور کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ تایا جان نے تو بھائی سے بات بھی کر لی تھی اور محمود درانی کو بھلا کوئی اعتراض کیوں ہوتا۔ معیز ان کا بھتیجا تھا۔۔۔ لیکن انہوں نے اتنا ضرور کہا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ یہ رشتہ سب کی رضامندی اور خوشی سے جڑے اگر تائی جان نہیں چاہتیں تو وہ یہ رشتہ کبھی نہیں کریں گے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ساری عمر اپنی ماں کی طرح ان کی ناپسندیدگی سہتی رہے اور تایا جان نے کہہ دیا تھا کہ وہ تائی جان کو منا لیں گے اور آج بھی معیز اور تائی جان میں یہی بحث چھڑی ہوئی تھی۔

"معیز میں نے کہہ دیا ہے کہ تمہاری شادی کسی صورت زروہ سے نہیں ہو گی بس۔" تائی جان کا وہی دو ٹوک جواب تھا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیوں؟ کیا برائی ہے اس میں؟ اور اگر کوئی برائی ہے بھی تو مجھے منظور ہے۔ زندگی مجھے گزارنی ہے۔ میں گزار لوں گا۔" معیز بھی بضد تھا۔

"یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ سفینہ کی بیٹی ہے۔ وہ خود ساری عمر میرے لیے کسی بوجھ کی طرح رہی اور اب میں اس کی بیٹی کو بہو بنا لوں ناممکن۔" تائی جان ان لوگوں میں سے تھیں جو ساری عمر دل میں فضول کدورت لیے بس لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں۔

"یہ برائی تو نہیں ہے یہ تو اچھائی ہے کہ وہ سفینہ چاچی کی بیٹی ہے اور رہی بات آپ کے سینے پہ بوجھ والی تو وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کیوں کہہ رہی ہیں؟" معیز کو ان کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ ماں کے سامنے ضبط کر گیا۔

"اب تم ان ماں بیٹی کی حمایت میں ماں سے بدتمیزی کرو گے۔" وہ قدرے تیز آواز میں بولیں۔ سچ بات ہمیشہ کڑوی لگتی ہے اور انہیں بھی یوں بیٹے کا آئینہ

دکھانا اچھا نہیں لگا۔

"امی میں آپ سے بدتمیزی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ گزری باتوں کو دوہرانے کا فائدہ۔ اس سے صرف دل میں کدورت بڑھتی ہے اور کچھ نہیں۔ آپ آج تک صرف اس بات کو لے کر بیٹھی ہیں کہ آپ کی خواہش کے مطابق خالہ کی شادی محمود چاچو سے نہیں ہوئی اور یہی بات سفینہ چاچی سے آپ کی نفرت کی وجہ ٹھہری۔ ایسی باتیں سوچتے وقت ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ ساری نصیب کی باتیں ہیں۔ ہم اپنی مرضی سے ایک پتا بھی نہیں ہلا سکتے اور پھر کون سا خالہ اپنی زندگی میں ناخوش ہیں۔ ماشاء اللہ اپنے گھر میں خوش ہیں ایک عمر گزر گئی ان کی بھی۔ اب تو دادی بھی بن گئی ہیں۔ ایسا تو آپ تب سوچیں نا جب وہ اپنی زندگی میں ناخوش ہوں۔ پلیز بھول جائیں سب باتوں کو۔ اپنا دل اتنا سخت مت کریں صرف میرے بارے میں سوچیں امی پلیز۔ میں نے ہمیشہ صرف وردہ کو ہی سوچا ہے۔" معیز نے محبت سے ماں کے ہاتھ تھامے پوری کوشش کی تھی انہیں اپنا موقف سمجھانے کی۔

"تمہاری شادی وردہ سے نہیں ہوگی۔ میں نے کہہ دیا ہے بس۔ اس کے علاوہ جہاں کہو۔ میں آج ہی تمہارا رشتہ لے جاؤں گی۔" وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ گویا اس کا سمجھانا بے کار ہی گیا تھا۔

"اور میں اس کے علاوہ کبھی کسی اور شادی نہیں کروں گا امی۔ یہ آپ بھی سن لیں۔" وہ انہیں جاتے دیکھ کر پیچھے سے بے ساختہ چلا اٹھا۔ لیکن تائی جان ہمیشہ کی طرح اس کی کسی بات کا نوٹس لیے بغیر چلی گئی تھیں۔ معیز جھنجلا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم پھوپھو۔" زری ہاتھ میں ٹرے تھامے پھوپھو کی طرف آئی تھی۔ پھوپھو دادو کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ سو وہ بھی وہیں چلی آئی۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ زری۔" پھوپھو نے ہمیشہ کی طرح خوشدلی سے جواب دیا۔ وہ دادو کو سلام کر کے ان کے سامنے جھکی تو وہ سرسری سا جواب دے کر تسبیح اٹھا کر پڑھنے لگیں۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی ہمیشہ کی طرح وہی روکھا پھیکا انداز تھا ان کا۔

"کیا لائی ہو زری۔" پھوپھو نے اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"پھوپھو ماما نے آپ کے اور دادو کے لیے بگھارے بیگن بھیجے ہیں۔ انہوں نے کہا آپ دونوں کو بہت پسند ہیں۔"

"ارے ہاں، اور سفینہ بھابھی تو بناتی بھی بہت مزے کے ہیں۔ ہے نا اماں۔" پھوپھو نے اٹھتے ہوئے کہا۔ زروہ اس لمحے جانے کیوں دادو کا جواب سننے کو رک گئی تھی۔

"ہاں۔ بس ایک کھانا ہی اچھا بنا لیتی ہیں ہماری منجھلی بہو۔" تعریف کی بھی تو کس پیرائے میں، یہ بات سیدھے ڈھنگ سے بھی کہی جا سکتی تھی۔ پھوپھو اسے ساتھ لے کر کچن میں آگئیں۔ وہ کباب تلنے کے ساتھ ساتھ زری سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ تبھی اذان اور بلال ایک ساتھ ہی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ شاید وہ دونوں کہیں باہر سے آرہے تھے۔ اذان کی جاب شروع ہوگئی تھی اور اسے چھ ماہ کے لیے ٹریننگ پر جانا تھا بس وہ اسی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ اذان کچن میں پانی پینے آیا تو بلال بھی پیچھے ہی چلا آیا۔

"پھوپھو بہت اچھی خوشبو آرہی ہے۔ کیا بنا رہی ہیں؟" بلال نے کہتے ہی ایک کباب اٹھا لیا اور ساتھ ہی کچن ٹیبل پر رکھی ٹرے کا ڈھکن بھی اٹھایا تھا جو زری لے کر آئی تھی۔

"یہ آج کیا چیز تمہارے تجربے کی نذر ہوئی ہے۔" وہ دونوں ہی ڈش میں جھانک رہے تھے۔ البتہ سوال اذان کی طرف سے آیا تھا۔

"یہ میں نے نہیں ماما نے بنائے ہیں اور پھوپھو اور دادو کے لیے بھیجے ہیں آپ کے لیے نہیں ہیں۔" جواب حسب توقع تپا ہوا تھا۔ اتنی اچھی اچھی ڈشز وہ سیکھ کر آتی اور ٹرائے کرتی تھی اور وہ تینوں ایسے ہی ان میں سے برائیاں نکالتے تھے۔ ہاں یہ اور بات تھی کہ آخر میں ڈش ہمیشہ خالی ہی ملتی تھی۔

"ہماری ایسی قسمت کہاں کہ آپ ہمارے لیے خاص طور پہ کبھی کچھ لائیں۔" کباب کھاتے ہوئے بلال کی آواز اونچی ہرگز نہیں تھی کہ زری یا پھوپھو سن پاتیں لیکن ساتھ کھڑے اذان نے ضرور سنی تھی اور چند لمحے کو رک کر اسے غور سے دیکھا تھا۔ بلال کی نگاہوں میں جو چمک تھی وہ صاف محسوس کی جا سکتی تھی اور ایسا آج پہلی بار نہیں بلکہ چند بار پہلے بھی اذان کو محسوس ہوا تھا۔ اذان نے نگاہ پھیر کر زری کو دیکھا۔ وہ ہنوز پھوپھو کے ساتھ بات کرنے اور سلاد بنانے میں مصروف تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنے بجتے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

تائی جان نے تایا سے بات کی تھی اور انہیں معیز کو سمجھانے کو کہا تھا۔ لیکن بات الٹی ان کے گلے پڑ گئی تھی۔ تایا جان نے الٹا انہیں ہی سمجھانا شروع کر دیا۔

"تم یہ چاہتی — کہ وہ آپ کی بات مان لے۔ اگر آپ اس کی بات مان لیں تو کیا حرج ہے۔ ایسی غلط خواہش بھی نہیں ہے اس کی۔" تایا جان نے اخبار لپیٹ کر رکھا۔ عینک اتار اس کے اوپر رکھی اور بات کرنے کے لیے میدان میں اتر آئے۔

"کیوں میں کیوں مانوں۔ وہ اولاد ہو کر نہ جھکے اور میں ماں ہو کر اولاد کے سامنے جھک جاؤں۔ ہرگز نہیں۔" وہی ایک ہی رٹ تھی۔

"اسے جھکنا نہیں خواہش کا احترام کرنا کہتے ہیں۔ زندگی اس نے گزارنی ہے۔ جیسے وہ خوش اور مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آئی اس بات میں۔" تایا جان نے گویا اپنی طرف سے بات ہی ختم کر دی تھی۔

"اس کے ساتھ ہماری بھی زندگی جڑی ہے۔ میں نے اس کے لیے اپنی بھانجی کے لیے بات کر لی ہے۔ معیز کی شادی وہیں ہوگی کچھ تو میرے دکھوں کا ازالہ ہو۔ آپ بس اسے سمجھائیں۔" وہ بضد تھیں کہ تایا جان اسے سمجھائیں کیونکہ ماں کی وہ ذرا کم ہی سنتا تھا۔

"ویسے تو میں نے بھی محمود سے بات کر لی ہے پھر۔" تایا جان نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"پھر کیا آپ انہیں منع کر دیں۔"

"تو تم اپنی بہن کو کیوں نہیں منع کر دیتیں۔ ایسے بھی کوئی غم کے پہاڑ نہیں ٹوٹے ہیں تم پر اور تمہاری بہن پر اور ویسے بھی پہلے تمہاری بھتیجی نے آ کر کون سا گھر بسایا ہے۔ جواب یہ بھانجی صاحبہ نباہ کریں گی ایک ماہ تو پورا گزار نہیں سکی تمہارے ساتھ، تمہارے ساتھ زیادہ عرصہ رہنا نہ پڑے اس لیے اس نے پہلے ہی احمر کو قابو میں کر لیا تھا تاکہ وہ بعد میں کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکے۔" تایا جان بھی ہمیشہ دو ٹوک بات کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی بات کڑوی تھی سو وہ حسب توقع تپ گئیں کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا پر تایا جان نے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"اگر تمہیں اتنا ہی شوق ہے نا اپنے خاندان کو یہاں لا کر جمع کرنے کا تو عمر کی دفعہ میں یہ شوق پورا کر لینا کیونکہ وہ بھی احمر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ آسانی سے مان لے گا۔ لیکن معیز کی شادی وردہ سے ہی ہوگی۔ اس جمعے کو میں ان دونوں کی منگنی کر رہا ہوں۔ آنا چاہو تو آجانا ورنہ شوق سے جا کر رہو اپنی بھانجی، بھتیجیوں کے ساتھ۔" وہ اپنی بات کہہ کر اٹھ کر جا چکے تھے۔ تائی کو ان سے اس جواب کی توقع نہیں تھی وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

جمعہ کو معیز اور وردہ کی منگنی طے پائی تھی۔ رشتہ مانگنے تایا کے ساتھ تائی بھی خود چل کر آئی تھیں۔ ہے نا حیرت کی بات کیونکہ ان کی بھانجی نے معیز سے شادی کرنے سے انکار کہلوایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ساری عمر خالہ کی طنز بھری باتیں سن کر نہیں گزار سکتی اور معیز، احمر کی طرح بالکل نہیں تھا کہ فوراً ہی الگ گھر لے لیتا اور بیوی کو وہاں رکھتا۔ وہ کبھی بھی اپنے

اس گھر اور اپنی ماں باپ کو چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ سو تائی جان کو بھی بیٹے کی ضد کے آگے ہار ماننا پڑی اور مجبوراً" یہاں آنا ہی پڑا۔ معیز کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا مگر محمود درانی اور سفینہ تذبذب کا شکار تھے۔ کیونکہ وردہ سے بڑی نایاب تھی اور نایاب سے پہلے وردہ کی منگنی کیسے کردیتے نایاب نے سنا تو ہنس دی تھی۔

"ماما کیا میں نے اتنی پڑھائی' اتنی محنت اس لیے کی تھی کہ اب جب میں بالکل منزل پہ آکھڑی ہوں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شادی کرلوں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ لوگ غلط سوچ رہے ہیں یا آپ کی خواہش غلط ہے۔ لیکن ابھی نہیں ابھی تو میرا کیریئر شروع ہوا ہے۔ ابھی مجھے آگے جانا ہے مزید پڑھنا ہے۔ آپ میری بالکل فکر نہ کریں۔ آپ بے شک وردہ کی کردیں اتنی مشکل سے تو تائی جان مانی ہیں یہ نہ ہو کہ وہ پھر سے کوئی ہنگامہ کردیں۔" نایاب نے محبت سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی مشکل حل کردی۔

"لیکن بیٹا.....!" ماما کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں تو کہتی ہوں آپ وردہ کے ساتھ ساتھ زری کی بھی کردیں۔ پھر میں' آپ اور بابا مزے سے رہیں گے۔" نایاب نے سامنے سے آئی زری کو دیکھ کر کہا۔

"جی نہیں۔ میں اپنی ماما کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانے والی۔" وہ دوسری طرف سے ماں سے لپٹ گئی پھر بھلا وردہ کیوں پیچھے رہتی وہ بھی گھس آئی تھی۔ انہیں رباب کی یاد آئی۔ لیکن پھر بھی ماما آسودگی سے مسکرا دیں۔ گھر بھر میں وردہ اور معیز کی منگنی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

منگنی کا دن کیا طے ہوا سارے گھر میں جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب ہی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ چھوٹے بڑے سب ہی بہت خوش تھے معیز سب کا ہی چہیتا تھا تو وردہ بھی کم عزیز نہ تھی۔ فیملی میں یہ آپس کی پہلی شادی تھی سو سب ہی بہت خوش اور ایکسائیٹڈ تھے۔

منگنی والے دن سب کی تیاری دیکھنے کے لائق تھی۔ سب ہی نک سک سے تیار خوبصورت لگ رہے تھے۔ معیز کی یہ ضد تھی کہ وہ وردہ کو خود انگوٹھی پہنائے گا۔ سب ہی بڑوں کو اس پر اعتراض تھا خصوصاً" تائی جان اور دادی کو۔ لیکن وہ معیز ہی کیا جو کسی کی مان جائے اور پھر بالآخر تایا جان نے اس کے پھولے ہوئے منہ کو دیکھتے ہوئے اسے اجازت دے دی کہ بھلا اپنی منگنی پہ دولہا پھولے ہوئے منہ کے ساتھ کچھ جچ نہیں رہا ہے یوں یہ منگنی کی رسم ادا ہوئی البتہ معیز کو انگوٹھی محمود درانی نے پہنائی تھی کہ وردہ تو اس قدر کنفیوز تھی کہ وہ تو پلکیں ہی بمشکل اٹھا رہی تھی کجا کہ انگوٹھی پہناتی۔ بلال کو فوٹو گرافی کا کافی حد تک شوق تھا۔ سو گھر کے ہر فنکشن' ہر موقع پہ فوٹو گرافی کے فرائض وہی انجام دیتا تھا۔ آج بھی اس نے ہی کیمرا سنبھال رکھا تھا سب ہی اسٹیج پہ جمع تھے۔ فیملی فوٹوز بن رہے تھے۔ اذان بڑے ماموں کی کوئی بات سن کر سب کے بلانے پر اسٹیج کی طرف جا رہا تھا کہ یوں ہی اس کی نظر بلال کے ڈیجیٹل کیمرے کی اسکرین پر پڑی۔

جس کی اسکرین پہ صرف زروہ کا فوکس تھا اور بلال کے لبوں پر مدھم مسکراہٹ ڈول رہی تھی۔ یوں ہی اس نے زری پر نگاہ کی جو معیز کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی اور اس کا دھیان قطعی اس طرف نہ تھا۔ اذان کو تھوڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ بلال کو کچھ کہہ پاتا۔ معیز نے اسے اپنی طرف بلالیا۔ جہاں اس کے ایک طرف پھوپھو بیٹھی تھیں اور وہ چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے اذان اس کے ساتھ بیٹھے وہ سر جھٹک کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

یہ معیز اور وردہ کی منگنی کے تقریباً" ایک ڈیڑھ ہفتے بعد کی بات تھی جب نائبہ چاچی' پھوپھو سے کوئی بات کرنے ان کی طرف آئی تھیں۔ اذان اپنی ٹریننگ

کے سلسلے میں جاچکا تھا اور گھر میں سب ہی اسے بہت مس کررہے تھے۔ خصوصاً" زری کا تو آج بھی کوئی کام اس کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ ہر کام میں اس کی رائے ضرور لینی ہوتی تھی۔

"فاطمہ آپا آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے۔" نائبہ چاچی نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولیں نا بھابھی کیا بات ہے؟" پھوپھو پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھیں۔ دادو اس وقت تائی جان کی طرف تھیں۔ سو وہ دونوں اطمینان سے اپنی بات کرسکتی تھیں۔

"آپا میں چاہتی ہوں اب بلال کی شادی کردوں اس کے والدین کی بھی یہی خواہش ہے لیکن انہوں نے اور بلال نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔" نائبہ چاچی نے مسکراتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

"ہاں یہ تو بہت اچھی بات ہے اور اب تو ماشاءاللہ سے اسے اتنی اچھی جاب بھی مل گئی ہے۔ پھر کوئی لڑکی دیکھی اس کے لیے یا کوئی ذہن میں ہے۔" پھوپھو بھی ان کی ہمنوا تھیں۔ سو دلچسپی سے پوچھا۔ وہ یوں بھی آج کل اذان کے لیے بھی یہی سوچ رہی تھی۔

"ایک لڑکی ہے تو سہی نظر میں آپا۔ سوچا آپ سے مشورہ کرلوں۔ پھر بات چلاؤں۔" نائبہ چاچی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا کون؟"

"آپا میں سوچ رہی ہوں کہ....." نائبہ چاچی چند لمحوں کو رکیں۔ اک نگاہ پھوپھو کو دیکھا۔ جو منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ زری کے لیے سفینہ بھابھی سے بات کروں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔"

"زری کے لیے....." پھوپھو کے لیے یہ بالکل غیر متوقع تھا۔ سو چند لمحوں کو وہ کچھ بول ہی نہیں پائیں۔

"جی آپا۔ آپ تو جانتی ہیں کہ بچپن ہی سے زری میرے کتنے قریب رہی ہے۔ بالکل میری بیٹی کی طرح ہے وہ اور مجھے عزیز بھی بہت ہے۔ وہ میرے گھر میں ہوتی ہے تو مجھے اپنا گھر مکمل لگتا ہے۔ بیٹے کی خواہش تو اللہ نے بلال کی صورت کی پوری کردی ہے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ بیٹی کو بھی گھر لے آؤں تو میرا گھر مکمل ہوجائے۔ آپ کیا کہتی ہیں آپا۔" نائبہ چاچی نے ان سے پوچھا تھا۔ گویا تائید چاہی تھی۔

"بھابھی۔ آپ کی محبت' چاہت' خواہش سر آنکھوں پہ' لیکن....." پھوپھو لمحے بھر کو خاموش ہوگئیں جیسے سوچ رہی ہوں کہ انہیں بتائیں یا نہ بتائیں۔

"لیکن کیا آپا۔ کوئی بات ہے کیا؟"

"نہیں اور تو کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن میں بہت پہلے اذان اور زری کے لیے بھائی اور بھابھی سے بات کرچکی ہوں اور انہیں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔" پھوپھو نے انہیں بتا ہی دیا تھا کہ اب چھپانا ناگزیر تھا۔

"اچھا۔ مگر مجھے تو پتا ہی نہیں۔" وہ حیرانی سے بولیں

"آپ کو کیا یہ بات کسی کو بھی پتا نہیں ہے۔ یہ بات صرف بھائی' بھابھی اور میرے درمیان ہے یہاں تک کہ میں نے آج تک اماں کو بھی نہیں بتایا آپ کو تو پتا ہے ان کی عادت کا وہ کیسا ری ایکٹ کرتی ہیں۔ آپ کو برا لگا؟" پھوپھو نے ندامت سے پوچھا۔ نائبہ چاچی بالکل ان کی دوستوں کی طرح تھیں اور ایسے میں ان کی خواہش کو رد کرنا انہیں بہت برا لگ رہا تھا۔

"ارے نہیں آپا برا کیوں لگے گا بلکہ مجھے تو بہت خوشی ہورہی ہے۔ بلال یا اذان میرے لیے دونوں برابر ہیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔" نائبہ چاچی نے انہیں بھرپور تسلی دی۔ جانتی تھیں اس بات کو لے کر پھوپھو یونہی پریشان ہوتی رہیں گی۔

"آپ تو جانتی ہیں نا بھابھی۔ اذان کا اپنے ددھیال میں کتنا آنا جانا ہے اور پھر تجل سے اس کی دوستی ہے اس لڑکی کا بس چلے تو وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہے۔ ایسے میں میرا دل اس کے لیے بہت پریشان رہتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اذان آگے چل کر اپنے مستقبل کو لے کر کوئی ایسا فیصلہ کرے جس پہ بعد میں اسے اور

مجھے ساری زندگی پچھتانا پڑے اور پھر زری سے اس کی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ دونوں ایک کامیاب زندگی گزاریں گے۔" انہوں نے اپنے خدشات کے پیش نظر بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا۔

"میں جانتی ہوں آپا۔ آپ بالکل فکر مت کریں۔ ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" نائبہ چاچی نے ان کی ڈھارس بندھائی تھی۔ شکر ہوا کہ انہوں نے جلدی میں بات سنبھال لی تھی جلد بازی میں یہ نہیں کہہ گئیں کہ یہ ان سے زیادہ بلال کی خواہش ہے ورنہ بات سنبھالنی مشکل ہوجاتی۔

☼ ☼ ☼

"کیا کررہی ہو زری۔" وہ اپنے ہی خیالوں میں گم بیٹھی تھی۔ لبوں پہ دلفریب مسکراہٹ پھیلی تھی کہ ثنا نے آکر اسے چونکا دیا۔

"کیا سوچ رہی ہو۔" ثنا نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

بات ایسی تھی کہ وہ ابھی کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ صرف خود تک رکھنا چاہتی تھی۔ اس دن جب وہ نائبہ چاچی کو ڈھونڈتی ہوئی پھوپھو کی طرف آئی تو وہاں اپنا نام سن کر وہ باہر ہی رک گئی۔ وہ یوں چھپ کر سننا نہیں چاہتی تھی کہ یہ انتہائی غلط حرکت ہے مگر اپنا نام سن کر وہ غیر ارادی طور پر وہاں رک گئی تھی اور جیسے وہ پوری بات سنتی گئی اسے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی تھی۔ اذان جو اس کا اچھا دوست تھا۔ ہمیشہ اس کی بات سنتا تھا' اس کا اتنا خیال رکھتا تھا' اسے ہر بات میں اتنی اہمیت دیتا تھا۔ پھوپھو ہمیشہ کے لیے اسے زری کی زندگی میں شامل کرنے کا سوچ رہی ہیں۔ یہ احساس ہی اس کے لیے بہت خوش کن تھا اور یہ جان کر وہ ماما' بابا سے بات کرچکی ہیں اور انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ سرشار سی ہوگئی تھی —— یہ بات ان تینوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور آج وہ نائبہ چاچی کو بتا رہی تھیں۔ اس لیے وہ بھی کسی کو بتانے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ جب وقت آئے گا سب کو خود ہی پتا چل جائے گا۔ زری نے صرف اپنے اور اذان کے بارے میں سنا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس سے پہلے وہ دونوں کیا بات کررہی تھیں۔

"معیز بھائی کی منگنی کی تصویریں آگئی ہیں۔ سوچا مل کر دیکھتے ہیں۔" ثنا نے البم کھولتے ہوئے اسے پھر سے خیالوں کی دنیا سے نکالا۔

"ہاں آؤ۔ دیکھتے ہیں۔" وہ بھی مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"کتنے اچھے لگ رہے ہیں نا۔" ثنا نے ایک تصویر کو دیکھتے ہوئے ریمارکس دیے تھے۔ جس میں تقریباً سب ہی موجود تھے۔

"کون معیز بھائی نا۔ واقعی وہ اس دن ماشاء اللہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔" زری کا دھیان معیز کی طرف گیا۔

"میں معیز بھائی بات نہیں کررہی۔" ثنا نے سر اٹھا کر اسے گھورا۔

"پھر؟" زری نے حیرت سے پوچھا۔ جواب میں ثنا نے تصویر پہ ایک جگہ انگلی رکھ دی۔

"ان کی بات کررہی ہوں۔"

"بلال بھائی کی۔" ثنا کے انداز کو دیکھ کر زری کی چیخ بے ساختہ تھی۔ ثناء نے اثبات میں سرہلایا تھا۔

"ہاں اچھے لگ رہے ہیں وہ بھی۔" زری کی نگاہیں اب اذان پہ ٹکی تھیں۔ جو ڈارک براؤن شرٹ میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سو انداز سرسری تھا۔

"صرف اچھے۔ بہت اچھے لگ رہے ہیں اور ہمیشہ ہی لگتے ہیں۔" وہ کہہ کر پھر تصویر کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"ثنا ادھر دیکھو میری طرف۔" زری نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں کیا؟" زری نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"بالکل۔" ثنا نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

دادو کی طبیعت آج کل بہت خراب رہنے لگی تھی۔ ان پہ ہلکا سا فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ چند دن اسپتال میں رہنے کے بعد وہ گھر آچکی تھی۔ سو اب سب ہی ان کی دیکھ بھال میں لگے تھے۔ پھوپھو کے لیے جاب کے ساتھ ساتھ انہیں دیکھنا بہت مشکل ہوتا تھا حالانکہ ملازمہ موجود تھی۔ مگر پھر بھی کسی گھر والے کا موجود رہنا ازحد ضروری تھا۔ تو ایسے میں سب ہی باری باری ان کا خیال رکھ رہے تھے۔ تائی جان اور ثنا تو بس کبھی کبھار ہی انہیں دیکھنے آتی تھیں اور وہ بھی کھڑے کھڑے اور سفینہ چاچی اور نائبہ چاچی تو کام کاج سے فارغ ہوکر ہر وقت ہی ان کے پاس موجود رہتی تھیں اور رات میں وردہ اور زری میں سے کوئی نہ کوئی ان کے پاس ضرور رکتا تھا۔ وردہ تو پڑھائی سے فارغ تھی لیکن زری کو صبح کالج بھی جانا ہوتا تھا۔ سو وہ کالج کے بعد آکر سارا وقت دادو کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔ ہاں رات میں کم ہی رکتی تھی مگر چھٹی والے دن ضرور رکتی تھی۔ دادو اب سارا وقت ان بہنوں کو دعائیں ہی دیتی تھیں گو زبان سے کچھ نہیں بولتی تھیں مگر اب وہ اچھی طرح جان چکی تھیں کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ اب ان ماں بیٹیوں سے بات کرتے وقت ان کی زبان پر طنز نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت پیار اور حلاوت سے بات کرتی تھیں۔ رباب بھی کتنی بار انہیں دیکھنے آئی —— نایاب بھی صبح اسپتال جانے سے پہلے اور شام میں اسپتال سے آنے کے بعد انہیں چیک کرنے ضرور آتی تھی۔ دادو جو ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ بس سب الویں ناٹک ہے کوئی ڈاکٹر واکٹر نہیں بن رہی اب جب انہیں وہ چیک کرتی اور دیکھ کر دوائیں وغیرہ کھلاتی تو انہیں یقین آیا تھا کہ واقعی ان کی پوتی قابل ڈاکٹر بن گئی ہے اور اب انہیں بہت فخر محسوس ہوتا تھا۔

اذان بھی ان کی طبیعت کی خرابی کا سن کر انہیں دیکھنے آیا تھا۔ معیز اور بلال بھی اکثر ان کے پاس بیٹھے ہوتے لیکن عمر نے آکر ایک بار بھی ان کی طبیعت نہیں پوچھی تھی۔ تائی جان بھی چند ایک بار ہی آئی تھیں۔ بہانہ جوڑوں کے درد کا تھا کہ بار بار سیڑھیاں نہیں اتر سکتیں وہ وقت بھول گئی تھیں جب ساس کے کان بھرنے کے لیے دن میں کئی کئی بار سیڑھیاں اترا اور چڑھا کرتیں اس وقت جوڑوں کا درد کہاں گیا تھا اب جب بوڑھی ساس اک اک پل ان کا انتظار کیا کرتیں تو اب انہیں سیڑھیاں اترنا دوبھر لگ رہا تھا اور بچوں کو بھی منع کرتی تھیں معیز تو کم ہی ان کی سنتا تھا ہاں البتہ ثنا ماں کے کہنے میں آجاتی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ دادو کی بیماری بہترین علاج کے باوجود دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی تھی اور پھر گرمیوں کی ایک تپتی دوپہر میں دادو اپنی بیماری سے لڑتے لڑتے ہار گئیں یا اپنوں کے غم نے انہیں ہرا دیا۔ جنہیں وہ ساری زندگی سب سے زیادہ اپنا سمجھتی رہی تھیں اور جن سے وہ عمر بھر دور بھاگتی رہیں وہ آخری گھڑی تک ان کے سرہانے بیٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

دادو کے انتقال کو تقریباً" دو ماہ ہوگئے تھے اور ان کے بعد پہلی مرتبہ تائی جان نے محمود درانی کے پورشن میں قدم رکھا تھا۔ اتفاق سے آج رباب بھی آئی ہوئی تھی۔ تائی جان' زری کے لیے کوئی رشتہ لے کر آئی تھیں۔ اپنے کسی بھانجے' بھتیجے کا جو عرصے سے ملک سے باہر تھا اور اس دوران اس قدر کم آیا تھا اپنے گھر کہ شاید اس کے اپنے گھر والے کو بھی اس کی شکل بھول چکی تھی اور انہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ وہاں کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کیا جاب کرتا ہے اور کریکٹر کا کیسا ہے بس ان کے نزدیک یہ بات بڑی تھی لڑکا ملک سے باہر ہے اور شادی کرنے یہاں آئے گا اور شادی کے بعد بیوی کو لے کر جائے گا۔ رباب اور سفینہ نے خاموشی سے ان کی بات سنی تھی۔ اس وقت گھر پہ وہ دونوں ہی تھیں۔ نایاب اسپتال گئی ہوئی تھی۔ وردہ نے ماسٹرز میں ایڈمیشن لے لیا تھا وہ یونیورسٹی گئی ہوئی تھی اور

زروہ کالج اس کے فائنل ایگزام ہو رہے تھے۔

"مجھے تو جیسے ہی اس رشتے کا پتا چلا۔ میں نے تو فوراً" ہی سوچا کہ زری کے لیے نہایت مناسب رہے گا۔" تائی جان تو گویا اپنی طرف سے بات طے کیے بیٹھی تھیں۔

"اور آپ کو ایسا کیوں لگا تائی جان؟" رباب نے لمحے بھر کو انہیں دیکھا پھر پوچھا۔

"تو برائی کیا ہے؟" تائی جان نے چائے کا کپ لبوں سے لگالیا۔ جو ابھی ابھی سفینہ نے آگے رکھا تھا۔

"معاف کیجیے گا تائی جان کیا آپ کے خاندان کے سارے ادھیڑ عمر اور آوارہ مرد ہم بہنوں کے لیے ہی رہ گئے ہیں۔" رباب کو ویسے ہی ان پر غصہ رہتا تھا سو وہ آج برداشت نہ کرسکی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا رباب! اب اتنی بھی کیا عمر ہوگی اس کی تمہارے شوہر کی عمر کا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ اور کیا۔ اس میں برائی کیا ہے۔"

"میرا شوہر آج تک میری عمر سے میل نہ کھاسکا تو اس کی عمر کا مرد زری سے کیسے میل کھاتا ہے۔ آپ شاید بھول رہی ہیں وہ سب سے چھوٹی ہے اس کے اور میرے بیچ دو بہنیں اور ہیں۔ تائی جان۔" رباب کا جی چاہا کہ ان کے سب حساب برابر کردے اس کی زندگی برباد کرکے انہیں چین نہیں ملا تھا کہ وہ اب زری کے پیچھے پڑی تھیں۔

"تو مرد کی عمر کون دیکھتا ہے بی بی۔ تم کون سا اپنے گھر میں ناخوش ہو۔ بس ایک اولاد کی کمی ہے باقی تو تم عیش کررہی ہو۔" تائی جان خاصے غصے سے بولیں۔

"تو کیا مرد کی آوارگی دیکھتے ہیں۔ اس کا غلط چال چلن دیکھتے ہیں یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی صحبت کتنی خراب ہے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ جتنا خراب مرد ہوگا اتنا اچھا شوہر ہوگا۔ اگر آپ کے نزدیک یہ سب اچھائیاں ہیں تو آپ ثنا کی کیوں نہیں کردیتیں وہ بھی تو زری کی ہی عمر کی ہے اور رہی بات میری تو آپ نے میری زندگی برباد کرنا تھی سو کردی اور یہ جو آپ مجھے بے اولادی کے طعنے دیتی ہیں نا تو آج میں آپ کو بتادوں کہ خرابی مجھ میں نہیں آپ کے لائے ہوئے اس بہترین مرد میں ہے اور وہ اس بات کو ماننے سے انکاری ہے یہ قصور میرا نہیں ہے اور نہ ہی میری ماں کا۔ کیونکہ اس نے بیٹیاں ضرور پیدا کی ہیں۔ لیکن وہ بانجھ نہیں ہے اور نہ ہی اس نے مجھے بانجھ پیدا کیا ہے۔ یہ قصور اس بہترین مرد کا ہے۔ میں اگر چپ ہوں تو صرف اپنے ماں 'باپ اور بہنوں کی وجہ سے کہ میری وجہ سے انہیں کوئی دکھ نہ پہنچے اور اگر آپ کو یہ ڈر ہے کہ کہیں معیز کی طرح عمر بھی زری کے لیے نہ کہہ دے۔ تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ مگر خدا کے لیے آپ زری کے ساتھ یہ دشمنی نہ کریں۔" بولتے 'بولتے رباب کی آنکھوں سے آنسو قطار قطار گرنے لگے تھے وہ ہانپنے لگی تھی۔

"بھابھی آپ پلیز جائیں۔ رباب بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہمیں اگر زری کے لیے سوچنا ہوگا تو ہم خود سوچ لیں گے۔" وہ بیٹی کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"اونہہ..... ڈرامہ۔" تائی جان جاتے جاتے بھی نفرت سے ہنکارا بھر کر گئی تھیں۔

سچ تو یہی تھا کہ جب سے معیز نے وردہ کے لیے ضد کی تھی۔ انہیں دھڑکا سا لگ گیا تھا کہ کہیں عمر بھی بھائی کے نقش قدم پہ نہ چل پڑے اور اس ڈر کی وجہ سے وہ آج یہاں آئی تھیں۔ حالانکہ وہ رشتہ قابل قبول کیا قابل ذکر بھی نہ تھا۔ گھر والے اس لڑکے کی شادی صرف اس لیے کرنا چاہتے تھے 'تاکہ وہ عیاشیوں کو چھوڑ دے۔ مگر یہاں رباب کی باتیں سن کر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

"رباب بچے!" سفینہ نے اسے سینے سے لگالیا۔ وہ ماں کے سینے سے لگتے ہی بلک بلک کر رو پڑی۔

"بیٹے تم نے کبھی کچھ نہیں جتایا۔ اتنا کچھ اکیلے ہی برداشت کرلیا 'اتنا پرایا سمجھ لیا ہمیں۔" ماما نے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا تھا۔ ایسی صبر والی ان کی بیٹی کہ آج تک منہ سے بھاپ تک نہ نکالی 'ان کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔

"کیا جتاتی ماما! جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا ہے۔ میرا تو وجود ہی لہولہان ہے۔ کون سے کون سے زخم دکھاتی آپ کو۔" سچ ہے اس نے کبھی اپنے منہ سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ سب دیکھتے تھے 'سمجھتے تھے 'پوچھتے بھی تھے کہ وہ ناخوش دکھتی ہے 'لیکن وہ ٹال دیتی۔ اس نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔

"میں تو آج بھی نہ کہتی اگر تائی جان 'زری کے لیے وہ رشتہ نہ لاتیں۔ میرا تو خون کھول اٹھا ہے ان کی باتیں سن کر 'وہ ہوتی کون ہیں ہمارے مستقبل کے فیصلے کرنے والی۔ مجھے تو وردہ اور معیز کی محبت چپ کرا گئی۔ میں تایا اور بابا کی وجہ سے چپ رہی — ورنہ میں وردہ کی شادی بھی کبھی وہاں نہ ہونے دیتی۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے ماں سے الگ ہوئی۔

"لیکن معیز ایسا نہیں ہے بیٹا 'وہ بہت الگ ہے اور یہی بات مجھے مطمئن کرتی ہے۔"

"یہی بات سوچ کر تو میں خاموش ہوجاتی ہوں ماما 'میری تو ہر لمحہ یہی دعا ہوتی ہے کہ اللہ میری بہنوں کے نصیب اچھے کرے۔" وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔

"لیکن بیٹا مجھے تو بتاؤ 'جو تم نے ابھی بڑی بھابھی سے کہا۔ کیا مجھ سے بھی چھپاؤ گی۔" ماما نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اس کا رخ اپنی طرف پھیرا تھا۔

"رہنے دیں ماما 'تکلیف ہوتی ہے 'بس جیسی زندگی گزر رہی ہے 'گزرنے دیں 'بس آپ اللہ سے دعا کریں کہ اللہ میری مشکلیں آسان کردے۔" رباب کی آواز پھر سے بھرا گئی۔ ماما بس اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ کیسی بکھری بکھری سی لگ رہی تھی ان کی بیٹی 'لیکن جانتی تھیں کہ اب یہ لاکھ کوشش کرلیں۔ وہ انہیں ایک لفظ نہیں بتائے گی۔ صرف اس خیال سے کہ ماں کو تکلیف ہوگی اور خود ساری تکلیف 'ساری پریشانیاں سہتی رہے گی۔

☼ ☼ ☼

اذان کی ٹریننگ ختم ہوگئی تھی اور وہ اگلے ہفتے واپس آرہا تھا۔ یہ بات سن کر ہی پھوپھو نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ باقاعدہ طور پر محمود بھائی سے زری کے لیے بات کریں گی اور پھر جس طرح تائی جان آئے دن زری کے لیے نت نئے رشتے بتارہی تھیں ایسے میں انہیں یہی مناسب لگا کہ وہ یہ بات ظاہر کردیں۔ سو آج انہوں نے بھائی اور بھابھی سے بات کرلی تھی اور انہیں تو کوئی اعتراض تھا ہی نہیں اور اعتراض کرنے والی کوئی بات تھی بھی نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اذان ان کی پیاری لاڈلی بہن کا بیٹا تھا اور انہیں بھی اپنے بیٹوں کی طرح ہی عزیز تھا اور جب پھوپھو نے انہیں بتایا کہ دادو کی بھی آخری خواہش یہی تھی وہ چاہتی تھیں کہ کچھ تو ان کی زیادتیوں کا ازالہ ہو۔ تو محمود درانی کو سن کر بہت خوشی ہوئی کہ چلو ساری زندگی نہ سہی لیکن کم از کم آخری وقت میں تو ان کی ماں 'ان کی بیوی اور بچوں سے خوش تھیں۔ گھر میں سب کے لیے یہ خبر بہت خوشی کی تھی۔ ماسوائے تائی جان کہ کیونکہ وہ تو کب سے ثنا کے لیے اذان کو سوچے بیٹھی تھیں کہ گھر کی بات ہے 'کوئی جھنجھٹ ہی نہیں ہوگا اور کبھی بھی موقع دیکھ کر نند سے بات کرلیں گی اور بھلا وہ کیوں انکار کریں گی۔ لیکن افسوس وہ سوچتی رہ گئیں اور اس بار بھی سفینہ بازی لے گئیں۔ ایسا کیا ہے ان کی بیٹیوں میں جو ان کی بیٹی میں نہ تھا۔ یہ بات سوچتے ہوئے وہ اکثر یہ بات بھول جاتی تھیں کہ انسان کی اچھی سوچ اور سچی نیت بھی ان سارے معاملات میں بہت کام آتی ہے۔

اذان تو یہاں تھا نہیں 'تو سب نے زری کو پکڑ لیا تھا اور مسلسل اسے تنگ کیے جارہے تھے۔ جس میں سرفہرست معیز تھا اور ہمیشہ ایسے موقعوں پہ چہکنے والا بلال اس وقت بالکل خاموش تھا اور کچھ شاک کی کیفیت میں تھا۔ نائبہ چاچی کو شکایتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے کتنا کہا تھا آپ کو کہ آپ بات کرلیں 'لیکن آپ نے دیر کردی اور نائبہ چاچی نگاہ چرا رہی تھیں۔

"آپ نے دیر کردی نا خالہ جانی۔" وہ موقع ملتے ہی ان کی طرف آیا تھا۔

"دیر نہیں کی بیٹا۔ لیکن آپا نے مجھ سے بھی زیادہ جلدی کردی۔ وہ مجھ سے بہت پہلے محمود بھائی سے بات کرچکی تھیں۔ سو پہلا حق ان ہی کا بنتا تھا اور اب تم بھی اس بات کو یہیں ختم کردو۔" نائبہ چاچی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ بھی ان کی تسلی کے لیے مسکرا دیا۔ کوئی جنونی قسم کا عشق یا محبت نہیں تھی اسے زری سے۔ بس وہ اچھی لگنے لگی تھی اور دل میں ایک خواہش سی جاگی تھی۔ مگر خیر جو اللہ کو منظور۔ اس نے نائبہ چاچی کی بات گرہ سے باندھ لی اور سر جھٹک کر معیز کے بلانے پر ان سب کے پاس آگیا۔

☼ ☼ ☼

اذان واپس آیا تو سب کے لیے گفٹس لایا تھا۔ وہ سب اس وقت پھوپھو کے لاؤنج میں جمع تھے۔

"زری یہ تمہارے لیے۔" اس نے زری کی طرف اس کا گفٹ بڑھایا۔ جو اس نے مسکرا کر تھام لیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے لیے چاکلیٹس اور اس کی پسند کی کچھ اور چیزیں لایا تھا۔

"اب بھی چاکلیٹ' اب تو اس کے لیے چاکلیٹس لانا بند کردے میرے بھائی۔" حسبِ توقع معیز کی زبان میں کھجلی ہوئی۔ زری نے مسکرا کر سر جھکا لیا اور اذان ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھ رہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے معیز سے پوچھا تھا۔

"اذان بیٹے' یہ بلیو پیکٹ کس کے لیے ہے۔" پھوپھو نے معیز کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اذان کا دھیان اپنی طرف کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اچانک اسے یہ بات پتا چلے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ خود ہی کوئی موقع دیکھ کر اسے بتادیں گی۔

"یہ سجل کے لیے ماما۔ اس نے منگوایا تھا۔ کل دے آؤں گا جا کے اسے۔" اس نے وہ پیکٹ اٹھا کر سائیڈ پہ رکھ دیا۔ پھوپھو کو سجل کا ذکر ناگوار گزرا تھا' لیکن وہ خاموش رہیں۔ وہیں اس کے ذکر پہ زری کے چہرے پہ ایک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ بہت غور سے اذان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس کے چہرے پہ سجل کے ذکر پہ ایک چمک سی آگئی تھی۔

"تم اتنے چپ کیوں ہو بلال' کیا ہوا ہے؟" اذان نے کافی دیر سے خاموش بیٹھے بلال سے کہا۔ بلال کی نگاہیں زری کے چہرے پہ جمی تھیں' جس کا چہرہ اذان کو دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ ایک دم اذان کی طرف متوجہ ہوا۔ پتا نہیں اذان نے اس کی نگاہوں کی چوری پکڑی تھی یا نہیں۔ کیونکہ بہرحال اب یہ چوری ہی تھی' "کیونکہ اب زری' اذان کی امانت ہے اور اذان میرا دوست ہے اور مجھے خود کو روکنا ہوگا۔" بلال نے خود کو اچھی طرح ڈانٹ کر اپنا دھیان اذان اور معیز کی طرف لگالیا۔

☼ ☼ ☼

اذان نے اگلے دن سے آفس جوائن کرلیا تھا۔ چونکہ پہلا دن تھا۔ اس لیے اتنا کام نہیں تھا۔ آفس ٹائم سے ایک گھنٹہ پہلے وہ تمام کام نبٹا کر فری ہوچکا تھا۔ ابھی اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ پیون نے اطلاع دی کہ اس سے کوئی ملنے آیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ پیون سے آنے والے کا نام جان پاتا کیبن کا دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا اور اندر داخل ہوتی سجل کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی اور حیرت بھی۔ اس نے پیون کو جانے کا اشارہ کیا۔

"سجل تم یہاں۔"

"کیوں میں نہیں آسکتی کیا؟" سجل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بالکل آسکتی ہو' ان فیکٹ آج میں تمہاری طرف آنے ہی والا تھا۔ تمہارے وہ گفٹس بھی تو تم تک پہنچانے تھے۔ جو تم نے منگوائے تھے۔" اذان نے اسے خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ توجیہ بھی پیش کی تھی۔

"پھر تو اچھا ہوا کہ میں آگئی۔" سجل نے بیٹھتے ہوئے اپنا ہینڈ بیگ ٹیبل پہ رکھا۔ جس کی زپ میں سجل کی کی چین لٹک رہی تھی۔ وہ ایسی ہی اپنے عشق میں مبتلا تھی۔ اسے خود سے اپنے نام سے بہت محبت تھی۔

"کیا مطلب؟" ٹیبل پہ دونوں کہنیاں ٹکاتے ہوئے اذان نے اس سے پوچھا۔

"مطلب یہ مائی ڈیئر کہ گھر پہ تم سب سے ملتے ہو' سوائے میرے سارا وقت تو تم دادو کے ساتھ ہی بیٹھے رہتے ہو' وہاں بات ہی کب ہوپاتی ہے؟ اذان۔" سجل نے بالکل ویسے ہی انداز میں کہنیاں ٹیبل پہ ٹکا کر اذان کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر جواب دیا۔ اذان ہنس دیا۔

"اس لیے میں نے سوچا کہ تم اتنے دنوں بعد آئے ہو تو آج کچھ وقت ساتھ گزارتے ہیں۔" سجل کی آئی شیڈ سے سجی آنکھیں اس وقت خاصی خوب صورت لگ رہی تھیں' ورنہ اس کی آنکھیں اتنی خوب صورت نہیں تھیں۔

"ٹھیک ہے جیسے تم چاہو۔ پھر اب کیا پروگرام ہے۔" اذان نے بھی اس کے پروگرام میں اس کا ساتھ دیا تھا سچ تھا کہ آج اس کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ وہ آج سجل سے ملے' ورنہ عموماً" وہ ہی اس سے ملنے آتی تھی۔ کال بھی زیادہ وہ ہی کرتی تھی۔

"او کے... پھر پروگرام یہ ہے کہ تھوڑی دیر گھومیں گے' پھریں گے' تھوڑی سی شاپنگ کریں گے' پھر کسی اچھی سی جگہ ڈنر کریں گے' ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے ویسے مائی ڈیر کزن تمہاری کبھی بھی کوئی بات شاپنگ کے بغیر پوری ہوسکتی ہے۔" اذان نے اسے چھیڑا۔

"بالکل بھی نہیں۔" سجل نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

"چلو اٹھو اب' دیر مت کرو۔" سجل خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور اسے بھی بازو سے پکڑ کر کھڑا کردیا تھا۔

"ارے بابا چلو۔" وہ بھی اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔

اس دن وہ ایک بھرپور شام سجل کے ساتھ گزار کر گھر لوٹا تو بہت خوش تھا۔ اس نے سجل سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد ماما سے اس کے بارے میں بات کرے گا۔ یوں ہی مسکراتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوا تو اپنے پورشن کی طرف جاتے ہوئے اسے زری دکھائی دی۔ وہ ہمیشہ کی طرح شرارت سے اس کی ناک دباتا اندر چلا آیا۔ لیکن زری کے چہرے پہ پھیلتے رنگوں نے اسے حیران کردیا تھا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" وہ کتنے ہی پل سوچتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"اتنا کام کیوں کرتی ہیں ماما' تھک جائیں گی۔" اذان' ماما کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر وہیں آگیا تھا۔ وہ اپنے کالج کے کسی کام میں مصروف تھیں۔ کتنے دن ہوگئے تھے اذان کو یہ سوچتے ہوئے کہ وہ ماما سے سجل کے متعلق بات کرے گا۔ لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ مگر آج اس نے ماما سے بات کرنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔ وہ ماما کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ماما نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر سے اپنی نگاہیں فائل پہ جمادیں۔

"ماما... اب آپ یہ جاب چھوڑ دیں۔" لمحہ بھر ماما کو دیکھتے رہنے کے بعد اذان نے کہا۔

"کیوں بھئی۔ آج بیٹھے بٹھائے میرے بیٹے کو یہ خیال کیوں آگیا؟" ماما نے محبت سے اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھا۔ جس میں زیادہ تر شباہت اپنے بابا کی تھی۔

"وہ اس لیے کہ ماما کے بیٹے کو اتنی اچھی جاب جو مل گئی ہے اور یہ میری خواہش ہے ماما کہ اب آپ یہ جاب چھوڑ دیں' اتنا کام نہ کیا کریں۔" اذان نے لاڈ سے ان کے کندھے پہ سر رکھ دیا۔

"جانی چند سال تو رہ گئے ہیں میری ریٹائرمنٹ میں' پھر تو میں سارا دن تمہارے سر پہ سوار ہوں گی اور پھر تم سوچو گے کہ ماما تو جاب کرتی ہوئی ہی اچھی تھیں۔" ماما نے آخری فائل بھی دیکھ کر رکھی اور مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھیں۔

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو چاہتا ہوں آپ ہر لمحہ' ہر وقت میرے ساتھ رہیں۔"

"اچھا اب زیادہ رعب مت جھاڑو اپنی نوکری کا مجھ پہ۔ پہلے تم کچھ عرصہ اپنی جاب میں اچھی طرح سیٹ

ہو جاؤ، پھر دیکھیں گے، اذان ایک بات کہنی تھی تم سے۔" ماما نے محبت سے اس کے بال سنوارے تھے۔
"کہیں نہ ماما، پوچھ کیوں رہی ہیں؟"
"اذان میں چاہتی ہوں بیٹا کہ تم اب شادی کر لو۔" ماما نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ تاکہ اس کے تاثرات جان سکیں۔
"یہ آج آپ کو اچانک میری شادی کا خیال کیسے آگیا۔" وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی ماما سے یہی بات کرنے آیا تھا۔
"کیوں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب دیکھو نا بیٹا اماں کے بعد میں بالکل اکیلی ہو گئی ہوں۔ جب تم یہاں نہیں تھے تو یہ چھ ماہ میں نے کیسے گزارے، صرف میں جانتی ہوں۔ اکیلا گھر کاٹنے کو آتا ہے۔ حالانکہ آس پاس تو سب ہی ہیں، لیکن کوئی کب تک اپنے کام کاج چھوڑ کر میرے پاس رہ سکتا ہے۔ پھر تم کہتے ہو کہ جاب بھی چھوڑ دوں۔ اب جاب چھوڑنے کے لیے کوئی معقول بہانہ بھی تو ہونا چاہیے نا، اب سارا دن گھر پہ بیٹھ کر کیا کروں۔ بہو آجائے گی تو اس سے لڑنے جھگڑنے میں کم از کم ٹائم تو پاس ہو جائے گا نا۔" ماما کی اتنی لمبی تمہید پر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔
"آپ اسے لڑنے کے لیے لائیں گی ماما، دس از ناٹ فیئر۔ چلیں جیسے آپ کی خوشی۔ جو چاہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"
"واقعی۔" ماما کو شاید اس سے اتنی سعادت مندی کی توقع نہیں تھی۔
"اتنی بے یقین کیوں ہو رہی ہیں ماما کیا مجھ پہ اعتبار نہیں ہے۔" وہ چند لمحے ماما کو دیکھتا رہا۔
"بالکل ہے میری جان، اس لیے تو میں نے تمہارے لیے لڑکی بھی پسند کر لی ہے اور تمہاری بات بھی فائنل کر دی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گے۔" وہ بس انہیں دیکھتا ہی رہا۔ ماما کیا کہہ رہی ہیں یا شاید اسے ہی سننے میں غلطی ہوئی تھی۔
"ماما آپ۔۔۔" یہ الفاظ بمشکل ہی اس کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔ وہ تو ابھی ماما کو بتا ہی نہیں پایا تھا۔ تجل کے بارے میں اور یہ ماما کس کی بات کر رہی ہیں۔
"کیوں تمہیں زری پسند نہیں ہے کیا؟"
"زری۔۔۔" ماما کو اندازہ تھا کہ اس کا یہی ری ایکشن ہو گا۔
"ہاں تو میں نے زری سے تمہاری بات فائنل کی ہے۔ مجھے تو شروع سے ہی وہ تمہارے لیے بہت پسند ہے۔ میں تو کب سے اس دن کا انتظار کر رہی تھی۔ بہت پہلے سے میں نے محمود بھائی سے بات تو کر لی تھی، بس اب جیسے ہی تمہیں جاب ملی، میں نے سب کچھ فائنل کر دیا۔ تم اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو اذان۔"
اس لمحے اذان سمجھ نہیں پایا تھا۔ لمحہ بھر کو زری کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا تھا۔ تو یہ سبب تھا اس کے چہرے پہ پھیلتے رنگوں کا اور میں سمجھ ہی نہیں پایا۔ سب کو ہی خبر تھی، بے خبر تھا تو صرف میں۔
"ماما، آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں زری سے شادی کروں گا، کبھی نہیں۔" اس کے اندر غصے کی لہر سی اٹھی۔ وہ جو ابھی تک بے خیالی میں ماما سے لگا بیٹھا تھا۔ یک دم ہی ان سے دور ہوا۔
"کیوں کیا برائی ہے زری میں؟"
"کوئی برائی نہیں ہے ماما۔ میں نے کبھی اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا۔ کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا؟" اذان کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ ماما کو کیسے اور کن الفاظ میں سمجھائے۔
"یہ تو اچھی بات ہے نا کہ کبھی نہیں سوچا، کبھی نہیں دیکھا، رشتہ بھی تو اب بدلا ہے نا۔ تو اب نظر اور سوچ بھی بدل لو۔ بچپن کی دوست ہے وہ تمہاری، کزن ہے اچھی طرح جانتے ہو تم اسے۔"
"بچپن کی بات کو آپ اب رہنے دیجیے ماما۔ اب بچپن نہیں رہا، اب نہ وہ بچی ہے اور نہ میں۔ آپ نے خود ہی سب کچھ سوچ لیا۔ میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے کم از کم ایک بار مجھ سے پوچھا تو ہوتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں تو آپ سے بات کرنے والا تھا

کہ میں تجل۔۔۔"
"دیکھو اذان، میری بات غور سے سنو۔ تجل کو لے کر اگر تمہارے ذہن میں کوئی بھی بات ہے تو اسے اپنے ذہن و دل سے نکال دو۔ کیونکہ میں کبھی بھی تمہاری شادی تجل سے نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری شادی صرف زری سے ہو گی اور یہ بات تم اچھی طرح سے اپنے دل و دماغ میں بٹھا لو۔" وہ غصے سے اس کی بات کاٹتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جانتی تھیں کہ ایک نہ ایک دن اذان یہ بات ضرور کرے گا۔ اسی لیے انہوں نے اتنی جلدی اسے بتائے بغیر یہ فیصلہ کیا تھا۔
"مگر ماما آپ میری بات تو سنیں۔" وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ مگر ماما نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں وہ وہیں لاؤنج میں کھڑا رہ گیا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ماما کو کیسے سمجھائے کہ وہ تجل کو پسند کرتا ہے اور اسی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر ماما اس کی کوئی بھی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھیں۔ اسے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے ماما نے ایک بار بھی اس سے پوچھا نہیں۔ اسے آگاہ تک نہیں کیا تھا کیا اسے جاننے کا بھی حق نہیں تھا۔ کاش وہ انہیں پہلے ہی اپنی پسند سے آگاہ کر دیتا تو شاید ماما یہ سب نہ کرتیں لیکن یہ بات وہ آج تک سمجھ نہیں سکا تھا کہ وہ تجل اور اس کے تمام ددھیال والوں (علاوہ دادی) سے اتنا چڑتی کیوں ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ وہ آج تک کبھی وہاں گئی نہیں ان کا ذکر تک پسند نہیں کرتیں کیوں وہ جان نہیں پایا تھا۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی وہ وہیں بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

کتنے ہی دن گزر گئے تھے۔ وہ مسلسل ماما کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ماما اس کی کوئی بھی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھیں۔ وہ اسی طرح اپنے فیصلے پہ قائم تھیں۔ اذان کی کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا اس وقت بھی وہ آفس سے آنے کے بعد بنا کچھ بھی کھائے پیے باہر لان میں ٹہل رہا تھا۔
ماما اندر عشاء کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ نماز ختم کر کے وہ یقیناً" اسے کھانے کے لیے بلانے آتیں تو اس نے سوچا کہ وہ ایک بار پھر۔۔۔ ان سے بات کرے گا انہیں سمجھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ کبھی بھی زری کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گا اگر تجل بیچ میں نہ ہوتی تو شاید پھر بھی کوئی صورت نکل سکتی تھی۔ لیکن اب اس کا دل بالکل نہیں مان رہا تھا ایسا زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ یوں کسی بات پر ماما سے اتنی بحث کر رہا تھا۔ ورنہ تو ہمیشہ ہی ماما نے بنا کہے ہی اس کی باتیں مانی تھیں۔ سب خواہشیں پوری کی تھیں۔ اب پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھیں یہی سب باتیں سوچتے ہوئے اس کی نظر سامنے لگے جھولے پہ پڑی۔ جو ہوا کے زور سے ہلکا ہلکا جھول رہا تھا اور جھولے پہ نظر پڑتے ہی اسے زری یاد آئی اور زری سے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بلال، زری کو پسند کرتا ہے اذان نے بارہا یہ بات نوٹ کی تھی اور اگر زری کو اس پسندیدگی کا علم ہے تو یقیناً" وہ بھی بلال میں انوالو ہو گی۔
"مجھے زری سے بات کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی یہ سب نہ چاہتی ہو اور بڑوں کے آگے مجبور ہو کہ اس نے ہامی بھری ہو اسی لیے تو بلال بھی پچھلے کئی دنوں سے چپ چپ سا ہے۔" اس بات کا خیال آتے ہی وہ فوراً" ہی محمود ماموں کی طرف آگیا تھا۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔
"السلام علیکم اذان بھائی۔ آپ نے تو ہمیں بھلا ہی دیا ہے کتنے دنوں بعد آئے ہیں۔" لاؤنج میں ہی اسے وردہ مل گئی۔
"وعلیکم السلام کیسی ہو وردہ؟" اس نے حسب معمول اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اس کے سلام کا جواب دیا۔
"امی اپنے کمرے میں ہیں۔ آپ بیٹھیں میں انہیں بلاتی ہوں۔" وردہ اسے بیٹھنے کا کہہ کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ زری کچن میں تھی اس نے

اذان کی آواز سن لی تھی۔ لیکن باہر نہیں آئی تھی۔ ایک عجیب سی جھجک اسے اب اذان سے محسوس ہوتی تھی ورنہ یہی زری تھی جو اس کی آواز سن کر سب سے پہلے لپک کر آتی تھی۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی زری۔" اذان نے اسے کچن میں دیکھ لیا تھا سو وہیں چلا آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد زری سے بات کرکے اس معاملے کو ختم کرے۔ جس نے اتنے دن سے اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اسے یقین تھا کہ زری بھی ایسا نہیں چاہتی تھی۔

"جی کہیے۔" وہ دھیمے سے بولی تھی۔ اس کا دل اس لمحے بہت تیزی سے دھڑک کر اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنے والی چمک اور چہرے پہ پھیلتے رنگوں کو اذان نے بہت حیرت سے دیکھا تھا۔ یہ وہ زری ہرگز نہیں تھی جسے وہ جانتا تھا جس سے وہ آسانی سے ہر بات کرلیا کرتا تھا جو اس کا بازو تھام کر آسانی سے لاڈ سے اپنی فرمائشیں کرلیا کرتی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھی۔ جس کے چہرے کا ایک ایک نقش گواہی دے رہا تھا کہ قوس قزح کے پھیلتے یہ رنگ بے معنی، بے مقصد نہیں ہیں ان کے پیچھے محبت چھپی ہے۔ وہ کتنے ہی لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تو کیا اس نے اس نئے رشتے کو قبول کرلیا وہ اپنی محبت بھول گئی وہ منتظر اس کے سامنے لرزتی پلکیں لیے کھڑی تھی۔

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ....." کتنے لمحے بعد وہ کہہ پایا۔

"ارے اذان بیٹا آیا ہے۔ بڑے دنوں کے بعد آئے ہو یار کہاں ہوتے ہو۔ اپنے ماموں سے کوئی ناراضی ہے کیا؟" بات ابھی اس کے لبوں پر ہی تھی کہ محمود ماموں نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔ اس کی بات لبوں پر ہی دم توڑ گئی تھی۔ مامی اور ماموں اس سے بالکل ویسے ہی بات کر رہے تھے جیسے ہمیشہ کیا کرتے تھے پھر بدلا کیا تھا اس دن وہ الجھا الجھا سا کافی دیر تک ماموں اور مامی کے ساتھ زبردستی بیٹھا رہا۔ زری دوبارہ اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ چائے بھی ورده ہی لے کر آئی تھی بمشکل وہ چائے ختم کرکے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ماموں اصرار کر رہے تھے کہ وہ کھانا ان کے ساتھ کھائے لیکن وہ وہاں سے اٹھ آیا تھا۔ مگر گھر جانے کی بجائے گھر سے ہی باہر نکل آیا اس کا دل و دماغ دونوں ہی اس وقت بڑی الجھن کا شکار تھے۔ وہ کیا کرے اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اگر زری بلال کو پسند کرتی ہے تو پھر یہ سب کیا ہے۔ معیز یہاں نہیں تھا وہ تائی جان کے ساتھ ان کے کسی عزیز کی شادی میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ ورنہ اس سے ہی اپنے دل کی بات کہہ کر وہ دل ہلکا کرلیتا وہ بنا مقصد سڑکوں پہ چل رہا تھا اس کا دل گھر واپس جانے کو نہیں کر رہا تھا۔

اس رات وہ زندگی میں پہلی بار رات ساڑھے بارہ بجے گھر میں داخل ہوا۔ ماما اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں وہ جانتا تھا کہ ماما اس کا انتظار کر رہی ہوں گی وہ اس کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتی تھیں یہ بھی جانتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے کچھ کہیں فکرمندی سے پوچھیں کہ وہ اتنی دیر کہاں رہا لیکن وہ اسے ایک نگاہ دیکھ کر کچھ بھی کہے بنا چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ انتہائی دل برداشتہ ہو کر اپنے کمرے میں چلا آیا اس پوری رات وہ سو نہیں سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں اندازہ ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے اذان۔" سجل اس کی پوری بات سننے کے بعد بولی تھی اور اذان جانتا تھا کہ سجل کا ری ایکشن یہی ہوگا۔ اذان کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ بات کس سے شیئر کرے سو آج وہ آفس کے بعد سجل کے ساتھ باہر آگیا تاکہ ساری بات اسے بتا سکے اور اس کے ساتھ مل کر یہ بھی سوچ سکے کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔

"ایسا ہی ہے سجل! ماما میری کوئی بھی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہیں وہ فیصلہ کرچکی ہیں اور اب اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گی۔ میں اپنی ماما کو جانتا ہوں وہ فیصلہ کرنے میں اتنی ہی سخت ہیں۔" اذان نے اسے پھر سے وہی جواب دیا تھا۔ جو اس سے پہلے بھی دے چکا تھا۔

"تو اب کیا ہوگا اذان! میں یہ سب برداشت نہیں کرسکتی۔ ان سے پھر سے بات کرو نا پلیز۔ میری خاطر۔" سجل بھی اس کی باتیں سن کر پریشان ہوگئی تھی۔

"تو میں اور کیا کر رہا ہوں۔ اتنے دنوں سے انہیں سمجھانے کی۔ ان سے بات کرنے کی کوشش ہی تو کر رہا ہوں۔" اب اذان ذرا سا جھنجھلا گیا۔

"لیکن وہ تو تمہارا نام بھی سننے کو تیار نہیں ہیں۔ تو تم بتاؤ میں کیا کروں۔"

"مجھے پتا تھا یہی ہوگا وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ پتا نہیں انہیں ہم لوگوں سے پرابلم کیا ہے۔" ماما کے ذکر پہ سجل کے چہرے پہ عجیب ناگوار سا تاثر تھا جسے اذان اپنی الجھن میں محسوس نہیں کرسکا ورنہ ضرور نوٹ کرتا اور شاید اسے ٹوک بھی دیتا۔

"لیکن اذان میں تمہیں کبھی بھی کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو اور اپنی ماما کو بھی سمجھا دو۔ محبت کرتی ہوں میں تم سے اور تم مجھ سے۔ ہمیں اتنی آسانی سے کوئی الگ نہیں کرسکتا۔" سجل کی آنکھیں اک پل کو جھلملا گئیں یا اذان کو ایسا محسوس ہوا تھا۔

"مجھے احساس ہے اس بات کا تم فکر مت کرو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔" اس نے اپنے ہاتھ پہ رکھے سجل کے ہاتھ کو دیکھا اور تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔

☼ ☼ ☼

"محمود بھائی دونوں بچیوں کی ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو کہہ دیا ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم بتاؤ کیا کہتے ہو؟" رات کا کھانا کھاتے ہوئے ماما نے پھر وہی بات چھیڑ دی تھی جس سے اب اذان چڑنے لگا تھا۔ وہ بنا جواب دیے خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔

"اذان میں تم سے بات کر رہی ہوں بیٹا۔" ماما نے پھر سے اسے پکارا۔

"مجھے اس ٹاپک پہ کوئی بات نہیں کرنی ماما۔" بالآخر اسے جواب دینا ہی پڑا۔

"ٹھیک ہے پھر ہم لوگ مل کر بیٹھ کر خود ہی کوئی اچھی سی تاریخ طے کرلیں گے۔" انہیں جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر سوچتا رہا کہ اب کیا کہے۔

"ماما میں یہ شادی نہیں کروں گا۔ میں صرف سجل سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اس نے گھما پھرا کر بات کرنے کی بجائے دوٹوک بات کی تھی۔

"ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" یہ ماما نے کہا ہے۔ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہا تھا کیا اسے خوش ہونا چاہیے یا ابھی نہیں۔

"ہاں۔ تم سجل سے شادی کرسکتے ہو اذان لیکن اس کے بعد تمہارا مجھ سے عمر بھر کے لیے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور تمہیں اس گھر سے بھی جانا ہوگا اذان اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" وہ حتمی انداز میں کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

یہ ماما کے الفاظ تھے۔ اس نے کیا وہی سنا تھا جو انہوں نے کہا تھا یا یہ اس کا وہم تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کیا اسے اتنا بھی حق نہیں تھا کہ وہ اپنی پسند سے زندگی گزار سکے اپنی مرضی کی لڑکی کے ساتھ اور بدلے میں اتنی کڑی سزا۔ اس کا دل یکدم ہی بہت برا ہوا۔ کیا کوئی ماں اپنی اولاد سے اتنا سخت رویہ رکھ سکتی ہے اور وہ بھی اکلوتی اولاد سے ایسی کتنی ہی ان گنت سوچیں اس وقت اس کے ذہن میں آرہی تھیں۔

وہ نہ جانے کتنے ہی لمحے وہیں بیٹھا رہتا اگر وہ اپنے کمرے میں جاتی ماما کو لڑکھڑاتے ہوئے نہ دیکھ لیتا۔ وہ چند قدم چلنے کے بعد لڑکھڑائی تھیں اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتیں اذان نے انتہائی تیزی سے اٹھ کر بھاگتے ہوئے انہیں تھام لیا۔ انہیں شاید چکر آگیا تھا۔

"ماما آپ ٹھیک ہیں۔" نہیں پسینہ بھی آرہا تھا۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھیں اور ان کا بی پی بھی کنٹرول میں نہیں رہتا تھا۔ ذرا سی لاپروائی ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی وہ یہ بات کیوں بھول گیا تھا مگر یہ کیا ماما نے اپنے کندھوں پہ رکھے اس کے ہاتھ جھٹک دیے تھے اور بنا اسے جواب دیے اپنے کمرے میں چلی آگئی تھیں وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

وہ اپنی ماں سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو اس کے لیے اپنی ماما سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے جس طرح انہوں نے بابا کے بعد اس کی پرورش کی اسے کبھی کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا ہر ممکن کوشش کی کہ اسے زندگی کے کسی موڑ پہ باپ کی کمی محسوس نہ ہو اس کی ہر صحیح غلط بات مانی وہ اگر آج ایک کامیاب انسان ہے تو اس میں صرف اپنی ماں کی وجہ سے ہے تو کیا وہ ان کی بات نہیں مان سکتا۔ ان کی خواہش نہیں پوری کرسکتا اپنے دل کو نہیں مار سکتا۔ ماں باپ بھی تو بہت بار اولاد کی خاطر اپنے دل کو مار لیتے ہیں تو پھر میں کیوں نہیں۔ زندگی میں ہمیں بہت سے کام دوسروں کی خوشی کے لیے بھی کرنے پڑتے ہیں اور اگر انہیں کچھ ہوگیا تو اس سے آگے وہ سوچ نہیں پایا تھا اس نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کرلیا تھا اپنی ماں کی بات ماننے کا فیصلہ... صرف ماما کی خاطر... اپنے دل کو مارنے کا فیصلہ... صرف ماما کی خاطر...

☼ ☼ ☼

وقت اور حالات انسان کو کبھی کبھار اس قدر مجبور کردیتے ہیں کہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سارے کام کرنے پڑتے ہیں جسے کرنے کے لیے اس کا دل راضی ہوتا ہے اور نہ ہی دماغ قبول کرتا ہے لیکن اسے اپنوں کی محبت کے آگے سر خم کرنا پڑتا ہے خاص کر اگر سامنے آپ کے ماں باپ ہوں تو آپ کے پاس کوئی راہ نہیں بچتی اور آپ چاہے جتنا بھی انکار کریں آپ ان کی محبت میں جھک ہی جاتے ہیں۔ اذان بھی اس وقت ایسا ہی محسوس کررہا تھا گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ دونوں شادیوں کی ڈیٹ ایک ہفتے کے فرق سے رکھی گئی تھیں اور یہ وردہ کی ضد تھی کہ اس طرح وہ ایک دوسرے کی شادی کو انجوائے نہیں کرپائیں گے۔ یوں معیز اور وردہ کی شادی ایک ہفتہ پہلے ہو رہی تھی اور ایک ہفتے بعد اذان اور زری کی۔ ان چاروں میں سے تین لوگ اپنی آنے والی زندگی کو لے کر بہت خوش تھے اور انہوں نے کتنے ہی خواب سجائے تھے اور اگر ناخوش تھا تو صرف اذان اور یہ بات گھر میں سوائے پھوپھو اور اذان کے کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ وہ بے دلی سے ہر کام میں شریک ہورہا تھا کیونکہ معیز اور بلال اسے ساتھ گھسیٹ ہی لیتے تھے۔ اس نے آفس سے چھٹی لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کون سا وہ اس شادی سے خوش ہے، جو چھٹیاں لے کر وقت برباد کرتا آدھا دن بلکہ اس سے بھی زیادہ ٹائم آفس میں گزار کر آتا تو پھر بھی گھر میں بھرپور ہنگامہ اس کا استقبال کرتا تھا۔

ماما نے اذان کے دادو کو فون کرکے انہیں شادی میں آنے کی دعوت دی تھی وہ بے حد خوش تھیں اور اب ماما چاہتی تھیں کہ اذان خود جاکر انہیں کارڈ دے آئے تاکہ باقی لوگ بھی اگر آنا چاہیں تو شریک ہوسکیں اور ہوسکے تو وہ دادو کو اپنے ساتھ ہی لے آئے مگر اذان جانے سے انکاری تھا۔ وہ کیسے تجل کا سامنا کرے گا وہ پہلے ہی اسے اتنی تکلیف دے چکا تھا اور اب وہاں جاکر اسے خود اپنی شادی کا کارڈ لے کر وہ مزید اس کے زخموں پر نمک نہیں چھڑک سکتا تھا۔ اس نے ماما کو صاف منع کردیا تھا لیکن جب ماما کے کہنے پر احمد چاچو اور نائبہ چاچی وہاں جانے لگے تو انہوں نے زبردستی اذان کو بھی ساتھ لے لیا کہ اذان ساتھ ہوگا تو وہ لوگ ایزی محسوس کریں گے۔ وہ لوگ صرف اذان کی دادو کی وجہ سے وہاں جارہے تھے۔ ورنہ باقی گھر والوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اذان کو مجبوراً ان کے ساتھ آنا پڑا تھا۔ وہ دادو سے مل کر باہر لاؤنج میں آبیٹھا تھا۔ اندر دادو، احمد چاچو اور چاچی سے اس کی شادی کے موضوع پر ہی بات کررہی تھیں شکر ہوا کہ تجل گھر پہ نہیں تھی۔ سو تائی جان اس کے پاس آبیٹھیں اور بتانے لگیں کہ تجل آج کل کتنی پریشان ہے اور کس قدر تکلیف میں ہے وہ شرمندہ ہورہا تھا اسی بات سے بچنے کے لیے وہ یہاں آنا نہیں چاہ رہا تھا کس دل سے وہ اپنی خواہش سے دستبردار ہوا تھا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کیونکہ اسے تجل کے خلوص میں کوئی کمی نظر نہیں آئی تھی کس طرح اس نے تجل کو سمجھایا تھا یہ صرف وہ جانتا تھا۔

"تمہاری ماں تو کبھی چاہتی ہی نہیں تھی کہ تمہارا تعلق اپنے باپ کے خاندان سے جڑا رہے۔ ساری زندگی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس نے میکے کے در پہ گزاری اور تمہیں بھی ضد میں آکر وہیں رکھا اور اب ساری زندگی کے لیے باندھ دیا۔ سب نے کتنا سمجھایا اسے کہ تمہیں یہاں سے نہ لے جائے لیکن نہیں اسے تو عزت راس ہی نہیں تھی۔ دیکھنا ایک دن کتنا پچھتائے گی تمہاری ماں جب ہاتھ میں کچھ نہیں رہے گا۔" اذان نے صرف ان سے اتنا پوچھا تھا کہ ماما یہاں کیوں نہیں آتیں حالانکہ دادو انہیں اتنا یاد کرتی ہیں اور اس کے جواب میں اسے یہ سب سننے کو ملا تھا۔ آخر کوئی وجہ ہوگی نا ماما کے اس گریز کی۔ وہ جو بابا سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتی ہیں کہ آج بھی اتنے سالوں بعد بھی ان کے ذکر پہ ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور وہ کہتی ہیں کہ وہ کبھی بھی بابا کا گھر چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں پھر کیا وجہ رہی ہوگی؟ اسے یہ سب جاننا تھا مگر کیسے؟ اس نے یہی سوال تائی جان سے کیا تو ان سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ بن پڑا اور وہ اس کے لیے چائے لانے کے بہانے اٹھ گئیں اس کی الجھن بڑھتی جارہی تھی تائی جان کی باتوں نے اس کے دل پہ بوجھ بڑھا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج معیز اور وردہ کی مہندی تھی۔ پورا "درانی ہاؤس" لائٹوں سے سجا تھا۔ تقریب کا اہتمام باہر لان میں کیا گیا تھا۔ اکتوبر کے آخری دن تھے جہاں راتیں طویل اور دن مختصر ہونا شروع ہوجاتے ہیں گو کہ سردی میں اتنی شدت نہیں تھی پھر بھی موسم قدرے خشک تھا۔ دونوں کا نکاح عصر اور مغرب کے درمیان ہوچکا تھا اس لیے مہندی کی تقریب مشترکہ ادا کی جانی تھی۔

پورے لان کو پھولوں سے سجایا گیا تھا اور دولہا اور دلہن کی نشست وہ دلکش جھولا تھا جو کہ زری کی ملکیت تھی۔ اسے نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ پھولوں اور لائٹوں کی آمیزش سے اس کی خوبصورتی دوگنی ہوگئی تھی۔ معیز کاٹن کے وائٹ سوٹ میں گلے میں سرخ چنری کا دوپٹہ ڈالے بے پناہ خوش تھا۔ وردہ بھی گرین کلر کے بنارسی غرارے جس کے ساتھ پیلے رنگ کا دوپٹہ اور کرتی تھی جس پہ نفیس کام بنا ہوا تھا۔ پھولوں کا زیور پہنے بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ یہ جوڑا اس کے لیے زری نے پسند کیا تھا۔ اذان بھلے جتنا بھی ناخوش سہی لیکن وہ معیز کی خوشی میں اس کے ساتھ پورے دل سے شریک تھا۔ بلیک کلر کے شلوار کرتے میں گلے میں معیز جیسا سرخ چنری کا دوپٹہ ڈالے اذان بے پناہ دلکش لگ رہا تھا گو کہ اس کی بھوری آنکھوں میں اداسی نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ پھر بھی وہ مسلسل معیز کے ساتھ تھا۔ دوسری طرف بلال تھا۔ زری اس طرف آنے کو جھجک رہی تھی جہاں اذان کھڑا تھا کیونکہ وہاں چھوٹے بڑے اپنے پرائے تقریباً سب ہی موجود تھے حالانکہ ان کا کوئی باقاعدہ پردہ نہیں کرایا گیا تھا مگر پھر بھی ایک فطری جھجک لازم تھی کل تک وہ صرف اس کے بچپن کا ساتھی اور کزن لیکن آج وہ اس کا ہونے والا شوہر تھا۔ سو جھجک فطری تھی لیکن رباب اور نایاب کے ساتھ اسے رسم کے لیے آگے آنا ہی پڑا۔ ساری لڑکیوں نے مہندی کی مناسبت سے گرین، یلو کپڑے پہن رکھے تھے لیکن زری کو یلو کلر پسند نہیں تھا۔

سو اس وقت بھی وہ ریڈ اور گرین چنری کے سوٹ میں سجی سنوری بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ ریڈ کلر اس کی صبیح رنگت پہ بہت کھل رہا تھا۔ اسٹیپس میں کٹے بال کمر تک آتے تھے جنہیں اس وقت اس نے

فرنچ ناٹ میں باندھ رکھا تھا چہرے پہ شرم وحیا کے رنگ لیے وہ اس سمے بے پناہ حسین لگ رہی تھی جیسے ہی وہ آئی تو اسے دیکھ کر سب نے ہی اذان کی طرف دیکھا وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا گئی جبکہ اذان کا چہرہ بنا کسی تاثرات کے بالکل سپاٹ تھا۔ زری نے کتنی بار چپکے سے اس پہ نگاہ کی تھی لیکن وہاں تو شوخی و شرارت رقصاں تھی نہ ہی لودیتی نگاہیں اس کی منتظر تھیں۔ وہاں تو سرے سے کچھ تھا ہی نہیں لیکن وہ اس کی طرف متوجہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو صرف معیز کی طرف متوجہ تھا جیسے وہاں معیز کے علاوہ اور کوئی ہے ہی نہیں۔

اذان نے کتنی ہی بار زری کی نگاہوں کو خود پہ محسوس کیا۔ اسے الجھن سی ہو رہی تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان دونوں کو زبردستی ایک دوسرے سے منسلک کردیا گیا ہو کیونکہ نہ تو زری ایسا چاہتی ہے اور نہ وہ خود۔ وہ تو بلال کو پسند کرتی ہے۔ یکایک ہی اس کا دل اس سارے ہنگامے سے بے زار ہوگیا تھا۔ وہ معیز کو کہہ کر وہاں سے دور آگیا۔

لان میں ہنگامے سے دور کونے میں گلاب کے کنج کے پاس رکھی چند کرسیوں میں سے وہ ایک پہ بیٹھ گیا وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھا کہ اس کی توجہ بجتے سیل فون نے اپنی طرف کھینچ لی۔ دوسری طرف سجل تھی وہ اب بھی اسے اتنی ہی اپنائیت سے کال کرتی تھی۔ کتنی اچھی ہے سجل، اذان تو بہت ہی اسے کم فون کرتا تھا اب تو بالکل ہی نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ اس سے اس قدر محبت کرتی تھی کہ اب بھی بنا کچھ جتائے اسے کال کرتی تھی اور بالکل پہلے کی طرح ہی اس سے بات کرتی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو چند منٹ اس سے بات کرنے کے بعد اس نے فون رکھا تو غیر ارادی طور پر نگاہ سامنے اٹھی جہاں اب بھی ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ معیز کے بعد اب وردہ کی رسم ادا کی جارہی تھی اور سب چاہتے تھے کہ معیز اب یہاں سے اٹھ جائے لیکن وہ ڈھیٹ بنا مستقل وہیں جما تھا۔ زری ہاتھ میں چند پیکٹ اٹھائے اس رش سے نکل کر شاید انہیں اندر رکھنے جارہی تھی چند قدم ہی چلی ہوگی کہ ہائی ہیل کی وجہ سے نہ جانے کیسے اس کا پاؤں رپٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑتی پیچھے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑے بلال نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے گرنے سے بچالیا تھا البتہ اس کے ہاتھ میں تھامے پیکٹس میں سے ایک نیچے گر پڑا تھا جسے اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے بلال نے اس سے جانے کیا کہا تھا کہ وہ خفگی سے اسے گھورتی، کچھ کہتی اندر بڑھ گئی اور بلال ہنستا ہوا پھر سے اس ہنگامے کا حصہ بن گیا۔

یہ منظر اذان کی نگاہوں نے بہت غور سے دیکھا تھا۔ اس کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے کوئی سروکار نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور معیز کیا سوچے گا اور سب لوگ اسے باہر نہ پاکر کیا کہیں گے۔

اور پھر اسی رات نیند نہ آنے کی وجہ سے ٹیرس پہ ٹہلتے ہوئے اس نے محمود ماموں کے گھر کے پچھلی طرف دو سایوں کو نہایت قریب بیٹھے دیکھا تھا اندھیرے کی وجہ سے ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن اتنا ضرور محسوس ہو رہا ہے کہ وہ سرگوشیوں میں باتیں کررہے ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اس پوری رات اذان سو نہیں سکا تھا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اگر زری اور بلال ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو سب کو کہتے کیوں نہیں ہیں۔ ان سب باتوں کے بیچ اس کی زندگی کیوں تباہ کی جارہی ہے کیا کرے، کس سے بات کرے اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ماما کا ری ایکشن جانتا تھا کہ ان سے بات کرنے کی صورت میں کیا ہو سکتا تھا اور جب بیچ میں بس چند دن ہی رہ گئے تھے تو وہ کیا کرسکتا ہے یہی سوچتے سوچتے بالآخر اس کے نڈھال دل و دماغ پہ نیند کی پری مہربان ہو ہی گئی۔

✲ ✲ ✲

اس گزرتے ایک ہفتے میں جہاں معیز اور وردہ کی شادی بخیر وخوبی انجام پائی تھی۔ احمر اور اس کی بیوی شادی میں شریک نہیں ہوسکے تھے۔ اذان نے کتنی ہی بار زری اور ماما سے ایک بار پھر سے بات کرنا چاہی تھی کہ ابھی بھی وقت ہے لیکن ماما تو اس کی کوئی بات سن ہی نہیں رہی تھیں اور باوجود کوشش کہ اسے زری سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور اسی کشمکش کے بیچ میں ان کی شادی کا دن آن پہنچا۔ پھوپھو کے بار بار کہنے پر اذان نے آفس سے صرف دو دن کی چھٹی لی تھی اس نے اپنی شادی کے سلسلے میں ماما کی کوئی کسی بھی قسم کی مدد نہیں کرائی تھی۔ انہوں نے سب کے ساتھ مل کر خود ہی سب کچھ کرلیا تھا۔ وہ تو بس اپنے ہی خیالات میں گم تھا۔

"درانی ہاؤس" کے لوگوں کی سج دھج آج نرالی تھی، تقریب کا اہتمام شادی ہال میں کیا گیا تھا۔ تمام مہمان آچکے تھے۔ اذان کی دادو نہیں آسکی تھیں یا انہیں آنے نہیں دیا گیا تھا۔ صرف چھوٹے چچا چند لمحوں کو آئے تھے باقی گھر والوں نے شریک ہونا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اذان کو بہت برا محسوس ہوا۔ پھوپھو نے ان دونوں کے شادی کے ڈریسز خاص طور پر ایک ڈیزائنر سے تیار کروائے تھے۔ پیور ریڈ کلر کے لہنگے میں جس پر ڈل گولڈن اور مختلف رنگوں سے خوبصورت، دلفریب کام بنا تھا۔ طلائی زیورات اور خوبصورت میک اپ میں زروہ محمود کی چھب ہی نرالی تھی چہرے پہ شرم وحیا اور خوشی سرخی بن کر چھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں اپنی سب سے قیمتی چیز پالینے کا نشہ سا ہلکورے لے رہا تھا لائٹ براؤن اسکن شیروانی میں جس پہ دلہن کے لہنگے کی مناسبت سے ہی کام کیا گیا تھا سر پر گولڈن براؤن کلاہ پہنے کم دلکش اذان بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے کلاہ پہ جڑا نگ بالکل ویسا ہی تھا جیسا زری کے پرس پر جڑا تھا۔ پھوپھو نے اور سفینہ چاچی نے کتنی ہی بار دونوں کی نظر اتاری تھی سب ہی ان دونوں کو سراہ رہے تھے۔

"اذان صدیقی ولد عظیم صدیقی آپ کو زروہ محمود والد محمود درانی بعوض شرعی حق مہر سکہ رائج الوقت اپنے نکاح میں قبول ہیں۔" مولانا صاحب نے تیسری بار اس کے سامنے یہ کلمات دوہرائے تھے۔ سب کی نگاہیں اذان کی سپاٹ چہرے پہ جمی تھیں۔

"اذان بولو بیٹا۔" دائیں طرف بیٹھے محمود درانی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اس کا دل چاہا وہ کندھے پہ رکھا ہاتھ جھٹک دے اور اٹھ کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں اسے کوئی ڈھونڈ نہ سکے۔ جہاں یہ زبردستی کے بندھن نہ ہوں۔ جہاں یہ شور ہنگامے نہ ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ واقعی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ محمود ماموں نے اسے دوسری بار مخاطب کیا تھا اس نے بس ایک لمحے کو ان کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہاں کیا کچھ تھا ڈر، خوف، کسی ان ہونی کا اندیشہ، یہ اذان بول کیوں نہیں رہا یہ خوف، اتنے سارے لوگوں کا سامنا کرنے کا خوف اس سے پہلے کہ وہ اسے تیسری بار مخاطب کرتے اس کے سامنے ماما کا چہرہ آگیا۔ اس کے منہ سے خود بہ خود ہی قبول ہے نکلا اور جیسے ہر طرف خوشی دوڑ گئی۔ محمود درانی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور پھر جہاں جہاں مولانا نے انگلی رکھی وہ بنا کچھ سوچے سائن کرتا چلا گیا۔ اس وقت اس کا ذہن کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

پھوپھو کو اذان کے موڈ کا اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ سب کچھ جلدی جلدی نبٹا رہی تھیں۔ تمام رسموں وغیرہ کے بعد زری کو اذان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ رخصتی ہال سے ہی ہوئی تھی۔ کمرے کو معیز اور بلال نے مل کر بہت خوب صورت ڈیکوریٹ کیا تھا۔ تمام کمرے میں سفید اور لال گلاب کی بہار تھی۔ زری جانتی تھی کہ اذان کو سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔ دیواروں پہ جا بجا گلاب کی کلیاں لگی تھیں۔ سائیڈ ٹیبلز، سینٹرل ٹیبل اور کمرے کے کارنرز میں وائٹ اور ریڈ پھولوں کے بکے لگے تھے۔ کمرے میں کہیں کہیں کینڈلز بھی جل رہی تھیں۔ جس سے کمرے کی خوب صورتی میں کئی گنا اضافہ ہو رہا تھا۔ پورے بیڈ پہ

گلاب کی پتیاں بکھری تھیں۔ بیڈ کے چاروں اطراف چھت سے لے کر زمین تک وائٹ اور ریڈ پھولوں کی لڑیاں لگائی گئی تھیں۔ جو چھت پر ایک گچھے کی صورت تھیں اور نیچے آکر اسے بیڈ کے چاروں اطراف بکھیر دیا گیا تھا۔ ایسے کہ جیسے چھتری سی بن گئی تھی اور بیڈ کو چاروں اطراف سے گھیر لیا تھا۔

زری اس کمرے میں بہت کم آئی تھی۔ لیکن آج اس کمرے کی خوب صورتی ہی الگ تھی اور پھر ایک نئے رشتے میں بندھ کر یہاں آنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کتنی ہی دیر اسے یہاں بیٹھے ہوئے گزر گئی اسے تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ تب ہی دروازے پہ ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ آنے والے لمحوں کا سوچ کر ہی اس کے ہاتھ پاؤں میں لرزش سی اتر آئی تھی۔ دل الگ دھڑک دھڑک کے بے حال ہو رہا تھا۔

لیکن یہ کیا اذان کمرے میں داخل ضرور ہوا تھا' لیکن اس کی طرف آنے کے بجائے وہ سیدھا ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گیا۔ وہاں اس نے باقی چیزوں کے ساتھ کلاہ بھی اتار کر رکھا۔ اپنا موبائل' گھڑی' سب ہی کچھ رکھ دیا۔ چند لمحے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر نگاہ جمائے کھڑا رہا۔ پھر اس نے جیب سے نکال کر وہ مخملی کیس' جو ابھی اندر آتے ہوئے ماما نے اسے ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہوئے تھمایا تھا کہ زری کو دے دینا' کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس نے زری کے لیے کچھ نہیں خریدا ہوگا بلکہ اسے یاد ہی نہیں ہوگا۔

اذان نے بنا کچھ کہے کچھ پوچھے وہ کیس تھام لیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ رنگ' کنگن یا کچھ اور وہ جاننا چاہتا بھی نہیں تھا اور ابھی بھی اس نے بنا دیکھے ہی وہ کیس ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ وارڈ روب سے اپنے کپڑے لے کر وہ واش روم میں چلا گیا۔ وہاں گرم پانی سے نہانے کے بعد اس کے اعصاب کچھ نارمل ہوئے تھے۔ جب وہ باہر نکلا تب اس کی نظر سامنے بیٹھے وجود پر پڑی تھی۔ جو شاید نہیں 'یقیناً" اتنی دیر سے اس کے ہی انتظار میں بیٹھی تھی۔ چند لمحے وہ زری کے ہوشربا وجود سے نگاہ نہیں ہٹا سکا تھا۔

"کیا یہ واقعی زری ہی ہے یا کوئی اپسرا بھٹک کر آگئی ہے۔" اذان کے دماغ میں آنے والی پہلی سوچ یہی تھی۔ کیا زری دلہن بن کر اس قدر حسین لگ سکتی ہے۔ اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ کبھی اسے نگاہ بھر کے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی ناک کتنی کھڑی اور ستواں ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی پیشانی پہ دائیں طرف ابرو سے ذرا اوپر اک تل ہے' جو اس کی پیشانی پہ چاند کی مانند چمکتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسا ہی ایک تل اس کی لانبی گردن کے ذرا بائیں طرف بھی ہے' جو اس کی اک نظر کرم کا منتظر ہے۔ ہاں وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ زری کی آنکھوں کا رنگ اس کی آنکھوں جیسا لائٹ براؤن ہے' زری منتظر نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے اذان سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ جہاں سب لوگوں نے اسے اتنا سراہا تھا۔ ان کے کپل کی اس قدر تعریف کی تھی تو وہ جس کے لیے پور پور سجی تھی اس نے اس پہ ابھی تک ایک نگاہ تک نہ ڈالی تھی' کیا وہ اس رویے کی مستحق تھی۔ وہ جو دنوں میں اس کی محبت میں سراپا ڈوب چکی تھی۔ اسے اپنا سب کچھ مان چکی تھی۔ کیا وہ اک محبت بھری نگاہ کی بھی مستحق نہیں تھی۔ لیکن اذان بھی کیا کرتا' اس کا دل اس نئے رشتے کو قبول کرنے پر بالکل آمادہ نہیں تھا۔

وہ سر جھٹک کر بالوں میں برش کرنے لگا۔ اسے اپنی پشت پہ زری کی نگاہوں کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن وہ لاتعلق سا اپنے بجتے ہوئے سیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا نمبر دیکھتے ہی اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ دوسری طرف نجل تھی' اس نے فوراً" ہی کال پک کی اور بات کرتا ہوا ٹیرس پہ نکل آیا۔ زری کتنے ہی لمحے ساکت سی بیٹھی رہی۔ کیا وہ اتنی ارزاں تھی۔ اس کی ذات اس قدر ارزاں تھی کہ اس کا شوہر اس کے سجے سنورے روپ پہ ایک نگاہ بھی ڈالنا پسند نہ کرے۔ اس کے نزدیک نئی نویلی دلہن اور اس کی خواہشوں' اس کے جذبات و احساسات سے زیادہ ضروری وہ فون کال ہے۔

"تو کیا زروہ محمود کہیں تمہیں اذان صدیقی کی زندگی میں زبردستی تو شامل نہیں کر دیا گیا۔ جیسے ہمیشہ ہی تمہارے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک۔" اس کی ستارہ آنکھیں جھلملانے لگیں۔ تھکن اس کے اعصاب پہ سوار ہو رہی تھی۔ اس نے بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائی۔ باوجود ان ساری سوچوں کے وہ کتنی ہی دیر اذان کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ تو شاید بھول ہی گیا تھا کہ کوئی شدت سے اس کا منتظر ہے۔

"تو یہ طے ہوا زروہ محمود کہ یہاں بھی تم ان چاہی ہی ہو۔ یہاں بھی ادھوری محبت ہی شاید تمہارا مقدر ٹھہرے۔" یہ وہ تلخ سوچ تھی جو اس کی بوجھل پلکوں پہ اتری تھی اور پھر تھکن مکمل اس کے اعصاب پہ سوار ہو گئی۔ اس کی پلکیں آپس میں جڑنے لگی تھیں اور شاید وہ بوجھل ذہن اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ بھیگی پلکیں لیے سو گئی تھی۔ بے چینی کی نیند ایسے کہ آنکھیں بند تھیں' مگر ذہن بے دار تھا۔ اذان اس پوری رات کمرے میں نہیں آیا تھا اور پھوپھو کی دی ہوئی مخملی ڈبیا وہیں ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دور کہیں ہوا کے دوش پہ موذن کی آواز ہولے سے گونجی تھی۔ وہ فلاح کی طرف بلا رہا تھا۔ ایمان کی طرف بلا رہا تھا۔ شاید زری کی آنکھ اس آواز سے کھلی تھی یا گردن میں اٹھتی ان درد کی ٹیسوں کی وجہ سے جو تمام رات بے آرامی سے سونے کی وجہ سے اٹھ رہی تھیں۔ چند لمحوں کو وہ سمجھ نہ سکی کہ وہ کہاں ہے آہستہ آہستہ جب اعصاب بے دار ہوئے تو یاد آیا کہ وہاں کیوں ہے۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ کی تھی۔ ابھی مکمل صبح نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا اب بھی موجود تھا اور اس ہلکے پھلکے اندھیرے میں وہ اچھی طرح دیکھ سکتی تھی کہ اذان اب بھی کمرے میں موجود نہیں ہے۔

"تو یہ طے ہوا زروہ محمود نہیں یا شاید زروہ اذان کہ تم اس کی زندگی میں زبردستی شامل کر دی گئی ہو۔ ورنہ کوئی خوش ہو تو یوں بھی کرتا ہے کہ بات تک نہیں کی۔" وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ہار سنگھار سارا جوں کا توں تھا۔ چوڑیوں نے کھنک کر پھر سے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جھومر' ٹیکے' سنگھار پٹی نے جھوم کر اپنی ناقدری پہ احتجاج کیا تھا۔ وہ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ وہاں کھڑی اپنے نظر آتے عکس کو دیکھتی رہی۔ پھر جانے کیسی وحشت اس پہ سوار ہوئی کہ اس نے ایک ایک چیز کو اتار کر نوچ کر پھینک دیا۔ پھر کپڑے بدلنے کی غرض سے باتھ روم میں چلی آئی۔ کتنے ہی آنسو پانی کے ساتھ بہہ گئے تھے۔ وہ وضو کر کے باہر نکل آئی۔ جائے نماز اٹھاتے ہوئے اسے اذان کا خیال آیا۔ اگر وہ ساری رات کمرے میں نہیں تھا تو وہ کہاں تھا۔ گھر میں اتنے سارے مہمان ہیں' وہ کہاں گیا ہوگا' اگر کسی نے دیکھ لیا تو' وہ اس کے سامنے ٹیرس پہ گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ ٹیرس کی طرف آگئی۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا اس وقت اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ اسے کپکپی سی آگئی۔ مگر ٹیرس خالی تھا۔ البتہ سجاوٹ کے لیے لگائی گئیں لائٹس ابھی بھی جل رہی تھیں۔ اذان وہاں بھی نہیں تھا تو کہاں تھا۔

دفعتاً" اس کی نگاہ واش روم کے ساتھ ذرا فاصلے پہ بنے دروازے پہ پڑی۔ وہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے اذان وہاں تھا۔ یہ برابر والے کمرے میں کھلنے والا دروازہ تھا اور یہ کمرہ بھی بچپن سے ہی اذان کے استعمال میں ہی رہا تھا۔ اسٹڈی کے طور پر بچپن سے لے کر آج تک وہ اپنی پڑھائی لکھائی کا سارا کام وہیں کرتا تھا۔ اس کا کمپیوٹر وغیرہ بھی وہیں رکھا تھا۔ زری کو اذان سے کبھی بھی ہوم ورک میں کوئی مدد چاہیے ہوتی تھی تو وہ لوگ وہیں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ کھیلتے وقت بھی یہ جگہ چھپنے کے لیے بہترین سمجھی جاتی تھی۔ یہ اسٹڈی سب کو آسانی سے چھپا لیتی تھی اور ڈھونڈنے والا ڈھونڈتا ہی رہ جاتا تھا اور آج بھی وہ ایسے

ہی کسی کو چھپائے ہوئے تھی سب سے۔ وہ مطمئن ہوتے نماز پڑھنے کھڑی ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

"ازان کہاں جا رہے ہو بیٹا۔" پھوپھو ان دونوں کو بلانے کے لیے آرہی تھیں۔ سب لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ازان انہیں تک سک سے تیار دروازے پر ہی مل گیا۔

"آفس۔۔۔" سرسری سا جواب دے کر اس نے آگے بڑھنا چاہا۔

"آفس۔۔۔ کیوں۔۔۔ ناشتا تو کرلو بیٹا۔" وہ حیرت سے بولیں۔

"بھوک نہیں ہے اور آفس کیوں جاتے ہیں ماما۔" اس نے جواب میں سوال ہی داغ دیا تھا۔

"نہیں میرا مطلب ہے بیٹا کل تمہاری شادی ہوئی ہے اور آج تم آفس جا رہے ہو۔ ایسی بھی کیا آفت آ پڑی ہے۔ گھر میں اتنے سارے مہمان ہیں' کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔" وہ بھی اپنی جگہ بالکل درست تھیں۔ بھلا کون سا دولہا ہوگا جو شادی کے دوسرے دن آفس جائے گا۔

"تو کیا اب مجھے سب کام دوسروں کی خوشی اور مرضی سے کرنے پڑیں گے۔" وہ یک دم ہی تلخ ہوا۔ ماما اسے خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ کس قدر بدلا ہوا انداز تھا ازان کا۔

"ضروری کام ہے' دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔" اسے فوراً" ہی احساس ہوا تھا کہ وہ مما کے ساتھ زیادہ ہی تلخ ہو گیا تھا۔ وہ خود کو کمپوز کرتا وہاں سے چلا گیا۔

"کہیں میں نے زیادہ جلد بازی سے تو کام نہیں لے لیا۔ ازان نے ابھی بھی اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کیا' کس قدر اکھڑا اکھڑا انداز تھا اس کا۔" یک دم ہی پھوپھو کو اپنی جلد بازی کا احساس ہونے لگا۔ انہوں نے ازان کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر فوراً" ہی شادی کردی تھی۔

"کیا ہوا ہے فاطمہ' یہاں کیوں کھڑی ہو۔ سب لوگ کب سے ان دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔" اور نہ جانے کتنے پل وہ اپنی ہی سوچوں میں گم وہاں کھڑی رہتیں کہ بڑی بھابھی کی آواز ان کو سوچوں سے کھینچ لائی۔

"اور یہ ازان کہاں گیا ہے۔ پوچھا تو کہہ رہا تھا آفس جا رہا ہوں۔ شادی کے دوسرے دن بھی بھلا کوئی آفس جاتا ہے کیا۔ خیر تو ہے نا فاطمہ۔ مجھے تو یہ ازان کچھ بجھا بجھا سا لگ رہا ہے' خوش تو ہے نا۔" "نہیں تو بس موقع چاہیے تھا۔

"اُف ایک تو یہ بڑی بھابھی کے اندازے۔" پھوپھو نے گہری سانس کھینچ کر خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کیا تھا۔

"نہیں بھابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آفس سے فون آگیا تھا۔ ضروری کام تھا۔ اس لیے جانا پڑا۔ گھنٹے تک آجائے گا۔ آپ چلیں' میں زری کو لے کر آتی ہوں۔" وہ سرسری سے انداز میں کہتی آگے بڑھ گئیں۔ تائی جان خیر مطمئن تو ہوئیں نہیں۔ البتہ کچھ بھی کہے بنا واپس لاؤنج کی طرف چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

شادی کو ایک ہفتہ ہو چلا تھا اور ازان کی وہی روش تھی۔ عجیب سرد اور اکھڑ رویہ تھا۔ زری نے کتنی ہی بار اس سے خود سے بات کرنی چاہی تھی۔ لیکن وہ اس سے بات کرنا تو دور اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ پھوپھو الگ پریشان تھیں۔ انہیں ازان سے اس سخت رویے کی امید نہیں تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ اسے کیسے سمجھائیں۔ وہ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ آج بھی وہ آفس سے آکر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ معیز اور وردہ چلے آئے۔ اس پہ عجیب سی بے زاری طاری ہو رہی تھی۔ اس کا اس وقت کسی سے بھی بات کرنے اور ملنے کو دل نہیں کر رہا تھا اور اوپر سے معیز کی فرمائش کہ وہ اور وردہ ہنی مون کے لیے جا رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ازان اور زری بھی ان کے ساتھ چلیں۔ زری اور پھوپھو بھی لاؤنج میں ہی موجود تھیں۔

"آئیڈیا تو بہت اچھا ہے ازان! میرا خیال ہے تم دونوں کو ضرور جانا چاہیے بیٹا۔" پھوپھو نے معیز کی بات سے اتفاق کیا۔ ازان نے اک نگاہ انہیں دیکھا' مگر کہا کچھ نہیں تھا۔

"تم کیا کہتی ہو زری' ہم لوگوں کے ساتھ جانا چاہو گی یا نہیں۔" وردہ نے اب زری کو مخاطب کیا تھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" وہ چند لمحوں کو گڑبڑائی۔ کیونکہ ازان کی خاموشی اسے کچھ بھی کہنے سے روک رہی تھی۔

"تم دونوں چلے جاؤ معیز۔" ازان نے ایک نگاہ زری کو دیکھ کر معیز سے کہا۔

"کیوں۔ تم ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتے کیا۔ الگ سے پروگرام ہے۔" معیز نے شرارت سے کہا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔" اس قدر روکھا انداز' یہ ازان تو نہیں تھا۔ مانا کہ وہ شروع سے ذرا ریزرو طبیعت کا تھا۔ مگر اس قدر اجنبیت۔۔۔ جیسے یہاں بیٹھے کسی کو بھی جانتا ہی نہ ہو' کسی سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔

"ایکسکیوز می۔" اس سے پہلے کہ معیز کچھ اور کہتا وہ بلاوجہ ہی اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ ان سب کو باتیں کرتا چھوڑ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ شکر ہے کہ وردہ اور معیز نے پھوپھو کے ساتھ اپنے ٹرپ کو ڈسکس کرتے ہوئے اس پہ زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ ورنہ بات کے پیچھے پڑ جانے میں معیز کچھ کچھ ماں پہ پڑا تھا۔ زری کتنے ہی پل جاتے ہوئے ازان کو دیکھتی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج بہت دنوں بعد وہ سجل کے ساتھ لنچ کے لیے باہر آیا تھا۔ ہوٹل کا وہی مخصوص ماحول تھا۔ گہما گہمی تھی۔ لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ وہ دونوں کھانا آرڈر کر چکے تھے۔ ابھی ان کا آرڈر سرو نہیں ہوا تھا کہ تب ہی ایک ادھیڑ عمر شخص ان کی ٹیبل کی طرف آیا۔

ازان کے لیے وہ شخص قطعی اجنبی تھا اور یقیناً" وہ بھی ازان کو نہیں جانتا تھا۔ اس لیے وہ سیدھا سجل کی طرف آیا۔

"ہائے بے بی ہاؤ آر یو۔" سجل اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور بے تکلفی کا یہ مظاہرہ ازان کو کھولا گیا۔

"یہ ازان ہیں میرے کزن اور ازان یہ تنویر ملک ہیں میرے دوست۔" سجل نے اس شخص کا ہاتھ ابھی بھی تھام رکھا تھا۔ اس شخص نے ازان سے ہاتھ ملانے کی زحمت نہیں کی اور نہ ہی ایسی کوئی مروت ازان نے دکھائی تھی۔ بس دونوں نے ہی سرسری سا سر ہلایا تھا' کیونکہ دونوں کو ہی ایک دوسرے سے مل کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحے سجل سے بات کرنے کے بعد وہ شخص وہاں سے چلا گیا۔

"کون تھا یہ شخص۔" ویٹر جب کھانا سرو کر کے چلا گیا تو ازان نے سرسری سا پوچھا۔ یہ بات تو وہ جانتا تھا کہ سجل کے سرکل میں مرد اور خواتین دونوں ہی موجود ہیں۔ لیکن ایسی بے تکلفی اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

"وہ تنویر ملک ہے' میرا دوست' بہت بڑا مل اونر ہے' کیوں؟" سجل نے بتانے کے ساتھ ساتھ اس سے پوچھا بھی تھا۔

"اس کی اور اپنی عمر میں فرق دیکھا ہے تم نے۔" ازان نے ایک نظر اسے دیکھا۔ آج بھی اس نے جینز کے ساتھ مختصر سا ٹاپ پہن رکھا تھا۔ ازان کو یک دم ہی اس کا حلیہ ناگوار لگنے لگا۔

"عمر سے کیا فرق پڑتا ہے ازان اس کی جیب تو بہت بھاری ہے نا' تم جانتے ہو ازان وہ شخص میرے ایک اشارے کا منتظر ہے۔ میں ایک اشارہ کروں نا' وہ اپنے خزانے کا منہ کھول دے۔" کھانا کھاتے ہوئے وہ اسے بتا رہی تھی۔

"کیا مطلب۔۔۔" ازان کے لہجے میں ناگواری در آئی۔

"مطلب بہت سادا سا ہے ازان۔ وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"وہ تم سے شادی کا خواہش مند ہے' وہ یقیناً" شادی شدہ بھی ہو گا۔ اس کے اگر تمہارے جتنے نہیں بھی تو تم سے کچھ چھوٹے بچے بھی ہوں گے' پھر بھی۔" اذان کو اس کا انداز بہت عجیب لگا۔

"ہاں پھر بھی' تم بھی تو شادی شدہ ہو' پھر تم کیوں اس وقت میرے دوست ہو۔ جب ان سب باتوں سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تو میں کیوں سوچوں' چھوڑو ان سب باتوں کو' مجھے یہ بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے۔" اس نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے اذان کی توجہ بٹائی۔

"کس بارے میں۔" اس کا دماغ سجل کے جملے میں اٹک گیا تھا۔ واقعی میں اب اس کے ساتھ کیوں ہوں۔

"اپنے اور میرے بارے میں اور کس بارے میں۔ ایک بات تو طے ہے اذان' جب تک وہ لڑکی تمہاری زندگی میں ہے' میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تمہیں اسے چھوڑنا ہو گا' ورنہ......" سجل نے آج اس سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"ورنہ کیا سجل' تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں یہ فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں۔ اگر یہی فیصلہ کرنا ہوتا تو میں پہلے نہ کر لیتا۔ تم جانتی ہو ——— ماما مجھ سے کتنی ناراض ہیں' اب میں مزید انہیں ٹینشن نہیں دے سکتا۔ تم تھوڑا ویٹ کرو سجل' میں دیکھتا ہوں' میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تم کیا کر سکتے ہو اذان' میں اچھی طرح جانتی ہوں' تم ہر بار کی طرح اس بار بھی اپنی ماں کے آگے ہار مان لو گے اور کیا' تم جیسے لوگوں کا یہی پرابلم ہے۔ ساری زندگی دوسروں کو کہنے پہ گزار دیتے ہو۔ اپنی زندگی اپنی خوشی کے لیے کبھی خود سے کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔" سجل ناگواری سے بولی۔

"وہ کوئی دوسرے نہیں ہیں سجل' وہ میری ماما ہیں اور میں ان سے بے انتہا محبت کرتا ہوں اور ان کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا' سوچوں بھی تو جا نہیں سکتا' تم جانتی ہو' انہوں نے میری خاطر کیا کچھ کیا ہے۔" اذان کو بہت برا لگا تھا اس کا طرح کہنا۔

"تو کون سا احسان کر دیا انہوں نے تم پر۔ دنیا کے سب ماں' باپ یہی کرتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم ساری زندگی ان کے ہاتھوں کٹھ پتلیاں بنے رہیں۔ آئی ایم سوری اذان' لیکن سچائی یہی ہے کہ تمہاری ماما ایک خود غرض عورت ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی خود بھی اپنے بھائیوں کی غلامی کی ہے اور اب تمہیں بھی ان کا غلام بنا دیا ہے۔"

"شٹ اپ سجل! تم میری ماں کے بارے میں بات کر رہی ہو اور تمہیں کوئی حق نہیں ہے ان کے بارے میں اس طرح بات کرنے کا۔" سجل کی بات سن کر اس کے اندر آگ سی لگ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی اس کی ماما کے خلاف بات کرتی تھی۔ بہانے بہانے سے اسے ان کے خلاف اکساتی تھی اور آج یقیناً" اگر سجل کی جگہ کوئی ہوتا تو اذان اس کا منہ توڑ دیتا۔

"آئی ایم ویری سوری اذان! مجھے واقعی اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن میرا دل تمہارے لیے دکھتا ہے۔ وہ جس طرح تمہیں ہمیشہ ہر چھوٹی بڑی بات کے لیے ٹریپ کرتی ہیں' ایسا کوئی نہیں کرتا اذان۔ آج کل وہ زمانہ نہیں رہا ہے' جب بچے اپنے ماں' باپ کی بات' ان کی پسند' ناپسند سب خاموشی سے مان لیتے تھے۔ تم اگر مجھ سے محبت کرتے ہو' میرے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو یہ تمہارا حق ہے اور انہیں تمہاری خوشی میں خوش ہونا چاہیے نہ کہ زبردستی اپنا فیصلہ تم پہ تھوپ کر تمہیں ساری زندگی کے لیے ناخوش کر دیں۔ ہم ساری زندگی اوروں کے کہنے پہ نہیں گزار سکتے اذان۔" سجل' اذان کے غصے سے چند لمحوں کو خائف ضرور ہوئی تھی۔ لیکن پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر نرمی سے اپنا موقف بیان کر ہی گئی۔

"لیکن میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کرتا سجل! کیونکہ جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو اس سے ہم اپنی ہر خوشی' ہر امید وابستہ کر لیتے ہیں اور ہمیں پوری امید ہوتی ہے' بلکہ یقین ہوتا ہے کہ وہ بھی ہماری تمام خوشیوں اور امیدوں پہ پورا اترے گا۔ خاص کر ہمارے ماں' باپ جو اپنی زندگی جیسے بھی گزارتے ہیں' دکھ سکھ کے سائے میں' اگر سکھ سہتے ہیں تو آگے ہمیں بھی سکھ ہی ملتے ہیں اور اگر خدانا خواستہ ان کی زندگی میں کبھی کوئی دکھ یا تکلیف رہی ہو تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ دکھ' وہ تکلیف ہمیں نہ سہنی پڑے۔ اس لیے بعض دفعہ ہمیں ان کے کیے گئے فیصلے سخت لگتے ہیں۔ لیکن بعد میں سوچو تو ان میں بھی ہماری ہی بھلائی ہوتی ہے۔" اس لمحے سجل نے جو محبت اذان کی آنکھوں میں اس کی ماما کے لیے دیکھی وہ اسے آگ لگا گئی۔

"ٹھیک ہے اذان! جیسے تمہاری مرضی' میرا کام تھا تمہیں سمجھانا' اب تم خود اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ ہم نے تو ہمیشہ یہی سنا ہے کہ تمہاری ماما نے ہمیشہ صرف اپنی خوشی ہی دیکھی ہے۔ تم تو ان کی زندگی میں بہت بعد میں آتے ہو' انی وے میں تو صرف یہی کہہ رہی ہوں کہ ڈیڈی آج کل میری شادی پہ بہت زور دے رہے ہیں اور میں آج بھی تمہارے انتظار میں ہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم ایک ان چاہی زندگی گزارنا پسند کرتے ہو یا چند قدموں کے فاصلے پہ کھڑی اپنی محبت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہو' اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

بات ختم کرتے کرتے بھی وہ اذان کے لیے سوچوں کے نئے در وا کر گئی۔ ماما نے کب اپنی خوشی چاہی تھی۔ انہوں نے تو زندگی کے ہر قدم پر صرف اس کی خوشی کو ہی مقدم رکھا تھا۔ تو پھر یہ سجل کیا کہہ رہی ہے۔ الجھے الجھے ذہن کے ساتھ وہ سجل کے ساتھ بمشکل کھانا ختم کر کے وہاں سے اٹھ آیا تھا۔

(دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ)

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی۔... مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے حس ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے.... رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے.... اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رگو میلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے.... اور ایسی خوشی میں نمل ان دونوں کو پیلس میں لنچ کی دعوت دیتی ہے.... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، وکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں پیلس میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے.... رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے.... وہ دونوں واپس جانے کے لیے سڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے.... اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے.... اب آگے پڑھیں۔

۲۸

اٹھائیسویں قسط

رومیلہ دروازے پر ایسے کھڑی تھی جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ دستک دے یا یہیں کہیں کونے میں بیٹھ کر رات گزار دے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا اول تو سکینہ اس کے سر پر کھڑی تھی دوئم وہ اس گھرانے کی بہو تھی کوئی ملازمہ نہیں جو کہیں بھی پڑ کر سو سکتی۔

سکینہ تو اسے دروازے تک لا کر اپنے کمرے کی طرف جانے کی بجائے وہاں کھڑے ہو کر ایسے اس کے اندر جانے کا انتظار کرنے لگی جیسے کمرے میں جا کر وہ جائزہ لینے والی ہے کہ ہر چیز اس کی مرضی کے مطابق ہے یا نہیں۔

رومیلہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ کر بولی۔

"تم جاؤ سکینہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" سکینہ جواباً "ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر رہ گئی مگر اپنی جگہ سے ہلی تب بھی نہیں۔ آخر رومیلہ کو گہرا سانس کھینچ کر اندر داخل ہونا پڑا۔

ایک نفرت بھری نظریں ابھی تک اس کا پیچھا کرتی آئی تھیں اور دوسری نفرت بھی بھری نظروں کے لیے وہ خود کو تیار کرتی کمرے کا دروازہ بند کر کے کن انکھیوں سے اپنے پیچھے دیکھنے لگی اور جیسے ہی اسے یہ اندازہ ہوا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے وہ ایک پرسکون سانس خارج کرتی پلٹ گئی اور دروازے سے سر باہر نکال کر سکینہ کو رخصت کیا پھر دروازہ لاک کر کے اس سے پشت لگا کر بڑے آرام سے کمرے کو دیکھنے لگی۔

کمرہ خاصا کشادہ تھا کمرے کے ساتھ بنا خوب صورت ٹیرس کمرے کو کافی ہوادار بنا رہا تھا کمرے کی ڈیکوریشن بالکل سادہ اور نفیس تھی البتہ کمرے کے ایک طرف رکھے دو سوٹ کیسز اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ اس کا اور الیان کا سامان ان دونوں کے آنے سے پہلے یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔

ایک دم رومیلہ کو خیال آیا کہ وہ الیان کے آنے سے پہلے جلدی سے کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ جائے پھر بھلے ہی نیند آئے یا نہ آئے وہ اس کے آنے پر سوتی تو بن سکتی ہے دوسرے لفظوں میں اس کا سامنا کرنے سے بچ تو سکتی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ تیزی سے سوٹ کیس کی طرف بڑھی اور اسے زمین پر لٹا کر کھولنے کی کوشش میں جانے کیسے برابر میں رکھا الیان کا سوٹ کیس نہ صرف گر پڑا بلکہ گرتے ہی کھل بھی گیا۔

شاید اسے ٹھیک طرح سے بند کیے بغیر ہی کھڑا کر دیا گیا تھا تبھی رومیلہ کے ہلکے سے دھکا لگنے پر وہ زوردار آواز کے ساتھ کھل کر گر پڑا سامان بھی شاید اس میں ٹھونس کر بھرا گیا تھا یا پھر باقاعدہ پیک کرنے کی بجائے بے ترتیبی سے ڈال دیا گیا تھا تبھی دو تین شرٹ اور پینٹس بمع بیلٹ کے سوٹ کیس سے آدھے سے زیادہ باہر لٹکنے لگے۔

رومیلہ نے یہ سوچ کر سوٹ کیس کا ڈھکنا اٹھایا کہ ان کپڑوں کو اندر کر کے سوٹ کیس واپس بند کر دے کہ عین اسی وقت باتھ روم کا دروازہ کھول کر الیان کمرے میں آ گیا۔

وہ جس طرح تولیے سے سر پونچھتا ہوا باہر نکلا تھا وہ اس کے نہا کر نکلنے کو ظاہر کر رہا تھا۔

رومیلہ اسے پہلے سے کمرے میں موجود دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی خود الیان کے ہاتھ سر رگڑتے ہوئے ایک ہی حرکت پر جامد ہو گئے۔

رومیلہ کو کمرے میں دیکھنے سے زیادہ الیان کو اسے اپنے سوٹ کیس میں گھسا دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔

اسے یہ تو معلوم تھا کہ رومیلہ اسی کے کمرے میں ٹھہرے گی اور اس بات پر کوئی تبصرہ یا اعتراض کر کے وہ سب کو چونکانا نہیں چاہتا تھا۔

البتہ وہ ریاض غفار کی بات پر عمل کرتے ہوئے اس کے ساتھ اپنا رویہ بہتر نہیں کر سکتا تھا جبکہ ریاض غفار نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اسے رومیلہ کے ساتھ ہر حال میں بہت اچھے طریقے سے پیش آنا ہے، جو کہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

چنانچہ وہ اس کے کمرے میں آنے سے پہلے پہلے نہا کر سونے کے لیے لیٹ جانا چاہتا تھا ماحول سے فرار کے سوا اس کے پاس اس وقت اور کوئی راستہ نہیں تھا اور اسی جلد بازی میں اس نے اپنے کپڑے وغیرہ نکالے تھے اور سوٹ کیس بغیر لاک کیے بند کر کے کھڑا کر دیا تھا۔

اسے قطعاً "امید نہیں تھی کہ لاک کھلا دیکھ کر رومیلہ فوراً "موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سوٹ کیس کی تلاشی لینا شروع کر دے گی نتیجے کے طور پر الیان بغیر کوئی حرکت کیے منہ کھولے اور آنکھوں میں شدید حیرانی لیے اسے دیکھتا چلا گیا جسے سمجھتے ہوئے رومیلہ پر گھڑوں پانی گر گیا وہ جلدی جلدی کپڑے ٹھونس کر صفائی دینے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہ... وہ... پتا نہیں یہ سوٹ کیس کیسے گر گیا اور خود ہی کھل بھی گیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" رومیلہ جس طرح خجالت کے ساتھ ہاتھ چلاتے ہوئے کپڑے اندر رکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اسے دیکھتے ہوئے الیان تولیہ صوفے پر ڈالتا اس کے قریب چلا آیا۔

"آپ چھوڑ دیں میں بند کر دیتا ہوں۔" الیان نے سنجیدگی سے کہا۔

مگر رومیلہ اس کی آنکھوں میں پھیلے تحیر کا مطلب بخوبی سمجھ گئی تھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس کے سوٹ کیس میں گھس کر اس کی تلاشی لے رہی ہے اور یہ بات اسے بری طرح شرمندہ کر گئی تھی تبھی وہ الیان کے کہنے پر دھیان دیے بغیر اپنا کام جاری رکھتے ہوئے سوٹ کیس زبردستی بند کرنے کی کوشش کرتی رہی چنانچہ الیان کو اس کے پاس زمین پر دو زانو بیٹھنا پڑا مگر رومیلہ نے اپنی کارروائی جاری رکھی وہ کسی بھی طرح سوٹ کیس کو بند کرنے پر کمربستہ تھی۔

الیان بیٹھا تو تھا اسے روکنے کے لیے مگر اس کی گھبراہٹ اور تیزی دیکھتے ہوئے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا جو سارے کپڑے ڈالنے کے بعد اب اپنی پوری قوت لگا کر سوٹ کیس کا ڈھکنا بند کرنے کے درپے تھی اسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ زبردستی کے ٹھونسے کپڑے کناروں سے باہر نکل رہے ہیں اور اسی وجہ سے سوٹ کیس کا ڈھکنا بند نہیں ہو پا رہا اور یہی چیز الیان کو اسے بغور دیکھنے پر مجبور کر گئی تھی۔

وہ اتنی نروس کیوں تھی جو انسان بہت بڑے بڑے غلط کام کرنے کا عادی ہو وہ کسی معمولی سی غیر اخلاقی حرکت پر اتنا شرمندہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

جس قسم کے خاندان سے وہ تعلق رکھتی تھی وہاں اخلاقی اقدار کیا ہوں گی یہ سمجھنا الیان کے لیے مشکل نہیں تھا ایسے لوگ تو بڑی سے بڑی بات پر بھی اپنی غلطی نہیں مانتے پھر یہ اتنی چھوٹی سی بات پر کیوں پانی پانی ہو رہی ہے۔

کیا یہ ایکٹنگ کر رہی ہے۔ بس الیان اس کے چہرے سے یہی اخذ کرنے کے لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

رومیلہ کو جب بالکل کامیابی حاصل نہیں ہوئی سوٹ کیس بند کرنے میں تو اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے اور تبھی اسے الیان کی خود پر جمی نظروں کا احساس ہوا تو وہ بالکل ہی ساکت ہو گئی۔

الیان کی جانب دیکھے بغیر ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت اس کی آنکھوں میں رومیلہ کے لیے نفرت یا بے زاری نہیں ہے بلکہ وہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

یہ اندازہ ہوتے ہی رومیلہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اس نے بڑی ہمت کر کے الیان کی جانب دیکھا۔ اسے متوجہ ہوتا دیکھ کر بھی الیان نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا نہیں اور یہ بات رومیلہ کے لیے حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بالکل مختلف تجربہ ثابت ہوئی تھی۔

وہ اس سے شرمانا یا کترانا نہیں چاہ رہی تھی تبھی اپنا اعتماد بحال رکھنے کے لیے اس کی توجہ دوسری جانب

مبذول کرانے کے لیے اٹک اٹک کر بولی۔

"آ..... آ..... آپ بند کردیں گے مجھ سے..... تو نہیں ہورہا۔" اس کے کہنے پر الیان کچھ دیر اس کی شکل دیکھتا رہا جہاں اس کے ڈرامہ کرنے کے کوئی آثار نہیں تھے بلکہ وہ واقعی شرمندہ لگ رہی تھی بلکہ اس شرمندگی میں اب گلابیاں گھلنے لگی تھیں، جو کہ الیان کے لیے خاصا منفرد منظر ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی تھا۔

اس کے صبیح رخسار پر بار بار سایہ فگن ہوتیں اس کی گھنی سیاہ پلکیں الیان غیر ارادی طور پر دیکھتا چلا گیا تو رومیلہ جو پورا وزن سوٹ کیس پر ڈال کر اسے بند کرنے میں ہلکان ہورہی تھی اس پر سے ہٹتے ہوئے ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی۔

اس کی اس حرکت سے الیان کی محویت میں خلل پڑ گیا تو وہ چونکا تو نہیں البتہ سنبھلتے ہوئے کہنے لگا۔

"جب یہ سوٹ کیس آپ نے جان بوجھ کر نہیں کھولا تو پھر اتنی شرمندہ کیوں ہیں۔ انسان گھبراتا اس وقت ہے جب اس کے دل میں چور ہو۔" الیان کا لہجہ بڑا سادہ سا تھا اس میں کوئی طنز نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تب بھی رومیلہ اس کے سامنے اس وقت چھوئی موئی سی ہوگئی تھی وہ ان احساسات کے زیر اثر اس طنز کے پس منظر کو سمجھ بھی نہیں سکتی تھی اسی لیے بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔

"صرف دل کا چور انسان کو گھبرانے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ لوگوں کی نظروں میں اپنا غلط امیج بنتا دیکھ کر بھی انسان پریشان ہوجاتا ہے۔

خاص طور پر میرے جیسے لوگوں کے لیے تو یہ برداشت کرنا بہت مشکل ہے کہ کوئی میرے بارے میں غلط رائے قائم کرے اور مجھے ویسا سمجھے جیسی میں نہیں ہوں۔" رومیلہ خلاف توقع بڑی وضاحت سے بولی۔

"آپ کو کیسے پتا کہ میں نے آپ کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرلی ہے۔" الیان نے بے اختیار پوچھا تو رومیلہ، جو اس کے سامنے سے اٹھ کر صوفے پر جاکر بیٹھنے کا ارادہ کررہی تھی ٹھٹک کر اپنی جگہ ہی رک گئی۔

اس کے سوال سے یہی ظاہر تھا کہ وہ اس کے بارے میں واقعی کچھ غلط سوچ رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی لگا تھا کہ الیان کا اشارہ صرف اس سوٹ کیس کی طرف نہیں ہے بلکہ اس سوال کا پس منظر کچھ اور ہے۔

وہ بے اختیار الیان کی جانب دیکھنے لگی جس کی سوالیہ نظریں رومیلہ کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

"آپ کے دیکھنے کے طریقے سے ہی پتا چل گیا تھا کہ آپ سوچ رہے ہیں میں نے جان بوجھ کر آپ کا بیگ کھولا ہے تلاشی لینے کے لیے۔ جبکہ میں ایسی حرکتیں نہیں کرتی۔" اس پل رومیلہ کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

کچھ ثانیوں کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے چلے گئے پھر آخر رومیلہ ہی پلکیں جھپکاتی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

پہلے تو الیان نے ہاتھ بڑھایا سوٹ کیس کے کناروں سے نکلتے کپڑے اندر کرنے کے لیے مگر دوسرے ہی پل ارادہ ملتوی کرتا رومیلہ کے پیچھے ہی کھڑا ہوگیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال بنانے لگا۔

رومیلہ کو اس کے اس طرح خاموش ہوجانے کی امید نہیں تھی وہ چاہتی تھی وہ اس کے اندازے کی تردید کر دے اور کہہ دے کہ اس نے رومیلہ کے متعلق ایسا کچھ نہیں سوچا۔

مگر اسے چپ دیکھ کر آخر رومیلہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے خود ہی بول پڑی۔

"کیوں؟ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا نا۔" الیان ہاتھ روک کر آئینے میں اس کے عکس کو دیکھنے لگا۔

مرجنڈہ کلر کی قمیص پر لائیٹ پنک کلر کی کڑھائی کے ساتھ وہ کڑھائی کے ہی ہم رنگ شلوار دوپٹے میں ملبوس گزشتہ دنوں کے مقابلے میں خاصی نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔

یہ فرق نانی اماں کے گھرانے کے ساتھ وقت گزارنے کا نتیجہ تھا یا الیان نے اس پر غور ہی آج کیا تھا۔ الیان

سمجھ نہ سکا البتہ برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر اس کی طرف پلٹتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے میں واقعی یہی سوچ رہا تھا حالانکہ اس چھوٹے سے سفر میں، میں بیگ میں کپڑوں کے علاوہ اور بھلا کیا رکھ سکتا ہوں۔

اس لیے اسے لے کر کسی کا متجسس ہونا اور اسے کھنگالنے کی کوشش کرنا بڑی حماقت ہے۔"

رومیلہ کو اس کے جواب سے مایوسی ہوئی تھی کاش وہ مروتاً ہی کہہ دیتا کہ نہیں وہ اس کے متعلق اتنی منفی سوچ نہیں رکھتا لیکن اس نے تو صاف گوئی کی انتہا کردی تھی۔

رومیلہ کی خاموشی نے الیان کو اتنا تو احساس دلا دیا تھا کہ اس کے جواب نے رومیلہ کو دکھ پہنچایا ہے لیکن بھلا وہ اپنے کہے پر شرمندہ کیسے ہوتا لہٰذا وہ بڑے مطمئن انداز میں بیڈ کی طرف بڑھ گیا کہ تبھی رومیلہ سنجیدگی سے بولی۔

"اپنا سوٹ کیس لاک کردیجیے کل صبح اگر کوئی چیز آپ کو نہ ملی تو آپ یہی سوچیں گے کہ میں نے چرالی، چاہے وہ چیز کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اور جسے چرانا نری حماقت ہو۔" الیان کے قدم یک لخت تھم گئے کچھ دیر اپنی جگہ کھڑے رہنے کے بعد وہ پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں، جو کچھ تم اور تمہارا بھائی ہتھیا چکے ہیں اس کے بعد اس سوٹ کیس میں سے چوری کرنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں۔" رومیلہ کچھ چونک سی گئی۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے جب سب کچھ پہلے ہی سے تمہیں مل چکا ہے تو چوری چھپے کچھ نکالنے کی کیا ضرورت ہے وہ بھی اس سوٹ کیس میں سے جس میں کپڑوں اور ڈیوڈرنٹ وغیرہ کے علاوہ کچھ خاص ہے بھی نہیں۔" الیان نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

رومیلہ ہنوز اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ الیان اس پر طنز کرکے اسے کیا جتانا چاہتا ہے۔ جبکہ الیان اسے خاموش دیکھ کر بستر پر سینے کے بل لیٹ گیا اور منہ دوسری طرف کرکے اسے مکمل طور پر شب بخیر والا اشارہ دے دیا۔

مگر اس کی کہی بات اور اس کا لب ولہجہ ایسا نہیں تھا جسے آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا تھا رومیلہ اس کے نظر انداز کرنے کو نظر انداز کرتی پوچھنے لگی۔

"میں نے اور میرے بھائی نے آپ سے کسی اسٹامپ پیپر پر سائن تو نہیں لے لیے جو آپ ہمارے لیے اس طرح ہتھیانے کا لفظ استعمال کررہے ہیں۔

ابرار بھائی نے اگر آپ کو اپنی اور آپ کی دوستی کا واسطہ دے کر شادی کے لیے مجبور کیا تھا تو یہ سراسر ان کے حالات کی مجبوری تھی۔

اگر آپ اس شادی سے خوش نہیں تھے تو آپ انکار کردیتے اس طرح احسان جتانے سے تو یہی بہتر ہے نا کہ انسان ڈھیٹ بن کر ایک بار منع کردے۔" رومیلہ کی بات کسی تیر کی طرح الیان کو لگی تھی وہ ایک جھٹکے سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔

"تمہارے بھائی جیسے گرے ہوئے انسان کو میرے دوست ہونے کا شرف حاصل ہو ہی نہیں سکتا کجا کہ اس کی دوستی کا پاس کرکے میں اس کی بہن سے شادی کرڈالوں۔" الیان ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

اس پل وہ بھول گیا تھا کہ ریاض غفار نے کتنی سختی سے اسے رومیلہ کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کے لیے کہا تھا۔

رومیلہ اس کا انداز اور اس کی گفتگو دونوں ہی نہیں سمجھی تھی البتہ اس کا اس طرح طیش میں آجانا رومیلہ کو

تھوڑا خائف کرگیا تھا۔

اس کے لہجے کی یہ نرمی ہی تو تھی، جو رومیلہ اب تک اس سے اتنے آرام سے باتیں کررہی تھی ورنہ وہ تو الیان کے سامنے آنے سے بھی کتراتی تھی۔

لیکن جو کچھ الیان نے کہا تھا اس کی وضاحت طلب کرنا سخت ضروری تھا رومیلہ اپنی ہمتیں مجتمع کرکے کہنے لگی۔

"کیا آپ، ابرار بھائی کے دوست نہیں ہیں اور اگر نہیں ہیں تو آپ اس اچانک کی شادی کے لیے کیوں تیار ہوگئے۔ اتنا اہم فیصلہ اس طرح جلد بازی میں بغیر کسی ٹھوس بنیاد کے تو نہیں ہوسکتا۔" رومیلہ کی بات پر الیان کا تنفس بڑھتا چلا گیا تبھی دانت پیستے ہوئے بولا۔

"اتنی انجان کیوں بن رہی ہو جیسے تمہیں کچھ خبر ہی نہ ہو۔"

"مجھے واقعی کچھ نہیں پتا۔ آپ میرے بھائی کے لیے اس طرح کے الفاظ کیوں استعمال کررہے ہیں اور پھر آپ سب گھر والوں کا رویہ تو ایسا ہے جیسے میں خود سے آپ کے گھر آکر بیٹھ گئی ہوں۔"

"جس طرح تم آئی ہو اسے خود سے گھر آکر بیٹھ جانا ہی کہتے ہیں بھلے ہی ہم سب خود تمہیں رخصت کراکے کیوں نہ لائے ہوں۔" الیان کا لہجہ حد درجہ تلخ ہوگیا۔

تھوڑی دیر پہلے وہ جس انداز میں مخاطب تھا اب اس کا شائبہ تک اس کی گفتگو میں نہیں تھا رومیلہ کو اپنا ذہن ماؤف ہوتا لگ رہا تھا وہ بے اختیار صوفے سے اٹھ کر بیڈ کے نزدیک چلی آئی۔

"اتنا تو میں سمجھ گئی ہوں کہ اس شادی کے پیچھے آپ کی کوئی مجبوری پوشیدہ تھی لیکن وہ مجبوری کیا تھی اس کا مجھے بالکل علم نہیں۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ آپ ابرار بھائی کے دوست ہیں اور میری شادی ٹوٹ جانے پر انہوں نے اپنے دوست سے مدد مانگی اور......"

"جھوٹ مت بولو تم سب جانتی ہو اور بالفرض اگر نہیں جانتیں تب بھی تم اپنے بھائی کی ہی طرح ہو تمہارے نزدیک دوسرے کی عزت اور اس کا وقار اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔

تم لوگوں کو جو چاہیے، بس وہ چاہیے، باقی اس کے نتیجے میں دوسرے کے اوپر قیامت گزر جاتی ہے تو گزر جائے تمہاری بلا سے۔

تم نے اور تمہارے بھائی نے یہ شادی یہی سوچ کر کی ہے کہ آگے چل کر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن میں تمہیں بتادوں کہ تمہارے یہ خواب صرف خواب ہی رہنے والے ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے زخم کو وقت گزرنے کے ساتھ بھر لیتے ہیں۔ میں ان میں سے ہوں جو اپنے زخم پر آئے کھرنڈ کو روز کھرچتے ہیں تاکہ وہاں سے روز خون نکلے اور زخم روز ہرا ہوجائے۔" الیان بستر سے اتر کر رومیلہ کے عین مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

رومیلہ اس کی بات تو نہیں سمجھ رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں سے ٹپکتی نفرت اور زہر اگلتی زبان اسے ہراساں کرگئی تھی وہ آنکھوں میں آئی نمی کو تیز تیز پلکیں جھپکا کر اپنے اندر اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ایسا کیا کیا ہے میرے بھائی نے جو آپ، ہم لوگوں کے بارے میں اتنی بری رائے قائم کیے بیٹھے ہیں۔" رومیلہ نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"میرے سامنے انجان بننے کی ایکٹنگ مت کرو تمہارے جیسے گھٹیا لوگ اچھے اور اونچے گھرانوں سے رشتہ جوڑنے اور ان کے پیسے بٹورنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں اسی لیے ایسی سازشیں تمہارا پورا گھرانہ مل کر کرتا ہے۔

لیکن تم لوگوں کو یہ نہیں پتا کہ تمہارا واسطہ جس شخص سے پڑا ہے وہ بہت ٹیڑھی کھیر ثابت ہونے والا ہے

"بہت پچھتاوا ہوگا تمہارے بھائی کو میرے ساتھ دشمنی مول لینے پر۔" الیان کا لہجہ چٹانوں جیسا سخت تھا۔

رومیلہ اتنی روہانسی ہوگئی تھی کہ اس سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا وہ ڈبڈبائی نظروں سے الیان کے چہرے پر پھیلی درشتگی اور جلال کو دیکھتی رہی۔

اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو کا الیان پر بھلا کیا اثر ہونا تھا البتہ ریاض غفار کا جھڑکنا اسے بے اختیار یاد آگیا تبھی مزید کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کرتا بیڈ کی طرف پلٹ گیا۔ مگر اگلے ہی پل کچھ خیال آنے پر وہ اس کی طرف گھومتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم چاہو تو میرے اس رویے کی شکایت اپنے بھائی سے کر سکتی ہو اس نے بار بار یہی کہہ کر تو دھمکایا ہے کہ تمہیں ذرا بھی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔

لیکن میں بھی کوئی بے وقوف نہیں ہوں مجھے معلوم ہے وہ صرف ہمیں ڈرا کر بلیک میل کر سکتا ہے مگر اس راز پر سے پردہ نہیں اٹھا سکتا۔

کیونکہ جیسے ہی یہ راز فاش ہوگا سب ختم ہو جائے گا۔ اللہ نہ کرے، لیکن ایک بار اگر بریرہ گھر واپس آ بیٹھی تو تمہارا اپنا صاف ہونا بھی یقینی ہے۔

تب تو میں تمہارا اور تمہارے بھائی کا وہ حشر کروں گا کہ تم لوگ موت کی تمنا کرو گے۔ اور ابرار اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ اسی ترپ کے پتے کو پھینک دے، جس پر اس نے پوری بازی سجائی ہے۔ لیکن پھر بھی اگر تم چاہو تو بتا دو ابرار کو کہ مجھے اس گھر میں کسی نے بھی قبول نہیں کیا ہے اور نہ ہی کبھی کرے گا یہاں سب لوگ ایک ایسے موقعے کا انتظار کر رہے ہیں جب یہ سب مجھ سے جان چھڑا سکیں اور مجھے اور آپ کو اپنے اپنے انجام پر پہنچا سکیں۔" الیان کے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ رومیلہ کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہا تھا۔

آخر اس میں ضبط کا یارا نہ رہا اور اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو چھلک کر اس کے رخسار پر آ ٹھہرے۔

الیان ان آنسوؤں پر ایک سفاک سی نظر ڈالتا ایک جھٹکے سے مڑ گیا بستر پر لیٹ کر اس نے رومیلہ کی جانب پیٹھ کرتے ہوئے تکیہ سر کے نیچے سے نکال کر اپنے منہ پر رکھ لیا۔

رومیلہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے بے آواز رونے لگی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اس سے اتنی نفرت کر سکتا ہے کہ اسے گھر سے نکالنے کے لیے کسی موقعہ کا انتظار کر رہا ہے۔

ان سب کی بے رخی اس کے لیے برداشت کرنا مشکل تھا مگر یہاں تو سب اس کے وجود سے خار کھا رہے تھے اور اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔

ان سب کے اندر تو زہر بھرا ہوا تھا اس زہر کو وہ کیسے پیئے گی کب تک پیئے گی اور کیوں پیئے گی؟

آخر ابرار بھائی نے ایسا کیا کیا ہے، جو وہ سب اس کی اور ابرار بھائی کی زندگی موت سے بھی بدتر بنا دینا چاہتے ہیں۔

ایک کے بعد ایک سوال اس کے اندر سر اٹھا رہا تھا وہ پورے پندرہ منٹ تک اپنی جگہ سے ہلے بغیر، یہاں تک کہ پلک بھی جھپکائے بغیر الیان کو غیر ارادی طور پر دیکھتے ہوئے روتی رہی۔

لیکن جب اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے اور اسے لگا کہ اب اس کی سسکی نکلنے والی ہے تب وہ دونوں ہتھیلیوں سے چہرہ رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔

الیان کے قریب ہی سائیڈ ٹیبل پر پانی کا جگ اور گلاس ڈھکا رکھا تھا وہ اپنی ہمت جمع کر کے ایک ذرا سی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر دو گلاس پانی غٹا غٹ چڑھا گئی۔

کئی گہرے گہرے سانس لینے کے بعد جب اسے لگا کہ وہ اب پہلے سے کافی بہتر ہو گئی ہے تب اس نے اپنے پرس میں سے موبائل نکالا اور ٹیرس میں آ کھڑی ہوئی۔

ایک ٹھنڈے خوشگوار جھونکے نے اس کا خیر مقدم کیا تو اس کی حالت مزید بہتر ہو گئی۔

وہ ٹیرس حویلی کے وسیع و عریض لان کی جانب تھا جہاں جلتی ہلکی ہلکی بتیاں تمام مکینوں کے کمروں میں چلے جانے کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

مگر اسے پتا تھا کراچی میں ابھی کوئی بھی نہیں سویا ہوگا بلکہ اس کے گھر میں تو ابھی رات کا کھانا بھی نہیں کھایا گیا ہوگا اسی بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس نے ابرار بھائی سے بات کرنے کے لیے ان کا موبائل نمبر ملا ڈالا۔

خلاف توقع پہلی ہی گھنٹی پر انہوں نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو رومیلہ، تم اس وقت، خیریت تو ہے نا۔" ابرار بھائی کی آواز میں پریشانی کا عنصر واضح تھا رومیلہ نے محسوس تو کیا مگر گلا کھنکھارتے ہوئے ہشاش بشاش لہجے میں ایسے بولی جیسے ان کا خیریت پوچھنا ایک عام سی بات ہو۔

"جی بھائی بالکل خیریت۔ میں گاؤں آ گئی ہوں۔ کھانا وغیرہ بھی کھا چکی ہوں بس اب سونے لیٹ رہی تھی تو سوچا آپ لوگوں کو بتا دوں کہ سفر ساتھ خیریت کے کٹ گیا۔"

"چلو اچھا ہوا۔ باقی سب لوگ کیسے ہیں۔"

"ہوں باقی سب بھی ٹھیک ہیں۔" رومیلہ سرسری انداز میں بولی لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا ابرار یہ سب سرسری انداز میں نہیں پوچھ رہا وہ پچھلے تین دنوں سے اسے صرف کرید رہا تھا اب بھی اس کا طریقہ ایسا ہی تھا شک و شبہات سے بھرپور۔

"سب کا رویہ کیسا ہے اب تک تو سب بے تکلف ہو گئے ہوں گے۔" رومیلہ نے ایک گہرا سانس کھینچ کر موضوع پر آنے کی کوشش کی۔

"جی کافی بے تکلف ہو گئے ہیں، بہت باتیں کی ہیں سب نے بلکہ صرف باتیں ہی نہیں۔ بہت منت سماجت بھی کی ہے۔" الیان کی باتوں سے رومیلہ اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی کہ ابرار نے ان لوگوں کو بریرہ کے ذریعے بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس شادی پر انہیں راضی کسی دھمکی پر کیا ہے کہ وہ بصورت دیگر بریرہ کا گھر اجاڑ دے گا۔

چنانچہ رومیلہ اسی ساری معلومات کو سیڑھی بنا کر قدم اٹھانے لگی۔

اس کی بات پر حسب توقع ابرار چونک کر بولا۔

"منت سماجت!"

"ہاں۔ آپ نے جس قسم کی دھمکیاں دی ہیں اسے سن کر وہ لوگ منت سماجت نہ کریں تو کیا پیٹرول چھڑک کر مجھے جلانے کی کوشش کریں گے۔" رومیلہ کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہونے لگا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو کیا کہا ہے ان لوگوں نے تم سے" ابرار ایک دم طیش میں آ گیا۔

"بھئی کہنا کیا ہے۔ اب وہ لوگ تو یہی سمجھ رہے ہیں نا کہ میں بھی آپ کے ساتھ اس سازش میں شریک ہوں چنانچہ وہ لوگ اس راز کو راز رکھنے کی کوشش میں خوشامد میں لگے ہوئے ہیں اور اسی خوشامد کے دوران ان لوگوں کے منہ سے جو باتیں نکلی ہیں اس سے مجھے سب پتا چل گیا ہے کہ آپ اور الیان کوئی دوست وست نہیں ہیں اور یہ کہ آپ نے الیان کو اس شادی کے لیے کیسے مجبور کیا ہے۔" رومیلہ از حد سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

ویسے بھی اس کے اور ابرار کے بیچ کوئی شوخی اور مذاق والا رشتہ نہیں تھا دونوں شروع سے ہی ایک دوسرے سے بہت لیے دیے رہتے تھے۔

اس لیے اس وقت ابرار کے ذہن میں ذرا بھی نہیں آیا کہ رومیلہ صرف اندھیرے میں تیر چلا رہی ہے وہ یہی سمجھا کہ وہ ساری حقیقت سے واقف ہو گئی ہے تبھی ایک دم تلملا گیا۔

"تو گویا ان گھٹیا لوگوں کے پیٹ میں کوئی بات ٹکی نہیں۔ دو دن میں ہی تم پر ساری اصلیت فاش کر دی۔ ہونہہ مجھے پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا وہ تمہارے سامنے مظلوم بننے کے لیے مرچ مسالا لگا کر اس کہانی کو سنائیں گے ضرور۔ مگر مجھے لگا بھلا اپنی بدنامی کا ڈھنڈورا کون پیٹتا ہے۔ لیکن یہ لوگ بھی....." ابرار بھائی کو شدید کوفت ہو رہی تھی۔

رومیلہ کے کوئی بھی سرا ہاتھ نہیں آیا تھا وہ سوچ میں پڑ گئی کہ ان سے کس طرح اگلوائے۔ وہ الیان یا اس کے گھر والوں کے متعلق کچھ ایسا نہیں کہہ سکتی تھی کہ ابرار ان سے بدظن ہو جائے کیونکہ اتنا تو وہ سمجھ ہی گئی تھی کہ ابرار نے ان لوگوں کو دھمکی دی ہے کہ وہ سب رومیلہ کا خیال رکھیں۔

اگر ابرار کو لگتا کہ وہ سب رومیلہ کو پریشان کرنے یا طعنے مارنے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں تب تو وہ اور زیادہ دھمکیوں پر اتر آئے گا چنانچہ وہ ان کا دامن صاف رکھتے ہوئے، بہت سوچ سمجھ کر بولی۔

"بدنامی کے ڈر سے ہی تو ان کے منہ سے سب کچھ نکلا ہے ورنہ میں تو جان ہی نہ پاتی کہ آپ نے....." رومیلہ نے سوچا تھا وہ کہے گی آپ نے مجھے منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا لیکن اس سے پہلے ہی ابرار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں بدنامی کا ڈر؟ بڑا بدنامی کا ڈر ہے نا جو شادی میں سب ناک بھوں چڑھائے بیٹھے تھے۔ وہ تو میں نے الیان کے باپ سے دوٹوک بات کی تب وہ لوگ لائن پر آئے ہیں ورنہ تمہارے ولیمے میں تو ان لوگوں نے ہمیں خوب نچا دکھایا ہے۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب تمہیں پتا چلے لیکن خیر اب جبکہ تم جان ہی گئی ہو تو ہم کھل کر بات کر لیتے ہیں۔ اب تم مجھے کھل کر بتاؤ۔ ان لوگوں کے بالکل دباؤ میں مت آنا ان کی بہن کی ایسی کمزوری میرے ہاتھ میں ہے کہ وہ تمہارے سامنے چوں تک نہیں کر سکتے۔

آخر کسی لڑکی کا اغوا ہونا ہمارے معاشرے میں کوئی معمولی بات تھوڑی ہے۔" ابرار بگڑے ہوئے انداز میں کہتا چلا گیا۔

"اغوا۔" رومیلہ کے منہ سے اچنبھے کے عالم میں نکلا۔

"ظاہر ہے دو دن گھر سے غائب رہی ہے۔ بے شک میں نے اس کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔ لیکن یہ تو صرف میں جانتا ہوں نا بریرہ کے سسرال والوں کو تو ایسا کوئی علم نہیں۔

انہیں جب پتا چلے گا کہ بریرہ اپنی زندگی کے چند شب و روز گھر سے باہر گزار کر آ رہی ہے تب وہ لوگ اس کی شکل پر تھوکنا بھی پسند نہیں کریں گے۔" رومیلہ کو اپنی سماعت پر ہتھوڑے برستے محسوس ہو رہے تھے۔

ابرار کی باتوں سے جو کہانی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی وہ اس کے لیے ناقابل یقین تھی گویا ابرار نے بریرہ کو اغوا کر کے الیان کو رومیلہ کے ساتھ شادی پر مجبور کیا تھا۔

اتنی گھٹیا اور رکیک حرکت کر کے بھی ابرار فخریہ کہہ رہا تھا کہ میں نے بریرہ کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔ یعنی کسی لڑکی کو حبس بے جا میں رکھنا ابرار کی نظر میں کوئی معیوب بات ہی نہیں تھی وہ ابھی بھی خود کو عظیم اور شریف ہی سمجھ رہا تھا ساری دنیا کے سامنے اس کے کردار کو مشکوک کر دینا کیا نازیبا حرکت نہیں، رومیلہ کا سر چکرانے لگا بے اختیار اس نے ٹیرس کی گرل کو مضبوطی سے پکڑ لیا مبادا وہ غش کھا کر گر ہی نہ پڑے جبکہ ابرار اس کی حالت سے بے خبر غصے سے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے بولتا رہا۔

"میں نے الیان کے گھر والوں سے صاف کہہ دیا ہے رومیلہ کو اگر ذرا بھی تکلیف ہوئی تو میں بریرہ کے گھر والوں کو ساری سچائی بتا دوں گا۔

کوئی بھی شریف خاندان ایسی لڑکی کو بہو کی حیثیت سے قبول نہیں کر سکتا اگر انہیں اپنی بہن کا گھر بسائے رکھنا ہے تو انہیں تمہیں بھی عزت و احترام کے ساتھ اپنے گھر میں رکھنا ہوگا۔"

"عزت....؟ احترام....؟ آپ کو ان لفظوں کا مطلب پتا ہے۔" رومیلہ کی آواز کی لغزش اس کے شدید صدمے میں ہونے کو بخوبی ظاہر کر رہی تھی ابرار کچھ چونک سا گیا۔

"آپ کسی کی عزت سے کھیلیں گے اور ان سے امید رکھیں گے کہ وہ آپ کی بہن کو اپنی عزت بنا لیں تو ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔

آپ نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی ان سب کی نظروں سے اتنا گرا دیا ہے کہ وہ صرف مجبوری میں مجھے برداشت کر سکتے ہیں لیکن میری عزت کبھی نہیں کر سکتے۔" رومیلہ کی آنکھوں سے ہی نہیں اس کی آواز تک سے دکھ ٹپکنے لگا تھا۔

"فضول بکواس مت کرو۔ اگر تم ان کے رویے میں ذرا سی بھی سرکشی دیکھو تو فوراً مجھے مطلع کرو میں نے کہا نا وہ تمہیں ذرا بھی تکلیف نہیں دے سکتے میں انہیں....."

"وہ مجھے تکلیف دیں یا نہ دیں اس سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے بھائی آپ نے میری شادی صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے کی ہے شہر کے بہت بڑے دولت مند خاندان کی بہو بنا کر آپ نے گلفام کے سامنے کیا چیلنج پورا کر دیا۔ بس اب میں جیوں یا مروں اس سے آپ کو کیا" رومیلہ پھٹ پڑی۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔ اتنے اچھے خاندان کے ایسے ہیرا جیسے لڑکے سے تمہاری شادی کی ہے تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیے۔"

"کس بات کا احسان مند؟" رومیلہ تڑخ کر بولی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے اس طرح زبردستی انہیں شادی پر مجبور کر کے آپ نے مجھ بہت خوش کر دیا ہے وہ لوگ مجھے کبھی دل سے قبول نہیں کریں گے میرے لیے میری عزت نفس ان تمام عیش و آرام سے زیادہ قیمتی ہے معاشی لحاظ سے میں یہاں چاہے جتنے عیش کر لوں لیکن کسی کے ماتھے پر پڑی ایک شکن میرا سارا ذہنی سکون درہم برہم کر دے گی۔" رومیلہ کے آنسو میں روانی آتی جا رہی تھی مگر ابرار کو اس کے نظریے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اس کی بات سمجھتا تو کیا سننا بھی نہیں چاہتا تھا وہ اپنی ہی کہے گیا۔

"یہ سب صرف اور صرف تمہارے ذہن کا فتور ہے۔ جو تم کسی کے ماتھے کی شکن برداشت نہیں کر سکتیں سسرال اور شوہر کے گھر میں لڑکی کو ہزار باتیں اپنی مرضی کے بغیر برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

اگر وہ تمہیں بہت ارمانوں سے بھی بیاہ کر لے کر گئے ہوتے تب بھی وہ ساری زندگی تمہیں سر آنکھوں پر بٹھانے والے نہیں تھے۔

ہمارے معاشرے کی شادیاں تو کمپرومائز پر مبنی ہوتی ہیں پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ شادی ان لوگوں نے مرضی سے کی ہے یا مجبوری سے۔ پھر تمہاری فطرت بھی ایسی ہے کہ تم اپنی خدمت اور صبر سے ان لوگوں کے دل میں جگہ بنا لو گی باقی کچھ باتیں اگر مرضی کے خلاف ہوتی بھی ہیں تو اگر معمولی ہوں تو نظر انداز کر دینا اور اگر شدید ہوں تو مجھے بتانا میں کہہ رہا ہوں نا، میرے پاس ٹرم کارڈ ہے یہ تمہیں ذرا بھی ڈاؤن نہیں کر سکتے۔" ابرار کے بے نیازی سے کہنے پر رومیلہ کا غصہ دوچند ہو گیا وہ ایک دم بھڑک کر بولی۔

"اس خوش فہمی میں مت رہیں کہ آپ کے پاس کوئی ٹرم کارڈ ہے آپ صرف ان لوگوں کو دھمکا سکتے ہیں عملی

طور پر کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ جس دن آپ نے اس راز کو فاش کیا اسی دن آپ کا ٹرم کارڈ آپ کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔

اس دن بریرہ کا جو انجام ہوگا سو ہوگا سب سے پہلے تو آپ کی خودکی بہن آپ کے گھر واپس آبیٹھے گی۔

لیکن آپ کو تو اس کی بھی فکر نہیں ہوگی کہ بہن طلاق کا داغ لیے واپس دہلیز پر لوٹ آئی ہے آپ کو پہلے بھی میرے وجود کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا سو اب بھی نہیں پڑے گا۔" رومیلہ کا لہجہ بولتے بولتے گلوگیر ہو گیا۔ تو اس نے ابرار کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ہی فون بند کر دیا۔

ابرار نے تو محض انا کی ایک جنگ لڑی تھی اور بظاہر جیت بھی گیا تھا مرزا صاحب اور گلفام کے سامنے تکبر و تفاخر سے اس نے جو بھی کہا وہ لفظ بہ لفظ سچ ہو گیا اب اگر ساری زندگی رومیلہ گھٹ گھٹ کر جیتی ہے یا کچھ عرصے بعد یہ شادی ختم ہو جاتی ہے ابرار کو ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

گلفام نے اسے چیلنج کیا تھا کہ دو دن کے اندر کسی اچھے گھرانے کا رشتہ تو آپ کو ملے گا نہیں آپ رومیلہ کی شادی میرے ساتھ ہی کر دیں۔

لیکن اس کی یہ بات غلط ثابت ہو گئی محض دو دن کے بعد ابرار نے اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جس کا ساتھ کسی بھی لڑکی کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ ہوگا۔

رومیلہ ست روی سے چلتی الیان کے بستر کے پاس آگئی وہ بہت گہری نیند سو رہا تھا شاید وہ ایسے ہی سوتا ہو گا یا سفر اور ذہنی اضطراب کے بعد تھک کر ایسی ہی نیند آئی ہو گی۔

کس قدر ذہنی کرب سے گزرے ہوں گے یہ سب لوگ دو دن کے اندر اندر کس قدر تغیر ہوا ہے ان لوگوں کی زندگی میں۔

کسی شریف گھرانے میں لڑکی کا اغوا ہو جانا گھر والوں کے لیے ڈوب مرنے کے برابر ہوتا ہے ایسے میں اگر اس لڑکی کی شادی سر پر ہو تو گھر والوں کی پریشانی کا کیا عالم ہو گا اس کا تصور بھی رومیلہ کے لیے مشکل تھا۔

چنانچہ جب ابرار نے تاوان میں الیان کو رومیلہ سے شادی کرنے کا کہا ہو گا تو فیصلہ کرنے میں کسی بھی غیرت مند بھائی کو ایک لمحہ نہیں لگے گا یہی الیان نے کیا گھر کی عزت بچانے کے لیے وہ فوراً" رومیلہ کو اپنی عزت بنا کر لے آیا۔

لیکن اب آگے کیا ہو گا۔

رومیلہ بے اختیار الیان کو دیکھنے لگی جس کا آدھے سے زیادہ چہرہ تکیہ کے پیچھے چھپا ہوا تھا پہلی بار الیان کو دیکھنے پر رومیلہ نے اس کے چہرے سے زیادہ اس کے چہرے کے تاثرات پر غور کیا تھا جن میں اتنی سختی و سنجیدگی پوشیدہ تھی کہ چہرے کی ساری جاذبیت کہیں دب گئی تھی۔

مگر آج یہ جاننے کے بعد کہ اس کے کم ظرف بھائی کے مقابلے میں ایک یہ بھائی ہے، جس نے بہن کی عزت اور اس کا گھر بچانے کے لیے خود کو بھی بیچنے سے گریز نہیں کیا رومیلہ کے دل میں اس کی عزت و احترام کو ہزار گنا بڑھا گیا تھا۔

وہ صرف ظاہری طور پر وجیہہ نہیں تھا بلکہ اس کا باطن اس سے بھی خوب صورت تھا جو اتنا کچھ ہونے کے باوجود نہ صرف رومیلہ کو اپنے نکاح میں لے کر اپنے گھر لے آیا تھا بلکہ اس کے ساتھ صرف رویے کے کھردرے پن کے علاوہ کسی وحشیانہ رویے کا مظاہرہ بھی نہیں کیا تھا۔

اگر اس کی جگہ ابرار ہوتا تو کیا اپنی بہن کے لیے اتنی بڑی قربانی دیتا؟

وہ تو اپنی بہن کے اغوا کا ڈھنڈورا پیٹ کر مجرم کو اس کے انجام تک پہنچانے کے ڈرامے میں مصروف ہو جاتا

اور یہ بھی نہ سوچتا کہ یہ سب کر کے نقصان کس کے حصے میں آرہا ہے اس کے مقابلے میں الیان کا رویہ تو لاکھ بہتر تھا۔

پتا نہیں کتنی نفرت بھری ہوگی اس کے دل میں رومیلہ کے لیے وہ تو محض زبان سے زہر اگل سکا تھا وہ بھی اس لیے کہ رومیلا نے اتنی بات کر لی تھی ورنہ وہ یہ سب بھی نہ کہتا کہ اس کے کہے ہر لفظ کا حساب اس کی معصوم بہن کو دینا پڑے گا۔

کیا بھائی ایسے بھی ہوتے ہیں؟

رومیلہ عجیب سی حسرت لیے الیان کے بے سدھ وجود کو دیکھتی رہی اس کی آنکھیں ایک بار پھر بہنے لگی تھیں مگر اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی بھی نہیں نکلی تھی۔

جب اس کے اپنے سگے بھائی نے اس کی ذات کو رول دیا تھا تو یہ لوگ تو اسے جو بھی کہیں وہ کم ہے بلکہ ایک طرح سے تو ان سب نے اپنی نفرت کا کھل کر اظہار ہی نہیں کیا تھا۔

کس قدر کٹھن مرحلے سے گزر رہے تھے یہ سب جس شخص سے کراہیت آرہی ہو اسی کی شکل ہر وقت اپنے سامنے برداشت کرنا اور وہ بھی ایسے کہ ارد گرد لوگوں کو احساس بھی نہ ہو، کسی آزمائش سے کم نہیں تھا یہ سب۔

اس کے ساتھ اب تک جو کچھ بھی ہوا وہ اس کے لیے ان لوگوں کو مکمل طور پر حق بجانب سمجھ رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ ان کے رویے کی جائز بد صورتی کو برداشت کرنے کے لیے پہاڑ جیسا حوصلہ کہاں سے لائے۔

☼ ☼ ☼

نمل اور سنبل رکشا میں اپنے اپنے گھر تو پہنچ گئیں لیکن ان دونوں کا ہی ذہن جیسے یونیورسٹی میں ہوئے سانحہ پر اٹک کر رہ گیا تھا۔

نمل کو سمیر کا سب کے سامنے نمل کو اپنی گرل فرینڈ کہنا سخت زہر لگا تھا اس نے مکمل تہیہ کر لیا تھا وہ آئندہ سمیر کے ساتھ کبھی نہیں بیٹھے گی۔ بلکہ اس کی پچھلی کچھ حرکتوں کی وجہ سے وہ سمیر کے ساتھ مکمل قطع تعلق کر لینے کا فیصلہ کر چکی تھیں اتنے ہلکے انسان کو وہ اپنے مطلب کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پھر اس کے دوست نے اس کے سامنے خرم کی تصویر اپنے موبائل سے لی اور وہ اس بے ہودہ حرکت میں بھی اس کے ساتھ شامل رہا یہاں تک کہ مار پیٹ پر اتر آیا۔

اسے رہ رہ کر سمیر کی حرکتوں پر غصہ آرہا تھا اور یہ سوچ کر غصہ کوفت میں تبدیل ہو رہا تھا کہ وہ اس شخص کے ساتھ اپنا اسکینڈل بنا رہی تھی خرم کو جلانے کے لیے۔

اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے خرم زوبیہ کو اس کے مد مقابل لے آیا اور زوبیہ کو اس اذیت سے گزرنا پڑا جانے اسے کیا ہوا تھا جو وہ خرم کے دوستوں کو دیکھ کر چیخ پڑی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ خرم سے زوبیہ کی خیریت پوچھ لے لیکن اسے ڈر تھا کہیں خرم اس کے فون کرنے کو کوئی اور رنگ نہ دے دے وہ اسے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتی تھی۔

وہ یہ نہیں سوچتا کہ نمل زوبیہ کی طرف سے فکر مند ہے بلکہ وہ یہ سوچتا کہ اس کا حربہ کامیاب رہا۔ نمل اسے زوبیہ کے ساتھ دیکھ کر خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگی تبھی اس سے رابطہ بڑھانے کے لیے زوبیہ کے بہانے فون کر رہی ہے ورنہ اسے زوبیہ کی کیا فکر۔ حالانکہ اس کی فطرت ایسی تھی کہ اسے سب کی فکر رہتی تھی۔

یہ اور بات تھی کہ اس بات سے سنبل بھی متفق نہیں تھی گھر پہنچنے کے بعد اس نے بھی نمل سے خوب بحث

کی تھی۔
وہ خرم کی حمایت نہیں کر رہی تھی جو شخص اپنے منہ سے کہہ چکا ہو کہ میں نے محض انتقاماً "تم سے منگنی کی ہے تمہارے تھپڑ کا بدلہ لینے کے لیے" اس شخص سے کوئی بھی لڑکی خوشی خوشی کیسے شادی کر سکتی تھی۔
نمل کا خرم سے منگنی توڑنے کی خواہش رکھنا سنبل کی نظر میں بالکل جائز تھا۔
مگر خرم کو تپانے اور سلگانے کی تمام کوششیں سنبل کی نظر میں سراسر حماقت اور بے وقوفی تھی، جس کے نتائج بھی خود نمل کو ہی بھگتنے تھے اور جس کی ابتدا ابھی سے ہو گئی تھی۔
ایک تو وہ یونیورسٹی میں اپنا تماشا بنا رہی تھی سمیر سے دوستی کر کے، دوسرے خرم کو بھی اکسا رہی تھی کوئی انتہائی قدم اٹھا لینے پر جو نمل کے حق میں ہی نقصان دہ ہونے والا تھا۔
نمل اس سے متفق تھی بھی اور نہیں بھی۔ سنبل کی باتیں غلط نہیں تھیں مگر اس کے مشورے ضرور غلط تھے

اس کا کہنا تھا خرم کے معاملے میں بالکل خاموش رہو وہ کچھ کہتا بھی ہے تو نظر انداز کر دو۔ ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ خود تنگ آ کر اسے زچ کرنا چھوڑ دے گا۔
نمل کو یقین تھا خرم ایسا کچھ نہیں کرے گا اول تو اس میں اتنا صبر نہیں تھا کہ وہ خرم کے طنز کے نشتروں کو خاموشی سے سہہ لیتی۔
دوسری بات یہ کہ خرم اس کی خاموشی کو اس کی ہار سمجھ کر اور بھی مغرور ہو جائے گا جو کہ نمل بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی چنانچہ یہ تو ممکن نہیں تھا۔
البتہ ایک چیز اس نے طے کر لی تھی اور وہ تھا سمیر سے قطع تعلق۔ جو اسے ہر حال میں کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

زوبیہ کو ہوش آیا تو اس نے خود کو اسپتال میں پایا نرس اس کے بائیں ہاتھ میں لگی ڈرپ نکال رہی تھی وہ خالی خالی نظروں سے نرس کو دیکھنے لگی جو اسے ہوش میں آتا دیکھ کر اس کی خیر خیریت پوچھنے لگی تھی تبھی عائشہ اختر کی آواز پر وہ چونک گردن گھما کر اپنے دائیں جانب دیکھنے لگی۔
"کیسی ہو جانو۔ اب کیسی طبیعت ہے۔" وہ بڑی محبت سے پوچھ رہی تھیں۔
"مجھے کیا ہوا تھا۔" زوبیہ خالی الذہنی کے عالم میں بولی۔
"تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ کیا ہوا تھا یونیورسٹی میں۔" ایک کوندا سا زوبیہ کے ذہن میں لپکا اور جیسے اسے سب یاد آ گیا۔
وہاں ایک لڑکے کو دیکھ کر اسے لگا جیسے شائستہ خالہ اس پر حملہ کر دیں گی۔ لیکن وہ تب بے ہوش نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے کچھ اور دیکھا تھا تب اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔
اسے یاد آ گیا تھا وہ اس لڑکے کو دیکھ چکی تھی ایک بار نہیں بلکہ کئی بار اس نے اپنے سامنے مجسم اسے نہیں دیکھا تھا مگر اس کی تصویر دیکھی تھی۔
پین اور پینسل کے بنے مختلف اسکیچز میں وہ اس کی شکل دیکھ چکی تھی۔
وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ عائشہ اختر نے اس کا کندھا ہلا کر اسے چونکا دیا۔
"تم کچھ بول کیوں نہیں رہیں۔ تم ٹھیک تو ہو نا۔" وہ تفکر بھرے انداز میں بولیں۔
"ج۔۔۔۔جی میں ٹھیک ہوں بس ذرا کمزوری ہو رہی ہے۔" زوبیہ نے بروقت خود کو سنبھال لیا۔

انہیں کچھ بتانا عبث تھا جو انسان بات سمجھنا تو در کنار سننا بھی نہیں چاہتا ہو اس سے اپنا مسئلہ ڈسکس کرنا حماقت ہی تھی چنانچہ اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ ایک دم چکر آ گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔
البتہ رات کو اپنے موبائل پر خرم کی کال آنے پر وہ سوچ میں پڑ گئی بے اختیار اسے نمل کی باتیں یاد آ گئیں کہ خرم نے شرط جیتنے کے لیے اس کا نمبر لیا تھا۔
ایک پل کو اس کا دل چاہا فون کاٹ دے لیکن دوسرے پل اسے لگا اگر وہ اپنا مسئلہ خرم سے نہیں کہے گی تو کس سے کہے گی کم از کم ایک بار اس سے بات کر کے پوچھ تو لے کہ نمل کی باتوں میں کتنی سچائی ہے۔
یہی سب سوچتے ہوئے اس نے کال ریسیو کر لی۔
"اب آپ کیسی ہیں زوبیہ" خرم کا لہجہ نہایت سنجیدہ تھا۔
زوبیہ صرف "ٹھیک ہوں" کہہ کر خاموش ہو گئی۔
"کیا ہوا تھا کیا آپ کو وہ لڑکا دوبارہ نظر آیا تھا۔" خرم کے سوال پر زوبیہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔
"کیا وہ لڑکی واقعی آپ کی منگیتر ہے، جو میری میز پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔" اب کی بار خاموش ہو جانے کی باری خرم کی تھی۔
وہ پریشان نہیں ہوا تھا البتہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اب اس کا اگلا سوال کیا ہو گا۔
"ہاں وہ میری منگیتر ہے۔" خرم نے کہا تو اس نے وہی پوچھ لیا جس کی خرم امید کر رہا تھا۔
"تو پھر وہ آپ کے بارے میں ایسا کیوں کہہ رہی تھی کہ آپ نے شرط جیتنے کے لیے میرا نمبر لیا ہے۔"
"اچھا فرض کرو اگر میں نے شرط جیتنے کے لیے تمہارا نمبر لیا تھا تو مجھے وہ ساری باتیں کیسے پتا چلیں جو میں نے پوچھی تھیں اور اگر میں شرط جیت چکا ہوں تو اب میں تمہیں کیوں فون کر رہا ہوں۔" خرم انتہائی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا زوبیہ لحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی تو خرم رسانیت سے کہنے لگا۔
"تم یونیورسٹی وغیرہ کے ماحول کو نہیں جانتیں اور کیونکہ تم خود آج کل کی لڑکیوں جیسی نہیں ہو اس لیے تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ آج کل لڑکیاں اپنے منگیتروں کو کس کس طرح پریشان کرتی ہیں۔
وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی اسے معلوم تھا میں تم سے پیلس ہوٹل میں ملا تھا چنانچہ اس نے ایسی بات کہی کہ تم مجھ سے بد ظن ہو کر مجھ سے قطع تعلق کر لو۔
حالانکہ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں تمہارے مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہوں۔" خرم کی آخری دو باتوں میں ذرا جھوٹ نہیں تھا۔
وہ جس طرح اسے اپنے ساتھ یونیورسٹی لے گیا تھا اور وہاں جا کر وہ جس طرح بے ہوش ہو گئی تھی اس سے خرم کو احساس جرم پریشان کرنے لگا تھا۔

بھلے ہی اس نے موبائل توڑ دیا تھا جس میں اس کی زوبیہ کے ساتھ تصویر لی گئی تھی لیکن اور جانے کتنے لوگ ہوں گے جو خاموشی سے اس منظر کو موبائل کے کیمرے میں قید کر چکے ہوں گے۔
اس کے علاوہ جب ساری یونیورسٹی کے سامنے وہ اسے خاصے نازیبا انداز میں گاڑی تک لے گیا تو پھر اس سے کیا فرق پڑا تھا کہ تصویر یا موی بننے کی صورت میں وہ سب بھی اس گھٹیا اسکینڈل سے واقف ہو جائیں گے جو وہاں موجود نہیں تھے۔

وہ صرف اسے اپنے ساتھ یونیورسٹی لے جانا چاہتا تھا مگر اس کے چلا کر بے ہوش ہو جانے پر خرم کو اس کے ذہنی طور پر بیمار ہونے کی نزاکت کا احساس ہوا تھا۔

وہ سوچنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن گاڑی میں جو کچھ نمل نے کہا تھا وہ بھی اسے شرمندہ کر گیا تھا۔

وہ صرف زوبیہ کے ساتھ جا کر آجاتا تو بات الگ تھی۔ لیکن وہ زوبیہ کو اٹھا کر گاڑی تک لے کر گیا وہ واقعی بہت معیوب تھا وہ نمل کے منہ پر تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اب ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے پر اسے لگ رہا تھا کہ نمل اور سنبل کا ساتھ چلنا زوبیہ کے کردار کو پامال ہونے سے بچا گیا تھا اپنی تو اسے پروا نہیں تھی کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں اپنے لیے تو وہ "who cares" کے مقولے پر یقین کرتا تھا۔

لیکن ایک ایسی لڑکی کے کردار کو مشکوک کرنا۔ جس سے اس کی کوئی دشمنی نہ ہو اس کی سرشت میں نہیں تھا۔

اسی لیے وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا کم از کم اس کی بات سن کر اسے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا موقع ضرور دینا چاہتا تھا اور زوبیہ اتنی زیادہ ڈپریس تھی کہ اسے خرم کی بات کا یقین کرنا ہی تھا۔

ویسے بھی اس کی بات میں وزن تھا کہ وہ یہ سب کیسے جانتا ہے کہ کوئی سایہ اس گھر میں ہے وغیرہ۔ چنانچہ زوبیہ نمل کی باتوں کو خرم اور نمل کی آپس کی لڑائی کا ردعمل سمجھتے ہوئے بہت ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی۔

"آپ اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتے کیونکہ اس مسئلے کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا۔

اب جو میں نے یونیورسٹی میں دیکھا ہے اور جو میری سمجھ میں آیا ہے وہ میں آپ سے کہوں گی تو آپ بھی یہی کہیں گے یہ کیا بکواس ہے۔" زوبیہ کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

"تم بتاؤ تو سہی میں ایسا کچھ نہیں کہوں گا۔" خرم بولا۔

"میں نے جس لڑکے کو دیکھا تھا وہ... وہ شائستہ خالہ کا قاتل ہے۔" زوبیہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

"کیا۔" خرم کی واقعی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"ہاں۔ اسی نے شائستہ خالہ کو مارا ہے کیونکہ میرے پاس شائستہ خالہ کے بنائے ہوئے مختلف اسکیچز ہیں ان میں کئی صفحوں پر ایک ہی منظر ہے کہ دو لڑکے ایک قبر کھود رہے ہیں۔ وہ شائستہ خالہ کی قبر کھود رہے ہیں اور ان دو لڑکوں میں ایک یہی تھا جسے میں نے دیکھا تھا۔" زوبیہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

خرم کی بے یقینی کوفت میں بدلنا شروع ہو گئی اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا وہ کیوں ایک پاگل لڑکی کی مدد کرنے چل پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں تو جو بھی آجاتا وہ کہہ دیتی اس کی باتوں میں کوئی ربط کوئی دانش مندی پوشیدہ تھوڑی تھی۔

"زوبیہ جس لڑکے کو دیکھ کر تم بے ہوش ہوئی تھیں، وہ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ پڑھاتا نہیں ہے شائستہ خالہ کی موت کے وقت وہ بچہ ہو گا بلکہ کیا پتا پیدا ہی نہ ہوا ہو۔" خرم نے بور ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں خرم میں یقین سے کہہ سکتی ہوں یہ وہی لڑکا ہے کاش میں آپ کو وہ اسکیچز دکھا سکتی۔ جس جگہ پر وہ قبر کھود رہے ہیں وہ جگہ کوئی فارم ہاؤس جیسی ہے۔

وہ... وہ بہت بڑا فارم ہاؤس ہے۔ وہاں اصطبل ہے۔ بلکہ نہیں، پیڑ نہیں درخت ہے ایک، بہت بڑا درخت۔ جس کے آس پاس کی ساری زمین کچی ہے جہاں کوئی گھاس وغیرہ بھی نہیں ہے۔

وہیں اس درخت کے ساتھ بنے فارم ہاؤس کی دیوار کے پاس وہ لڑکا شائستہ خالہ کی لاش کو دفنا رہا ہے ان اسکیچز پر کوئی رنگ نہیں ہوتا پھر بھی میں یقین سے کہہ سکتی ہوں اس دیوار پر لائٹ گرین کلر ہوا ہے اور اس دیوار کے اوپر اسی کی ہم رنگ گرل لگی ہے شاید کبھی کسی وقت اسکیچز بناتے وقت شائستہ خالہ نے میری کلر

پنسل بھی یوز کی ہو گی! اسی لیے مجھے لگتا ہے کہ وہاں گرین کلر ہوا تھا۔" زوبیہ بولتی رہی اور خرم بے یقینی کے عالم میں گھراسب سنتا رہا۔

حمید کے والد جدی پشتی رئیس آدمی تھے ان کا اپنا فارم ہاؤس تھا جو خرم نے سیکڑوں بار دیکھا ہوا تھا۔ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ زوبیہ اسی فام ہاؤس کا ذکر کر رہی ہے ٹھیک ایسی ہی دیوار اور اس کے اوپر لگی گرل خرم کو اچھی طرح یاد تھی۔

مگر اس کا دماغ اس بکواس کو قبول کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔

بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ زوبیہ کی وہ خالہ جو زوبیہ کے پیدا ہونے سے پہلے مر گئی ہوں ان کا قاتل حمید ہو جو اس وقت پیدا بھی نہ ہوا ہو۔

"دیکھو زوبیہ۔" خرم نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس پر ایک ہیجان برپا تھا وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"خرم میں... میں مانتی ہوں کہ وہ اس وقت پیدا نہیں ہوا ہو گا لیکن یہ وہی لڑکا تھا یا پھر ہو سکتا ہے یہ اپنے والد یا کسی چچا سے بہت مشابہہ ہو اور وہ اسکیچز اس کے کسی رشتے دار کے ہوں مگر پھر بھی مجھے یقین ہے کہ اس کا شائستہ خالہ کی موت سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔

میں... میں جانتی ہوں اس طرح کسی فارم ہاؤس کا پتا لگانا بہت مشکل ہے لیکن اگر ہم اس جگہ تک پہنچ گئے۔ تو مجھے یقین ہے آج اتنے سال بعد بھی ہم شائستہ خالہ کی قبر کھودیں گے تو ان کی بوسیدہ ہڈیاں ضرور نکل آئیں گی اگر ہم ان ہڈیوں سے ان کی موت کے متعلق کچھ پتا نہیں بھی کر سکے تب بھی یہ تو معلوم ہو جائے گا ناں کہ شائستہ خالہ کو قتل کر کے ان کی لاش کو اس طرح ایک ویران اور سنسان جگہ میں دفنا دیا گیا تھا۔" زوبیہ بڑے جوش و خروش سے بول رہی تھی۔

خرم خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا اس کی دو باتیں اپنی جگہ درست تھیں وہ حمید کو ہی دیکھ کر چلائی تھی اور حمید کے ہی والد کا ٹھیک ایسا فارم ہاؤس تھا۔

بیک وقت اس کی دو باتوں میں اتنا بڑا اتفاق نہیں ہو سکتا اگر اس کا اندازہ صحیح تھا اور حمید کی جگہ اس کے والد یا کسی چچا وغیرہ اس سارے مسئلے کا سبب تھے تو وہ لاش برآمد کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے جرم کا پول بھی کھول سکتے تھے۔

"خرم میں آپ کے ساتھ ایک بار پھر یونیورسٹی چلنا چاہتی ہوں۔"

اسٹور روم میں رکھی وہ تصویر چاہے میں نہ دیکھ سکوں لیکن اس لڑکے کو تلاش کرنا چاہتی ہوں مجھے پتا کرنا ہے کہ وہ کون ہے اور اس کا تعلق کس گھرانے سے ہے۔" زوبیہ کا انداز بڑا مضطرب سا تھا جیسے سب کچھ آج ابھی اور اسی وقت کر لینا چاہتی ہو۔

"تمہیں یونیورسٹی دوبارہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" خرم بے اختیار سختی سے بولا اور اس سے پہلے کہ زوبیہ اس کے لہجے پر غور کرتی یا چونکتی اس نے خود کو فوراً سنبھال لیا اور کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں اس لڑکے کا ہی نہیں بلکہ اس فارم ہاؤس کا بھی پتا کر لیتا ہوں لیکن پھر تمہیں میرے ساتھ اس فارم ہاؤس پر چلنا ہو گا جہاں شائستہ خالہ کی لاش دفن ہے۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

مسرت ظہور

اک کھنڈر وہ بھی

تین ماہ پہلے کی بات ہے جب شہناز اپنی دو بچیوں اور میاں کے ساتھ ہمارے محلے میں کرائے دار کی حیثیت سے آئی تھی، صبح کا وقت تھا بچے اسکول جا چکے تھے۔ میں نے برتن سمیٹ کر سنک میں رکھے اور ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ گھر کے کام کا آغاز کہاں سے کروں کہ پڑوس میں رہنے والی خالہ جمیلہ کی آواز سنائی دی جو مجھے بلا رہی تھیں۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے پک اپ میں سے تین چارپائیاں ایک چولہا اور کھانے پینے کے برتن، ٹرنک اور تین بستر ہمارے گھر سے دو مکان چھوڑ کر تیسرے مکان کے سامنے اتارے گئے تھے۔

میرے دریافت کرنے پر خالہ جمیلہ نے بتایا کہ گجروں نے مکان کرائے پر دے دیا ہے۔

"خدا غارت کرے ایسے لالچی لوگوں کو یہ مکان کوئی رہنے کے قابل ہے نا معلوم کب گر جائے اور رہنے کے لیے آنے والوں نے بھی کچھ نہیں دیکھا۔" میں نے افسوس سے کہا۔ اسے تو مکان بھی نہیں کہنا چاہیے تھا وہ کھنڈر تھا۔ پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا سرکاری نل لگا ہوا تھا وہ بھی گھر سے باہر۔ جس میں کبھی پانی ہوتا اور کبھی کئی کئی دن غائب۔ گلی میں آٹھ گھر تھے سب نے تنگ آ کر پانی کی موٹریں لگوالی تھیں۔ سب متوسط گھر تھے سوائے ایک گھر کے جو کہ فیاض گجر کا تھا اور جس مکان کی میں بات کر رہی ہوں وہ اس کے گھر کے بالکل ساتھ تھا اور اس نے وہ پانچ مرلہ پلاٹ کے ساتھ ہی خریدا تھا۔

کافی عرصہ اس نے اس پلاٹ میں بھینسیں باندھے رکھیں پھر کسی اور جگہ شفٹ کر دیا اور اس پلاٹ کو ویسے کا ویسا ہی چھوڑ دیا کبھی کبھار جب تک وہ کمرہ ٹھیک تھا کسی نہ کسی کو کرائے پر دے دیا کرتا تھا اور آپ تو تقریباً" دو سال سے کسی نے اس طرف جھانکنا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا کہ صبح صبح ان چاروں کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ اب میں اور خالہ کھڑی اس انتظار میں تھیں کہ جیسے ہی خاتون خانہ اس کھنڈر کو دیکھیں گی تو اپنا سامان واپس اسی پک اپ میں رکھوا کر چلی جائیں گی مگر حیرت تو اس وقت بڑھ گئی جب سارا سامان اندر چلا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔

"کوئی بہت مجبور ہوں گے اور دیکھا نہیں سامان سے ہی غریب لگ رہے ہیں۔" خالہ جمیلہ نے کہا۔

"آؤ چل کر ملتے ہیں۔" خالہ جمیلہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھنا چاہا۔

"نہیں خالہ آپ جائیں میں اب اس حالت میں باہر نہیں نکلوں گی۔" میں نے معذرت چاہی میں اگرچہ چوتھی بار ماں بن رہی تھی مگر ہر بار میں اپنی جھجک پر قابو پانے میں ناکام ہی رہی تھی جیسے جیسے مہینے آگے جاتے تھے ویسے ویسے میں گوشہ نشینی میں چلی جاتی تھی اور اب تو میں بالکل ہی گوشہ نشین تھی۔ خالہ کو ان کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر میں اپنا گیٹ بند کر کے اندر چلی آئی اور آہستہ آہستہ اپنے گھریلو کام نبٹانے لگی۔

دوپہر کا لنچ تیار کر کے تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے کے لیے جیسے ہی لیٹی تو دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ لوڈ شیڈنگ کے باعث بیل کی بجائے یہ دستک سننا پڑتی تھی جو کہ بہت کوفت زدہ کر دیتی تھی۔ مشکل سے اٹھی اور من ہی من میں آنے والے سے بے زاری کا اظہار بھی کر ڈالا مگر دروازہ کھولتے ہی خالہ جمیلہ کے ساتھ ایک اجنبی صورت خاتون کو دیکھتے ہی خوش اخلاقی سے مسکرا کر انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"عائشہ یہ شہناز ہے آج ہی ہمارے محل میں کرائے دار آئی ہے۔" خالہ جمیلہ نے خاتون کا تعارف کروایا۔ شہناز کافی خوش شکل تھی اور اپنے رکھ رکھاؤ سے پڑھی لکھی معلوم ہو رہی تھی مگر میرے بعد میں دریافت کرنے پر اس نے اپنے پڑھے لکھے ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

"دو بچیاں ہیں میاں بیمار رہتا ہے اس نے گھریلو کام کاج کے لیے کہا تو میں فوراً" اسے تمہارے پاس لے آئی تمہیں ضرورت ہے نا کام والی ماسی کی۔" خالہ جمیلہ نے کہا تو میں حیرت زدہ رہ گئی بھلا کسی ضمانت کے بغیر میں اسے کیسے رکھ سکتی ہوں خالہ جمیلہ بھی نا کچھ

سوچتی سمجھتی نہیں۔

"ہاں ضرورت تو ہے مگر میں ایسے کیسے؟" میں جھجک کر خاموش ہو گئی اسی لمحے شہناز اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے پاؤں پکڑ لیے۔

"خدا کے لیے بی بی میں بہت مجبور ہوں مجھے کام پر رکھ لو میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔" اس کے آنسو دیکھ کر میرا دل جو پہلے فیصلہ کرنے میں ڈانوا ڈول تھا۔ یکدم فیصلہ کیا اور اسے کام کے لیے رکھ لیا۔

اس کے ساتھ کام اور اجرت طے کی اور اسے صبح آنے کے لیے کہا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کیا۔ اس دن چونکہ اس کے کرنے والے کام میں ختم کر چکی تھی لہٰذا وہ اور خالہ جمیلہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

میرے میاں ایلیٹ فورس میں "اے ایس آئی" ہیں ان دنوں ان کی ڈیوٹی گورنر پنجاب کے حفاظتی دستے میں تھی۔ وہ کبھی ایک ماہ بعد اور کبھی کبھی دو ہفتے بعد چھٹی پر گھر آتے تھے۔ میرے ساس سسر فوت ہو چکے ہیں میرا سب سے چھوٹا دیور ان دنوں سیکنڈ ایئر میں زیر تعلیم تھا۔ لہٰذا حامد (میاں) نے اپنا تبادلہ کروانے کی کوششیں نہیں کیں۔

دوسرے دن صبح ہی شہناز بچوں کے اسکول جانے سے پہلے ہی اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ آگئی اس نے بچیوں کو ایک طرف بٹھایا اور مجھ سے پوچھ کر ناشتا بنانے لگی اس نے بہت پھرتی سے سب کے لیے ناشتا بنایا۔ میں اس کے صبح صبح ہی آجانے پر حیران تھی حالانکہ اس سے طے ہوا تھا کہ وہ بچوں کے اسکول جانے کے بعد آئے گی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود ہی اس سوال کا جواب دے دیا۔

"باجی میں نے سوچا آپ اس حالت میں کیسے کام کریں گی آپ بے شک مجھے اتنا ہی معاوضہ دینا جتنا طے ہوا ہے۔" شہناز نے ناشتا میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا اچانک میری نظر اس کی دونوں بچیوں پر پڑی اس نے انہیں جہاں بٹھایا تھا وہ وہیں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی بچی کی عمر تقریباً" چھ سال کے لگ بھگ تھی جبکہ چھوٹی بچی ابھی بمشکل ڈھائی سال کے قریب لگتی تھی۔

"شہناز خود بھی ناشتا کر لو اور بچیوں کو بھی کروالو۔" میں نے شہناز سے کہا جو اب سارے گندے برتن سنک میں اکٹھے کر رہی تھی۔

"بی بی ہم ناشتا کر کے آئے ہیں۔" شہناز نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

"کیسے کر کے آئی ہو ناشتے کا تو ابھی وقت ہے جب تم میرا خیال کر سکتی ہو تو میں کیوں نہیں شاباش جھوٹ مت بولو۔۔۔ بلکہ ادھر آؤ مل کر ناشتا کرتے ہیں۔" میں نے اسے ڈائننگ ٹیبل پہ بلایا۔

"نہیں بی بی اللہ آپ کا بھلا کرے ہم ادھر ہی بیٹھ کر کر لیتے ہیں۔" اس نے جلدی سے کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں اٹھی اور اس کے اور اس کی بچیوں کے لیے ناشتا ٹرے میں رکھا اور اسے ڈرائنگ روم میں ہی دے دیا۔ اس نے نیچے ہی بیٹھ کر اپنی بچیوں کو ناشتا کروایا جبکہ خود نہیں کیا بچیوں نے بھی بہت تھوڑا سا کھایا۔ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی اس کی بچیوں کے پیٹ بھرے ہوئے تھے۔ دونوں بچیاں بہت خوب صورت تھیں۔ مگر بہت سہمی ہوئی تھیں شاید نئی جگہ ہے میں نے خود ہی سوچا۔

تقریباً" دو گھنٹے میں سارا گھر چم چم کر رہا تھا شہناز بہت پھرتیلی تھی۔ ایک بات اور میں نے دیکھی کہ وہ بہت ہی کم گو تھی جتنی بات پوچھتی بس اتنا جواب دیتی تھی۔ کام کرنے کے بعد وہ اپنی بچیوں کو لے کر گھر چلی گئی اگلے تین ماہ کے دوران اس نے بتایا تھا کہ اس کی یہی دو بچیاں ہیں میاں اس کا بیمار ہے جو اپنی بہن کے پاس ہوتا ہے کیونکہ وہ سرکاری ہسپتال سے دوائی لے رہا ہے لہٰذا ادھر ہی رہتا ہے اس کی نند سرکاری ہسپتال میں نرس ہے اور جو اس دن آدمی ان کے ساتھ آیا وہ ان کا پرانا محلے دار تھا جو گجر صاحب کو جانتا تھا اور اس نے ہی گجر صاحب سے یہ کمرہ لے کر دیا ہے۔ اس کا کرایہ گجر صاحب نہیں لیتے۔۔۔ اس کے بدلے میں وہ گجر صاحب کے گھر برتن اور صفائی کا کام کر دیتی ہے۔

گجر صاحب واقعی ایک خدا ترس آدمی ہیں اور ان کی بیوی بھی ایک اچھی خاتون ہیں دو بیٹے ہیں جو ملک سے باہر ہوتے ہیں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی۔ دونوں میاں بیوی اکیلے ہوتے ہیں اور بھینسوں کا فارم قائم کیا ہوا ہے۔ اس دوران گجر صاحب نے وہ کمرہ مرمت کروا دیا اور ایک دروازہ اپنے گھر کی طرف دیوار میں کھول دیا اب وہ کمرہ ان کے گھر کا ایک حصہ بھی تھا خالہ جمیلہ نے بتایا کہ شہناز نے اس پلاٹ کو صاف کر کے اس میں سبزیاں اگا دی ہیں۔ اسے ہمارے گھر کام کرتے ہوئے تیسرا مہینہ تھا اور میرا چھوٹا بیٹا جو اس کے آنے کے بعد پیدا ہوا تھا تقریباً" دو ماہ کا تھا۔ جب ایک دن وہ کام ختم کرنے کے بعد ابھی گئی ہی تھی کہ پھر بہت گھبرائی ہوئی تیزی سے واپس آئی اور دروازہ بند کر دیا۔

ابھی میں نے اس سے پوچھنا ہی تھا کہ گلی میں سے کسی مرد کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ اور پھر ہمارے دروازے پر زور زور سے دستک دی۔ علی (دیور) اس وقت گھر میں ہی تھا اس نے دروازہ کھولا تو باہر ایک ہٹے کٹے آدمی کو دیکھا۔

"آپ کے گھر میں رضیہ کام کرتی ہے اسے باہر بلائیں۔" آدمی نے کہا۔

"یہاں رضیہ کام نہیں کرتی آپ کہیں اور سے پتا کریں۔" علی نے جواب دیا۔

"دیکھو میں نے اسے اس گلی میں ہی دیکھا ہے وہ یہیں کہیں چھپی ہوئی ہے اسے شرافت سے باہر نکال دو ورنہ۔۔۔۔" آدمی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"جب میں کہہ رہا ہوں کہ یہاں کوئی رضیہ نہیں ہے تو مان کیوں نہیں رہے۔" علی نے مرعوب ہوئے بغیر کڑے تیوروں سے جواب دیا۔ اس کی بات سن کر وہ آدمی چلا گیا۔ میں نے اور علی نے بہت پوچھا مگر شہناز نے ہمیں کچھ نہیں بتایا بس روتی رہی اور یہی بتایا کہ وہ کچھ نہیں جانتی یہ آدمی کون تھا۔

اس بات کو تقریباً" دو ہفتے گزرے ہوں گے۔ شہناز بدستور میرے اور گلی کے دو اور گھروں میں کام کر رہی تھی جب ایک شام تقریباً" چار بجے اس کے گھر سے اس کی بچیوں اور اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں اس کے گھر کے باہر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ آوازیں سن کر علی فوراً" اس کے گھر کی طرف دوڑا میرے منع کرنے کے باوجود کچھ اور لوگ بھی دروازے پر کھڑے صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے کہ اسی دوران گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں تین گولیاں چلیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ گلی کے ایک لڑکے نے ہمت کی اور دیوار سے اندر کود گیا اور دروازہ کھول دیا۔ جیسے ہی لوگ اندر گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی مر چکا ہے جبکہ دوسرا شدید زخمی ہے اور شہناز کے کپڑے پھٹ چکے ہیں اور وہ بھی شدید زخمی حالت میں دیوار کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اس سے تھوڑے فاصلے پر پستول پڑا تھا جس سے فائر ہوئے تھے۔

لوگوں میں سے کسی نے پولیس کو فون کیا اور تقریباً" بیس منٹ بعد پولیس آگئی اس دوران وہ زخمی آدمی بھی مر گیا۔ پولیس نے دونوں لاشوں پستول اور شہناز کو حراست میں لے لیا اور پولیس اسٹیشن لے گئے جبکہ اس کی دونوں بچیاں گجر صاحب کے گھر چھپ گئی تھیں۔ اس وقت گجر صاحب اپنے فارم پر تھے۔ جیسے ہی انہیں معلوم ہوا وہ تھانے گئے اور ساتھ ہی مجھ سے نمبر لے کر حامد سے بات کی اور انہیں چھٹی لے کر آنے کے لیے کہا۔ کچھ میری سفارش اور کچھ گجر صاحب کی وجہ سے حامد چھٹی لے کر آئے۔ گجر صاحب نے ایک بہت اچھے وکیل کے ذریعے سے شہناز کا کیس تیار کروایا۔

تھانے جا کر حامد اور گجر صاحب شہناز سے ملے اور ساری کہانی معلوم کی۔

"صاحب جی میرا اصل نام مقدس ہے میں ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں میرے والد صاحب کی شیخوپورہ میں کریانے کی دکان ہے میرے دو بھائی ہیں جبکہ میں اکلوتی بہن ہوں میرے بھائی بھی دکانیں

ہی چلاتے ہیں ان کی الگ الگ دو کانیں ہیں۔ میں ان دنوں ایف اے کی اسٹوڈنٹ تھی جب میری احسان سے ملاقات ہوئی جنہیں میں نے قتل کیا ہے ان میں ایک احسان اور دوسرا اس کا دوست منصب علی ہے۔ احسان خوش شکل تھا وہ روزانہ میرے کالج کے باہر اپنی گاڑی لے کر کھڑا ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں اس کی باتوں میں آگئی اور محبت کر بیٹھی میں بچپن سے ہی اپنی خالہ کے بیٹے سے منسوب تھی جو کہ مجھے بالکل پسند نہیں تھا۔ جب احسان نے کہا کہ وہ اپنی خالہ کو میرے گھر رشتہ کرنے کے لیے بھیجنا چاہتا ہے تو مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہ میرے ساتھ کھیل نہیں کھیل رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے والدین بچپن میں ہی فوت ہو چکے ہیں اور اسے اس کی خالہ نے پالا ہے۔ جب اس کی خالہ ہمارے گھر رشتہ لائیں تو حسب توقع ہمارے گھر سے انکار ہو گیا۔ مگر میں نے اس انکار کو قبول نہیں کیا اور احسان کے کہنے پر گھر سے زیور اور نقدی لے کر اس کے ساتھ فرار ہو کر کراچی آگئی۔ چونکہ ابھی میرا شناختی کارڈ نہیں بنا تھا اس بات کو جواز بنا کر احسان نے کہا کہ ابھی کورٹ میں شادی نہیں ہو سکتی

اس نے بغیر شادی کے ہی مجھ سے ازواجی تعلقات قائم کر لیے۔ مجھے عجیب تو محسوس ہوتا تھا مگر میرا یقین تھا کہ میرے اٹھارہ سال کے ہوتے ہی یہ مجھ سے شادی کر لے گا۔ میرے بہت اصرار کرنے پر اس نے اپنے دو دوستوں کی موجودگی میں مجھ سے ___ نکاح پڑھوا لیا جو کہ جعلی تھا جس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ تقریباً" ایک سال ہم کبھی کہیں تو کبھی کہیں رہتے رہے۔

اس کے پاس بہت پیسہ ہوتا تھا ہر مہینے گاڑی بدل لیتا تھا۔ کئی بار تو اس کے پاس تین تین اور کبھی اس سے زیادہ موبائل ہوتے' میرے پوچھنے پر یہ کہتا کہ وہ آج کل موبائل کا بزنس کر رہا ہے۔ شروع میں فلیٹ کو باہر سے لاک لگا کر جاتا مگر بعد میں اس نے ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ ایک دن میں نے خود ہی بازار جانے کا سوچا چونکہ اس کے ساتھ میں بہت بار بازار جا چکی تھی لہٰذا مجھے رستوں کا بخوبی علم تھا۔

شام کا وقت تھا احسان ہمیشہ آدھی رات کو ہی گھر لوٹتا تھا لہٰذا اس کے آجانے کی مجھے فکر نہیں تھی جیسے ہی میں سڑک کے کنارے پہنچی تو ایک رکشا آگیا جس پر میں سوار ہو کر مطلوبہ مارکیٹ چلی گئی۔ چونکہ احسان کافی پیسہ دیتا تھا اور میں خود بھی شاپنگ کی بہت شوقین تھی تو کافی شاپنگ کی اور جب میں شاپنگ کر کے نکلی اسی دوران میں نے دیکھا کہ دو نوجوانوں نے ایک گاڑی کو روک کر اس سے موبائل چھیننے کی کوشش کی مزاحمت پر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اسے گولی مار دی۔ اسے گاڑی سے باہر پھینکا اور اس کی کار لے کر فرار ہونے لگے جیسے ہی اس میں سے ایک لڑکے نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں نے اسکارف کے باوجود اسے پہچان لیا کہ وہ احسان ہے احسان نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا مگر بہت تیزی سے گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ میں شک و یقین کی کیفیت میں فلیٹ لوٹی۔ تقریباً" آدھی رات کو احسان واپس آیا تو میں نے بات کرنے کی ٹھانی میں نے جیسے ہی بات کی احسان مانتا چلا گیا اور مزید اس نے بتایا کہ اس نے اور اس کے دوستوں نے سوچا ہے کہ تم نے بہت دن مفت بیٹھ رکھا یا ہے لہٰذا اب تم بھی اس ڈکیتی میں شامل ہوا کرو گی میں نے بہت شور مچایا روئی چلائی مگر اس نے ایک نہ سنی۔

اس نے میرے سامنے دو راستے رکھے یا میں ڈکیتیوں میں ان کا ساتھ دوں یا پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں کی خواہش پوری کروں مجھے دوسری صورت قبول نہیں تھی میں اس سے مر جانا بہتر خیال کرتی تھی لہٰذا کچھ عرصہ کی ٹریننگ کے بعد میں ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ ان کے گروہ میں شامل ہونے کے بعد علم ہوا کہ وہ نا صرف ڈکیتیاں کرتے ہیں بلکہ میری جیسی خوب صورت لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر کچھ عرصہ داد عیش دیتے اور پھر انہیں بیچ دیتے ہیں۔ میرے بارے میں احسان کا کہنا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہو گئی تھی لہٰذا وہ اپنے دوستوں کے کہنے کے باوجود مجھے چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا تھا۔ میں نے ان کے ساتھ تقریباً"

آٹھ سال مختلف جرائم کیے۔ اسی دوران مجھے علم ہوا کہ اس نے دبئی کے ایک گروہ کے ساتھ معاہدہ کیا ہے کہ وہ کم سن بچیوں کو باہر بھیجے گا اور اس سلسلے میں وہ تقریباً" بائیس بچیوں کو باہر بھیج چکا تھا۔ باہر بلانے کا انتظام دبئی میں رہنے والے لوگ کرتے تھے وہ ایک فیملی کی صورت میں ان بچیوں کو باری باری لے کر باہر جاتے تھے۔ یہ بہت بڑا گروہ تھا اور بہت منظم طریقے سے کام کرتا تھا۔ میں بھی اس گروپ میں شامل ہو کر یہ کام کرنے لگی۔ اسی دوران یہ دونوں بچیاں جو اس وقت میرے پاس ہیں لائی گئیں انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا دل بے قرار ہو گیا میں نے اس بڑی بچی سے اس کے ماں باپ اور شہر کے بارے میں معلوم کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرے سگے بھائی کی بیٹی ہے جب میں نے مزید کچھ باتیں بچی سے معلوم کیں اور وہ تصویریں جو میں آتے ہوئے اپنے ساتھ اپنے گھر سے لائی تھی جس میں میرے والدین کے علاوہ بھائیوں کی بھی تصویریں تھیں دکھائیں تو بچی فوراً" پہچان گئی۔

اس سے پہلے کہ یہ دونوں بچیاں بھی درندگی کا شکار ہو جاتیں میں نے بہت ساری نقدی زیور جو گاہے بگاہے احسان لے کر دیتا رہتا تھا لیا اور موقع پا کر فرار ہو گئی۔ کچھ عرصہ لاہور چھپی رہی۔ مگر میں جانتی تھی کہ وہ پاگل کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں اور کبھی نہ کبھی مجھ تک پہنچ ہی جائیں گے۔ شک پڑنے پر میں لاہور سے نارووال آگئی مگر چونکہ اس گروہ کے لوگ چھوٹے بڑے سارے شہروں میں موجود ہیں لہٰذا انہوں نے میرا پتا دریافت کر لیا اور کل رات مجھے ڈھونڈ کر یہاں پہنچ گئے۔ چونکہ مجھے ہر وقت ان سے خطرہ رہتا تھا لہٰذا میں پستول اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ جیسے ہی احسان کو علم ہوا وہ خود آیا اور مجھے مارنے پیٹنے لگا اس کا کہنا تھا کہ قتل کرنے سے پہلے وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا ہے اس دوران مجھے موقع مل گیا اور میں نے ان دونوں کو مار دیا' میرا ضمیر ہر وقت مجھے ملامت کرتا تھا۔

میں نے دنیا کی آسائش کے لیے گناہ کی زندگی کو اختیار کیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ان بچیوں کو اپنے بھائی کے حوالے کرنے کے بعد خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گی اور احسان اور اس کے گروہ کے بارے میں جتنا مجھے معلوم تھا وہ سب پولیس کو بتا دوں گی مگر اس سے پہلے ہی احسان اور اس کا دوست اپنے انجام کو پہنچ گئے جس کا مجھے کوئی افسوس نہیں' آپ لوگوں کا بہت شکریہ میں اب اس دنیا میں واپس نہیں جانا چاہتی بس آپ سے ایک ہی درخواست ہے کہ ان بچیوں کو ان کے والدین کے حوالے کر دیں۔" شہناز کی نشاندہی پر کچھ لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور کچھ تاحال فرار ہیں۔ دونوں بچیاں اپنے والدین کے پاس پہنچ چکی ہیں۔ شہناز کا کیس عدالت میں ہے چونکہ وہ خود حلفیہ بیان دے چکی ہے کہ اس نے دونوں قتل کیے ہیں لہٰذا امکان یہی ہے کہ اسے عمر قید کی سزا ہو جائے گی۔

ریحانہ امجد بخاری

ناولٹ

چند سانسوں سے زندگی کا وجود
موت کا نام۔۔۔ آخری ہچکی!

زندگی کسی بے پایاں سمندر کی طرح ہے جس کا صرف ایک ہی کنارہ ہے ایک ہی ساحل ہے۔ وہ ساحل جہاں چراغاں ہے۔ بھیڑ بھاڑ ہے روشنی کے میلے ہیں لیکن ساتھ ساتھ تنہائیاں اور اداسیاں بھی ہیں اس کے دوسرے کنارے کی کسی کی خبر نہیں اور جو لوگ دوسرے کنارے کی خبر لینے گئے وہ کبھی نہیں لوٹے۔

زندگی کب سے ہے اور کب تک ہے کون جانے ازل سے ابد تک' ازل سے چلے اور ابد کے بعد بھی زندگی ہے' زندگی سے زندگی نکل رہی ہے۔ زندگی میں زندگی شامل ہو رہی ہے یا پھر زندگی سے زندگی جدا ہو رہی ہے۔ اگر زندگی کو مسلسل سفر کہا جائے تو پھر منزل کیا ہے؟ اگر زندگی بے داری ہے تو پھر غفلت کو کیا کہا جائے؟ اگر زندگی محبت ہے تو نفرت بھی تو زندگی ہے جبکہ نفرت زیادہ زندہ' زیادہ پائیدار ہے حسد' انتقام' غصہ' نفرت' زندگی کو زیادہ فعال اور متحرک رکھ سکتے ہیں محبت اور نفرت زندگی کے ہی نام ہیں۔

زندگی موت کے تعاقب میں ہے اور موت زندگی کے پیچھے آرہی ہے۔ جب تک دونوں میں سے ایک ختم نہیں ہوتا یہ کھیل جاری رہنا ہے۔ لہٰذا ہماری نظر میں زندگی کا آخری مرحلہ موت ہے!

موت کا زندگی سے اور زندگی کا موت سے ایک اٹوٹ تعلق ہے چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن ہم اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے ہم اس کو جھٹلانا چاہتے ہیں۔ بھاگ جانا چاہتے ہیں حالانکہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کوئی اپنے سائے سے کب تک اور کہاں تک بھاگ سکتا ہے۔ اس کے باوجود ہم بھاگتے ہیں اور جس سے ہم بھاگ رہے ہیں وہ ہمارے تعاقب میں ہے ہم جتنا تیز دوڑتے ہیں وہ اپنی رفتار اتنی ہی تیز کر دیتی ہے۔ زندگی جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہی چلی آتی ہے کیونکہ موت دراصل زندگی کی پرچھائیں ہے جو ہمیشہ زندگی کے پیچھے رہتی ہے۔ ہم اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے ہم روز کسی نہ کسی کو مرتا ہوا دیکھتے ہیں روزانہ ہی کوئی نہ کوئی موت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ موت نہ ہو تو شاید زندگی ایک المیہ بن جائے ایک طویل دورانیہ کا بے ربط ڈرامہ کہ ٹی وی چلتا رہے اور لوگ بور ہو کر سو جائیں۔ ہم کشاں کشاں خود کی طرف سفر کرتے رہتے ہیں اور پھر زندگی کے امکانات تلاش کرتے کرتے ہم اس بند گلی تک آجاتے ہیں جہاں سے مڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ آگے رستہ بند ہوتا ہے کیونکہ موت ایک ازلی حقیقت ہے ہم اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتے ہیں خواہ موت ہم سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو یہ واقع ہوتی ہے۔

ہم اس سے کتنا بھی فرار حاصل کریں کتنا ہی دور بھاگیں یہ ہم کو گھیر لیتی ہے۔ ہم اس سے جتنا بھی بھاگ لیں گے وہ بہرحال باقی رہے گی ہر روز کوئی نہ کوئی موت سے ہمکنار ہوتا رہے گا اور موت ہماری زندگی کی بنیادوں کو ہلاتی رہے گی۔ ہمیں بہرحال اس کی

عادت ڈالنی ہی پڑے گی تبھی ہمیں زندگی کا ادراک ہو گا اور تب ہی ہم خدا کے دربار میں حاضری دیں گے۔ موت برحق ہے اور یہ ہی زندگی کا سب سے عظیم سچ ہے۔

فیضی صاحب نے اس عظیم سچ کو جان لیا تھا اور وہ اپنے خالق حقیقی کے دربار میں جا پہنچے تھے۔ انہیں نا صرف زندگی کا ادراک حاصل ہوا تھا بلکہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں آنے والی موت کو شناخت کر لیا تھا۔ دبے پاؤں آنے والی موت کی آہٹ کو محسوس کر لیا تھا جس کا ثبوت اذان کے ہاتھ میں دبا لرزتا ہوا وہ کاغذ تھا جس پر گرنے والے اذان کے آنسو اس پر تحریر لفظوں کی سچائی کی گواہی دے رہے تھے۔

دیکھنا مر جائیں گے بیمار لوگ
کب تلک زندہ رہیں گے یار لوگ
بعد مرنے کے بھلا دیں گے سبھی
یاد رکھیں گے فقط دو چار لوگ
میری میت کو ذرا تم روکنا

۵

پانچویں قسط

کرنے آئے ہیں مرا دیدار لوگ
تیری محفل چھوڑ کر اے ہمنوا
ہوگئے رخصت سبھی بے کار لوگ
اب تری دنیا میں کیا رکھا ہے دوست
ہوگئے ہیں مجھ سے جب بے زار لوگ
جارہا ہوں میں تو دنیا چھوڑ کر
کھینچتے ہیں کیوں بھلا دیوار لوگ
وقتِ آخر قبر میں جاتے ہوئے
چھوڑ جاتے ہیں یہیں گھر بار لوگ
شہر خاموشاں میں آکر دیکھ لو
جارہے ہیں چھوڑ کر غم خوار لوگ

ازان نے اشک بار نظروں سے فدا کی جانب دیکھا رندھی ہوئی آواز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر لرزتے ہاتھوں سے وہ کاغذ تہ کرکے جیب میں رکھ لیا۔ جو فدا نے اسے دیا تھا یہ کہہ کر کہ حالت بیماری میں فیضی صاحب نے کاغذ اور پین طلب کیا تھا اور اس پر یہ غزل تحریر کی تھی جو یقیناً "فیضی صاحب کی آخری تحریر تھی۔

ازان نے چاروں طرف دیکھا اور شدت کرب سے آنکھیں بھینچ لیں کچھ دیر تک تو ازان کچھ بول ہی نہیں سکا اس روح فرسا سناٹے میں عجیب سی بے چینی تھی۔ جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں البتہ دل شدت سے محسوس کررہا تھا۔ اس سے پہلے کہ دل اس سناٹے سے رک جاتا ملک آصف کی آواز نے ازان کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔

"ازان حافظ صاحب کہہ رہے ہیں۔ جنازے کا وقت ہوگیا ہے کسی کا انتظار تو نہیں؟"

ازان نے اس کا جملہ سن کر غائب دماغی سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں سارے ہی چہرے تھے مگر ایک وہ چہرہ جسے فیضی صاحب دیکھنا چاہتے تھے نظر نہیں آرہا تھا۔ وقت رخصت تو اس چہرہ کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے پاس سے گزرتے علی کو روکا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"علی ۔۔۔ فرزان نظر نہیں آرہا۔ کسی نے اسے اطلاع دی۔"

✡ ✡ ✡

ہے فیصلہ اس ذاتِ مقدس کا ازل سے
گزرے گا ہر اک لمحہ مکافاتِ عمل سے

جھومتا لڑکھڑاتا ہوا جوں ہی وہ اپنی گلی میں داخل ہوا دروازے کے سامنے مختلف گاڑیاں، موٹر سائیکل اور بہت سے لوگ آزادانہ اندر آتے جاتے دکھائی دیے۔ اس کے قدموں کی رفتار کچھ تیز ہوگئی۔ ابھی وہ گھر کے دروازے سے خاصے فاصلے پر تھا اس نے اپنی گہری سرخ انگارہ آنکھوں سے ایک نظر ہاتھ میں موجود وہسکی کی بوتل کی طرف دیکھا۔ جو آدھی سے زیادہ اس کے حلق میں اتر چکی تھی۔ اس نے اطمینان سے بوتل کو ایک بار پھر منہ سے لگایا اور دو تین گھونٹ بھرنے کے بعد دوبارہ گھر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جوں ہی وہ دروازے کے قریب پہنچا اندر سے غضنفر ولیکا برآمد ہوا اور اس پر نظر پڑتے ہی دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اس کی جانب لپکا اور اس سے لپٹتے ہوئے اشکبار لہجے میں گویا ہوا۔

"فرزان بھائی اللہ کا حکم ۔۔۔"

فرزان نے گہری سرخ آنکھوں سے اسے گھورا اور پھر دائیں ہاتھ سے اسے دھکا دیتے ہوئے بولا۔

"اللہ کا حکم مجھ تک بعد میں پہنچانا، پہلے یہ بتاؤ تم کوئی پیغمبر ہو یا بذات خود جبرائیل، جو مجھ تک اللہ کا حکم پہنچا رہے ہو۔

تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھ سے ایسی بات کہنے کی۔"

غضنفر ولیکا جو بے چارہ فرزان کا زوردار دھکا کھانے کے بعد لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اس اچانک افتاد پر ہکا بکا کھڑا نظریں جھپکاتے ہوئے فرزان کی طرف دیکھ رہا تھا اور فرزان کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا اس نے آگے بڑھ کر غضنفر کا گریبان پکڑ لیا اور چلاتے ہوئے بولا۔

"جواب دو۔ کون ہو تم مجھ تک اللہ کا حکم پہنچانے والے۔"

اور بے چارہ غضنفر ہکلاتے ہوئے بولا۔

"فف ۔۔۔ فف ۔۔۔ فرزان بھائی، آپ کے بابا اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں ایسے موقع پر یہ ہی کہا جاتا ہے۔"

"کیوں ۔۔۔ اب وہ اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں پہلے کیا ان کی اللہ سے دشمنی چل رہی تھی۔"

فرزان زور سے دھاڑا۔

"دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ میں ایسی بے سروپا باتیں کرنے والے شخص کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ دور ہوجاؤ میری نظروں سے اگر آئندہ نظر آئے تو بہت ماروں گا۔"

اور غضنفر بے چارہ کان لپیٹتے ہوئے گلی کی دوسری جانب روانہ ہوگیا۔

فرزان کی بے محل چیخ وپکار اور شور و غوغا کی وجہ سے اردگرد کھڑے کافی لوگ ان کی جانب متوجہ ہوچکے تھے اور یہ ہی نہیں گھر کے اندر سے علی شاہ، انکل لئیق عبدالقیوم، فدا بھی گھبرا کر باہر نکلے تھے اور اب ملامتی نظروں سے فرزان کی جانب دیکھ رہے تھے۔

فرزان نے ایک نظر بے نیازی سے ان سب کی جانب دیکھا اور بوتل ایک بار پھر منہ سے لگاتے ہوئے گھر کی جانب قدم بڑھا دیے، جوں ہی وہ گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ انکل لئیق، عبدالقیوم فدا اور علی تیزی سے ادھر ادھر ہٹ گئے اور اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی جو آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی اسے سن کر سب حیرت زدہ رہ گئے۔ اس کے لبوں سے بڑے رسان کے ساتھ ایک شعر برآمد ہوا تھا

سانس ٹوٹی تو دور تک دیکھا
زندگی موت کے سفر پر تھی
سوچتا ہوں کہ گھر سے کیوں نکلا
میری دنیا تو میرے گھر پر تھی

فرزان قدم قدم چلتا ہوا اندرونی کمرے کی جانب بڑھا وہ ایک نظر دیکھ کر اندازہ لگا چکا تھا کہ تمام مرد حضرات صحن اور بیٹھک میں موجود تھے۔ جبکہ گھر کے اندرونی حصے یعنی فیضی صاحب کے کمرے سے خواتین کے رونے اور بین کرنے کی آواز بلند ہو رہی تھی اور فرزان کے قدم بے اختیار اسی جانب اٹھتے چلے گئے۔

جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوا ایک عجیب منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

کمرے میں دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ جہاں مہمان خواتین کے ساتھ ساتھ محلے بھر کی خواتین جمع تھیں اور بغیر کسی جان پہچان سے ایک دوسرے کے گلے لگ کر بین کرتے ہوئے یوں رو رہی تھیں۔ جیسے ایک دوسرے کو باری دے رہی ہوں، ایک کی تان ختم ہوتی تو دوسری کی بلند ہوتی اور مزے کی بات یہ تھی کہ باآواز بلند رونے کے باوجود کسی ایک کی آنکھوں میں بھی آنسو نہیں تھے۔ سوائے زارا اور ذکیہ بیگم کی آنکھوں کے، جو فیضی صاحب کے سرہانے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھیں۔ اس نے ایک طائرانہ نظر چاروں طرف دوڑائی اور دھاڑا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب، کسی فلم کا شوٹ چل رہا ہے کیا ڈراما ہے؟ نکل جاؤ یہاں سے سب، دور ہوجاؤ۔ مجھے اپنے باپ سے ملنے دو۔"

عورتیں یوں بدحواس ہوکے باہر نکلیں جیسے کمرے میں سانپ نکل آیا ہو کسی کا دوپٹہ وہیں رہ گیا تو کسی کی جوتی۔ لیکن فرزان ان کی یہ بدحواسی دیکھنے کے لیے وہاں رکا نہیں وہ آہستہ آہستہ فیضی صاحب کی پائنتی کی جانب بڑھا اور پھر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتا چلا گیا بالکل بے جان انداز میں، بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری تھی اور زمین پر دبیز دری بچھے ہونے کی وجہ سے ٹوٹنے سے محفوظ رہی تھی۔ لیکن ڈھکن کھلا ہونے کے باعث اس میں موجود آتشیں سیال جرعہ جرعہ کرکے دری میں جذب ہوگیا اس کا سر آہستہ آہستہ جھکتے ہوئے فیضی صاحب کے قدموں پر جا ٹکا۔ اور پھر اس کے حلق سے بھرائی ہوئی آواز خارج ہوئی۔

"بابا اتنا شدید ناراض ہوگئے۔ گھر سے نکالا تھا تو

سوچا تھا کبھی نہ کبھی واپس بھی بلائیں گے اور خود دنیا سے ہی نکل گئے۔ آپ تو جب چاہتے واپس بلا سکتے تھے میں آپ کو کیسے بلاؤں گا۔ کیسے واپس لاؤں گا...... مجھے اتنا بے بس کر دیا...... کیوں کیا بابا...... میں...... میں کیا کروں......" فرزان کے منہ سے بے ربط جملے نکل رہے تھے۔

ٹھیک اسی لمحے اس کے کندھے پر کسی کا نرم و گداز ہاتھ آٹکا اور پھر مختاراں کی نرم آواز بلند ہوئی۔

"بیٹا دکھ سب کو ہوتا ہے لیکن مرنے والے کے بوجھ میں اضافہ نہیں کرتے۔ انسان کو سجدہ جائز نہیں اور تم فیضی صاحب کے پیروں پر سجدہ ریز ہو۔"

مختاراں کا جملہ ختم ہوتے ہی فرزان تڑپ کر پیچھے کی جانب پلٹا بالکل یوں جیسے اسے کسی سانپ یا بچھو نے ڈس لیا ہو یا اچانک اس کے جسم میں برقی رو سرائیت کر گئی ہو۔ اس کی دہکتی سرخ انگارہ آنکھیں مختاراں کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں جو اس کے اچانک ری ایکشن کی وجہ سے گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی، کمرے میں موجود تقریباً" تمام خواتین جا چکی تھیں۔ صرف چند ایک مہمان خواتین کے علاوہ وہاں کوئی اور موجود نہ تھا۔ فرزان کی آنکھیں اس وقت انتہائی خوفناک نظر آ رہی تھیں پھر اس کے حلق سے چنگھاڑتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

"کون کہتا ہے کہ انسان کو سجدہ جائز نہیں میری ایک بات کا جواب دیں گی آپ کیا آپ اس بات کو مانتی ہیں کہ ہم سب انسان ابن آدم ہیں اگر ایک بندر کا بچہ بندر، ریچھ کا بچہ ریچھ تو میں انسان کا بچہ آدم کیوں نہیں ہو سکتا، ہم آدم کی اولاد ہیں لہٰذا ہم بھی آدم ہیں اور آدم تو وہ ہے جس کو خدا نے خود فرشتوں سے سجدہ کروایا اور جس ایک نے سجدہ نہ کیا وہ ابد تک ملعون قرار دے دیا گیا، جس انسان کو فرشتوں نے سجدہ کیا اس کو مجھ جیسے اور آپ جیسے انسان سجدہ کیوں نہ کریں کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ سجدہ کرنے والوں میں شامل ہیں یا سجدہ نہ کرنے والوں میں۔"

فرزان جس نے شدت جوش میں مختاراں کو شیطان کی صف میں لا کھڑا کیا تھا وہ شاید اس وقت کچھ سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھی۔ وہ سراسیمگی سے بولی۔

"شش...... شاید...... تت...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں تم سے بحث نہیں کر سکتی۔"

اور وہ جلدی سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

فرزان کی نظروں نے کمرے سے باہر نکلنے تک مختاراں کا تعاقب کیا تھا پھر اس کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور پھر اس کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

ٹوٹتے، ٹوٹتے بکھر گیا ہوں
خاک تھا خاک میں اتر گیا ہوں
جسم و جاں میں صدائے ماتم ہے
ایسا لگتا ہے جیسے مر گیا ہوں

اور اس کے ساتھ ہی اس کا سر بے جان سے انداز میں فیضی صاحب کے قدموں پر گر پڑا۔

☼ ☼ ☼

جامن اور فالسے کے درختوں میں چھپے ہوئے اس گھر کی سفید پتھروں سے بنی بلند دیواریں اپنے ازلی سکون و اطمینان کے ساتھ مضبوط چھت کو اپنے سروں پر لیے خاموش کھڑی تھیں۔

بہت بڑا صحن جسے شامیانے لگا کر ڈھانپ دیا گیا تھا۔ نیچے ترتیب سے بچھائی گئی دریاں جن پر بیٹھے لاتعداد افراد اس وقت قاری صاحب کی جانب متوجہ تھے جو تلاوت کلام پاک فرما رہے تھے، گھر کی بیرونی جانب گاڑیوں کی ایک طویل قطار تھی جن میں بلو لائٹ سے مزین سرکاری گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ گھر کے اندر اس وقت ڈی سی او، ڈی پی او مختلف محکموں کے ای ڈی اوز غرض یہ کہ پوری ضلعی انتظامیہ کے ساتھ ساتھ معززین شہر، شعرا برادری اور فیضی صاحب کے معتقدین کی کثیر تعداد جمع تھی جو آج فیضی صاحب کے سوئم میں شرکت کے لیے وہاں جمع ہوئے تھے۔ اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود ماحول گم سم اور چپ چاپ تھا۔

قاری صاحب کے دائیں جانب نظریں جھکائے اور دونوں ہاتھ باندھے اذان بیٹھا تھا۔ جبکہ بائیں جانب انکل لئیق۔ البتہ ان کے اردگرد فرزان موجود نہیں تھا۔ اذان نے نظریں اٹھا کر اس جم غفیر کا جائزہ لیا تو گیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے لوگوں میں موجود فرزان پر اس کی نظریں جا ٹکیں سب لوگ خاموش اور باادب انداز میں بیٹھے تلاوت کلام پاک سن رہے تھے لیکن فرزان منہ پر ہاتھ رکھے عجیب بے ڈھنگے پن سے جمائی لے رہا تھا۔ اذان کی نظریں احساس شرمندگی کی باعث ایک مرتبہ پھر جھک گئیں۔ اسے تدفین کے دن کا وہ سارا منظر یاد آ گیا تھا۔

فرزان کے باعث اسے اس دن بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا رویہ، اس کا انداز کسی کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ دبے دبے لفظوں میں لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا بھی کہ فیضی صاحب نیک انسان تھے نرم مزاج تھے لیکن ان کے بچے بہت مختلف مزاج کے مالک ہیں ظاہر ہے ایک تو موقع ایسا تھا اور دوسرا لوگ فیضی صاحب کا احترام ہی اتنا کرتے تھے کہ کسی کو کچھ کھل کر کہنے کی جرات نہ ہو سکی۔

اذان کو اس کی حرکتوں پر اس دن بھی شرمندگی کے ساتھ ساتھ شدید غصہ آیا تھا۔ لیکن وہ کوئی تماشا کھڑا کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے خاموش رہا۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ جنازہ اٹھاتے وقت چارپائی کے پائے سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے فرزان بے ہوش ہو گیا اور وہ لوگ اسے گھر کی خواتین کے حوالے کر کے فیضی صاحب کو لے کر رخصت ہوئے۔ جس کی وجہ سے مزید کوئی بدمزگی پیدا نہ ہوئی۔

اذان نے ایک مرتبہ پھر نظریں اٹھا کر فرزان کا جائزہ لیا جو بری بری شکلیں بنا کر تمام لوگوں کے چہروں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ قاری صاحب کی آواز اردگرد گونج رہی تھی اور تمام لوگ محویت سے انہیں سن رہے تھے، ٹھیک اسی لمحے دروازے پر غضنفر ولیکا نظر آیا جو دروازے کے باہر ہی جوتے اتار کر اندر داخل ہو رہا تھا۔

فرزان جو وہاں موجود ایک ایک شخص کے چہرے کے تاثرات کا ناگواری سے جائزہ لے رہا تھا اس کی نظر غضنفر پر پڑی تو وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر لوگوں کے کندھوں پر سے پھلانگتا ہوا وہ تیز رفتاری سے غضنفر کی جانب لپکا، غضنفر جو دروازے کے قریب جگہ دیکھ کر اطمینان سے بیٹھ رہا تھا ابھی بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ فرزان اس کے سر پر جا دھمکا۔

کسی نے بھی اس جانب متوجہ ہونے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ سب لوگ پوری محویت سے قاری صاحب کی آواز کی لوچ میں گم تھے۔

فرزان نے یک لخت غضنفر کو کالر سے پکڑ لیا۔ اذان جو یہ پورا منظر دیکھ رہا تھا اس نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ادھر فرزان غضنفر کو گھسیٹتے ہوئے گیٹ سے باہر لے گیا اور اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ اس کے منہ سے بے ربط سے الفاظ نکل رہے تھے۔

"الو کے پٹھے، تم پھر آ گئے۔ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ دوبارہ ادھر نظر نہیں آنا ورنہ بہت ماروں گا۔ تمہاری یہ جرات، مجھے چڑانے کے لیے تم پھر آ گئے۔"

غضنفر بے چارہ دونوں ہاتھوں سے خود کو بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ہکلا رہا تھا۔

"فف...... فف...... فرزان بھائی...... مم...... میری بات تو سنو۔"

مگر فرزان پر تو جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اور وہ ایک ہی جملہ بار بار بول رہا تھا۔

"مجھے چڑاتے ہو۔ پھر آ گئے۔"

غضنفر جو مار کھاتے کھاتے زمین پر گر گیا تھا اچانک کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا اور پھر وہ سر پر پاؤں رکھ کر یوں بھاگا جیسے اس میں جنات حلول کر گئے ہوں۔

اور فرزان بھی کسی جن سے کم تو نہیں تھا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا بھاگتے بھاگتے اس نے پاؤں سے جوتا اتارا اور کھینچ کر دے مارا جو سیدھا غضنفر کی کمر میں جا لگا۔ لیکن جوتے نے شاید مہمیز کا کام دیا کیونکہ غضنفر کی رفتار مزید تیز ہو گئی تھی اور چند ہی منٹ بعد وہ گلی کا

موڑ مڑ کر فرزان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
فرزان نے رک کر گلی میں پڑا اپنا جوتا پہنا۔ چند لمحے کھڑے ہو کر گہری گہری سانسیں لیں جلد ہی اس کی حالت اعتدال پر آگئی اب وہ پر سکون انداز میں چلتا ہوا واپس گھر کی جانب جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

فیضی صاحب کے انتقال کو دس پندرہ روز گزر چکے تھے لیکن اذان ابھی تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ بے سائبان ہونے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں اس کا احساس اسے اب ہوا تھا۔ مگر کاروبار زندگی تو چلانا تھا صبح اٹھ کر وہ حسب معمول شاپ پر چلا آیا تھا۔ اسے ہر چیز بدلی بدلی اور اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اتنے رش میں بھی خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا تھا۔
اذان کاؤنٹر کے پیچھے اداس و ملول بیٹھا تھا دکان کا اکلوتا ملازم سمیر صافی ہاتھ میں اٹھائے ریکس میں سجی الیکٹرانکس مصنوعات پر سے گرد صاف کر رہا تھا۔ جبھی بیرونی دروازے سے شاہد دکان میں داخل ہوا اور سیدھا اذان کے سامنے آکر کاؤنٹر پر کہنی رکھتے ہوئے ایک ہتھیلی پر چہرہ ٹکا کر بغور اذان کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پر سوچ انداز میں بولا۔
”ہیلو اذان کیسے ہو؟“
اذان ہنوز افسردگی سے بولا۔
”ہاں..... اللہ کا شکر ہے..... تم سناؤ۔“
شاہد نے ارد گرد دیکھا اور پھر ایک کرسی گھسیٹ کر دھم سے اس پر براجمان ہو گیا۔
”یار اذان..... دیکھو برا نہیں ماننا..... قانون قدرت ہے کہ جو اس دنیا میں آتا ہے اسے ایک نہ ایک دن واپس بھی جانا ہوتا ہے میں اور تم بھی آخر کار اللہ کے حضور حاضری دیں گے لیکن پیارے بھائی کسی کے جانے سے کاروبار زندگی متاثر نہیں ہوتا' میں جانتا ہوں کہ فیضی صاحب بہت پیارے انسان تھے۔ ہمارے والد تھے اور ہمیں یقیناً ”ان سے بے انتہا محبت بھی تھی۔ لیکن اب وہ اپنے اس اللہ کے دربار میں حاضر ہو گئے ہیں جس کی بارگاہ میں ہم لوگ دن کے پانچ وقت سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس بات کے خواستگار ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے سجدے اور ہماری حاضری قبول فرما لے اپنے آپ کو سنبھالو یار..... بابا نہیں رہے اس حقیقت کو تسلیم کرو لیکن تم ابھی باقی ہو۔ فرزان ہے..... بھابھی ہیں..... آنٹی ہیں اور فیضی صاحب کے بعد سارا بوجھ ساری ذمہ داری تمہارے ہی کندھوں پر آپڑی ہے۔ اگر تم افسردگی کے اس حصار کو توڑ کر باہر نہیں آؤ گے تو ان لوگوں کا حوصلہ بھی ٹوٹ جائے گا تمہیں ان کا حوصلہ بننا ہے ان کا سہارا بننا ہے..... میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا۔“
شاہد نے سلسلہ گفتگو ختم کرتے ہوئے اذان کے چہرے پر نظریں جما دیں اذان نے ایک طویل سانس لی اور گویا ہوا۔
”تم ٹھیک کہتے ہو شاہد میں کوشش کروں گا کہ اپنے آپ کو سنبھال سکوں۔“
شاہد پر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر شاہد اس کی توجہ ہٹانے کے لیے اس نے بات کا رخ بدل دیا اور پھر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ کچھ شوخی لیے ہوئے تھا۔
”اچھا چھوڑو ساری باتیں میں تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں میرے ساتھ پچھلے دنوں عجیب و غریب واقعہ ہوا جانتے ہو کیا ہوا۔“ اس نے پوچھا۔
اذان نے استفہامیہ انداز میں اس کے چہرے پر نظریں جما دیں تو شاہد کے ہونٹوں میں دوبارہ حرکت پیدا ہوئی۔
پچھلے دنوں میں اپنے ماموں کے ہاں ان کے شہر گیا۔ ان کے گھر پہنچا تو وہ لوگ کسی فنکشن میں جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے بہت اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں لیکن یار ظاہر ہے جان نہ پہچان میں تیرا مہمان' مجھے تو پتا ہی نہیں تھا وہ جا کہاں رہے ہیں کس سلسلے میں جا رہے ہیں اور اس پر مستزاد میں ان کے ہاں مہمان جا ٹھہرا تو یہ مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ لوگ

ہو آئیں میں گھر پر ٹھہرتا ہوں سو وہ لوگ چلے گئے۔
اب دوپہر کے وقت مجھے بھوک محسوس ہوئی تو میں نے سوچا کسی ہوٹل سے کھانا کھایا جائے لہٰذا اس اجنبی شہر میں نکل گیا کسی ڈھنگ کے ہوٹل کی تلاش میں' تلاش بسیار کے بعد بالآخر ایک ہوٹل مل گیا۔ وہاں جا کے کھانے کا آرڈر دیا اتنے میں ایک پریشان حال نوجوان آیا اور ملتمس ہوا کہ ایک چھوٹی سی کال کروا دیں اپنے سیل سے 'میرے والد ہاسپٹلائز ہیں' اس کی پریشانی دیکھ کر میرا دل پسیج گیا اور میں نے موبائل نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔
ہوٹل میں بلند آواز میں میوزک بج رہا تھا اور میری بے وقوفی دیکھو کہ میں نے خود ہی اسے دور ہٹ کر بات کرنے کا اشارہ دے دیا۔ اب کھانا کھا کر میں باہر نکلا تو لڑکا تھا نہ موبائل۔“
شاہد نے لمحہ بھر رک کر اذان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا تو اسے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا کیونکہ اذان اس کی بات میں پوری دلچسپی لے رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شاہد نے سکون کا سانس لیا اور سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے بولا۔
”میں نے بہت سر کھپایا ہوٹل میں موجود لوگوں سے اس کا اتا پتا دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود' پھر ایک صاحب سے موبائل لے کر میں نے اپنا نمبر ملایا لیکن موبائل سوئچ آف تھا۔ جیسے تیسے گھر پہنچا مجھے کھانا بہت مہنگا پڑ گیا تھا۔ خیر رات گزاری اور اگلے دن واپس آگیا۔
دو چار دن کے بعد ایسے ہی بیٹھے بٹھائے خیال آیا تو بھائی کے موبائل سے اپنا نمبر ڈائل کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی بیل جا رہی تھی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا جیسے اگلا بندہ کال ریسیو ہی کر لے گا اور پھر وہی ہوا۔“
اذان کے چہرے پر تجسس تھا شاہد نے لہجے کو اور پراسرار بنا لیا تھا۔
”میرے لیے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا کہ کال ریسیو کرنے والی آواز بھی میں شناخت کر چکا تھا میری نظروں کے سامنے مسمی صورت بنائے اس نوجوان کا چہرہ گھوم گیا جس کا نام حافظ عامر تھا اور جس کا باپ شدید بیمار تھا۔
میں نے اس سے اپنا تعارف کروایا اور اس سے کہا۔
”اللہ کے نیک شریف بندے تم نے تو بتایا تھا کہ تم حافظ قرآن ہو تمہارا باپ شدید بیمار ہے اور ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ میں نے نیکی کے جذبے کے تحت تمہیں اپنا موبائل دیا تمہارا احساس کیا اور تمہارے کام آنے کی کوشش کی اور تم نے میرا ہی کام تمام کر دیا بھائی میرے۔ نیکی کی ایسی سزا تو کسی کو نہیں دینی چاہیے تاکہ آئندہ کوئی بھی شخص انسانی ہمدردی کے ناتے کسی کے کام آنے سے بھی توبہ کر لے۔“
”جانتے ہو کیا ہوا۔“ شاہد نے حسب عادت پوچھا۔
”کیا.....“ اذان کے لہجے میں اشتیاق تھا۔
”آگے سے اس کی منحوس ہنسی سنائی دی۔ لیکن آج اس کا لہجہ بڑا پر اعتماد تھا۔ پھر اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مجھے اپنے دام میں پھنسانا شروع کیا اور میں بے وقوف ایک مرتبہ پھر رگڑا کھا گیا۔“ شاہد نے مایوسی سے کہا۔
”کیا مطلب۔“ اذان نے حیرت سے پوچھا۔
”بھئی ہوا یہ کہ اس نے مجھ سے کہا کہ ”میں تمہارا موبائل ابھی کے ابھی تمہیں ٹی سی ایس کروا دیتا ہوں۔ دراصل اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ میرے حواس کام چھوڑ چکے تھے' میرے والد کی طبیعت ہی اتنی زیادہ خراب تھی کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں نے تم سے موبائل لیا ہے میں جیسے اڑتا ہوا ہسپتال جا پہنچا تھا میرا مقصد قطعی تمہارا نقصان کرنے یا تمہیں دھوکا دینے کا نہیں تھا بہرحال چھوڑو اس بات کو موبائل میں تمہیں ابھی بھیج رہا ہوں پلیز اپنا ایڈریس لکھوا دو۔“
میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میں نے جلدی سے اسے اپنا ایڈریس نوٹ کروایا اور دل ہی دل میں اس انسان کو دعائیں دینے لگا جسے اس وقت تک گالیاں دے رہا تھا اللہ نے اس کے دل میں نیکی ڈالی تھی اور وہ میرا

موبائل واپس دینے کو تیار ہو گیا تھا۔
"لیکن اس ڈھیٹ نے ایڈریس لکھنے کے فوراً" بعد ہی پینترا بدلا اور بولا۔
"شاہد صاحب ہاتھ سے گئی ہوئی چیز اتنی آسانی سے واپس نہیں ملا کرتی یہ تو میں ہوں جو تمہارا موبائل واپس لوٹا رہا ہوں بس میری ایک چھوٹی سی شرط ہے میں نے جلدی سے پوچھا۔ "بتاؤ کیا شرط ہے۔" تو وہ خباثت سے بولا۔
"تمہارے موبائل کے اندر ایک لڑکی کی آواز ریکارڈ ہے، جو یونیورسٹی سنا رہی ہے۔"
"ہاں ہے تو۔" میں نے جلدی سے کہا تو وہ بولا۔
"ہاں بس اس لڑکی کا سیل نمبر نوٹ کروا دو بس ادھر تم نے سیل نمبر بتایا اور ادھر میں نکلا موبائل ٹی سی ایس کروانے۔"
میں ایک لمحے کے لیے سٹپٹا کر رہ گیا لیکن پھر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں نے نمبر نوٹ کروا ہی دیا کیونکہ ویسے بھی یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ وہ نمبر تو ہماری ٹیم کے ہر لڑکے کے پاس موجود تھا اور جہاں تک میری معلومات ہیں اس کی بات بھی سب ہی سے ہوتی تھی لہٰذا مجھے کوئی حرج نظر نہیں آیا۔"
"کون لڑکی۔" اذان نے بے ساختہ پوچھا۔
"بھئی ماہم کی بات کر رہا ہوں۔" اور اذان کے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا وہ یک ٹک شاہد کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا لیکن شاہد اس کی حقیقت سے بے پروا بولتا چلا گیا۔
"جانتے ہو کیا ہوا۔" اس کے بعد شاہد نے حسب عادت و حسب معمول کہا۔
"نہیں...." اس بار اذان نے غصے سے کہا اس کا تجسس سے برا حال تھا اور وہ تھا کہ کہانی کو طول دیے جا رہا تھا۔
"ظاہر ہے پتا بھی کیسے ہو۔ خیر میں بتاتا ہوں۔
اس کے بعد میں نے آٹھ دن تک اپنا نمبر ٹرائی کیا لیکن نہ تو میرا سیل مجھے موصول ہوا اور نہ ہی دوبارہ میرا نمبر آن ہوا۔ وہ ایک بار پھر مجھے چونا لگا گیا تھا۔" شاہد نے جل کر کہا۔

اذان جو ایک بار پھر اپنے اعصاب پر قابو پا چکا تھا اس کی ہنسی چھوٹ گئی کیونکہ شاہد نے رونی صورت بنا کر جس طرح چونا لگنے والی بات کی تھی اس پر ہنسی آنا ایک لازمی بات تھی۔
"ہوں.... اچھا.... تمہاری کہانی ختم ہو گئی؟"
"نہیں.... اسی پر بس نہیں تھوڑی سی اور ہے۔"
"وہ کیا۔" اذان نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
چند دنوں کے بعد میری دوبارہ ماہم سے بات ہوئی تو میں نے اسے پورا واقعہ کہہ سنایا تو پتا ہے اس نے کیا کہا۔" شاہد اب اس کے ضبط کا صحیح کا امتحان لے رہا تھا۔
"کیا کہا۔" اذان نے رٹا رٹایا جملہ کہا۔
"اس نے کہا کہ "ہاں میری اس سے بات ہو گئی ہے وہ بہت اچھا انسان ہے" میرا تو میٹر گھوم گیا۔ میں نے اس سے کہا' بی بی وہ جھوٹ بول کر فراڈ کر کے میرا موبائل لے گیا دھوکے سے اس نے تمہارا نمبر حاصل کیا اور تم کہہ رہی ہو وہ اچھا انسان ہے۔"
تو محترمہ بولیں "دھوکا اس نے تمہارے ساتھ کیا ہو گا میرے ساتھ نہیں۔ مجھے یہ سب کچھ وہ پہلے ہی بتا چکا ہے۔"
"مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے کال کاٹ دی اس کے بعد سے آج تک میں نے دوبارہ اسے کال نہیں کی۔"
اذان جو پرسوچ انداز میں اب تک شاہد کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا شاہد کی بات ختم ہونے پر بھی اس کی محویت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔
"او بھائی.... کہاں گم ہو گئے۔" شاہد نے اٹھ کر کندھے سے پکڑ کر اسے ہلاتے ہوئے کہا۔ اذان نے اس بار اسے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بدمزہ ہو گیا اور بولا۔
"میں تو چلا.... تم بھی ذرا روزی روٹی کرو پھر ملیں گے اللہ حافظ...."
شاہد اٹھ کر چلتا ہوا دکان سے باہر نکل گیا اذان کی نظریں پرخیال انداز میں خلا میں موجود کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔
(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔)

شعاع عمیر

اللہ اور بندے کا ساتھ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
"میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوتا ہوں پس اگر وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے دل میں یاد کرتا ہوں اگر وہ مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی مجمع میں یعنی فرشتوں میں اس کا ذکر کرتا ہوں اگر وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔"

ثمرانہ تنویر سوہاوہ

سچی بات سے پرہیز

افلاطون سچائی کی فضیلت بیان کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "سچائی اور سچ کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ایک ایسی سچی بات بھی ہے، جس سے انسان کو بچنا چاہیے!"
"سچی بات سے پرہیز.... کیا معنی؟" شاگرد نے سوال کیا۔
افلاطون نے کہا۔ "ہاں وہ سچی بات ہی ہے لیکن لائق پرہیز ہے اور وہ یہ کہ اپنی تعریف اور ستائش گو تم میں وہ ساری خوبیاں اور اوصاف موجود ہی کیوں نہ ہوں جن کا تم اظہار کر رہے ہو۔"

قمر ناز دہلوی.... کراچی

رعایا کا خیال

ملک شاہ کے عہد میں سلجوقیوں کی طاقت بام عروج پر تھی۔ ایک دن ملک شاہ طوس کی جامع مسجد میں نماز پڑھنے گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلا تو اس نے اپنے وزیر نظام الملک طوسی سے پوچھا۔ "آپ نے نماز کے بعد کیا دعا مانگی؟"
وزیر نے کہا۔ "میں نے دعا کی کہ آپ اپنے بھائی کے مقابلے میں فتح یاب ہوں۔"
ملک شاہ نے کہا۔ "لیکن میں نے یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! میں اور میرے بھائی دونوں میں سے جو بھی رعایا کا اچھی طرح خیال رکھے اور بہتر طریقے سے حکومت کر سکے' اسے فتح نصیب کر۔"

مدیحہ امانت.... سکرنڈ

آزادی کا جوہر

عدالت کے کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مقدمہ سننے والے چند سیاسی قیدی عدالت میں موجود تھے۔ سیاسی لیڈر یعنی سیاسی قیدی بلاوجہ پکڑے گئے تھے۔ حالانکہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب لوگ آرام سے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک شور بلند ہوا اور انگریز جج کمرہ عدالت میں داخل ہوا۔ سب کے سب لوگ کھڑے ہو گئے مگر ایک بارعب پروقار شخص اپنی کرسی پر بیٹھا رہا' وہ انگریز جج کی تعظیم میں کھڑا نہیں ہوا۔
یہ دیکھ کر انگریز جج سر سے پاؤں تک غصے سے کانپ گیا اور کڑک کر بولا۔
"اس سیاسی قیدی سے کرسی چھین لی جائے۔" اس سے پہلے کہ کوئی سیاسی قیدی سے کرسی چھینتا' وہ خود اٹھا' اس نے کرسی اٹھا کر دور پھینک دی اور زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور انگریز جج سے بولا۔

"کرسی چھیننے والے ظالم! کیا اللہ کی زمین بھی چھین لوگے؟"

یہ سن کر انگریز جج سناٹے میں آگیا۔ یہ عظیم شخص مولانا محمد علی جوہر تھے۔

حمیرہ..... کراچی

سخاوت

چار دوست بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ میز پر رکھے موبائل میں سے ایک بجا۔

ایک دوست نے موبائل اٹھایا اور کہا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے بیوی نے کہا۔ "جان! میں بازار میں ہوں۔ کیا میں ایک لاکھ روپے کا جیولری سیٹ خرید لوں۔"

"ہاں لے لو جان۔"

بیوی "سلک ساڑھی بھی، جو بیس ہزار روپے کی ہے؟"

"ایک ساڑھی نہیں، دو چار لے لو۔"

بیوی "او کے ڈیئر! تمہارا کریڈٹ کارڈ میرے پاس ہے، اسی سے لے رہی ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے!"

تینوں دوست بولے۔ "ارے! تو پاگل ہے یا تجھے چڑھ گئی ہے یا تو ہمیں نیچا دکھا رہا ہے کہ تو بیوی کو کتنا چاہتا ہے؟"

دوست نے کہا "وہ سب چھوڑو، یہ بتاؤ کہ یہ موبائل کس کا ہے؟"

صائمہ..... لاہور

اوور ٹیک

مجسٹریٹ صاحب نے ملزم سے پوچھا۔

"اچھا..... تو تمہیں تیز رفتاری کے جرم میں میرے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے تم میرے سامنے کتنی مرتبہ پیش ہو چکے ہو؟"

"ایک مرتبہ بھی نہیں جناب!" ملزم نے کہا۔

"البتہ سڑکوں پر کئی مرتبہ میں نے آپ کو اوور ٹیک کرنے کی کوشش کی ہے مگر میری گاڑی 80 میل فی گھنٹے کی رفتار سے زیادہ چلتی ہی نہیں ہے۔"

تبسم..... کراچی

وہ بھی حکمران تھے

مصر و شام کا حکمران نور الدین زنگی اتنا بڑا انسان تھا کہ صلاح الدین ایوبی میں اس کے کردار کا ایک پرتو پایا جاتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی نے اپنے کردار اور شخصیت کی تعمیر نور الدین زنگی ہی کی صحبت اور سرپرستی میں کی اور اسی کے نقش قدم پر چلنے کو اپنے لیے وجہ افتخار جانا۔ نور الدین زنگی شاہی خزانے سے اپنے لیے ایک پیسہ بھی نہ لیتا تھا۔ اس کی گزر اوقات مال غنیمت یا اپنے کسی کام کی اجرت پر ہوتی تھی۔ گھر میں تنگی ترشی رہتی۔ جس کی وجہ سے بیوی اس سے تنگ آچکی تھی۔ ایک دن اس نے شوہر سے کہا۔

"مصر اور شام کا علاقہ تمہارے زیر نگیں ہے اور تمہارے گھر کا یہ عالم ہے کہ اس میں آسودگی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔"

نور الدین نے تحمل سے جواب دیا۔ "بیگم! خزانہ عوام کا ہے اور مجھے اس کی چوکیداری پر متعین کیا گیا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری خوشی اور گھر کی آسودگی کے لیے خیانت اور بد دیانتی کر کے اپنے لیے جہنم میں ٹھکانہ بنا لوں؟"

بیوی نے شرمندہ ہو کر منہ پھیر لیا اور دیر تک ندامت سے آنسو بہاتی رہی۔

ارسلہ..... بورے والہ

موم کا

میں اداسیاں نہ سجا سکوں کبھی جسم و جاں کے مزار پر
نہ دیے جلیں میری آنکھ میں مجھے اتنی سخت سزا نہ دے
میرے ساتھ چلنے کے شوق میں بڑی دھوپ سر پہ اٹھائے گا
تیرا ناک نقشہ ہے موم کا کہیں غم کی آگ گھلا نہ دے

نکتہ ریزیاں

○ مرد عموماً" بزدل عورتوں کو پسند کرتے ہیں تاکہ ان کی حفاظت کر کے ان کے آقا بن جائیں۔

○ سوچنا نہایت مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ (ہنری فورڈ)

○ امیروں کا یہ سوچنا کہ غریب خوش اور بے غم ہوتے ہیں اتنا ہی احمقانہ ہے۔ جتنا غریبوں کا یہ خیال کہ امیر خوش و خرم ہوتے ہیں۔ (ہاسٹن پوسٹ)

○ کوئی نہ کوئی عیب ہر ایک میں ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ عقل مند اپنے عیب خود محسوس کر لیتا ہے۔ خواہ دنیا محسوس نہ کرے۔ بے وقوف اپنے عیب خود محسوس نہیں کرتا دنیا محسوس کر لیتی ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

ڈسپلن

میرے والد نے مجھے سکھایا کہ سیلف ڈسپلن کے ذریعے ہی تم آزادی حاصل کر سکتے ہو گلاس میں پانی ڈالو ۔ پھر تم اسے پی سکتے ہو۔ گلاس کے بغیر پانی چھلکے گا۔ گلاس ڈسپلن ہے۔ (اوکاڑو ما ئٹل بان)

فوزیہ ثمر بٹ، گجرات

گیان

○ سناٹا جب روح میں اتر جائے تو رونقیں متاثر نہیں کرتیں۔

○ ضمیر کو زندہ رکھ خواہ کتنی بار موت کی صورت سے گزرنا پڑے۔

○ خواہشات کے تلاطم پہ نہ جا کہ دریا آخر اتر جاتے ہیں۔

○ معاف کرنا سب سے زیادہ اسے زیب دیتا ہے جو سزا دینے پر قادر ہو۔

○ سب معاملے تقدیر کے آگے سرنگوں ہیں، یہاں تک کہ کبھی تدبیر کے نتیجے میں موت ہو جاتی ہے۔

○ یہ کائنات ایک حادثہ نہیں ہے حادثے میں اس قدر حسن نہیں ہو سکتا، کیونکہ حسن، حسن ترتیب کا نام ہے اور حادثہ کسی چیز کے بکھر جانے کا نام ہے۔

○ مطالعے کی عادت ڈالنا ایک طرح سے تقریباً" تمام دنیاوی غم و فکر سے نجات کے لیے اپنے لیے ایک اہم پناہ گاہ تعمیر کرنا ہے۔

○ حسن سیرت برائیوں سے پرہیز کرنے کا نام نہیں، بلکہ ذہن میں برائیوں کے ارتکاب کی خواہش نہ پیدا ہونے کا نام ہے۔

○ اگر کیفیت اور یکسوئی نہ بھی میسر ہو تو بھی نماز ادا کرنی چاہیے، نماز فرض ہے، کیفیت فرض نہیں۔

○ انسان جس کیفیت میں اور عقیدے میں جان دے گا اسی میں اٹھایا جائے گا، دعا کریں وقت رخصت کلمہ نصیب ہو۔

نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

☼ ☼ ☼

زندگی

جہاں آس کا کوئی دیا نہیں مجھے اس نگر پہنچا دیا
نہ میں بڑھ سکوں نہ ہی رک سکوں
نہ ہی دل کی بات سمجھ سکوں
نہ کسی کو بھی کچھ کہہ سکوں
تجھے کیا کہوں تو نے کیا کیا
مجھے منزلوں کی خبر تو دی پر راستوں میں الجھا دیا
اے زندگی تجھے کیا پتا!
یہاں کس کو کس نے گنوا دیا!!!

بے بسی

ایک مرتبہ امام شافعی ایک خلیفہ کے پہلو میں تشریف فرما تھے کہ ایک مکھی خلیفہ کو پریشان کر رہی تھی اس پر خلیفہ نے تنگ آکر کہا۔

"نہ جانے اس مکھی کے پیدا کرنے میں خدائے بزرگ و برتر کی کیا حکمت تھی۔" امام شافعی نے جواب دیا۔

"اس میں حکمت یہ ہے کہ طاقتوروں کو ان کی طاقت کی بے بسی دکھائے۔"

سلمیٰ رانی ..... قادر پور ملتان

دنیا ورنہ جانے امڑی

دل سے دور دراز
دل سے دور دراز بسے ہے' دنیا دور دراز
اشک لہو میں گھل مل جائیں' سینہ سہک سہک
سہلائیں
آنسو بے آواز
دور دور تک روح میں گونجیں خاموشی کے ساز
نہ جانے کس نقطے پر جاکے کھلے غموں کا راز
ابھی تو ہے آغاز نی امڑی' ابھی تو ہے آغاز
دنیا ورنہ جانے امڑی' دل سے دور دراز

امبر گل..... جھڈو

بوڑھا سال

یاد ہے میں کیا تھا' پر اب جانے کیا ہوگیا
آئینے میں شکل دیکھے اک زمانہ ہوگیا
ختم ہوئی ڈائری کرتے ہوئے پتے ریاض
آگیا ماہ دسمبر' سال بوڑھا ہوگیا

عنبر وسیم..... گوجرانوالہ

رفتار قلب

قابوس والئی گورگان کا بھتیجا ایک پراسرار مرض میں مبتلا ہوگیا تھا۔ کسی طبیب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شیخ الرئیس بو علی سینا سے اس کو دیکھنے کی درخواست کی گئی۔ بو علی سینا نے بیمار کے معائنے کے بعد ایک ایسے شخص کو بلایا' جو شہر سے واقف تھا۔ اس سے کہا کہ اس شہر کے محلوں کے نام لینا شروع کرے۔

اسی دوران بو علی سینا مریض کی نبض شمار کرتا رہا۔ ایک محلے کے نام پر پہنچ کر بو علی سینا نے کہا کہ "اب اس محلے کی گلیوں اور کوچوں کے نام لو۔" پھر ایک خاص گلی کے نام کے بعد کہا کہ "اب اس کوچہ کے رہنے والوں کے نام بتاؤ۔" ایک خاص اہل خانہ کا جب نام آیا تو کہا کہ "اس گھر کے رہنے والوں کے نام بتائے جائیں۔" اس دوران بو علی سینا نبض بھی شمار کرتا رہا اور مریض کے چہرے کے تغیرات پر بھی نظر رکھتا رہا۔

جب ایک خاص نام آیا' جو ایک خاتون کا تھا تو بو علی سینا نے محسوس کیا کہ مریض کے دل کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے۔ یہ مریض اس کے عشق میں گرفتار تھا۔ اس کیفیت کا اظہار عندلیب شادانی کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی کہ نہیں

(ڈاکٹر سید اسلم کی کتاب "قلب" سے اقتباس۔)

شارقہ..... ٹنڈوالہ یار

حقیقت

☆ پاؤں گیلا کیے بغیر سمندر تو پار کیا جاسکتا ہے مگر آنسو بہائے بغیر زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔

☆ زبان کو شکوہ سے روکو خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔

☆ ہم خیال لوگ ہم سفر ہو جائیں تو زندگی آسان ہوجاتی ہے۔

☆ محبت اور نفرت دونوں اگر حد سے بڑھ جائیں تو جنون کی حد میں داخل ہوجاتی ہیں۔

☆ مجبوریوں کے بندھن اور ساتھ بہت عارضی اور ناپائیدار ہوتے ہیں کیونکہ ایک نہ ایک دن یہ عارضی بندھن ٹوٹنا ہی ہوتا ہے تو بہتر نہیں کہ آپ خود ہی اس کو آزاد کردیں تاکہ آپ کی عزت نفس برقرار رہے۔

☆ عجلت' دانش و حکمت کی دشمن ہے۔

ارم کاش..... ملتان

محرومی

دنیا تو کیا خود سے بھی کرتے رہے گریز
جب تک ملے کسی سے' کسی سے نہیں ملے
جو بے طلب تھا اس کی ہمیں جستجو رہی
جو ملنا چاہتا تھا اسی سے نہیں ملے

فوزیہ ثمرث..... گجرات

بشریٰ محمود

صائمہ' کی ڈائری میں تحریر
قتیل شفائی کی غزل

یارو کہاں تک اور محبت نبھاؤں میں
دو مجھ کو بد دعا کہ اسے بھول جاؤں میں

دل تو جلا گیا ہے وہ شعلہ سا آدمی
اب کس کو چھو کے ہاتھ بھی اپنا جلاؤں میں

سنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
اے زندگی! خوشی سے کہیں مر نہ جاؤں میں

اک شب بھی وصل کی نہ مرا ساتھ دے سکی
عہد فراق آکہ تجھے آزماؤں میں

بدنام میرے قتل سے تنہا تو ہی نہ ہو
لا اپنی مہر بھی سر محضر لگاؤں میں

اترا ہے بام سے کوئی الہام کی طرح
جی چاہتا ہے ساری زمیں کو سجاؤں میں

اس جیسا نام رکھ کے اگر آئے موت بھی
ہنس کر اسے قتیل گلے سے لگاؤں میں

انیقہ انا' کی ڈائری میں تحریر
احمد فراز کی نظم

وہ تیری طرح کوئی تھی،

یونہی دوش پہ سنبھالے
گھنی زلفوں کے دوشالے
وہی سانولی سی رنگت
وہی نین نیند والے

وہی من پسند قامت
وہی خوش نما سراپا
جو بدن میں نیم خوابی
تو لہو میں رتجگا سا

کبھی پیاس کا سمندر
کبھی آس کا جزیرہ
وہی مہربان لہجہ
وہی میزبان وطیرہ

تجھے شاعری سے رغبت
اسے شعر یاد میرے
وہی اس کے بھی قرینے
جو ہیں خاص وصف تیرے

کسی اور ہی سفر میں
سر راہ مل گئی تھی
تجھے اور کیا بتاؤں
وہ تیری طرح کوئی تھی

کسی شہر بے اماں میں
میں وطن بدر اکیلا
کبھی موت کا سفر تھا
کبھی زندگی سے کھیلا

میرا جسم جل رہا تھا
وہ گھٹا کا سائباں تھی

میں رفاقتوں کا مارا
وہ میری مزاجِ داں تھی

مجھے دل سے اس نے پوجا
اسے جاں سے میں نے چاہا
اسی ہمرہی میں آخر
کہیں آگیا دوراہا

یہاں گمرہی کے امکاں
اسے رنگ و بو کا لپکا
یہاں لغزشوں کے ساماں
اسے خواہشوں نے تھپکا

یہاں دام تھے ہزاروں
یہاں ہر طرف قفس تھے
کہیں زر زمیں کا دلدل
کہیں جال تھے ہوس کے

وہ فضا کی فاختہ تھی
وہ ہوا کی راج پتری
کسی گھاٹ کو نہ دیکھا
کسی جھیل پر نہ اتری

پھر ایک شام ایسی آئی
کہ وہ شام آخری تھی
کوئی زلزلہ سا آیا
کوئی برق سی گری تھی

کہیں آندھیاں چلیں پھر
کہ بکھر گئے دل و جاں
نہ کہیں گلِ وفا تھا
نہ چراغِ عہد و پیماں

وہ جہاز اتر گیا تھا
یہ جہاز اتر رہا ہے
تیری آنکھوں میں ہیں آنسو
میرا دل پگھل رہا ہے

تو جہاں مجھے ملی ہے
وہ یہیں جدا ہوئی تھی
تجھے اور کیا بتاؤں
وہ تیری طرح کوئی تھی

طاہرہ بھٹی، کی ڈائری میں تحریر

عبیداللہ علیم کی غزل

ایسی تیز ہوا اور ایسی رات نہیں دیکھی
لیکن ہم نے مولا جیسی ذات نہیں دیکھی

اُس کی شان عجیب کا منظر دیکھنے والا ہے
اک ایسا خورشید کہ جس نے رات نہیں دیکھی

اُس کی آل وہی جو اُس کے نقشِ قدم پر جائے
صرف ذات کی ہم نے آلِ سادات نہیں دیکھی

شاہوں کی تاریخ بھی ہم نے دیکھی ہے لیکن
اُس کے در کے گداؤں والی بات نہیں دیکھی

صدیوں کی اس دُھوپ چھاؤں میں کوئی ہمیں بتلائے
پوری ہوتی کون سی اُس کی بات نہیں دیکھی

رمل خان، کی ڈائری میں تحریر

امجد اسلام امجد کی نظم

میرا تمام فن، میری کاوش، میرا ریاض
ایک ناتمام گیت کے مصرعے ہیں جن کے بیچ
معنی کا ربط ہے نہ کسی قافیے کا میل
انجام جس کا طے نہ ہوا ہو اک ایسا کھیل
میری متاعِ بس، یہی جادو ہے عشق کا
سیکھا ہے جس کو میں نے بڑی مشکلوں کے ساتھ
لیکن یہ سحرِ عشق کا تحفہ عجیب ہے
کھلتا نہیں ہے کہ حقیقت میں کیا ہے یہ
تقدیر کی عطا ہے یا کوئی سزا ہے یہ
کس سے کہیں اے جاناں، یہ قصہ عجیب ہے
کہنے کو تو عشق کا جادو ہے میرے پاس
یہ میرے دل کے واسطے اتنا ہے اس کا بوجھ
سینے سے اک پہاڑ سا ہٹتا نہیں ہے یہ
لیکن اثر کے باب میں ہلکا ہے اس قدر
تجھ پر اگر چلاؤں تو چلتا نہیں ہے یہ

آصفہ عنبرین، کی ڈائری میں تحریر

تابش کمال کی غزل

کبھی اس نگر تجھے ڈھونڈنا، کبھی اُس نگر تجھے ڈھونڈنا
کبھی رات بھر تجھے سوچنا، کبھی رات بھر تجھے ڈھونڈنا

مجھے جا بجا تیری جستجو تجھے ڈھونڈتا ہوں میں کو بکو
کہاں کھل سکا تیرے روبرو میرا اس قدر تجھے ڈھونڈنا

میرا خواب تھا کہ خیال تھا وہ عروج تھا کہ زوال تھا
کبھی فرش پہ تجھے دیکھنا کبھی عرش پر تجھے ڈھونڈنا

یہاں ہر کسی سے ہی بیر ہے تیرا شہر قریۂ غیر ہے
یہاں سہل بھی تو نہیں کوئی، میرے بے خبر تجھے ڈھونڈنا

تیری یاد آئی تو رو دیا جو تو مل گیا تجھے کھو دیا
میرے سلسلے بھی عجیب ہیں تجھے چھوڑ کر تجھے ڈھونڈنا

عنبر وسیم، کی ڈائری میں تحریر

نوشی گیلانی کی غزل

گریز شب سے سحر سے کلام رکھتے تھے
کبھی وہ دن تھے کہ زلفوں میں شام رکھتے تھے

تمہارے ہاتھ لگے ہیں تو جو کرو سو کرو
وگرنہ تم سے تو ہم سو غلام رکھتے تھے

ہمیں بھی گھیر لیا گھر کے زعم نے تو کھلا
کچھ اور لوگ بھی اس میں قیام رکھتے تھے

یہ اور بات ہمیں دوستی نہ راس آئی
ہوا تھی ساتھ تو خوشبو مقام رکھتے تھے

نجانے کون سی رُت میں بچھڑ گئے وہ لوگ
جو اپنے دل میں بہت احترام رکھتے تھے

نوشابہ منظور، کی ڈائری میں تحریر

نقاش کاظمی کی نظم

دھوپ کی لکیر

بجھا سکے گی نہ ذہنوں کے سرخ انگارے
دبی ہوئی ہے جو سینوں پہ سخت برف کی سل
جو تم نہیں ہو تو کیا ہے جو تم ہوتے بھی تو کیا
وہی خیالوں کے رشتے، وہی خلاؤں کی بات
وہی نگاہوں کی دُوری، وہی قرابت داری
وہی حیات کی نبض، وہی شعور کی رو
وہی چراغِ تمنا، وہی دُھوپ کی لکیر
بجھی بجھی سی مگر گرم گرم آنکھوں میں
خلش کی دھوپ لیے رات کی فصیلوں میں
تھکی تھکی جو کبھی نیند اترنے لگتی ہے
نہ جانے کیوں مجھے پھر ہچکیاں سی آتی ہیں
روایتاً میں یہی سوچتا ہوں اس کا سبب
یہی نہ ہو کہ کوئی یاد کر رہا ہو مگر
یقین ہی نہیں آتا کہ اس گھڑی ہر شب
مرے لیے بھی کہیں
کہ میری طرح کوئی خواب دیکھتا ہوگا۔

فرح دیبا راؤ کی ڈائری میں تحریر

فرحت عباس شاہ کی نظم

وقت کی تند و تیز ہوا کی
زد میں آکر
بیت چکے رستوں پر
لوٹ کے آنے والے
تو کیا جانے
رستوں کے موسم ہوتے ہیں
یہ بھی اپنی اپنی رُت میں
اپنی اپنی سمت بدلتے رہتے ہیں

فوزیہ ثمر ______ گجرات

سیرتیں بے قیاس ہوتی ہیں
صورتیں غم شناس ہوتی ہیں
جن کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ہو
ان کی آنکھیں اداس ہوتی ہیں

ندا، فضہ ______ کراچی

جو میرا نصیب تھا مل گیا، جو چھنا ہے مجھ سے میرا نہ تھا
تیرا دل یہ رمز سمجھ گیا تو کوئی کمی نہ رلائے گی

اریبہ ساجد ______ ٹھوٹھیالا جگنان

آج کچھ وقت کے لیے میرے پاس کاش تم آجاتے
بہت تنہا ہوں میں کاش تم آجاتے
کبھی خود کو اتنا کمزور نہ ہونے دیا میں نے
آج بک گیا ہوں سر بازار کاش تم آجاتے

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

ٹھوکریں مار کر محفل سے اٹھاتے ہیں مجھے
اور اک پاؤں سے دامن بھی دبا رکھا ہے

مسرت طارق ______ آزاد کشمیر

عجیب ہوتے ہیں آداب رخصت محفل
کہ اٹھ کے وہ بھی چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی

اقصیٰ، عذرا ______ کراچی

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

گل رعنا ______ کراچی

کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بن بلائے ہوئے

صائمہ حبیبی ______ کے ڈی اے

اترے جو زندگی تری گہرائیوں میں ہم
محفل میں رہ کے بھی رہے تنہائیوں میں ہم
دیوانگی نہیں تو اسے اور کیا کہیں
انسان ڈھونڈتے رہے پرچھائیوں میں ہم

عرشیہ عنبرین بھٹہ ______ کبیر والا

نہ کوئی خواب، نہ کوئی آنسو نہ خیال
کیا عجیب قحط پڑا ہے مجھ میں
منکشف آج تلک ہو نہ سکا
میں خلا ہوں کہ خلا ہے مجھ میں

سکینہ عمر ______ خانقاہ شریف

تمام عمر صحیفہ سمجھ کر جس کو پڑھا
وہی سبق تو خلاف نصاب ٹھہرا ہے
وہ درد جس کو کیا مدتوں نظر انداز
کتاب دل کا وہی خاص باب ٹھہرا ہے

ایم۔آر۔ کے ______ مظفر گڑھ

سجدے کے نشانوں سے جبیں زخم ہوئی ہے
اور تجھ سے مقدر میرا بدلا نہیں جاتا

رخسانہ اقبال ______ اسلام آباد

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں

رضیہ طاہر ______ گوجرانوالہ

تتلی کے تعاقب میں کوئی پھول سا بچہ
ایسا ہی کوئی خواب ہمارا بھی کبھی تھا

کرن، بینش ______ فیصل آباد

آسمانوں پر نظر کر انجم و ماہتاب دیکھ
صبح کی بنیاد رکھنی ہے تو پہلے خواب دیکھ

مدیحہ، فضہ ______ گوجرہ

خواب میں تجھ سے ملاقات رہا کرتی تھی
خواب شرمندۂ تعبیر ہوا کرتے تھے

عظمیٰ غلام نبی ______ کراچی

روٹھا تو شہر خواب کو غارت بھی کر گیا
پھر مسکرا کے تازہ شرارت بھی کر گیا
محسن یہ دل کہ جس سے بچھڑتا نہ تھا کبھی
آج اس کو بھولنے کی جسارت بھی کر گیا

صدف عمران ______ کراچی

جانے والے ہماری محفل سے
چاند تاروں کو ساتھ لیتا جا
ہم خزاں سے نباہ کرلیں گے
تو بہاروں کو ساتھ لیتا جا

فرزانہ رشید ______ کراچی

ہر شام ابھرتا تھا اسی طور سے ماہتاب
لیکن دل وحشی کی یہ حالت نہ ہوئی تھی
خوابوں کی ہوا راس تھی جب تک سمجھ محسن
یوں جاگتے رہنا مری عادت نہ ہوئی تھی

مہوش یوسف ______ چیچو کی ملیاں

طول غم حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

آمنہ ناز محمد ______ میرپور ساکرو

ہمارے بعد رسم دوستی چلی کہ نہیں
ہوا کی زد پہ کوئی شمع پھر جلی کہ نہیں
دیار ہجر سے آئے ہو کچھ کہو محسن
کہ شام غم بھی ___ کسی موڑ پہ ملی کہ نہیں

صائمہ سلیم ______ مانسہرہ

چھوڑ آئے ہو سر شام اسے کیوں ناصر
اسے پھر گھر سے بلا لاؤ کہ کچھ رات کٹے

عابدہ نثار ______ کراچی

تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز میرے گھر میں اتر شام کے بعد

عذرا ناصر ______ کراچی

ہر روز سفر کرتی ہوں میں دیکھ کے اس کو
وہ شام کا تارا مجھے بھٹکائے بہت ہے

مس زاہدہ رشید علوی ______ راولپنڈی

اب تو مے کدے میں بھی نہیں کچھ اہتمام کیف
ویراں ہیں شعور تو دل ہیں بجھے ہوئے
ساغر یہ واردات سخن بھی عجیب ہے
نغمہ طراز شوق ہوں لب ہیں سلے ہوئے

در ثمین ______ سرگودھا

یہ تو سچ ہے چپ رہنے سے پاگل پن بڑھ جاتا ہے
لیکن پتھر کے اس شہر میں آخر کس سے بات کریں

ماریہ علی ______ کراچی

ویران راہگزر کو ہی دیکھا کریں گے ہم
آئے گی تیری یاد تو رویا کریں گے ہم
وہ دن جو تیرے ساتھ گزارے تھے پیار میں
کتنے حسین خواب تھے سوچا کریں گے ہم

نمرہ، اقرا ______ کراچی

جہاں بھی جانا تو آنکھوں میں خواب بھر لانا
یہ کیا کہ دل کو ہمیشہ اداس کر لانا

رضوانہ فیصل ______ سرگودھا

جس طرح خواب مرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کوئی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

لائبہ، ایمن ______ مظفر آباد

قدرت کا کھیل ہے یہ مقدر کی بات ہے
ساحل ہوا قریب تو کشتی الٹ گئی!
یہ بھی بجا وہ آئے تو درد اور بڑھ گیا
یہ بھی درست ہے میری تکلیف گھٹ گئی

تحریم ______ محراب پور

کھلتا تھا کبھی جس پہ تمنا کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

فرزانہ سہیل ______ میاں چنوں

وہ حرف حرف مری روح میں اترتا گیا
جو بات کرتا گیا اور اداس کرتا گیا

زیب یوسف ______ کراچی

اتنی خوش رہنا میرے بعد کہ پھر جب ملیں
اسی تصویر سے عارض بھی ملیں لب بھی ملیں

مریم شہباز ______ اورنگی ٹاؤن

ہمیں زمانے نے سب کچھ سکھا دیا ورنہ
ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسا کمال نہ تھا
یہ کیا ظلم کہ ایک دوسرے کو جان گئے
اگرچہ رابطہ ایسا کبھی بحال نہ تھا

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

کڑاہی قیمہ

اجزا:

کٹا ہوا قیمہ — آدھا کلو
ٹماٹر — چار عدد (بڑے سائز کا)
ہری مرچ — دس عدد
ادرک پیسٹ — ایک چائے کا چمچہ
لہسن — ایک چائے کا چمچہ
پیاز — دو عدد (سلائس کاٹ لیں)
سرخ مرچ — دو چائے کے چمچے
دھنیا پاؤڈر — ایک چائے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر — ایک چائے کا چمچہ
نمک — ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا — آدھا چائے کا چمچہ
گھی/تیل — تین چوتھائی کپ
ہرا دھنیا اور ہری مرچیں — گارنش کے لیے

ترکیب:

تیل گرم کریں، پیاز کو فرائی کرلیں قیمہ کو نمک، ادرک، لہسن کے ساتھ پکائیں پھر ایک کپ پانی ڈال دیں اور اس وقت تک پکائیں کہ قیمہ نیم گل جائے تو کٹے ہوئے ٹماٹر اور ہری مرچیں ڈال دیں۔
اس وقت تک پکائیں کہ تیل اوپر تیرنے لگے۔ آخر میں گرم مسالا اور ہرا مسالا شامل کردیں۔ کڑاہی قیمہ تیار ہے۔ گرما گرم سرو کریں۔

چکن فرائیڈ اونین

اجزا:

چکن بریسٹ — دو عدد
کالی مرچیں — آدھا کھانے کا چمچہ
نمک — آدھا کھانے کا چمچہ
مسٹرڈ پیسٹ — آدھا کھانے کا چمچہ
لہسن — آدھا کھانے کا چمچہ
سویا ساس — دو کھانے کے چمچے
تیل — دو کھانے کے چمچے
پیاز کے لچھے (کٹے ہوئے) — چوتھائی کپ
مکھن — آدھا کھانے کا چمچہ

ساس بنانے کے لیے:

میدہ — ایک کھانے کا چمچہ
فریش کریم — ایک کھانے کا چمچہ
یخنی — چوتھائی کپ
نمک — چٹکی بھر
کالی مرچ — چوتھائی کپ
براؤن سیرپ — چوتھائی کپ
(تمام اجزا کو ملا کر سوس بنالیں)

ترکیب:

چکن بریسٹ میں تمام مسالا لگا کر دو گھنٹے رکھ دیں۔ ایک پین میں تیل گرم کریں چکن بریسٹ ہلکی آنچ میں تلیں۔ دونوں طرف سے براؤن ہوجائے تو سویا سوس ڈال کر پکنے دیں۔ تیار ہونے پر اتار لیں اب ایک ڈش میں چکن نکال کر (اور سوس تیار کر کے پیاز کے لچھے ملا کر) چکن کے اوپر ڈال کر سرو کریں مزے دار فرائیڈ

چکن اونین تیار ہے۔

تھائی اسٹائل چکن کری

اجزا:

آلو (چوکور ٹکڑے کٹے ہوئے) — دو عدد
تیل — دو کھانے کے چمچے
پیاز (درمیانی کٹی ہوئی) — ایک عدد
لہسن (کٹا ہوا) — دو جوئے
چکن بریسٹ (لمبائی میں کٹے ہوئے پیس) — آدھا کلو
کری پاؤڈر — دو چائے کا چمچہ
کوکونٹ ملک — ایک کپ
چکن یخنی — آدھا کپ
سرکہ — دو کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا (کٹا ہوا) — چار کھانے کے چمچے
نمک — حسب ضرورت

ترکیب:

آلو کو ابال کر چوکور ٹکڑے کر کے ہلکا فرائی کرلیں۔
اب ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز اور لہسن ڈال کر چار منٹ فرائی کریں جب پیاز براؤن ہو جائے تو چکن ڈال کر پانچ منٹ فرائی کریں۔ جب چکن ہلکی سی بھون جائے تو اس مسالے میں کوکونٹ ملک، یخنی اور سرکہ ڈال کر تھوڑا پکائیں۔ جب سوس گاڑھی ہوجائے تو اتار کر اوپر ہرا دھنیا ڈال کر سرو کریں۔

چکن ڈونٹس

اجزا:

مرغی بغیر ہڈی کے — ایک کلو
انڈے — تین عدد
پودینہ — ایک گڈی
میدہ — ایک کپ
ہری مرچیں — پانچ عدد
بریڈ کرمبز — ایک کپ
زیرہ (کٹا ہوا) — ایک کھانے کا چمچہ
بیسن — ایک کھانے کا چمچہ
سرخ مرچ — ایک کھانے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
تیل — ڈیپ فرائنگ کے لیے
نمک — حسب ذائقہ
لہسن ادرک کا پیسٹ — دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

چکن میں پودینہ ہری مرچیں لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر بلینڈر میں بلینڈ کریں پھر ایک برتن میں نکال کر اس میں کٹا ہوا زیرہ نمک، بیسن سرخ مرچ ایک عدد انڈہ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں پھر ڈونٹس بنا کر یعنی کباب بنا کر درمیان میں انگلی کو میدہ لگا کر سوراخ بنالیں پہلے میدے میں ڈپ کریں پھر انڈے میں اور پھر بریڈ کرمبز میں ڈپ کر کے ڈیپ فرائی کریں گولڈن ہوجائیں تو نکال لیں اور ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

ڈرائی بیف معہ چلی

اجزا:

پسندے (انڈر کٹ کے پسندے) — آدھا کلو (لمبائی میں کٹے ہوئے)
ٹماٹر (باریک کاٹ لیں) — ایک عدد
ادرک (باریک کٹی ہوئی) — دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ (باریک کاٹ لیں) — چھ عدد
چائنیز نمک — آدھا چائے کا چمچہ
نمک — آدھا چائے کا چمچہ
سویا سوس — دو کھانے کے چمچے
آئل — آدھا کپ

تیل گرم کر کے اس میں پسندوں کو فرائی کرلیں پھر ٹماٹر، ہری مرچ، نمک، چائنیز نمک اور سویا سوس ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب پسندے گل جائیں تو بھون کر ادرک اور ہری مرچیں شامل کر کے دو سے تین منٹ دم پر رکھ دیں۔ مزے دار ڈرائی بیف معہ چلی تیار ہے۔

حسن وصحت

ادارہ

لیموں اور افزائش حسن

تیزابی خصوصیت رکھنے کے باعث لیموں جلد کو دوبارہ زندگی عطا کرتا ہے۔ جس سے جلد کم عمر اور تروتازہ نظر آنے لگتی ہے۔ اس میں وٹامن اے۔ بی اور سی سب پھلوں سے زیادہ مقدار میں ہے جو نہ صرف انسانی نشوونما بلکہ افزائش حسن کے لیے بھی نہایت ضروری ہے۔ جلد کی حفاظت کے لیے لیموں کے چند آزمودہ نسخے حاضر ہیں۔

1 جن خواتین کے چہرے کی رنگت پہلے گوری ہو اور پھر سانولی ہونے لگے ان کو چاہیے کہ صبح کے وقت آدھا لیمن نیم گرم پانی میں نچوڑ کر ایک چٹکی پہاڑی نمک ڈال کر پی لیں اور بقیہ آدھا لیموں بالائی میں نچوڑ کر رات کو سونے سے پہلے چہرے پر ملیں۔

2 جو خواتین عینک لگاتی ہیں اور عینک سے ان کی آنکھوں کے اردگرد حلقے پڑ جاتے ہیں ان کو چاہیے کہ لیموں کے چھلکے باریک پیس کر نیویا کریم کے ساتھ ملا کر آنکھوں کے حلقوں کے گرد لگائیں حلقے دور ہو جائیں گے۔

3 لیموں کا ماسک چہرے کے کیل مہاسوں کو دور کرتا ہے۔ چہرے کو ڈیٹول سوپ سے دھو کر لیموں کے چھلکے نہایت باریک پیس کر گلیسرین میں ملا کر چہرے پر ماسک کی طرح لگائیں۔ 15 منٹ تک ماسک لگا رہنے دیں۔

4 بچے کی ولادت کے بعد اکثر خواتین کے چہرے کی جلد پر دھبے پڑ جاتے ہیں۔ یہ داغ جسم میں آئرن اور وٹامن سی کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ نہار منہ شہد اور لیموں کو پانی میں ملا کر پئیں۔ چند روز کے استعمال سے داغ دھبے دور ہو جائیں گے۔

5 بعض خواتین کے چہرے کی جلد بڑی چکنی ہوتی ہے خاص کر صبح کے وقت ماتھے اور ناک پر اتنی چکناہٹ ہوتی ہے جیسے خوب تیل ملا ہو۔ وہ میک اپ کرتی ہیں تو تھوڑی دیر بعد چکنائی سارا میک اپ خراب کر دیتی ہے۔ ایسی خواتین کو چاہیے کہ وہ ہفتے میں تین بار کھیرے کے رس میں ایک چمچہ لیموں کا رس ملا کر چہرے پر اس آمیزے کا ماسک لگائیں۔ منہ دھو کر اسٹرینجنٹ لگائیں۔ اس کے بعد فیس پاؤڈر لگائیں نیز ایسی غذا کھائیں جس میں چکنائی کم ہو۔ دن میں ایک بار لیمن کلینزنگ لوشن سے کلینزنگ کرنا بھی مفید ہے۔ ایک لیمن کا رس روزانہ پئیں۔

6 چہرے کی چھائیاں دور کرنے کے لیے بھی لیموں مجرب ہے اور اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ مندرجہ ذیل نسخے چھائیاں دور کرنے کے لیے استعمال کریں۔

☆ لیموں ایک چائے کا چمچہ، ہلدی پاؤڈر آدھا چائے کا چمچہ اور بیسن ایک کھانے کا چمچہ۔ یہ سب ملا کر پیسٹ بنالیں اور یہ ماسک چہرے پر لگائیں۔ ہفتہ میں تین بار کریں۔

لیموں کا رس، روغن بادام اور گلیسرین ہم وزن ملا کر شیشی میں بھر لیں۔ اس لوشن کو صبح سویرے چہرے پر ملتے رہنے سے چہرہ ملائم اور خوب صورت بن جائے گا۔ کیل مہاسے چھائیاں وغیرہ دور ہو جائیں گے۔

7 گہرے رنگ کے داغ دھبوں کے خاتمے کے لیے لیموں، ٹماٹر اور کھیرے کا جوس ہم وزن لے کر اچھی طرح مکس کر لیں اور داغ پر خوب اچھی طرح مالش کریں۔

8 لیموں رنگت نکھارنے میں بھی بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔

☆ لیموں کا رس ایک چائے کا چمچہ، گلیسرین ایک کھانے کا چمچہ، گلاب کا عرق ایک چائے کا چمچہ، ہائیڈروجن پر آکسائیڈ آدھا چائے کا چمچہ اور سہاگہ سفوف شدہ ایک چوتھائی چائے کا چمچہ۔ ان سب اشیاء کو یک جان کر کے کسی صاف شیشی میں محفوظ کر لیں اور رات کو سوتے وقت چہرے پر لگائیں اور صبح منہ دھو لیں۔

☆ ایک دن شہد میں لیموں کا رس نچوڑ کر چہرے پر ماسک کریں اور دوسرے دن روغن بادام یا زیتون کے تیل کا مساج کریں۔ یہ عمل ایک ماہ جاری رکھیں۔ رنگت صاف ہو جائے گی۔

9 لیموں جھریاں دور کرنے میں بھی مجرب ثابت ہوا ہے۔

☆ شہد ایک کھانے کا چمچہ، لیموں کا رس ایک چائے کا چمچہ اور بادام کا تیل ایک چائے کا چمچہ باہم ملا لیں اور شیشی میں محفوظ کر لیں۔ روزانہ رات کو آنکھوں کے اردگرد اس **مکسچر** کا مساج کریں۔ یہ **مکسچر** چہرے کے دوسرے حصوں میں بھی استعمال کریں۔ نہ صرف آنکھوں کے اردگرد جھریاں دور ہوں گی بلکہ چہرے کا رنگ فریش نظر آئے گا۔ یہ آمیزہ رنگت بھی نکھارتا ہے۔

☆ شہد ایک چائے کا چمچہ میں ایک لیموں کا رس نچوڑیں اور ماسک کریں ایک ماہ بلا ناغہ کرنے سے جھریاں دور ہو جائیں گی۔

10 کھلے ہوئے مسامات کا ایک بہترین علاج یہ بھی ہے کہ لیموں کا رس، دودھ اور ٹماٹر کا جوس تینوں ایک ایک چائے کا چمچہ لے کر اچھی طرح یکجان کر لیں۔ اس آمیزے کو روزانہ دن میں اپنے چہرے پر لگا کر اچھی طرح مساج کریں یہاں تک کہ یہ جلد میں جذب ہو جائے۔

لیموں سر کے بالوں کے لیے

1 لیموں کا رس ایک چائے کا چمچہ، ادرک کا رس ایک کھانے کا چمچہ اور اتنا ہی پیاز کا رس لے کر ملا لیں اور بالوں کا مساج کریں۔ بال گرنا بند ہو جائیں گے۔

2 سر میں خشکی ہو تو کالی مرچ پاؤڈر (10 گرام)، لیموں کا رس (20 گرام) اور کچا دودھ (50 گرام) ان تینوں چیزوں کو ملا کر سر کے بالوں میں اور ان کی جڑوں میں خوب اچھی طرح لگا کر ملیں اور وہ دو گھنٹے بعد دھو ڈالیں ہفتہ میں 2 بار سے زیادہ استعمال نہ کریں کیونکہ سر پر لیموں کا زیادہ استعمال کرنے سے بالوں کا قدرتی رنگ خراب ہوتا ہے۔

3 ناریل کا تیل ایک کھانے کا چمچہ، کیسٹر آئل ایک کھانے کا چمچہ اور لیموں کا رس ایک چائے کا چمچہ سب باہم ملا کر سر کا مساج کریں۔ خشکی دور کرتا ہے۔

☆ ☆

ریحانہ امجد بخاری

ہری مرچیں

☆ ایک اداکارہ نے دوسری اداکارہ کے گلے کے ہار کو دیکھ کر کہا۔

"یہ تم نے عجیب و غریب سا ہار پہن رکھا ہے۔"

"ہاں یہ میں نے اپنی منگنی کی انگوٹھیوں کو پرو کر تیار کیا ہے۔" دوسری نے فخر سے کہا۔

☆ ایک لڑکا۔ "کیا تمہیں وہ لڑکی ابھی تک یاد ہے' جس سے تم نے پہلی بار محبت کی تھی؟"

دوسرا لڑکا۔ "نہیں! میری یادداشت بہت کمزور ہے۔ مجھے تو وہ لڑکی بھی یاد نہیں' جس سے آج صبح میں نے اظہار محبت کیا تھا۔"

صبا۔۔۔۔ کراچی

تبدیلی کی ہوا

انتخابات میں علاقے کا بڑا زمیندار بھی امیدوار تھا۔ اس نے اپنے ایک مزارعے کو بلا کر تاکید کی۔

"تمہارے تینوں بیٹے بھی ووٹر ہیں' الیکشن والے دن تم انہیں ساتھ لے کر ووٹ ڈالنے کے لیے آنا اور میرا انتخابی نشان انہیں اچھی طرح سمجھا دینا۔"

مزارعے نے جواب دیا۔ "حضور! میں تو آپ کا خادم ہوں مگر میرے بیٹے میرے کہنے میں نہیں ہیں۔"

زمیندار برہم ہو کر بولا۔ "ایسا کیوں ہے؟"

"حضور! آپ کی دعا سے وہ پڑھ لکھ گئے ہیں۔" مزارعے نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

شائستہ عزیز۔۔۔۔ اسلام آباد

تصفیہ

جنگ نے لوگوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ ایک لاپروا اور بے فکری بیوی ہر روز اپنے شوہر کو نہایت انہماک سے اخبار پڑھتے دیکھتی تو کڑھنے لگتی۔ ایک دن اس نے شوہر سے اخبار چھین لیا اور پوچھا۔ "آخر تم ہر وقت اخبار کیوں پڑھتے رہتے ہو؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "سخت جنگ چھڑی ہوئی ہے' اس کی تفصیلات پڑھتا رہتا ہوں۔"

بیوی نے کہا۔ "یہ لوگ کب تک لڑیں گے' مل بیٹھ کر کوئی تصفیہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "یہ دونوں مل جل کر تصفیہ ہی کرنے بیٹھے تھے کہ وہیں سے لڑائی شروع ہو گئی۔"

عائشہ مری۔۔۔۔ لاہور

ایک ٹکٹ میں۔۔۔۔

ریڈیو پر بیک وقت تین اسٹیشن چل رہے تھے۔ ایک پر کرکٹ پر تبصرہ ہو رہا تھا' دوسرے اسٹیشن پر فلم اسٹوری چل رہی تھی جبکہ تیسرے پر کھانا پکانے کی ترکیب نشر ہو رہی تھی۔

تینوں آوازیں گڈمڈ ہونے سے آوازیں آ رہی تھیں۔

"آج باورچی خانے کی چھت پر۔۔۔۔ سلطان راہی اور عمران خان کے درمیان۔۔۔۔ انڈا پکانے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ آپ مصطفیٰ قریشی کو۔۔۔۔ دیگچی میں ڈال دیں' مزید ایک اوور کھیل کر۔۔۔۔ شان کو ڈوئی ماریں۔۔۔۔ اور چولہا بند کر دیں۔"

حنیفہ۔۔۔۔ گوجرانوالہ

مکرر ارشاد

ایک کل پاکستان مشاعرے میں ایک فوجی جرنیل صدر بنا دیئے گئے۔ ان کے رعب اور طنطنے کا کچھ ایسا عالم تھا کہ دس پندرہ منٹ تک سامعین کو کھل کر داد دینے کی ہمت نہیں پڑی۔ اتفاق سے ایک شاعر نے بہت ہی اچھا شعر پڑھا۔ سامعین کے درمیان سے ایک نوجوان تڑپ کر اٹھا اور بولا۔ "مکرر ارشاد فرمایئے۔۔۔۔" اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگوں نے بھی مکرر مکرر کے نعرے بلند کیے۔

صاحب صدر نے اسٹیج سیکریٹری سے پوچھا۔

"یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

اسٹیج سیکریٹری نے ادب سے کہا۔ "جناب! یہ شاعر سے کہہ رہے ہیں کہ یہی شعر دوبارہ سناؤ۔"

اس پر جرنیل صاحب نے اپنے سامنے رکھا ہوا مائیک اٹھایا اور یوں گویا ہوئے۔

"کوئی مکرر و کرر نہیں ہوگا۔ شاعر صاحب آپ کے والد کے نوکر نہیں ہیں' سننا ہے تو پہلی بار دھیان سے سنو۔"

(امجد اسلام امجد کی کتاب "چشم تماشا" سے انتخاب)

مہوش۔۔۔۔ ٹنڈوالہ یار

شامت اعمال

ایک عورت نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ بازو ٹوٹ جانے کے باعث اس کے شوہر اسپتال میں داخل ہیں۔

سہیلی نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"مگر ان کا بازو ٹوٹا کیسے' کیا ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا؟" عورت نے جواب دیا۔

"حادثہ تو نہیں ہوا مگر میں نے ان کا بازو ایک لڑکی کی کمر کے گرد دیکھ لیا تھا۔"

رابعہ۔۔۔۔ کراچی

ہری مرچیں

○ ہر عورت خوب صورت ہوتی ہے سوائے گھر کی عورت کے۔

○ آپ سینما دیکھ کر اتنی خوشی محسوس نہیں کرتے جتنا ایک عورت پڑوس کے گھر میں جھانک کر خوش ہوتی ہے۔

○ عورت کے نزدیک سب سے حسین عورت وہ ہے جو اسے آئینے کے سامنے دکھائی دے۔

○ سمجھدار جج پہلے عورت کی عمر دریافت کرتے ہیں اور تب کہیں جا کر سچ بولنے کا حلف اٹھواتے ہیں۔

آمنہ۔ لاہور

شاہکار

"یہ وہ ہے پینٹنگ۔۔۔۔ جسے شروع کرتے وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کیا چیز بن جائے گی۔" مصور نے فخر سے اپنی ایک پینٹنگ مہمانوں کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا اسے ختم کرنے کے بعد آپ کو پتا چل گیا کہ یہ کیا چیز ہے۔" ایک مہمان نے معصومیت سے پوچھا۔

عائشہ صدیقہ۔۔۔۔ درابن کلاں

خصوصیت

ایک انتہائی بد مزاج اور خشک طبیعت آدمی کا انتقال ہو گیا۔ پورے محلے میں انہوں نے کبھی کسی سے ڈھنگ سے بات نہیں کی تھی نہ کوئی اچھا کام کیا تھا۔ انتقال کے موقع پر لوگ مرنے والے کی اچھائیوں اور برائیوں کا تذکرہ کرتے ہیں مگر یہاں پر تمام لوگ خاموش بیٹھے تھے کہ مرحوم نے کسی سے اچھا سلوک کیا ہوتا تو کوئی خوبی بیان کرتا۔

جب سب چپ رہے تو محلے کا حجام ہمت کر کے بولا۔

"مرحوم میں ایک خوبی تھی کہ ان کی داڑھی کے بال سخت نہیں تھے۔۔۔۔ حجامت آسانی سے بن جاتی تھی۔"

نوشین سلیم۔۔۔۔ کراچی

امید کی کرن

لڑکے نے ڈرائنگ روم میں لگے ہوئے وال کلاک کی طرف دیکھ کر غمزدہ لہجے میں لڑکی سے کہا۔

"پندرہ منٹ بعد وہ ٹرین روانہ ہونے والی ہے، جو مجھے اس شہر سے بہت دور لے جائے گی اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا کیا تم اس دوران کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہہ سکتیں جس سے مجھے امید کی کوئی کرن نظر آئے۔"

"وال کلاک آدھا گھنٹہ آگے ہے۔" لڑکی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

صبا سحر۔۔۔ کراچی

برتری

برناڈشا ہمیشہ اپنی پسند کی چیزیں خریدتا اور بیوی سے کہتا۔

"تمہاری پسند کبھی معیاری نہیں ہوتی۔۔۔ تم کبھی بھی اچھی چیز پسند نہیں کرتیں۔" ایک دن بیوی نے جل کر کہا۔ "آپ نے تو سمجھ رکھا ہے کہ جیسے آج تک میں نے ایک بار بھی اچھی چیز پسند نہیں کی۔"

برناڈشا نے جواب دیا۔

"نہیں' ایک بار کا تو میں بھی قائل ہوں۔۔۔ شادی کے وقت۔۔۔ تمہاری پسند یقیناً" میری پسند سے بہتر تھی۔"

عابدہ۔۔۔ خانیوال

عشق کا خمیازہ

ایک شخص نے بس میں اپنے قریب بیٹھے ہوئے مایوس اور افسردہ شخص کو دیکھ کر باتوں باتوں میں کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ جیسے آپ نے زندگی میں عشق کیا اور ناکام ہوگئے۔" وہ صاحب جھلا کر بولے۔

"میں نے زندگی میں ایک ہی بار عشق کیا اور بدقسمتی سے کامیاب ہوگیا۔"

روبینہ نار۔۔۔ کراچی

معصوم خواہشات

"وکیل صاحب! میری بھی وہی چند معصوم خواہشات ہیں جو ہر عورت کی ہوتی ہیں۔ شوہر کی ساری جائیداد میرے نام' طلاق ہو تو بچے میرے پاس رہیں' شوہر ان کا خرچہ دیتا رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

اینا۔۔۔ اٹک

بے وقوف

تین افراد رات کو کار کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے اندر پھنس گئے اور سوچ رہے تھے کہ کار میں سے کیسے نکلا جائے۔

پہلا ۔۔۔ "یار انجن کے راستے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

دوسرا۔ "نہیں ڈگی کے راستے نکلتے ہیں۔"

تیسرا۔ "جو بھی کرنا ہے جلدی کرو۔ بارش ہونے والی ہے اور کار کی چھت بھی نہیں ہے۔"

آمنہ۔ کراچی

فلمی محبت

"روشنی!"

"ہاں رومی۔"

"کچھ عرض کروں۔"

"عرض نہیں حکم فرمایئے۔"

"دونوں باہر نکلتے ہیں۔ تم ایک دو فرلانگ آگے نکل جانا پھر واپس آنا۔ اس طرف میں چلوں گا۔ جب میں تمہارے قریب پہنچنے لگوں تو تم اپنا رومال گرا دینا۔ ان جانے راہ گیر کی طرح میں یہ رومال اٹھا کر تمہیں پیش کرنے لگوں تو تم پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھنا۔ جواباً" ایسی ہی نظروں سے میں تمہیں دیکھوں گا۔ چند لمحے نظروں کا یہ حسین ٹکراؤ جاری رہے گا اس کے بعد تم مسکرانا' میں بھی مسکراؤں گا اور اس مسکراہٹ کے ساتھ ہی تم اچانک "چھال" مار کر گانا شروع کر دینا۔"

"رومی! یہ سب کچھ تم مجھ سے کیوں کرانا چاہتے ہو؟"

روشنی نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ آج کچھ "فلمی محبت" کرنے کا موڈ ہو رہا ہے۔"

کرن عدنان۔۔۔ کراچی

(ارشاد احمد خان کی کتاب "تعمیل ارشاد سے اقتباس)

دلیل

ایک سیاستدان کو اس کے دوست نے مشورہ دیا۔

"لوگوں سے گفتگو یا تقریر کے دوران تم صرف اپنی بات کیا کرو' اس کے حق میں دلیل مت دیا کرو۔"

سیاستدان نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کیوں۔۔۔؟"

دوست بولا۔ "دراصل تمہاری بات تو سب خاموشی سے سن لیتے اور برداشت بھی کر لیتے ہیں مگر دلیل سن کر بے ساختہ ہنسنے لگتے ہیں۔"

ساجدہ خان۔۔۔ لطیف آباد

حادثہ

ایک صاحب ملازمت کے لیے انٹرویو دے رہے تھے۔ انٹرویو لینے والے صاحب نے پوچھا۔

"آپ کبھی بیمار رہے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"کوئی حادثہ وغیرہ پیش آیا؟"

"ہرگز نہیں۔"

"لیکن انٹرویو دینے کے لیے آپ بیساکھیوں کے سہارے تشریف لائے ہیں۔"

"دراصل میں کل آیا تھا اور زبردستی اندر آنا چاہ رہا تھا' آپ کے چپراسی نے مجھے اٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینک دیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو حادثہ پیش آچکا ہے۔"

"جی نہیں! یہ حادثہ نہیں تھا' آپ کے چپراسی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔"

مہوش۔۔۔ کراچی

جمہوریت

ایک شخص نے پاگل خانے کی سیر کرتے ہوئے ایک پاگل سے دریافت کیا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

پاگل نے جواب دیا۔ "اس جمہوری نظام کی وجہ سے۔"

اس شخص نے پوچھا۔

"وہ کیسے۔۔۔؟" پاگل نے جواب دیا۔

"لوگ کہتے تھے کہ میں پاگل ہوں اور میں کہتا تھا کہ یہ لوگ پاگل ہیں۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

پاگل نے جواب دیا۔ "ان کے حق میں زیادہ ووٹ پڑ گئے۔"

انجم۔۔۔ کنگن پور

جدوجہد

ایک طالبہ نے پروفیسر خاتون سے پوچھا۔ "معاف کیجیے گا' میں آپ کو پروفیسر کہہ کر مخاطب کروں یا مسز؟"

پروفیسر خاتون نے جواب دیا۔ "مجھے مسز کہہ کر مخاطب کرو بیٹی! کیونکہ مجھے مسز بننے میں زیادہ محنت کرنا پڑی ہے۔"

ثمینہ اختر۔۔۔ کراچی

ہر مرچیں

☆ "میرا بھائی دس سال سے وائلن بجانے کی مشق کر رہا ہے۔"

"اب تو بہت اچھا بجانے لگا ہو گا؟"

"زیادہ اچھا نہیں۔۔۔! دراصل نو سال کے بعد کی مشق کے بعد تو جا کر اسے یہ پتا چلا کہ وائلن منہ سے نہیں بجایا جاتا۔"

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

شاہانہ الماس..... کراچی

س آخر آپ نے کس کمپنی کا کمپیوٹر اپنے دماغ میں فٹ کر رکھا ہے جو اتنے دھماکہ خیز جوابات دیتے ہیں' پلیز ہمیں بھی اس کمپنی کا پتا بتا دیں تاکہ ہم بھی وہ ہی کمپیوٹر خرید کر اپنے دماغ میں فٹ کر کے آپ کو چٹ پٹے سوالات لکھ کر بھیجیں۔

ج چودھری کمپیوٹر۔ مگر معاف کیجیے یہ کھلے عام نہیں ملتا' خاندانی ہے۔

نسرین مظفر..... کراچی

س کوشش کے باوجود ہمیں وہ چہرے خواب میں نظر کیوں نہیں آتے جنہیں ہم دیکھنا چاہتے ہیں؟

ج ساڑھے چھ فٹ کے آدمی کو خواب میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ خوف خدا کریں۔

عافیہ حسن..... سکھر

س "ماڈرن دور کی محبت میں اور پرانے دور کی محبت میں کیا فرق ہے؟"

ج "بی بی' ماڈرن دور میں زنان خانہ' مردان خانہ ایک ہی ہو گیا ہے تو وہ مزا محبت کا کہاں' جو کبھی برسوں بیت جاتے تھے زنان خانے میں ان کی ایک جھلک دیکھنے کو۔"

ناہید نیازی..... راولپنڈی

س "بیوی شوہر کو مجازی خدا مانتی ہے' شوہر بیوی کو کیا مانتا ہے؟"

ج "محاورتاً" تو کچھ اور کہا جاتا ہے۔

س ایک مثالی شوہر بلی سے ڈرتا ہے یا بیوی سے؟

ج اگر بلی بیوی کی ہو تو..... تو۔

شمیم فاروق..... شکارپور

س "کہتے ہیں — کوشش سے کامیابی حاصل ہوتی ہے لیکن کوشش کے باوجود کامیابی مقدر میں نہ ہو تو؟"

ج "یا نصیب کلینک سے رجوع کریں۔"

راحت رحمن..... لاہور

س "انسان جب مر جائے تو اس کے لیے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ اگر ضمیر مر جائے تو؟"

ج "اللہ مغفرت فرمائے بے ضمیروں کی۔"

فاطمہ شمالہ..... کراچی

س "اگر آپ کی پسندیدہ شخصیت داڑھی مونچھ منڈوانے پر مجبور کر دے تو آپ کا رد عمل کیا ہو گا؟"

ج "اگر آپ کی مراد پسندیدہ شخصیت والدین کے علاوہ ہے تو میں اس کی ٹنڈ کر دوں گا۔"

راحیلہ کلام..... نصیر آباد

س "پرنس بھیا! یہ تو بتائیں کہ انسان پیار کی ٹھوکر کھا کر شیو کیوں بڑھاتا ہے؟"

ج "باربر ریٹ کتنے بڑھ گئے ہیں شیو کے' آپ کو کیا معلوم' اب ٹھوکر پیار کی ہو یا مار کی (والد صاحب کی) شیو تو بڑھے گی ہی ناں۔"

نجمہ النساء..... اسلام آباد

س "کب تک یوں خلاؤں میں گھومتے رہو گے؟ کیا لینڈ کرنے کا ارادہ نہیں؟"

ج "آپ حکم کریں' کراچی سے اسلام آباد کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔"

ماہ جبیں رحمن..... لاہور

س "اگر آپ کو 24 گھنٹے قہقہے لگانے پر ایک لاکھ کی پیش کش کی جائے تو آپ کا رد عمل کیا ہو گا؟"

ج "لاکھ روپے نہ بھی ملیں تو میں قہقہے ہی لگاتا جاؤں گا۔ غالباً" آپ کو زندہ رہنے کا گر نہیں آتا۔"

نیلم بھٹی..... سیالکوٹ

س "اگر سوال در سوال ہونے لگے تو کیا کرنا چاہیے۔"

ج "کم از کم مجھ جیسے آدمی سے نہیں ہو سکتے آپ کو تو اچھی طرح اندازہ ہو گا۔"

رفعت عزیز..... شور کوٹ سٹی

س "بعض لوگ دھوکا دے کر مسکراتے ہیں' بعض دھوکا کھا کر' بتائیے' جیت کس کی ہوتی ہے؟"

ج "پیٹ بھروں سے ایسی باتیں نہ پوچھیں۔"

خالدہ عظیم..... کراچی

س "سب کا سوال ہوتا ہے کہ آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے' میرا سوال آپ سے یہ ہے کہ آپ چھوٹے تھے تو کیا تھے؟"

ج "والد صاحب الو کا..... کہتے تھے' باقی آپ سمجھ لیں۔"

ثمر رؤف..... ہٹل

س "کیا آپ نے ہمارے لیے بھابی پسند کی کہ نہیں' اگر کی ہے تو بتا دیں' ایمان سے کسی کو نہیں بتاؤں گی بلکہ ان کی حصول کے لیے آپ کی پوری پوری مدد کروں گی' دیکھ لیں میری آفر میں پرافٹ ہی پرافٹ ہے؟"

ج "مجھے اور آپ کو' آپ کی بھابھی کے آنے سے بھلا ہم دونوں کو پیسے دو پیسے کا کیا فائدہ ہے اگر بھابھی کے آنے میں پرافٹ ہے تو چار بار کمائیے۔"

ماہ مبین رحمن..... لاہور

س "لڑکی کالا سوٹ' کالے بال' کالے جوتے اور کالا برقعہ تو پسند کرتی ہے مگر کالا لڑکا پسند کیوں نہیں کرتی؟"

ج "مجھے آپ سے اختلاف ہے' مجھے سب پسند کرتے ہیں۔"

ماجدہ عندلیب..... گھوٹکی

س : افسوس! چرب زبانی کے علاوہ جناب کو کچھ نہیں آتا۔ اگر آتا ہوتا تو ایک ہی قمیص پر گزارا نہ کرتے؟

ج : گزارا ہی تو کرنا ہے تن پر کچھ تو ہے۔

توحید صدیقی..... لانڈھی

س : کتنا پیارا فوٹو تھا ذوالقرنین بھائی بالکل خوب صورت گینڈے کی طرح؟

ج : ماشاء اللہ آپ کی عقل سلیم کے کیا کہنے۔

مدیرہ

نامے میرے نام

صدف سلیمان..... شور کوٹ

کرن اسٹاف اور قارئین کو محبتوں بھرا اسلام۔ کرن اس بار چودہ کو مل گیا۔ یعنی ڈبل خوشی" 14 اگست اور کرن" عید نمبر کے حوالے سے ٹائٹل کا ایک مائنڈ بنایا ہوا تھا کہ زبردست ہوگا پر نہیں۔ جی کرن نے تو شاید ہمیں حیران کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔

کرن ہاتھ آتے ہی جو ٹائٹل پہ نظر پڑی تو پلٹنا بھول گئی۔ اتنا زبردست اسٹائل' ڈریس کیا میک اپ کیا مہندی اور جیولری اور غرض یہ کہ ٹائٹل نے دل موہ لیا۔ کرن اسٹاف شکریہ اور مبارک باد۔

تو جی اب چلتے ہیں کرن کی ماہنامہ اسٹوریز کی طرف' تو" در دل" مائی موسٹ فیورٹ ناول' ہر بار کی طرح اس بار بھی زبردست تھا۔ عبداللہ کا حوصلہ و ہمت قابل داد تھی۔ دل آور کی پلاننگ زبردست ہے۔ پر نبیل کی محبت پر دل میں ہوک سی اٹھی ہے کہ جب نبیل' زری اور دل آور کی محبت کا راز جانے گا تو کتنا دکھی ہوگا۔ خیر جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ پر جو علیزے کے ساتھ ہو رہا ہے وہ تو بہت برا ہے۔ باپ کے کیے کی سزا بیٹی کو مل رہی ہے۔ دل آور اتنا کٹھور بھی ہو سکتا ہے۔ یقین نہیں آتا۔ عدیل کا اظہار محبت اچھا لگا' اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ زری اور علیزے کے درمیان کیا تعلق ہے۔

"وفا میری ضد" کا اینڈ زبردست لگا۔ پر فرحت جی آپ کو نہیں لگتا کہ سب کچھ ماہی کے گھر والوں کا ماننا' عدیہ کے والدین کی معذرت اور سب سے بڑھ کر ماہی اور عدید کا مان جانا' میرا دل کر رہا تھا کہ کہانی تھوڑی سی لمبی اور ہوتی چلیے آپ کی مرضی' لیکن پھر بھی آپ کی کہانی واقعی میں بہت زبردست تھی۔ پلیز جلد ہی ایسی کہانی کے ساتھ دوبارہ انٹری دیجیے گا۔

"وصال کی شام" مکمل ناول عائشہ جی آپ نے تو کرن کو چار چاند لگا دیے۔ ایسے ناول کو پڑھنے کے لیے آنکھیں ترس گئی تھیں۔ اربا اور زعیم کی محبت تو گم سم کرنے کے لیے کافی تھی۔ "مجھے بکھرنے نہ دینا" مصباح نوشین نے کمال لکھا۔ رامش اور ماہی کی جوڑی اچھی لگی۔ رامش کا انداز شادی اچھا لگا۔ مدثر عباس جیسے لوگ تو مجھے زہر لگتے ہیں جنہیں دوسروں کی زندگی اجاڑنے میں ذرہ برابر ملال نہیں ہوتا۔

افسانے سارے اچھے تھے۔ لیکن "یہ ہی ہے زندگی" بیسٹ تھا۔ چاروں دوستوں کی نوک جھونک اچھی تھی اور اس سے بڑھ کر ان کا اشتہار دل کو ہلانے کے لیے کافی تھا۔ اس پر خاقان کی ٹیلی فونک گفتگو پیسے بٹورنے کا اہم ذریعہ بنی۔ شانزہ کا رشتہ ٹوٹنے کا دکھ ہوا' پر خاقان کا اپنی غلطی کا یوں سب کے سامنے اعتراف اچھا لگا۔ یوں ہنستا مسکراتا افسانہ عید نمبر میں یادگار رہا۔

تبصرہ لمبا ہوتا جا رہا ہے تو جلدی سے اختتام کرتے ہیں' ورنہ ردی کی ٹوکری ہمارا مقدر بنے گی جو کسی طور قبول نہیں۔

مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح زبردست تھے۔ "یادوں کے دریچے" میں میرے بعد ام رومان اور حور العین کی غزلیں اچھی لگیں۔ مجھے یہ شعر پسند ہے میں آمنہ امتیاز' شہلا رفیق اور صائمہ کے اشعار اچھے لگے۔ "مسکراتی کرنیں" میں کسی ایک کا نام نہیں لکھ سکتی' سو مسکراتی کرنیں بیسٹ تھا۔ "کرن کرن خوشبو" سدرہ وزیر کے "انمول موتی" فوزیہ ثمرٹ کی "غافل مچھلیاں" بیسٹ آف دا منتھ تھا۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کرن اور پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے اور تمام مشکلات سے دور رکھے۔ (آمین)

عفی قیصرانی عفری..... کوٹ قیصرانی

سب سے پہلے تمام قارئین اور رائٹر کو سلام! کرن ڈائجسٹ چودہ تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل زبردست لگا۔ اس کے ساتھ ملنے والی "کرن کتاب گوری کرت سنگھار" کی تو کیا بات ہے۔ جس سے نا صرف ہم نے میک اپ کرنا سیکھا بلکہ زبردست ڈشیز بنائیں اور مزے لے کے کھائیں' ہاں جی تو آتے ہیں اسٹوریز کی طرف' سب سے پہلے تو اپنی فیورٹ بلکہ موسٹ فیورٹ اسٹوری "در دل" کی طرف آتے ہیں "در دل" تو آج کل دل دھڑکانے پہ تلی ہوئی ہے' شاک پہ شاک لگ رہے ہیں' چلو خیر اینڈ تو یقیناً" اچھا ہوگا' کیونکہ نبیلہ جی کا ناول ہو اور اینڈ برا ہو یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ پلیز نبیلہ جی اسٹوری کی قسط تھوڑی بڑھا دیں یہ کیا ایک طرف ہم نے پڑھنا شروع کیا تو دوسری طرف باقی آئندہ ماہ کا اشتہار دیکھ کے ہوش اڑ گئے۔ ہائے اب ایک مہینہ کیسے گزرے گا' تو پلیز پلیز کچھ رحم کریں ہم غریبوں پر۔

"وصال کی شام" عائشہ نصیر احمد کی اچھی تحریر تھی۔ مصباح نوشین کا ناول "محبتیں بکھرنے نہ دینا" زبردست لگا۔ "وفا میری ضد" کی تو کیا بات ہے۔ واہ جی واہ!! فرحت شوکت ویلڈن "عید تیرے سنگ پیا" میں سہیل پہ بہت غصہ آیا اور عانیہ پہ بہت ترس' خیر آخر میں سہیل کو عقل سلیم آ ہی گئی "دو ستاروں کا ملن" میں اسٹوری کا نام اچھا تھا۔ باقی ساری کی ساری سر کے اوپر سے گزر گئی' سارے کردار گڈ مڈ سے جو تھے۔

ارے' ارے یہ کیا' جس وجہ سے میں خط لکھ رہی ہوں وہ تو میں بھول ہی گئی اور وہ یہ کہ میں نے ایک تحریر بھیجی تھی' کیا وہ قابل اشاعت ہے بھی یا نہیں' چونکہ میں نے فرسٹ ٹائم لکھی ہے اسی لیے پلیز کچھ تسلی تو کرائیں کہ کیسی لگی۔

ایک ریکویسٹ کرنی تھی کہ کرن میں ایک ایسا حصہ بھی بنایا جائے جہاں قارئین کی بھیجی گئی تحریروں پر بات کی جائے' یعنی قابل اشاعت ہیں یا نہیں' کچھ محنت کی ضرورت ہے' اچھی لگی جلد شائع ہو جائے گی' وغیرہ وغیرہ اور جہاں ماہنامہ کرن اور صفحہ نمبر لکھا ہوتا ہے وہاں مہینے کا نام بھی ضرور' ضرور لکھا کریں کیونکہ میری فرینڈز ڈائجسٹ لے جاتی ہیں جب واپس کرتی ہیں تو اس کے پہلے اور آخری چار' پانچ صفحات شہید ہو چکے ہوتے ہیں۔ بعد میں پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ

ڈائجسٹ کون سے ماہ کا ہے۔ اس لیے میری ریکویسٹ پہ غور ضرور کیا جائے۔

میں کرن ڈائجسٹ میں چونکہ فرسٹ ٹائم خط لکھ رہی ہوں' اس لیے تبصرہ مختصر کر رہی ہوں اگر تبصرہ لمبا کروں گی تو مجھے پتا ہے آپ میرا خط ہاتھ میں لے کر ٹیبل کے نیچے دھری ردی کی ٹوکری کی طرف ہاتھ لمبا کر دیں گی۔ میرا خط ڈالنے کے لیے جی!! اس لیے یہ خط اگر شائع ہوا تو اگلے ماہ تک کے لیے اجازت دیں۔

آسیہ اکبر ہاشمی..... ضلع بھکر

اگست 2012ء کا کرن اور اس پر بنی سنوری دلہن ہمارے دل کے درد سے انجان ہمارے سامنے مسکرائے جا رہی ہے' وہ کیا خوب کسی نے کہا ہے کہ ایک طرف خوشیوں کی دلہن بنے گی اور دوسری طرف میرے ارمانوں کا جنازہ..... بابدولت کے دل کے ارمان بھلا کر آپ کو کیسے نظر آسکتے ہیں۔ اگر آتے تو چھ ماہ کے طویل دورانیہ میں آپ ہمیں اتنی تکلیف ہرگز نہ پہنچاتیں۔

ہم نے کیا کیا خواب پلکوں پر نہیں بنے کہ ادب میں اپنا ایک نام بنائیں گے' لوگ بانو قدسیہ' رفعت سراج' عمیرہ احمد کے ساتھ آسیہ اکبر کا نام بھی ضرور لیں گے' مگر کئی ناولٹ' افسانے بھیجنے کے بعد ان کی اشاعت نہ ہونے کے بعد یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے شیکسپیئر کی طرح ہمارے کام کو بھی ہماری زندگی میں کوئی نہیں سراہے گا۔

آپ ہماری بات پر یقین کیجیے ہمارے اندر بہت زیادہ لکھنے کی صلاحیت ہے۔ یہ اوور کانفیڈنس نہیں ہے بس تھوڑی سی خود آگاہی سمجھ لیجیے۔ ہم نے تو سمجھ لیا تھا کہ کرن سے ہمیں ایک ایسا پلیٹ فارم مل جائے گا جس سے ہم اپنے اندر چھپے ہوئے صلاحیت کے لاوے کو دنیا کے سامنے لاسکیں گے۔ مگر آپ کے حوصلہ شکن سلوک کے بعد تو یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے یہ لاوا سرزمین بھکر کی تپتی ریت میں بغیر زمانے کو جھلک دکھائے جذب ہو جائے گا۔ اوپر سے آپ کا خاموشی والا رویہ اف..... یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جرم کے بغیر موت کی سزا مل جائے۔ کیونکہ خواتین کے لیے سب سے تکلیف دہ بات اپنے آپ سے گفتگو ہے۔ جو آپ ہمیں نہ جانے کتنے عرصہ سے دے رہی ہیں اور نہ جانے یہ لامحدود دورانیہ کب تک رہے۔ پلیز پلیز آپ ہمارے بھیجے گئے کالے صفحات کو ایک بار غور سے پڑھ لیجیے جو یقیناً "ادب میں ایک تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوں گے۔

کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ کیا تحریر کر رہی ہوں' بس دکھی دل کی آواز آپ تک پہنچانا مقصد تھا..... اللہ تعالیٰ کرن کو مزید ترقی دے۔ (آمین)

نام نامعلوم..... جگہ نامعلوم

ڈھیر ساری دعاؤں اور سلام کے ساتھ ایک بار پھر میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔

اس ماہ بھی نہ جانے کیوں کرن رسالہ سولہ تاریخ کو ملا۔

پتا نہیں کیوں میرے ساتھ ہی ایسا ہو رہا ہے یا پھر آپ کے ادارے کا اک حصہ بننا بہت مشکل ہے۔

میں نے پہلے بھی اپنی دو کہانیاں "مقررہ وقت" اور "ہائے لمبی جدائی" بھیج چکی ہوں۔ مگر جواب ندارد' یہ میری قسمت کی ستم ظریفی ہے یا رب العزت کی مصلحت' خدا کے لیے میرا یہ خط آپ ردی کی نذر مت کرنا' پتا نہیں پہلے بھی آپ نے میرے خط پڑھے یا نہیں اور میری کہانیوں کا جائزہ لیا کہ — نہیں۔

مگر خدارا میرے اس خط کو پورا پڑھنا اور پھر میری تحریر کو بھی جو "سفر حق" کے نام سے ہے۔ ایک بار ضرور غور سے میری پوری کہانی تو پڑھیں پلیز اور خدا کے لیے میرے اس خط کا جواب ضرور دیں اور ساتھ یہ بھی بتایئے کہ میری تحریر قابل اشاعت ہے — نہیں۔

آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔

ماہ وش گل..... واہ کینٹ

بہت ہی خوش گوار موڈ اور نیک دعاؤں و تمناؤں کے ساتھ آپ کی محفل میں ایک بار پھر شرکت کی اجازت چاہتی ہوں۔

دسمبر میں بھیجی گئی تحریر "یہ میری بھول تھی" کو جولائی کے شمارے میں دیکھ کر جتنی خوشی مجھے ہوئی وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ یہ میری آپ کے شمارے میں پہلی اور کسی بھی شمارے میں تیسری کاوش تھی جسے قبولیت کی سند حاصل ہوئی۔

میں خود کو بالکل بھی مصنفہ نہیں سمجھنا شروع ہو گئی۔ یہ بہت لمبا سفر ہے اور ابھی میں نے پہلا قدم اٹھایا ہے' لیکن میرے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ میں اس ادارے کا حصہ بنی ہوں جہاں اور شخصیات کے زیر سایہ بہت سی مصنفات نے ادب کی دنیا میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ ادا کروں گی ناولٹ شائع کرنے پر' میں مانتی ہوں میری تحریروں میں ابھی وہ پختگی اور گہرائی نہیں ہے' لیکن آپ کا دست شفقت رہا تو ان شاء اللہ میں معاشرے میں چند اچھے لکھنے والوں میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوں گی۔ آج دن 26 رمضان المبارک اور 27 رمضان المبارک کی رات ہے' بہت مبارک رات ہے' میں اپنی تحریر کے شائع ہونے اور آپ کے ادارے' اس وطن کی سلامتی کے لیے ڈھیروں دعائیں کروں گی' لیکن پلیز لمبا انتظار مت کروایئے گا۔

مدیحہ اعجاز..... سردار کوٹ مظفر گڑھ

کرن میں یہ میرا پہلا خط ہے' بلکہ کرن میں کیا کسی بھی ادارے میں' دل میں سو طرح کے اندیشے وسوسے ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں' پتا نہیں اس خط کو جگہ ملے گی بھی یا نہیں۔ پہلی بار میں نے کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک چھوٹی سی تحریر ارے ارے پہلے یہ تو بتا دیں ردی کی ٹوکری کہاں ہے' تاکہ میں اسے چھپا دوں۔ پہلی بار شرکت کی ہے یہ نہ ہو کہ آپ دل توڑ کے رکھ دیں۔ ہر دس تاریخ کو میرا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔

وجہ ہے' نبیلہ عزیز کی زبردست تحریر "در دل" باقی ساری تحاریر اچھی ہیں۔ پلیز میرا خط ضرور شائع کر دیں۔ اس دعا کے ساتھ اجازت دیں کہ کرن دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ (آمین)

☆ ☆ ☆

ملیحہ..... لاہور

کرن کا شمارہ دیکھتے ہی جو سب سے پہلی چیز مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ناولٹ "وہ اک پری ہے" اس کی ہر قسط کا مجھے شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اذان کا کردار بہت اچھا ہے۔ جبکہ فرزان کی حرکتوں پر غصہ کے ساتھ پیار بھی آتا ہے۔ کہانی کچھ اپنی جگہ ٹھہری ہوئی لگ رہی ہے یا پھر ناول کے صفحات کم ہوتے ہیں۔ دل تو یہ چاہتا ہے کہ کرن کے سارے صفحات اسی ناول سے بھرے ہوئے ہوں۔ اللہ کرے جس طرح اب تک دلچسپ رہا ہے آگے بھی یہ ہماری امیدوں پر پورا اترے۔ ریحانہ جی آپ بتا سکتی ہیں کہ کم از کم کتنی اقساط کا ہمیں انتظار کرنا ہوگا.....

روزینہ جمیل..... وہاڑی

اگست کا کرن میرے سامنے رکھا ہے ٹائٹل بہت خوب صورت ہے اور اس ماہ کے افسانے تو بہت اچھے

ہیں خاص طور پر فاخرہ گل کا افسانہ بہت پسند آیا۔
سلسلے وار ناول دونوں ہی اچھے جا رہے ہیں۔ البتہ فوزیہ یاسمین نے ہمارے تجسس کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ پلیز اب واضح کردیں کہ کیا مسئلہ ہے زوبیہ کے ساتھ۔ عالیان کی غلط فہمی دور کردیں۔
ریحانہ کے ناولٹ "وہ اک پری ہے" میں فرزان کا کردار بہت دلچسپ ہے اور اس کا موقع کی مناسبت سے اشعار کا استعمال۔ مزا آتا ہے جب اس کی گفتگو پڑھتے ہیں۔ اس قسط میں فیضی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ فرزان کو اب پچھتانا پڑے گا کہ اس نے والد کی نافرمانی کی..... دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے ناولٹ میں نفیسہ سعید کا ناولٹ "میرا ستارہ" پسند آیا۔
کرن کتاب "گوری کرت سنگھار" کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ بہت کام کی باتیں آپ کرن کتاب کے ذریعے بتاتی ہیں۔ مستقل سلسلوں میں تمام سلسلے اچھے لگے۔ خاص طور پر "یادوں کے دریچے سے" اور "کرن کرن خوشبو" اچھے تھے۔ اجازت دیں۔

صبیحہ.... کراچی

بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اپنے رسالہ میں جگہ دی۔ یہ میرا دوسرا خط ہے امید ہے اسے بھی شامل اشاعت کریں گی۔ کرن کا جگمگاتا سرورق دل کو بہت بھایا۔ سلسلے سارے ہی ہمیشہ کی طرح بہت اچھے تھے۔ افسانے سارے بہت اچھے تھے رابعہ افتخار کا تعارف اور فاخرہ گل کا افسانہ بہت خوب صورت تھا۔
اس کے علاوہ انٹرویو میں شاہین رشید کا "پہلا روزہ" پڑھ کر بہت مزا آیا۔ ناولٹ "وہ اک پری ہے" کی ہر قسط کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ دعا ہے کرن اپنی کرنیں یوں ہی بکھیرتا رہے۔ آمین۔

صائمہ..... بھلوال

کرن اپنے دلکش رنگ اور کرن کتاب "گوری کرت سنگھار" کے ساتھ ملا۔ ٹائٹل دونوں کے واقعی زبردست تھے۔ اب آتے ہیں کرن کی طرف حمد و نعت سے مستفید ہوتے ہوئے آگے بڑھے اور انٹرویو میں صدیق اسماعیل سے ملاقات اچھی لگی۔ فوزیہ اور نبیلہ دونوں کے ناول اچھے جا رہے ہیں۔ سخت مقابلہ ہے۔
افسانوں میں بہترین فاخرہ گل کا تھام طیفور اور رفاقت جاوید کے افسانے بھی اچھے تھے۔
"مجھے سے ملیے" میں اپنی پسندیدہ مصنفہ رابعہ افتخار سے ملاقات اچھی لگی۔ ہماری تو کوئی بھی تحریر آپ نے شائع نہیں کی۔
پوچھنا آپ سے یہ ہے کہ ایک عدد افسانہ "ملن" آپ کو بھیجا ہے کیا وہ آپ کو مل گیا اور کب شائع ہو گا۔ دوسری بات یہ کہ ہم مختلف سلسلوں کے لیے تحاریر ایک ہی لفافے میں بھیج دیتے ہیں کیا وہ ضائع ہو جاتی ہیں کیونکہ پچھلے دو تین مہینوں سے یہ ہی ہو رہا ہے۔

ج پیاری صائمہ! آپ کا افسانہ ہمیں مل گیا ہے ابھی پڑھا نہیں ہے مختلف سلسلوں کے لیے الگ الگ صفحات استعمال کریں۔ قابل اشاعت ہونے کی صورت میں ہم ضرور شائع کرتے ہیں۔

علیزہ..... رائے ونڈ

خیال تھا کہ عید کی مناسبت سے کرن کا اگست کا شمارہ اپنے دامن میں بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہو گا مگر اس حوالے سے کم ہی تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ حمد و نعت ہمیشہ کی طرح لاجواب تھیں۔ انٹرویو میں رابعہ افتخار سے مل کر خوشی ہوئی۔
"دست کوزہ گر" میں خرم کے ہاتھوں فوزیہ کا استعمال باعث تکلیف لگا ہے مکمل ناول "محبتیں بکھرنے نہ دینا" اور ناولٹ "وہ اک پری ہے" شاندار ہیں۔
"وفا میری ضد" کی دوسری اور آخری قسط بھی شاندار رہی۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے نئی رائٹرز لکھنے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ مستقل سلسلے بھی پسند آئے۔ پلیز میرا خط ضرور شائع کریں۔